
تاثیر عشقم
مصنفہ: مہک عارف
Ig@aestheticnovels.online

تاثیرِ عشقم

ازقلم مہکؔ عارف

اہم اعلان!

اس تحریر کے تمام جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ لکھاری کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی اس ناول کو پبلش کرنے کی اجازت نہیں۔

لکھاری کا پی کرنے والے کے خلاف قانونی کارہ جوئی کا مجاز رکھتا ہے۔

باب نمبر 1

اس تنگ تاریک کوٹھری میں وہ تنہا کھڑا تھا۔ جگہ اتنی تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ ایسے میں وہ کوٹھری کے دروازے کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بے دریغ پیٹ رہا تھا۔ لیکن باہر کی ظالم اور بے حس دنیا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تھک ہار کر اسنے اپنا چہرا اوپر آسمان کی جانب اُٹھایا۔

یااللہ !!!" وہ ہلک پھاڑ کر چیخا تھا کہ اسکی آہ فرش سے عرش تک جا پہنچی اور وہ ہربڑا کر اٹھ بیٹھا۔

بھوری چار دیواری والے کمرے میں وہ اس جہازی سائز بیڈ پر تن تنہا تھا۔ پورا بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ کمرے میں واحد کھڑکی تھی جس سے رات کی تاریکی کا اندازا لگایا جا سکتا تھا۔ کمرے کے دائیں جانب ڈریسنگ روم کا دروازا تھا۔

آہ!! آخر کب یہ خواب میرا پیچھا چھوڑیں گے۔" سرد آہ بھرتے اس نے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں زور سے بھینچ کر جھٹکا دیا۔ آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ تبھی دور سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی وہ اسے بلا رہا تھا کامیابی کی طرف ہدایت کی طرف لیکن وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اٹھا اور جا کر کمرے میں لگی واحد کھڑکی بھی مقفل کر دی جس کے ساتھ ہی مؤذن کی آواز دم توڑ گئی اور وہ وہیں زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسکی سبز ہیزل آنکھوں سے زار و قطار پانی بہنا شروع ہو گیا۔

وہ مظبوط اعصاب کا مالک شخص پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کہ یہی تو وقت تھا اسکے پاس اپنے دل کا غبار نکالنے کا اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنے کا طلوع آفتاب کے بعد تو ایک الگ زندگی شروع ہو جانی تھی وہ جو گناہوں کی گرویدہ تھی جس زندگی میں وہ سر تا پیر گناہوں میں ڈوبا

ہوا تھا وہ اس زندگی کو چھوڑ کر دور چلا جانا چاہتا تھا مگر یہ اتنا آسان نہ تھا اسے اسی زندگی کے ساتھ جینا تھا خود سے جڑے لوگوں کے لیے۔

اسنے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچیں ایسے کہ ناخن ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئے۔ اسکا ضبط جواب دے رہا تھا لیکن یہ زندگی اس نے اپنے لیے خود نہیں چنی تھی یہ زندگی تو اسے تھمائی گئی تھی۔ خود کو پتھر سے زیادہ مظبوط کہنے والا مرد ایک بار پھر ہار رہا تھا لیکن طلوع آفتاب تک۔

یہ حسیں، دلنشیں۔۔

اک محبت کی ہے جو داستاں۔۔

اورب راکھاں اورب۔۔۔۔۔"وہ سر میں گنگناتی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی جب کسی چٹان جیسی چیز سے بری طرح ٹکرائی۔

یُو۔۔ڈفر اللہ میاں نے یہ آنکھیں صرف شو کروانے کے لیے دی ہیں دیکھ کے۔۔۔"لیکن وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی تھی۔ اپنے سامنے کھڑے غصے سے خود کو تکتے چنگیز خان کو دیکھ کر اسکا ہلک خشک ہو گیا اور جلدی سے اپنا رخ دوسری جانب موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

ہائے اللہ جی۔ آج تو مر گئی۔ کچھ کر جیا کچھ کر۔"دل ہی دل میں بڑبڑاتے اسنے رخ واپس موڑا۔ وہاں کسی زی روح کو نہ پا کر شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

اف بچ گئی۔ صحیح کہتے ہیں یہ چنگیز خان میری یہ زبان کسی دن مجھے ذلیل کروائے گی"خود کو ملامت کرتے جیا باقی سیڑھیاں پھلانگتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔

وسیع لان میں پڑی کرسیوں پر اس وقت معید سکندر اور ثانیہ بیگم براجمان تھیں۔ جیا لان کے بائیں جانب لگے جھولے پر آ کر بیٹھ گئی جس پر منہا پہلے سے بیٹھی فون میں غرق تھی۔

کیا دیکھ رہی ہو؟"جیا نے منہا کے ہاتھوں سے موبائل جھپٹا۔

منہا نے کھا جانے والی نظروں سے جیا کو گھورا گویا اسے کچا چبا جانے کا ارادہ رکھتی ہو اور ابرو سے موبائل کی سکرین کی جانب اشارہ کیا۔

اوہ تو سیل لگی ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں۔" جیا نے مزید موبائل کو کھنگالنا شروع کیا۔ منہا نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھیننے کی کوشش کی

جیا اس سے پہلے منہا کو مزید تنگ کرتی چنگیز خان کو لان کی جانب آتے دیکھ شرافت سے فون واپس کیا اور معصوم سی شکل بنا کر جھولے پر ٹک کر بیٹھ گئ.

بالاج سکندر عرف چنگیز خان اپنی پوری وجاہت کے ساتھ آ کر لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہوا۔ آج آفس میں کام زیادہ نہیں تھا جس وجہ سے وہ مغرب کے بعد گھر آ گیا تھا ورنہ رات آٹھ نو بجے سے پہلے اُسکی واپسی غیر یقینی ہوتی تھی۔

مظفر علی سے میٹنگ تھی نہ آج تمہاری کیا بنا اُسکا۔" معید سکندر نے بات کا آغاز کیا۔

جی وہ کل ڈیل سائن کر دیں گے۔ منشی سے بات ہوئی تھی میری لیکن آج میٹنگ کے دوران مجھے انکا رویہ خشک سا لگا تھا جیسے وہ اس سب میں انٹرسٹڈ نہ ہوں۔" بھاری رعب دار آواز سے کہتے اس نے سامنے میز پر دھری کیتلی سے چائے کپ میں انڈیلی۔ بالاج کی بات پر معید سکندر محض ہنکارا بھر کر رہ گئے۔

جیا!! تم کل صبح تیار رہنا۔ یونیورسٹی میں ایڈمشن کروانا تمہارا۔" بالاج نے کپ سے ایک گھونٹ بھرتے چند قدم دور بیٹھی جیا کو مخاطب کیا اور جس ذکر سے وہ پچھلے کچھ عرصے سے بچتی آ رہی تھی وہ آج کر دیا گیا تھا۔

اپنی سیاہ موٹی آنکھوں میں دنیا جہان کی بوریت سموئے اُسنے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

وہ جانتی تھی اگر وہ انکار بھی کر دیتی تو کون سا اس نے سن لینا تھی کیونکہ مسٹر چنگیز خان اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔ اپنی زبان کا پکّا ۔ اپنے الفاظ کو پتھر پر لکیر کہنے والا بالاج سکندر۔

کمرہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صوفے کے قریب کوئی چھوٹی سی لال رنگ کی شے چمک رہی تھی قریب جانے پر معلوم پڑتا کہ وہ سگریٹ تھی۔ بے شک سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے لیکن اس بات کا اثر اس شخص پر نہ تھا ایسے کئ سگریٹ کو ساتھ رکھے ٹیبل پر پڑے ایش ٹرے میں مسلا گیا تھا۔ آج ایک بار پھر سے وہ ماضی کے جھمیلوں میں کھویا ہوا تھا ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا ٹکڑا جب سلگ سلگ کر انگلی تک پہنچ جاتا تو گرمائش کے احساس سے وہ اسے ایش ٹرے میں مسل دیتا۔

ماضی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان چاہ کر بھی پیچھا نہیں چھڑوا سکتا۔ اسکا ماضی بھی ایسا ہی تھا۔ تکلیف دہ، مہلک بیماری سے زیادہ جان لیوا۔ دفعتاً وہ صوفے سے اٹھا اور آنکھوں کے نم کناروں کو انگلی کے پوروں سے صاف کیا۔ جا کر کمرے کی بتی جلائی تو تاریک

کمرہ مصنوعی روشنی میں نہا گیا تو وہاں کھڑے شخص کا سراپا واضح ہوا۔ بالاج سکندر جو دن کی روشنی میں چٹان سا مظبوط نظر آتا تھا یہ تکلیف دہ ماضی اسکی زندگی کا تاریک پہلو تھا۔ ٹھنڈی آہ خارج کرتے بالاج نے خود کو پھر سے مضبوط کیا تھا اور اپنی کل کی میٹنگ میں پیش کی جانے والی پریزینٹیشن تیار کرنے لگا۔

وہ کہتے ہیں نا کہ دن کی روشنی میں مظبوط نظر آنے والے رات کی تاریکی میں نمک کا مجسمہ ہوتے ہیں۔

صبح اُسکی آنکھ کسی خوبصورت خواب کے زیر اثر کھلی تھی وہ انگڑائی لیتی آنکھیں مسلتے اٹھ بیٹھی انگڑائی لیتے اسکی نگاہ اپنے دائیں جانب کروٹ لیے سوئی منہا پر گئی بلا کی معصومیت اپنے حسین و جمیل چہرے پر سجاے وہ آرام سے خواب و خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی

منوں منوں۔۔یار آٹھ جاؤ۔" اور وہ جیا سکندر رہی کیا جسے کسی کا سکون ہضم ہو جائے۔ اونچی آواز میں اسکے کان کے قریب چیختے پل میں بیچاری کو جھنجھوڑ ڈالا۔ منہا ھڑبڑا کر اٹھی۔

کیا مسئلہ ہے جیا کیوں چین نہیں تمہیں ایسے گدھوں کی طرح کون اٹھاتا ہے کسی کو نیند سے۔ ذرا جو شرم آجائے تمہیں۔ دیکھنا ذرا کل سے میں بھی تمہیں کیسے اٹھاتی ہوں یا اللہ مجال ہے جو یہ لڑکی کبھی مُجھے دو گھڑی چین لینے دے۔۔۔۔"

منہا اپنی نیند خراب ہونے پر سخت بد مزہ ہوتی اٹھ بیٹھی اور اب اپنا سارا غبار جیا پر نکالنے لگی۔ جو اُسکے شر سے بچنے کو تیزی سے باتھروم میں گھس گئی تھی۔

سنو۔ تمہاری شادی کب ہو گی؟؟" جیا جب باتھروم سے باہر نکلی تو منہا نے تجسس سے پوچھا اور خود باتھروم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

جیا نے پہلے تو حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

جب بھی ہو جائے۔۔ کونسا تم سے ہونی ہے۔" بالوں کی اونچی پونی ٹیل بناتے جیا نے کندھے اچکا دیے۔

وہ میں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کب ہو گی تمہاری شادی اور کب چھوٹے گی میری تم سے جان۔" بیزار لہجہ مقابل کو آگ ہی تو لگا گیا تھا۔ جیا ہاتھ میں پکڑا ہیئر برش مارنے کے سے انداز میں منہا کی جانب بڑھی لیکن اس سے پہلے ہی منہال اُسکے ارادے بھانپتی جلدی سے باتھرُوم میں غائب ہو گئی۔

فکر نہیں کرو میری جان ساری زندگی تمہارے سر پر مسلّط رہوں گی۔" چلا کر کہتے اُسنے اپنا بیگ اٹھایا جسمے اس نے اپنے اہم دستاویات رات کو بھر کر رکھے تھے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ پیچھے اُسکی بات پر منہا کا قہقہہ بلند ہوا۔

جیا گاڑی میں بیٹھی باہر دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی گاہے بگاہے وہ بالاج پر بھی نظر ڈالتی جو پوری طرح سے اپنا دھیان ڈرائیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ گاڑی میں چھائی خاموشی سے اب وہ اکتا گئی تھی۔

کیا یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ضروری ہے؟" جیا نے بالاج کی جانب رخ کرتے معصومیت سے پوچھا۔

تو کیا ساری زندگی گھر بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" الٹا سوال کر کے وہ اُسے لاجواب کر گیا جیا کو بالاج سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ تو کیا وہ اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسکی آنکھوں میں نمکین پانی بھر گیا

بول دیں اگر بوجھ ہوں آپ پر تو چلی جاؤں گی؟" بمشکل آنسوؤں پر ضبط کرتی وہ مزید گویا ہوئی

اچھا ذرا بتاؤ تو جاؤ گی کہاں؟؟" جیا اسکی بات سن کر حیران نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی یہی جواب ہو گا اُسکا۔

اپنے گھر۔۔!" یک لفظی جواب دے کر وہ اپنا رخ دوبارا کھڑکی کی جانب موڑ کے بیٹھ گئی۔ وہ بالاج سے شدید والا ناراض ہو چکی تھی۔

اچھا اس گھر جہاں سے پہلے بھی تم دو دفعہ بھوت پریت سے ڈر کر آ گئی تھیں۔؟" بالاج نے مصنوعی قہقہ لگایا اور گاڑی یونیورسٹی کے سامنے روک دی۔

تب میں چھوٹی تھی۔!! جیا نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ بالاج بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولتا گاڑی لوک کرتا باہر نکلا تھا۔ جیا کی بات پر دل تو قہقہ لگانے کو چاہ رہا تھا۔

"اچھا تب چھوٹی تھیں تم اب کتنی بڑی ہو گئی ہو۔؟" بالاج نے استہزائیہ انداز میں اسکے چھوٹے قد پر چوٹ کی اور قدم یونیورسٹی کے اندر کی جانب بڑھا دیے۔ دو قدم آگے چل کر پلٹ کر دیکھا تو جیا وہیں کھڑی خفگی سے اُسے ہی گھور رہی تھی۔

"چلو"۔ بالاج نے سنجیدگی سے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا وہ پیر پٹختی اسکے ہمقدم ہو لی۔

اُسکا یونیرسٹی میں ایڈمشن کروا کر وہ گاڑی میں بیٹھا کب سے جیا میڈم کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ یونی گھومنے کا بہانا بنائے نا جانے کہاں غائب تھیں۔

جیا اپنی دھن میں ادھر اُدھر دیکھتی کیفے کی طرف جا رہی تھی جب سامنے سے کوئی آ کر اُس سے بری طرح ٹکرایا۔ تصادم اتنا زوردار تھا کہ اُسکے ہاتھ میں پکڑے ڈاکومنٹس زمین بوس ہو گئے۔ سامنے والے کی فکر کیے بغیر وہ بال کانوں کے پیچھے اڑستی نیچے جھکی۔ سامنے والے کی نظریں بھی ساتھ ہی جھکی تھی۔ وہ اب اُسکے پیروں میں بیٹھی جلدی جلدی سب سمیٹ رہی تھی۔ سامنے والے کو مسلسل خود کو تکتے پا کر وہ جھنجلا کر اٹھی اور سامنے والے کو کچھ سنانے ہی لگی تھی کہ اُسکی آنکھوں میں دیکھ کچھ لمحات کے لئے ساکت ہو گئی۔

ایم سو سوری۔۔میں نے دھیان نہیں دیا۔ آپکو لگی تو نہیں۔"سامنے کھڑے وہاج ملک نے فوراًاپنی بے خودی پر قابو پاتے معذرت کی۔

دیکھ کر نہیں چل سکتے آپ۔یہ دو موٹی موٹی آنکھیں اللہ میاں نے لڑکیوں کو تاڑنے کے لیے دی ہیں۔"اسکا سکتہ ٹوٹا تو وہ بغیر لحاظ کے بولتے چلی گئی۔یہ جانے بغیر کہ سامنے والے کو اسکا ایک ایک لفظ جیسے حفظ ہوا تھا۔

ایسی بات نہیں ہے وہ دراصل میں۔۔"وہاج اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی والا تھا جب کسی مرد کو جیا کے پاس آتے دیکھ زبان کو بریک لگائی۔

کہاں چلی گئی تھیں تم جیا۔میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔۔"بالاج سے جب مزید انتظار نہ ہوا تو وہ گاڑی سے نکل کر جیا کو ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آیا تھا۔

جی وہ۔وہ می۔میں"جیا کی سمجھ میں نہ آیا کیا بولے۔

کیا وہ وہ لگا رکھی ہے چلو بھی اب یا انویٹیشن بھیجوں۔"بالاج کی بات سن کر جیا کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔اور وہ پیر پٹکتی بالاج کے پیچھے چل دی۔

ہمم۔"جیا"۔۔نائیس نیم۔"وہاج نے ہنس کر سر جھٹکا۔

رات کو ڈائننگ ہال میں سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔جیا کھانا کم کھا رہی تھی اس سے بڑھ کر منہا کے کھانے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔

جیا۔کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔۔۔مجھے کھانا کھانے دو۔"منہا نے جیا کو دو تین مرتبہ آہستہ آواز میں ٹوکا تھا لیکن وہ جیا ہی کیا جس کی کانوں پر کبھی کوئی جوں رینگ جائے اسلئے اب کی بار منہا نے قدرے اونچی آواز میں اُسے بولا۔

موٹی ہو جاؤ گی کھا کھا کر۔"جیا نے دانت پیستے ہوئے بولا

مر جاؤں گی لیکن موٹی نہیں ہوں گی۔انشاءاللہ۔۔"منہا نے ہمیشہ کی طرح اپنا ڈائیلاگ بولا تھا

بس'کیا تم دونوں چین سے نہیں بیٹھ سکتی ہو۔"بالاج جو معید سکندر اور ثانیہ بیگم کے ساتھ بات کر رہا تھا بار بار انکو چونچ لڑاتے دیکھ گویا ہوا

بھیو۔میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔یہ بدتمیز مجھے تنگ کر رہی ہے۔"بالاج نے آبرو اچکا کے جیا کی جانب دیکھا

نن۔ نہیں۔ تو "اُسکے دیکھنے پر جیا ممنائی۔

چپ ہو جاؤ تم دونوں۔ 'ثانیہ بیگم نے اب انکو چپ کروایا تھا اور وہ خاموش ہو بھی گئی تھیں۔

ہاں تو بیٹا میں کہہ رہی تھی کہ مصفرا کی منگنی پر جانا بہت ضروری ہے اگر ہم نہیں گئے تو انہیں برا لگے گا۔"

جی تو آپ لوگ چلے جائیں نا۔ میں نہیں جانا چاہتا۔ میری طرف سے آپ وش کر دینا اُسے۔" بالاج نے ہمیشہ کی طرح اپنا دامن بچایا تھا۔

ٹائمنگ بہت غلط ہے۔ چچ چچ چچ۔ "جیا نے کچھ سوچتے دل ہی دل میں افسوس کیا لیکن دل کی بات زبان پر آگئی تھی

کیوں جی کیا ہوا ہے اب۔" بالاج نے اسے دوبارا بولتے دیکھ کر ہاتھ سینے پر باندھتے اپنا رخ پورا اسکی جانب پھیرا تھا۔ تو یہ ناممکن تھا کہ جیا کی زبان کہیں بند ہو جاتی۔ انکی نوک جھوک دیکھ معید سکندر بے ساختہ مسکرا دیے۔

مم۔ میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ آ۔ آپ خود دیکھیں ابھی آج میرا ایڈمشن ہوا ہے یونی میں کک۔ کلاسز سٹارٹ ہونی ہیں میں کیسے جا سکتی ہوں۔۔ اُونہوں۔" جیا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے نفی میں سر ہلایا۔

صبح تک کسی کی جان جا رہی تھی یونی کے نام سے۔" منہا کو شاید اسکے کہے پر یقین نہیں آیا تھا۔

تب وہ سب نہیں دیکھا تھا جو دکھ گیا ہے آج۔" جیا کے سامنے چھن سے کسی کی مسکراتی آنکھیں لہرائی تھیں۔

کیا۔ کیا دکھ گیا ہے." منہا نے تجسّس کے مارے پوچھا

کک۔ کچھ بھی تو نہیں۔ م۔ میرا مطلب اتنا اچھا ماحول تھا یونی کا۔۔ مم۔ مم۔ میرا اب دل کر رہا ہے۔ سو مصفیرا سے معذرت کر لینا تم میری طرف سے۔" جیا کہتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ بالاج بھی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

یا اللہ۔ پتا نہیں کیوں جان جاتی ہے تم لوگوں کی اپنی خاندان والوں سے ملنے سے۔ حد ہے بھئی۔" ثانیہ بیگم کو شدید تاؤ آیا تھا

ارے بیگم بچے عہد کے بڑے ہو گئے ہیں۔ جانے دو انہیں ہم چلے جائیں گے تو نائلہ شکوہ نہیں کر پائے گی۔" معید سکندر نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ بات مان گئی تھیں جبھی بولیں

جی سہی کہہ رہے ہیں آپ اور تم بالاج اگر تم نے جیا کو ڈانٹا یا مجھے کوئی شکایت ملی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ویسے بھی ہمیں کوئی ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔" وہ بالاج کو جیا کے بارے میں خبر دار کرنا نہیں بھولی تھیں

جی کوئی شکایت نہیں ہو گی آپکو۔ اور یہی بات برائے مہربانی اپنی چہیتی کو بھی سمجھا دیں۔" بالاج اپنا موبائل اٹھاتا جس پر کال آ رہی تھی، لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا۔

☺----------☺

جیا بہت خاموشی ک ساتھ منہا کی پیکنگ میں مدد کر رہی تھی۔وہ اُداس ہو رہی تھی نا جانے یہ ایک ہفتہ کیسے گزرنا تھا لکن خیر وہ گزار لے گی۔

منہا بیٹا کتنی دیر ہے۔"ثانیہ بیگم نے انکے کمرے میں داخل ہوتے استفسار کیا

بس مما کچھ چیزیں رہ گئی ہیں۔۔ آپ نے شکور چچا سے بول کر باقی سامان رکھوالیا گاڑی میں۔۔"منہا اپنے ہاتھ میں موجود ڈریسز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

ہاں بیٹے رکھوا دیا ہے۔۔"ثانیہ بیگم صوفے پر براجمان ہوئی۔

جیا وہ کٹ پکڑانا ذرا نیو والی۔۔جیا۔جی۔۔"منہا نے باقی میک اپ کا سامان دیکھتے جیا سے کٹ مانگی جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ جیا کی جانب مڑی۔جو سوں سوں کرتی آنسو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی

جیا میری جان کیا ہوا ہے۔کسی نے کچھ کہا ہ بتاؤ تو۔ مما دیکھیں اسے۔بیٹھو تم یہاں۔"منہا نے اُسے سامان ایک طرف کر کے بیڈ پر بٹھایا۔

کچھ نہیں وہ بس آپ لوگ جا رہے ہیں تو اُداس ہو گئی میں۔۔"ثانیہ بیگم ک پوچھنے پر اُسنے کہا تھا۔وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

ا۔ آپ مت جائیں نا۔سوری کر لیں پھوپو سے۔ آپ کے بغیر بھی تو منگنی ہو جائے گی یم سب شادی پر چلے جائیں گے۔وہ کونسا کوئی آپکی منت کر رہی ہیں۔پلیز مت جایئے نا۔۔"جیا نے ایک آس سے کہا تھا

بیٹے۔رشتے منتوں یا ترلوں سے نہیں بنتے بلکہ رشتے تو احساسات کے محتاج ہوتے ہیں۔اس لیے رشتوں کا احساس کرنا چاہیے جو ہمارے ہمقدم، ہمارے ساتھ چلنا چاہے اسکا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ جانے چاہیے۔یہی ہماری زندگی ہے۔اور ویسے بھی ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے۔ہم واپس آ جائیں گے۔"ثانیہ بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن جس چنگیز خان کے ساتھ مجھے چھوڑ کے جا رہی ہیں اگر واپسی پر میں زندہ نہ بچی تو۔۔"جیا نے ایک اور جواز پیش کیا تھا جسے رد کر دیا گیا

میں نے سمجھا دیا ہے اسے آپکو کچھ نہیں کہے گا بشرطیکہ آپ اسے تنگ مت کرنا۔میری بات سمجھ رہی ہو۔جیا۔"انکے پوچھنے پر اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

پرومس۔"ہاتھ بڑھا کر وعدہ کیا تھا اسنے۔

اور جیا سکندر جب وعدہ کرنا جانتی تھی تو اسے تاحیات نبھانا بھی خوب جانتی تھی۔

تھوڑی دیر میں اس نے منہا کے ساتھ مل کر تمام تیاری کروادی تھی۔اور منہا، ثانیہ بیگم اور معید سکندر لاہور کے لیے نکل گئے تھے۔

آج انہیں گئے ایک رات ہی بیتی تھی لیکن جیا بہت اداس ہو گئی تھی۔

آج جیا کی یونیورسٹی کا پہلا دن تھا وہ بہت پر جوش تھی آج کے لیے۔اسی لیے صبح صبح اٹھ کر تیار ہو گئی۔

زرکہ بی نے دونوں کے لیے ناشتہ تیار کر دیا تو وہ دونوں اجلت میں ناشتہ کرتے اپنی منزل کی جانب بڑھے۔بالاج نے پہلے جیا کو یونیورسٹی ڈراپ کیا اور اسے خاص تاکید کی کہ جب تک وہ خود اسے پک کرنے نہیں آتا وہ یونیورسٹی سے باہر نہیں نکلے گی۔

اور پھر آفس چلا گیا۔

جیا تھوڑی گھبرائی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہی تھی جب اپنے عقب میں آتی آواز نے اُسکے قدم زنجیر کیے۔

ہیئے۔جیا۔"بھاری مردانہ آواز کو پہچاننے میں اسے ایک لمحہ لگا تھا وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور اپنے سامنے وہاج ملک کو اپنی بھرپور کشش کے ساتھ کھڑے پاتے اسکی دھڑکنیں عجیب انداز میں تھمی تھیں۔

ہہ۔ہی۔ہیلو۔آپ؟؟""گویا وہ اسے پہچان گئی تھی لیکن ہائے یہ انا۔۔

غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔وہ اس دن آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب آپ اپنے بھائی ک ساتھ چلی گئیں تھی۔"آہ اُسکی سحر کن آواز اس سے پہلے کہ جیا مزید بوکھلاتی "بھائی" لفظ نے اُسکی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

"اللہ اللہ وہ کھڑوس۔میرا مطلب بالاج میرے بھائی نہیں ہیں۔"ایسے شخص کو اپنا بھائی کے روپ میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھر؟؟"یک لفظی استفسار کیا گیا دل کو ایک دھڑکا سا لگا تھا

وہ میرے فرسٹ کزن ہیں."وہاج کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں تو وہ جی جان سے مسکرا دیا۔اور اسکی یہ مسکراہٹ مقابل کے دل پر وار کر گئی تھی۔جیا مسمرائزسی اسکی جانب دیکھ رہی تھی۔

آپ کا فرسٹ ڈے ہے آئی تھنک؟"جیا نے سر اثبات میں ہلایا

چلیں میں آپکو چھوڑ دیتا ہوں۔کہاں ڈپارٹمنٹ ڈھونڈتی پھریں گی۔"اس نے گویا احسان کرنے والے لہجے میں کہا جیا نے ایک بار پھر سر اثبات میں ہلایا لبوں سے الفاظ ادا کرنا بھاری ہو گیا تھا۔وہ خود جا سکتی تھی لیکن اس شخص جس کا نام تک اسے معلوم نہیں تھا

کے ہمقدم چلنے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اسکا دل بغاوت کر رہا تھا اور دماغ اسے ڈپٹ کر خاموش کروا رہا تھا لیکن یہ پہلی بار تھا کہ اسنے اپنے دل کی سنی تھی اور وہ اس راہ پر چل نکلی تھی جس سے واپسی ممکن نہیں تھی۔

□ ---------- □

بالاج فکس ٹائم پر اسے لینے کے لیے پہنچا تھا۔ جیا گم سم سی بیٹھی کھڑکی سے باہر دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ بالاج نے بھی اسکی یہ خاموشی نوٹ کی تھی لیکن کریدا نہیں وہ اسکے لیے کبھی اتنی اہم نہیں ہوئی تھی کہ اسکے لیے پریشان ہوتا۔ لیکن اس سب کے برعکس اسکی خاموشی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔

گھر کے پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے اسنے ایک سرسری نگاہ جیا پر ڈالی جو بغیر ایک لفظ بولے بیگ اٹھاتی گاڑی سے باہر نکل اندر چلی گئی تھی۔

اسے کیا ہوا ہے عجیب بیہیو کر رہی ہے۔" شانے اچکاتا وہ بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

دھوکے باز، ڈرامے باز شو باز اور جتنے بھی باز۔۔۔ تم نے تو کہا تھا جاتے ساتھ کال کرو گی۔ لیکن لگتا ہے وہاں سب کے ساتھ مصروف ہو کر تم مجھے بھول ہی گئی ہو۔" اپنے کمرے میں ٹہلتی جیا ویڈیو کال پر منہا سے مخاطب تھی۔ اس نے آج منہا کی کلاس لینے کی ٹھانی ہوئی تھی

اچھا اچھا سانس تو لے لو جیا۔ سوری کر رہی ہوں نہ میں۔ ایم رئیلی سوری میری جان۔" کب سے نان سٹاپ بولتی جیا کو بیچ میں ٹوکتے منہا نے کوئی دسویں بار معافی مانگی تھی جسے جیا نے "ہونہہ" کہہ کر جھٹک دیا

کیسا گزرا یونیورسٹی کا پہلا دن۔۔ مزا تو نہیں آیا ہو گا بھئی جو یونی کے نام سے بھی چڑتا ہو اسکا بھلا کیا دل لگے گا یونی میں۔" منہا کی بات پر جیا نے اپنی بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ دبائی۔ منہا اس سے بے خبر بولتے جا رہی تھی۔

بہت اچھا گزرا آج کا دن مجھے بہت مزا آیا۔ انفیکٹ آج" جیا کی بات پر منہا کی زبان کو بریک لگی۔ لب حیرت سے وا ہو گئے۔ وہ تحیر سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اس بات پر وہ کبھی یقین نہ کرتی لیکن خیر جیا سکندر سے کچھ بھی، کبھی بھی بعید تھا۔ اپنی رو میں بولتی جیا نے اپنی زبان دانتوں تلے دبائی۔

وہ منہا کو وہاج ملک کے بارے میں بتا سکتی تھی لیکن صحیح وقت آنے پر۔ جب تک وہ خود وہاج کو اچھے سے جان نہیں لیتی آج کی ملاقات سے وہ صرف اتنا جان پائی تھی کہ وہاج ملک کا تعلق ایک اونچے گھرانے سے تھا۔ یونیورسٹی میں وہ اس سے سینئیر تھا۔

دراز قد، مناسب سانولی رنگت والا وہاج ملک دکھنے میں بائیس تئیس سالہ نوجوان تھا۔

اسکی سحر انگیز شخصیت نے جیا کو بھی باقی لڑکیوں کی طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

دور اندر وہ خود بھی اپنے جزبات پر حیران تھی۔

آج تک اس نے اپنے دل میں کسی مرد کے لئے یہ جزبات نہیں پائے تھے۔

منہا سے بات کرنے کے بعد وہ خود کو کافی پر سکون محسوس کر رہی تھی۔

رات وہ دونوں ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے۔جب بالاج نے اسے مخاطب کیا۔

آج کا دن کیسا رہا۔کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی۔۔"چمچ اور کانٹے کی مدد سے اپنی پلیٹ میں کباب توڑتے اس نے سرسری سا استفسار کیا تھا۔یہ تو طے تھا کہ اسکی خاموشی بالاج کو حیران کر گئی تھی۔

بب۔بہت اچھا گزرا اور کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔۔آتی بھی کیوں ماشاءاللہ آپکی شکل جو دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔"جیا نے آخری فقرہ دل میں ہی ادا کرتے جواب دیا۔

ہوں۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"بالاج نے لقمہ منہ میں ڈالتے آفر پیش کی۔ جسے جیا نے محض سر ہلاتے قبول کیا۔

باقی کا کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔بالاج کھانا کھانے کے بعد جیا کو کافی بنانے کا بول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کھانا کھا کر جیا اٹھ کر کچن میں آ گئی ابھی اسے ایک کڑے مرحلے سے گزرنا تھا۔بالاج منہا۔جیا یا ثانیہ بیگم کے ہاتھ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کی کافی نہیں پیتا تھا اس لیے یہ کام اسے کرنا پڑ رہا تھا۔

منہ بسورتی اس نے ایک کپ کافی بنائی باقی ماندہ کافی کو دوسرے کپ میں انڈیلا پھر کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا تو سیاہ مائع ہلک تک میں کڑواہٹ پھیلتی گئی۔

افف۔۔اتنی کڑوی کافی تبھی تو ہر وقت سڑے رہتے ہیں۔۔"جیا نے کافی کا دوسرا کپ اٹھایا اور بالاج کے کمرے کی جانب بڑھی۔

دروازہ ناک کرنے پر اندر سے اجازت ملتے ہی دروازا دھیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔اس نے ایک نظر پورے کمرے میں دوڑائی۔وہ ایک کشادہ روم تھا۔دیواریں سرمئی پینٹ شدہ تھیں۔جن پر چند ایک تصاویر آویزاں تھی جن میں ہنستا مسکراتا بالاج مختلف پوز بنائے کھڑا تھا دراصل وہ تصاویر مختلف ممالک کی تھیں جہاں وہ اپنی سٹڈی ٹرپس کے دوران جاتا رہا تھا۔کمرے کی بائیں جانب ایک جہازی سائز بیڈ پڑا تھا جس کی عین اوپر بالاج کا ایک بڑا سا پورٹریٹ لگا ہوا تھا۔بیڈ کی بائیں جانب سنگھار میز اور اس کے ساتھ ہی ایک دروازا تھا جو ڈریسنگ روم میں کھلتا تھا۔کمرے کے دائیں جانب ایک صوفہ اور اسکے آگے ایک سٹڈی ٹیبل تھا۔جسکے آگے کرسی ڈالے بالاج بیٹھا لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔کمرے کے دروازے کے سامنے والی دیوار میں ایک قد آور گلاس ونڈو تھی جو باہر بالکونی میں کھلتی تھی۔جیا مگ تھامے آگے بڑھی۔

کافی۔"مصنوعی مسکراہٹ سے کافی پیش کی گئی۔

ہمم۔رکھ دوادھر۔"لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتے سامنے ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔جیاکافی رکھ کر مڑی ہی تھی کہ۔۔

رکو۔"اس سے پہلے وہ دروازاکھول کر باہر نکلتی بالاج کی آوازنے اسکے قدم زنجیر کیے۔وہ تلملا کر ایڑھیوں کے بل گھومی۔

جی۔"دانت پیستے اسنے اپنے لہجے کو حتی الامکان ٹھیک رکھنے کی کوشش کی

"ڈریسنگ روم میں میری شرٹ پڑی ہے وہ پریس کر دواچھے سے۔ صبح مجھے پہننی ہے۔"بالاج نے نظریں سامنے کیے حکم جاری کیا۔

مم۔میں کروں"تصدیق چاہی

جی آپ کے علاوہ اگر کوئی یہاں ہے تو بتادواس سے کہہ دیتاہوں میں۔"بالاج نے طنزیہ انداز میں کہا

آپ ہیں نہ۔"جیانے کہہ کر اپنی زبان دانتوں تلے دبائی۔بالاج ایک دم پورا گھوما اور آبرواچکا کر دیکھا آیا کہ یہ الفاظ جیا کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

مم۔میرا مطلب یہ نہیں تھاوہ تو بس زبان پھسل گئی مم۔۔۔"جیانے اسے خود کو گھورتے پا کر صفائی دیناشروع کی جب بالاج کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو خاموشی سے دو تین قدم پیچھے کی جانب لیے۔

تمہاری زبان آج کل ضرورت سے زیادہ چل رہی ہے۔کاٹنی پڑے گی۔"بالاج سینے پر بازو باندھتے جیا سے دو قدم کی دوری پر رک گیا۔اور اسکی زبان پر چوٹ کی۔لیکن ہمیشہ کی طرح لفظ ادا ہو چکے تھے۔اور پھر لفظ تو انسان کے غلام ہوتے ہیں لیکن بولنے سے پہلے تک،بولنے کے بعد انسان اپنے الفاظ کا غلام بن جاتا ہے۔

نن۔نہیں پلیز۔میں کر رہی ہوں نا ابھی کر دیتی ہوں۔"جیانے بمشکل آنسوؤں کو روکتے کہا۔

شاباش!!"بالاج کے کہنے پر وہ فوراً مڑی اور اس سے پہلے کے باہر بھاگتی بالاج نے اسے کہنی سے پکڑ کر ڈریسنگ روم کی جانب دھکیلا۔

ڈریسنگ روم ادھر ہے۔"کہتاوہ واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں جا کر بیٹھ گیا۔

جیا اپنی کہنی سہلاتی بالاج کو نت نئے القابات سے نوازتی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

ہیلو۔کیا ہم بات کر سکتے ہیں۔"جیا جب شرٹ پریس کر کے اپنے کمرے میں آئی تو اسکے فون پر کسی ان ناؤن نمبر سے میسج جگمگا رہا تھا۔

میسج پڑھتے ایک خوبصورت مسکراہٹ اسکے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ اس نے وہاج کو اپنا کانٹیکٹ نمبر تک دے دیا تھا۔وہ جانتی تھی یہ سب غلط ہے لیکن اسے ہوش نہیں تھا اب۔

شیور۔"میسج سین ہوتے ساتھ ہی اس نمبر سے کال آنے لگی۔

جیا نے پہلے جا کر کمرے کا دروازا بند کیا اور پھر اسی مسکراہٹ کے ساتھ فون کان سے لگایا

کیا کر رہی تھیں۔؟"وہاج کی شیریں آواز نے اسکے کانوں میں رس گھول دیا اور پھر بہت دیر تک دونوں کی طویل گفتگو چلتی رہی بات کرتے کرتے کب جیا نیند کی وادیوں میں کھو گئی اسے خود پتہ نہیں چلا

وہاج نے جب اسکی بھاری ہوتی سانسوں کی آواز سنی تو خود ہی رابطہ منطق کر دیا۔

صبح وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہونٹوں پر بھر بھر کے لپ گلوز لگا رہی تھی جب بالاج اسے آوازیں دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

یہ کیا ہے؟؟"بالاج نے شرٹ اسکے سامنے لہرائی

مجھے تو شرٹ لگ رہی ہے۔"جیا نے احسان کرنے والے لہجے میں کہا۔جو بالاج کو اندر تک سلگا گیا

اندھا نہیں ہوں میں کہ پہچان نہ سکوں وہی پوچھ رہا ہوں کہ یہ شرٹ پریس کی ہے تم نے۔"بالاج نے چبا چبا کر شرٹ پر چوٹ کی جو جگہ جگہ سے شکن آلود تھی۔

تو آپ سے کس نے کہا تھا مجھے کہے یہ کام"جیا اپنی محنت ضائع ہوتے دیکھ تپ کر بولی۔

ایک۔۔صرف ایک کام بولا تھا وہ ڈھنگ سے نہیں کر سکتیں تم۔۔"

اور یہ اتنا تیار ہو کر کہاں جا رہی ہو۔؟؟"بالاج نے افسوس سے کہتے اسکے حلیے پر نظر ڈالی۔جو گلابی رنگ کی گھٹنوں سے تھوڑی اوپر آتی انگرکھا فراق میں ملبوس آنکھوں میں بھر بھر کر کاجل لگائے ہونٹوں پر پنک کلر کی ہی لپ اسٹک لگائے تیار کھڑی تھی۔

یونیورسٹی۔۔!!"یک لفظی جواب آیا۔

واٹ!!!جاؤ فوراً منہ دھو کر آؤ۔تم جا رہی ہو یا نہیں۔"بالاج کا تو صدمے سے منہ کھل گیا۔وہ ادھر شرٹ کے لیے پریشان ہو رہا تھا اور جیا میڈم کی تیاریاں مکمل نہیں ہو رہی تھیں۔

میں بڑی ماما کو بتاؤں گی۔"جیا نے منہ بسورتے ہوئے کہا

کیا۔ہمم کیا بتاؤ گی تم زرا مجھے بھی تو پتہ چلے۔۔"بالاج نے استہزائیہ آبرو اچکائے

یہی کہ آپ نے پھر سے مجھے ڈانٹا ہے۔وعدہ کرنے کے باوجود جبکہ میں نے کوئی بد تمیزی بھی نہیں کی۔"جیا نے اپنی کاجل لگی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لاتے ہوئے کہا

میں نے کب ڈانٹا ہے میں تو تمہیں غلطی بتا رہا تھا۔اچھا اب رو کیوں رہی ہو سوری اب نہیں ہو گا۔اب پہلے جاؤ منہ دھو کر آؤ اور پھر یہ شرٹ اچھے سے پریس کر کے دو مجھے جلدی۔"بالاج نے اسے ہلک پھاڑ کر رونے کی تیاری کرتے دیکھ نرم لہجے میں پچکارا۔

نہیں کروں گی۔ جائیں کسی اور سے کروائیں۔" بالاج کو تھوڑا نرم پڑتے دیکھ جیا نے نکھریلے لہجے میں اپنی بات کہی۔

تمہارے تو اچھے بھی کریں گے۔ چلو۔"۔۔۔"زرا نرم کیا پڑا میڈم نے نکھرے ہی دکھانا شروع کر دیے۔" بالاج نے آخری فقرہ دل ہی دل میں بڑبڑاتے اسے بائیں بازو سے پکڑتے کھینچا اور اپنے کمرے کی ڈریسنگ روم میں لا کر کھڑا کر دیا۔

میں فریش ہو کر باہر نکلوں تو میری شرٹ یہاں پریس ہوئی پڑی ہو۔ سمجھی۔"ساری نرمی ہوا ہوئی اور ایک بار پھر سے بالاج کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا تھا

جج۔جی سمجھ گئی۔"جیا نے اپنے رکے آنسوؤں پر بند باندھا۔ہلک میں آنسوؤں کا پھندا اٹک رہا تھا۔ بالاج کہتے ہوئے باتھروم میں چلا گیا۔

ہونہہ حکم ایسے چلا رہے ہیں جیسے بیوی ہوں انکی۔ استغفرُللہ۔ اللہ میاں غلطی سے منہ سے نکل گیا سوری۔" تپے ہوئے لہجے میں کہتی شرٹ کو آئرننگ سٹینڈ پر پھیلایا۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا اور اس دفعہ اچھے سے شرٹ پریس کر کے رکھی اور باہر نکل گئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ دونوں نکل پڑے تھے۔ یونیورسٹی سے کچھ دوری پر پہنچ کر بالاج نے سامنے ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ایک ٹشو اٹھا کر جیا کی جانب بڑھایا۔ جیا نے ناسمجھی سے اسکی طرف دیکھا۔

لپ اسٹک۔ ریموو کرو۔"اسکے ہونٹوں کی جانب اشارہ کرتے سخت وارننگ زدہ لہجے میں کہا تو جیا نے غصے میں ٹشو اسکے ہاتھ سے جھپٹا اور سائیڈ ویو مرر میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ مل مل کر ہونٹ صاف کیے۔ ہونٹ صاف کر کے اس نے شکوہ کناں نظروں سے بالاج کی جانب دیکھا جو شانے اچکا کر رہ گیا۔ بالاج کو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ جو مرضی کرتی پھرے اسے کوئی مسلئہ نہیں تھا لیکن اتنا تیار ہو کر اسکا یونی جانا اسے اچھا نہیں لگا تھا وہ یونیورسٹی کے ماحول کو جانتا تھا اور ان امیر لڑکوں کو بھی جو معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں اس طرح پھانستے تھے کہ لڑکی کو علم ہی نہ ہو۔ بالاج نہیں چاہتا تھا کہ جیا اس طرح ان سب کے سامنے جائے بالاج کے لاکھ کہنے کے باوجود جب جیا نے اسکی بات نہ مانی تو اس نے یہ طریقہ اپنایا۔

اس سب سے بے خبر جیا کو بالاج پر مزید تپ چڑھی تھی وہ تو اتنا تیار وہاج کے لیے ہوئی تھی بالاج کو کیا مسئلہ تھا لیکن وہ اس بات سے انجان تھی کہ نوجوانی میں سب سے زیادہ بے سکونی اور زلت کا سبب نامحرم سے محبت ہوتی ہے۔

کیوں کہ بنتِ حوا کے نرم لہجے نے ہی ابنِ آدم بگاڑ رکھے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے خود کو ان وقتی تعلقات سے دور رکھنا ہے۔ اسے تو لگتا تھا کہ یہ پہلی نظر کی محبت ہے۔ اس بات سے لاعلم کہ نظر سوچ کے اندر تصویر لے جاتی ہے، پھر یہ تصویر خواہش میں بدل جاتی ہے اور یہی خواہش بے حیائی کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

یہ تھی سکندر ہاؤس کی زندگی۔۔ گل زرین سکندر اور شائستہ زرین کی تین اولادیں تھیں۔ بڑے بیٹے معید سکندر اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد گھر کے کاروبار میں اپنے والد کا سہارا بن گئے۔ معید سکندر کی شادی انکی پسند سے ثانیہ بیگم سے ہوئی تھی جن سے انکے دو بچے بالاج سکندر اور منہا سکندر تھے۔ بالاج سکندر ستائیس کے ہندسے کو عبور کرتا بہترین مرد تھا۔ سب کا خیال رکھنے والا والدین کا فرمانبردار اور سب سے بڑھ کر ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ چھے فٹ سے نکلتا قد گوری سرخ و سپید رنگت اور سنہری آنکھوں والا بالاج سکندر کسی کو بھی اپنی جانب متوجہ کر سکتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنا اور سنجیدگی اسکی شخصیت کا خاصہ تھے۔ منہا سکندر ایم۔اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ مناسب قد، دبلی پتلی سی منہا سکندر کسی کے بھی دل کو بھا سکتی تھی۔ اسکے نقوش بہت حد تک بالاج سے ملتے تھے۔ منہا انیس سالہ چل بلی سی لڑکی تھی۔ ہنسی مزاح اسکی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے جن سے وہ کبھی چاہ کر بھی دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔ بالاج سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتی تھی اور کچھ ایسا ہی حال بالاج کا بھی تھا۔

گزرتے دنوں کے ساتھ زندگی معمول کی طرح گزر رہی تھی۔ معید سکندر لوگوں کو گئے آج ساتواں دن تھا۔ کسی اہم کام کی بنا پر انہیں مزید دو دن وہاں رکنا پڑ گیا تھا۔ جیا نے وعدے کے مطابق بالاج کو تنگ نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی بالاج نے اسے ڈانٹا تھا وجہ ان گزرے دنوں میں دونوں کے درمیان نام کی بول چال تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے سے سامنہ سوائے یونیورسٹی آنے جانے کے شاز و نادر ہی ہوتا تھا۔

ان چند دنوں میں ہی وہاج اور جیا کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

آج لیکچر کے بعد جیا اپنی کلاس فیلو انعم کے ساتھ کیفے ٹیریا کی طرف جا رہی تھی جب سامنے وہاج کو گراؤنڈ میں لگے سنگی بینچ پر بیٹھے ہوئے پایا وہ انعم سے معزرت کرتی اسکی جانب آئی۔

وہاج آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں۔؟" اپنا بیگ اپنے اور اس کے درمیان بینچ پر رکھتی وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔ وہاج تھوڑا ترچھا ہو کر جیا کو دیکھنے لگا۔

تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں میڈم۔" شوخ لہجے میں کہتے ایک انویٹیشن کارڈ جیا کی جانب بڑھایا۔

یہ کس چیز کا انویٹیشن ہے؟" جیا تجسس کے ساتھ اس کو کھولا اور ایک سرسری نگاہ ڈالی اندر کسی کے برتھڈے کا انویٹیشن تھا۔

میری برتھڈے کا انویٹیشن ہے یہ اور کوئی لیم ایکسکیوز نہیں چلے گا تمہیں آنا پڑے گا۔" وہاج نے اس کے چہرے پر معزرت خواہانہ تاثرات نوٹ کرتے کہا۔

لیکن۔۔۔اوکے میں کوشش کروں گی۔"جیا انکار کرنے ہی والی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر کے چند گھنٹوں کی ہی تو بات ہے وہ مان گئی تھی اس کی رضامندی پر ایک مخصوص خوبصورت مسکراہٹ وہاج کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ چند دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جیا اپنی اگلی کلاس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہاج کو خدا حافظ کرتی اپنی کلاس کی جانب بڑھ گئی۔وہاج کی نظروں نے دور تک اسکا پیچھا کیا تھا۔

جیا اس وقت لاونج میں بیٹھی بظاہر تو ٹی وی پر کوئی ڈاکیومنٹری دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسکا ذہن وہاج کی برتھڈے انویٹیشن میں اٹکا ہوا تھا۔

اس نے اپنے بڑے بابا اور بڑی ماما کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہاج کی برتھڈے میں جانے کی ہامی تو بھر لی تھی لیکن بالاج وہ اسے کیا بتائے گی۔ کہہ دے گی کہ دوست کا برتھڈے ہے۔۔۔خود ہی اس مسلئے کا حل نکالتی وہ گود میں رکھے باؤل میں سے پاپ کارن کھاتے ہوئے سامنے چلتی فلم دیکھنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں باہر پورچ میں گاڑی کھڑی ہونے کی آواز پر اس نے گلاس ونڈو سے باہر دیکھا تو بالاج گاڑی سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ جیا کے گھر پر اکیلی ہونے کی وجہ سے وہ سر شام ہی گھر آجاتا تھا مبادا وہ اسکی شکایت ہی نہ لگا دے۔

بالاج داخلی دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ صوفے پر دونوں پیر اوپر کیے بیٹھی نظر آئی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے وہ بھی وہیں دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

ایک گلاس پانی پلا دو جیا۔"بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے پیشانی مسلتے وہ جیا سے مخاطب ہوا۔ لیکن وہ تو پوری طرح فلم دیکھنے میں مگن تھی۔

جیا۔جیا۔۔بہری ہو گئی ہو کیا۔"اونچی آواز میں اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

نن۔ نہیں تو کچھ کہا آپ نے۔"جیا اتنے مگن انداز میں سامنے چلتی فلم دیکھ رہی تھی کہ بالاج کے چیخنے پر بوکھلا گئی۔

پانی پلا دو۔"ایک بار پھر اپنا کہا دھرایا

جی ابھی لائی۔ آپ میرے یہ پاپ کارن پکریں کھایئے گا مت۔"جیا صوفے سے اٹھی اور پاپ کارن والا باؤل بالاج کی طرف بڑھاتے ہوئے خاص ہدایت کی اور خود کچن میں پانی لینے چلی گئی۔

بالاج فلم کو دیکھتے بے دھیانی میں باؤل سے پاپ کارن پکڑ کر منہ میں ڈالنے لگا کہ جیا کی ہدایت یاد آگئی۔ پاپ کارن والا باؤل سامنے میز پر ہی رکھ دیا۔

پانی""جیانے پانی کا گلاس بالاج کو پیش کیا۔

جو اسنے تھام کر منہ سے لگالیا جیا وہیں کھڑی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مڑوڑ رہی تھی۔پانی پیتے بالاج نے اسکی جانب دیکھا۔

کچھ کہنا ہے۔"بالاج نے گلاس جیا کی جانب بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

جی وہ دراصل میری۔۔۔۔اوپس سوری۔"جیا جو اسکے سامنے ہی ٹیبل پر بیٹھ رہی تھی۔بالاج کے آبرو اچکا کر خود کو دیکھنے پر فوراً سے سیدھی ہو گئی۔

کہو بھی۔"بالاج نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ایکچولی میری دوست کی برتھڈے ہے اسنے مجھے انوائٹ کیا تھا میں چلی جاؤں اللہ کا پکا وعدہ زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔"جیا نے زور و شور سے سر ہلاتے تفصیلات سے بھی آگہی دی۔

اس ایک ہفتے میں کس سے اتنی پکی دوستی ہو گئی تمہاری۔خیر۔کب ہے برتھڈے۔"بالاج اپنا موبائل آن کرتا اسکے مقابل اٹھ کھڑا ہوا اور استفہامیہ آبرو سکیڑے۔

آ۔آ۔ج ہی ہے شام سات بجے۔"پر امید نظروں سے اسکی جانب دیکھا۔پہلے سوال کو وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی۔دل بہت زور سے دھڑکنے لگا مبادا وہ انکار ہی نہ کر گئی

ٹھیک ہے ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا لیکن۔واپس جلدی آجانا۔"آخری جملہ چبا چبا کر کہتے موبائل پر سر جھکائے وہ اسکے ساتھ سے ہو کر نکل گیا۔

جیا تو اسکے اجازت دینے پر خوشی سے پھولے نہ سمائی۔

یس یس یس۔!!"جیت کی خوشی میں بس بھنگڑا ڈالنے کی کمی رہ گئی تھی۔سیڑھیوں کی جانب بڑھتے بالاج نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو میڈم خوشی سے جھومتی دکھائی دی۔وہ تاسف سے نفی میں سر ہلاتا سیڑھیاں چھڑتا اپنے کمرے میں گم ہو گیا۔

اسلام آباد کا وہ فائیو سٹار ہوٹل محض سفید اور سنہرے رنگ میں ڈیزائین کیا گیا تھا۔دودھ جیسا سفید مرمریں فرش رات کی مصنوعی روشنیوں میں چمک رہا تھا۔سامنے داخلی راہداری سے جیا داخل ہوئی تو اندر کے خواب ناک ماحول نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔لابی میں رکھے صوفوں پر اور ارد گرد بہت سے لوگ آجا رہے تھے۔جن میں اکا دکا اسکی یونیورسٹی فیلو بھی تھے جنہیں وہ بظاہر

صورت سے ہی پہچانتی تھی۔ کسی کی چبھتی ہوئی نظروں کا ارتکاز محسوس کرتے اسکی جان ہوا ہو رہی تھی پیروں پر مزید کھڑا رہنا بہت کٹھن تھا اس سے پہلے کے وہ صوفے کی جانب بڑھتی

تبھی اسے اپنی دائیں جانب سے وہاج آتا دکھائی دیا گرے ایش تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہاج ملک مقابل کو چاروں شانے چت کرنے کی سی کشش رکھتا تھا اس کے مقابل جیا نے رائل بلو کلر کی پیروں کو چھوتی فراک زیب تن کی تھی جس کے دامن اور بازوؤں پر سنہری رنگ کی آرائش ہوئی تھی۔ مخمل کا ہمرنگ دوپٹہ بائیں کندھے پر سیٹ کر رکھا تھا۔ بال ایک جانب کو کندھوں پر ڈالے اپنی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگائے وہ ہلکے پھلکے میک اپ میں بھی وہ وہاج ملک کا دل دھڑکا گئی۔ کندھے پر ایک لمبی زنجیر والا ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔

ہیلو مائی بیوٹیفل لیڈی۔" وہاج نے جیا کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ یہ طرزِ مخاطب نا جانے کیوں جیا کو ناگوار گزرا تھا۔ ہونٹوں پر خوبصورت مسکان سجائے وہ اسکی جانب مڑی اور سر کے خم سے سلام کیا۔

بہت خوبصورت لگ رہی ہو آج!! آئی سُوئیر میں نے آج سے پہلے کبھی اتنی حسین دوشیزہ نہیں دیکھی۔" وہاج نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھتے اسکے حسن کو سراہا۔

شکریہ!!۔۔۔ برتھڈے سیلیبریشن کہاں ہیں۔" جیا نے ارد گرد نگاہ دوڑائی وہاں کا ماحول تو کہیں سے بھی برتھڈے والا نہیں لگ رہا تھا۔

آں۔ ہاں وہ۔ وہ دراصل میں نے فرسٹ فلور پر ایک سوئٹ بک کروایا تھا وہیں پر تمام ارینجمنٹس کی ہیں۔ ہمارے تمام دوست وہیں پر ہیں آؤ ہم بھی اوپر چلتے ہیں۔" اوہ تو وہاج نے ساری تیاریاں اوپر کی تھیں وہ ایسے ہی پریشان ہو رہی تھی۔ جیا مسکراتی اس کے ساتھ اوپر کی جانب بڑھی۔

وہاج نے سوئٹ کا دروازا کھول کر ایک ہاتھ سینے کے پاس لے جاتے اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

جیا اسکی حرکت پر مسکرا دی اور باریک گولڈن ہیل سے ٹک ٹک چلتی اندر داخل ہوئی۔

لیکن یہ کیا اندر تو سوائے لگسجری فرنیچر کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ دل ایک دم اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ جیا ایڑھیوں کے بل گھوم گئی سامنے وہاج بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا چہرے پر زہر خند مسکراہٹ تھی اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔

وو۔ وہ۔ وہاج یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" جیا نے بہت سا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

کس نے کہا یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں اور تم ہیں نا یہاں۔ پھر کسی تیسرے کی کیا ضرورت۔" اسکی بات سن کر جیا سکتے میں آ گئی تھی

یہ تو اس وہاج سے بلکل مختلف تھا جسے وہ پچھلے ایک ہفتے سے جانتی تھی۔ یہ وہ وہاج تو نہ تھا بلکہ اس کی شکل میں بھیڑیا تھا جو اسکے شکار کی تاک میں تھا۔

یا اللہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ میں اتنی بڑی بیوقوفی کیسے کر سکتی ہوں۔" سینے پر بوجھ بڑھنے لگا تو آنسو لڑیوں کی مانند نرم و ملائم گال پر بہنے لگے۔

وہ دو قدم آگے دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ وہاج نے جیا کی جانب قدم بڑھا دیے۔ جیا وہیں ٹھہر گئی۔

وہاج کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے ہو کر دروازہ کھولنے لگی۔ نئے طرز کا لاک کھولنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہاج نے اسے بازو سے پکڑ کر دوسری جانب دھکا دیا۔ جیا کو اسکی انگلیاں اپنے بازو میں دھنستی محسوس ہوئی تھیں وہ کراہ کر رہ گئی۔

اتنی جلدی کس بات کی ہے تجھے ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

پپ۔ پلیز مج۔ مجھے جانے دو مم۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ میرے ساتھ ایسا مت کرو۔" بازو میں ہوتے درد سے بے نیاز وہ اسکے سامنے کھڑی فریاد کر رہی تھی جس کا مقابل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اچھا پھر کیسی لڑکی ہو؟؟ بلکہ رکو میں بتاتا ہوں کہ تم کیا ہو اور تمہاری اوقات کیا ہے۔ تم ایک بدکردار و بے حیا لڑکی ہو جو کسی بھی خوبصورت مرد کی دوستی میں اس سے تنہائی میں ملنے چلی آتی ہے۔ جو۔۔"

بسسسس!!" جیا بولی نہیں دھاڑی تھی۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلی میں پیوست ہوتے درد دے رہے تھے لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔

تم وہاج ملک۔ تم ایک بزدل مرد ہو جو اپنے نفس پر قابو پانا نہیں جانتا جو اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی بھی لڑکی کی زندگی برباد کرنے چلے آتے ہیں۔ تم جیسے مردوں کے لیے تو جہنم کی آگ بھی کم ہو گی وہاج ملک مان لو کہ تم ایک کافر ہو جو خود پر شیطان کو غالب آنے دیتے ہو۔"

وہاج کو آئینہ دکھاتے اسنے اپنے قدم پیچھے کی جانب لینا شروع کیے۔

میں کافر ہوں تو تم کیا ہو بہت کوئی عالمہ فاضلہ ہو۔۔ بہت پارسا بننے کی کوشش کر رہی ہو تم تو بتاؤ کہاں ہے تمہاری پارسائی ارے ایک سرتک تو تم ڈھک نہ سکیں مجھے روکو گی۔ دیکھتا ہوں میں تم کیا کر سکتی ہو آج۔۔"

جیا کی حالت سے حظ اٹھاتے وہاج ایک ایک قدم اسکی جانب بڑھتا گیا کہ جیا پیچھے ٹھنڈی دیوار سے جا لگی۔ دیوار کی ٹھنڈک اسے اپنی ہڈیوں میں سرایت ہوتی محسوس ہوئی۔

"دیکھو میرے قریب مت آؤ وہیں پر رک جاؤ۔ وو۔ وہاج۔" وہاج کا ہاتھ اپنے منہ کی جانب بڑھتے دیکھ اس نے وہاج ملک کے منہ پر تھوکا تھا جو اس کو اندر تک سلگا گیا۔ جیا دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلتی ایک بار پھر سے دروازے کی جانب دوڑی لیکن دروازا کھولنے سے پہلے ہی وہاج تیزی سے اس پر جھپٹا تھا اس سے پہلے وہ کوئی پیش قدمی کرتا کوئی کمرے کا دروازا دھاڑ سے کھولتا اندر داخل ہوا تھا جیا کے ساتھ وہاج نے بھی اسکی جانب دیکھا۔

"اینجل" جیا کے لبوں نے بے آواز حرکت کی وہ جو کوئی بھی تھا جیا کو اپنے لیے کسی فرشتے سے کم نہ لگا۔ نووارد نقاب پوش تھا ایسے کہ سوائے آنکھوں کے کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ چہرے پر کیے نقاب میں سے سر کے لمبے بال شانوں تک آتے تھے لیکن وہ بال اصلی نہیں تھے۔ نووارد اپنے کپڑوں پر لمبا گھٹنوں سے نیچے تک آتا کوٹ پہنے ہوئے تھا ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے اور پیر لمبے بوٹوں میں قید تھے۔ جیا نے اس شخص کے حلیے سے نظریں ہٹا کر اسکے چہرے کو دیکھا اور وہ اسکی آنکھیں دیکھ کر دھک سے رہ گئی ان آنکھوں کو تو وہ سات پردوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ سبز ہیزل آنکھوں میں اس وقت سرخ ڈورے تیر رہے تھے جو اس کے اندر پکتے لاوے کی عکاسی کر رہے تھے۔ جیا کو ایک زوردار ہچکی بندھی تھی جو وہاں موجود تمام نفوس کو صاف سنائی دی۔ جیا نے اپنے آپ کو وہاج کے شکنجے سے نکالنے کی تگ و دو کرنا شروع کی لیکن اسکا حصار بہت مضبوط تھا۔ وہاج نے ایک ہاتھ سے جیا کو پکڑے دوسرے سے اپنی پینٹ کی جیب میں موجود شیشی نکالی وہ تین انچ لمبی شیشی تیزاب سے بھری ہوئی تھی انگھوٹے کی مدد سے وہاج نے اس کو کھولا اور اس سے پہلے کہ وہاج وہ شیشی جیا کے چہرے پر انڈیلتا نووارد نے تیر کی تیزی سے اس پر حملہ کیا تھا جیا جس نے ڈر سے آنکھیں میچ لیں خود پر کوئی حملہ نہ پا کر دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو سامنے کا منظر واضح ہوا۔ وہاج نووارد کے حملے کی وجہ سے زمین پر ڈھیر تھا اور وہ شیشی اس فرشتے کے ہاتھ میں تھی۔

جیا نے کمرے کا کھلا دروازا دیکھ باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اپنے بکھرے حلیے سے بے نیاز وہ سیڑھیوں کے دہانے تک ہی پہنچی تھی کہ ایک خیال کے تحت رک گئی۔ مڑ کر ایک بار پھر کمرے کی جانب دیکھا اور پھر نیچے اترتی سیڑھیوں کو۔ جائے یا نہ جائے۔ کچھ سوچتے اس نے اپنے قدم واپسی کے لیے بڑھا دیے۔ لیکن کمرے کے اندر کا منظر اسے ساکت کر گیا تھا۔ اس کی سانس سینے میں ہی اٹک گئی جیا کو اپنا وجود لرزتے ہوئے محسوس ہوا اس نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا جو خوف سے کپکپا رہے تھے اور نظر کمرے میں چل رہے منظر کو دیکھ کر وہ آنکھیں سختی سے میچ گئی۔

نووارد نے جیا کا باہر نکلنا شاید نوٹس نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت اسکا اہم کام اس بھیڑیے کو اس کے انجام تک پہنچانا تھا اسکو بری طرح مارنے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑی شیشی وہاج ملک کے نیم بے ہوش وجود پر انڈیلنی شروع کر دی۔

پیر تا سر تک اور پھر سر تا پیر وہ اس پر تیزاب کا چھڑکاؤ کرتا جا رہا تھا

دل دہلا دینے والی چیخ و پکار کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا بلکہ اس سب سے لطف اندوز ہوتے ایک زہر خند مسکراہٹ اسکے لبوں کا بسیرا کیے ہوئے تھی۔ دروازے میں کھڑی جیا سختی سے آنکھیں میچے کھڑی تھی۔ اور پھر اسے اپنی سماعت میں ان الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

"گیم اوور وہاج ملک!!"

باب نمبر2

"گیم او'ور وہاج ملک"

جیا کی سماعت میں وہ الفاظ کسی ٹھنڈی پھوار کی مانند گونجے تھی اس نے تشکر سے پلکیں جھپکیں۔

تیزاب کے جسم کے ساتھ لگنے پر ایک دھوئیں کا مرغولہ اٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔وہ شخص اب جھک کر وہاج کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتا۔جیا نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے کنسول ٹیبل کے قریب گرا اپنا بیگ اٹھایا اور بھاگنے کے سے انداز میں دروازے کی جانب بڑھی۔

کوریور سیلف. "دروازے کی دہلیز میں جیا کے قدم تھمے تھے۔اس نے حیرت سے پلٹ کر اس مہربان شخص کو دیکھا اور اسر جھکا کر ایک نظر اپنے بکھرے حلیے پر ڈالی۔پل میں اسے شرمندگی نے آن گھیرا۔بے شک وہ بنام ہی کپڑوں کے ساتھ سکارف لیتی تھی لیکن اس وقت جتنی شرمندگی اور ذلالت وہ محسوس کر رہی تھی اسکا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

کون ہو تم؟؟"سرسراتی ہوئی آواز کمرے کی ساکن فضا میں گونجی

"اینجل"یک لفظی جواب آیا تھا غالباً جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تب اس نے باریک بینی سے جیا کے ہلتے لبوں کو محسوس کیا تھا۔جیا چند پل لب وا کیے اسے دیکھے گئی۔اسکی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ہاتھوں کی بھینچی ہوئی مٹھیاں اس کے ضبط کرنے کی گواہی دے رہی تھیں۔تبھی جیا کو اسکی پشت پر اپنا دوپٹہ پڑا ہوا نظر آیا۔

وہاج سے اپنا آپ چھڑوانے کے دوران اسکا دوپٹہ اور بیگ وہیں گر گیا تھا۔جیا نے آگے بڑھ کر فرش پر گرا اپنا دوپٹہ اٹھایا اور اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹ کر باہر نکل گئی۔

اس سب کے دوران اس فرشتے نے اسکی جانب نہیں دیکھا تھا اسکی جیا کی جانب پشت تھی اور اگر کوئی اس وقت اسکی گرین ہیزل آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیتا تو جان جاتا کہ اصل میں "ضبط" کرنا کہتے کسے ہیں۔

اب کہ وہ شخص کھڑا ہوتا کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکالتا اسے سلگا گیا۔گہرے گہرے کش بھرتے اس نے ایک ناگوار نظر وہاج کے نیم مردہ وجود پر ڈالی تھی۔اب اسے وہاج کو یہاں سے نکالنے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چرر رر" کی آواز کے ساتھ وہ دروازا کھولتی اندر داخل ہوئی تھی۔ہیلز پیروں سے اتار کر بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں۔گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا غالباً بالاج اس وقت اپنے کمرے میں ہو گا۔وہ دبے پاؤں اندر آئی اور سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں جانے لگی۔جب وہ ہوٹل سے باہر نکلی تو اسکے حواس کام نہیں کر رہے تھے وہ بے دھیانی میں ایک طرف چل پڑی تھی ہائی ہیلز سے چلتے ہوئے جب پیروں میں درد اٹھنے لگا تو وہ ہوش کی دنیا میں آئی تھی اور ہلیز اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔اور پھر سارا راستہ پیدل چل کر وہ آئی تھی رونے کے باعث اس کی آنکھیں سوجھ رہی تھی اور گالوں پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان تھے۔دسمبر کیے اوائل میں خنکی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اس نے کمرے میں آکر سب سے پہلے شاور لیا اور فریش ہوئی۔

جیا ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے آگے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی اور شاید پہلی مرتبہ اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔وہ رو نہیں رہی تھی لیکن ہچکی اب بھی بندھی ہوئی تھی وہاج کے طنزیہ جملے دماغ میں ہتھوڑے برسا رہے تھے دفعتاً اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ایک نظر گھڑی کو دیکھا جو رات کے گیارہ بجا رہی تھی اور پھر ایک نظر دروازے کو اور پھر جلدی سے بستر میں گھس کر کمفرٹر سر تک اوڑھ لیا۔کسی نے آکر کلک کی آواز سے دروازا کھولا تھا۔بالاج نے ایک نظر کمرے میں دوڑائی تو وہ اسے کمفرٹر اوڑھ کر سوتی ہوئی ملی۔اسکے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے اور جیا کی یہی عادت اسے اچھی لگتی تھی کہ جب وہ وعدہ کر لیتی ہے تو اسے مرتے دم تک نبھاتی ہے۔آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آف کی اور دروازہ بند کرتا باہر نکلتا چلا گیا۔

کمفرٹر میں لپٹی جیا کی آنکھیں ایک بار پھر نمکین پانیوں سے بھر گئیں ذہن کچھ دن پہلے کی ہوئی گفتگو کی طرف گیا۔

جیا اور وہاج کی دوستی کو آج تیسرا دن تھا جب وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے تھے۔جیا مسکرا مسکرا کر وہاج کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ کیسے وہ اور منہا ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں اور پھر ماما بابا سے ڈانٹ بھی خوب کھاتے ہیں گفتگو میں کہیں نا کہیں بالاج کا ذکر بھی تھا۔جیا اپنی اور منہا کی کسی بیوقوفی پر سر پیچھے پھینک کر ہنسی تھی۔

ویسے یہ تمہارا کزن۔بالاج۔کس ٹایپ کا لڑکا ہے؟"وہاج نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔جیا کی مسکراہٹ عنقا ہوئی اور وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔

کک۔کیا مطلب۔کس ٹائپ کا ہے؟؟"جیا نے زبردستی کی مسکان چہرے پر سجاتے استفسار کیا

میرا مطلب یہ تھا کہ کافی خوش شکل ہے۔اس سے کوئی بھی لڑکی پل میں ایمپریس ہو سکتی ہے۔کیا تم نے کبھی نہیں سوچا اس بارے میں۔۔۔"وہاج نے سامنے رکھے کافی کے کپ کو لبوں سے لگاتے سرسری انداز میں کہا

اور جیا تڑپ ہی تو گئی تھی اس بات پر۔اس لیے دانت پیستی گویا ہوئی۔

بالاج۔ میرے لیے میرے بھائی جیسے ہیں میں کچھ ایسا ویسا تصور بھی نہیں کر سکتی اور رہی بات ٹائپ کی تو وہ ہر ایرے غیرے لڑکے کی طرح دل پھینک بالکل بھی نہیں ہیں مجھے پورا اعتبار ہے ان پر۔" جیا ایک ہی سانس میں اپنے اور بالاج کے تعلق کو واضح کر گئی تھی

وہاج نے داد دینے والے انداز میں سر ہلایا۔

کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے جیا۔ ہر کوئی بھروسے کے لائک نہیں ہوتا۔" وہاج نے پل میں اسکا سکون غارت کیا تھا لیکن وہ محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

بیڈ پر دراز جیا نے کروٹ بدلی تھی۔

"وہاج نے کہا تھا کہ ہر کوئی بھروسے کے لائق نہیں ہوتا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی اعتبار کے قابل نہیں۔" اب کی بار جیا پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اپنے اندر بہت دیر کا جمع کیا غبار آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آج کی رات پھر سے اذیت ناک تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ بار بار اس لڑکی کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے آجاتا جسے وہ سگریٹ کی نذر کر دیتا۔

"دعا کرو حریم ناز ہماری کبھی دوبارا ملاقات نہ ہو ورنہ میری نفرت تم جھیل نہیں پاؤ گی۔ "سخت لہجے میں خود سے ہمکلام بالاج نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی تھی۔ اس وقت وہ بالکنی میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔ بالکنی کی ریلنگ سے کھڑے ہو کر نیچے دیکھو تو گھر کا سارا پچھلا حصہ نظر آتا تھا۔

اسکی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں آج کی رات ایک بار پھر اسکے اندر کی ویرانیوں کی گواہی دے رہی تھی۔

دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے اس نے اندر کمرے کی جانب دیکھا سامنے ہی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ایک فوٹو فریم پڑا ہوا تھا وہ اٹھا اور قدم قدم چلتا بیڈ تک آیا پھر جھک کر تصویر اٹھا کر دیکھی

اس میں دو لڑکے مسکراتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کسی نومولود بچی کو اٹھایا ہوا تھا اور دلفریب مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا اسکی آنکھیں سنہری تھیں بالاج کو یاد آیا کہ یہ کب کی تصویر تھی۔ اور دوسرا لڑکا جھک کر اس بچی کے گال کا بوسہ لے رہا تھا۔ دونوں لڑکے ہی دس گیارہ سال کے تھے۔ بالاج نے تصویر میں نظر آتے دوسرے لڑکے کے وجود کو انگلی کے پوروں سے چھوا ایک آنسو نکل کر گال پر بہہ گیا۔

ارے تم مرد ہو اور مرد کبھی روتے نہیں ہیں تم تو میرے اچھے والے بھائی ہو نہ چلو اب رونا بند کرو۔"

ذہن کے پردے پر بچپن میں کی گئی ایک بات گونجی تھی۔اور اس نے جھٹ اپنا آنسو صاف کیا اور مسکرا کر اس تصویر کو اپنے لبوں سے لگا کر ہٹایا۔

میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔"بالاج اس لڑکے سے مخاطب تھا جب نگاہ اس بچی پر پڑی تبھی وہ تصویر واپس رکھتا جیا کے کمرے کی طرف بڑھا اس تصویر میں موجود بچے کا وجود جیا سکندر کا ہی تھا

بالاج نے جا کر جیا کا اس کے کمرے میں ہونے کی تصدیق کی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا بالاج کا موڈ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کمرے میں اسکی بھاری ہوتی سانسوں کی آواز گونج رہی تھی باہر افق پر سورج اپنی پہلی کرن نکالے کھڑا تھا دسمبر میں ہو نہی سورج تھوڑا دیر سے طلوع ہوتا تھا۔وہ نیند کی گہری وادیوں میں کھوئی ہوئی تھی جب اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔اپنے بازوؤں پر جانا پہچانا لمس محسوس کرتے وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور ہلک میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھانا چاہا لیکن وہاں کوئی گلاس یا جگ نہیں تھا یقیناً زر قابی رکھنا بھول گئی تھیں۔

چند دن ماما اس گھر سے دور ہوں سب ٹریک پر سے اتر جاتے ہیں۔"بیڈ سے اٹھتے اس نے پیروں میں جوتے اڑسے ور منہ میں بڑبڑاتی ملازموں کو کوس رہی تھی۔صوفے پر پڑی اپنی شال اٹھا کر اپنے ارد گرد لپیٹی اور دروازہ کھول کر سر باہر نکالا۔یہ وقت بالاج کی جوگنگ کا ہوتا تھا۔اس نے قدم نیچے کچن کی جانب بڑھا دیے کیونکہ پیاس کی وجہ سے اسکا ہلک خشک ہو چُکا تھا۔

بالاج ابھی ابھی جاگنگ سے لوٹا تھا صبح کی تازہ ہوا نے اسکے موڈ پر خوشگوار اثر کیا تھا۔وہ اس وقت ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا ماتھے پر بکھرے بال وہ اپنے بے پرواہ حلیے میں بھی پر کشش مرد تھا۔اسکا ارادہ کمرے میں جا کر فریش ہونے کے بعد آفس کے لیے تیار ہونے کا تھا جب جیا کو ہاتھ میں پانی کا جگ تھامے سیڑھیوں کی طرف آتا دیکھ کر وہ رک گیا۔وجہ جگ نہیں بلکہ اس کی سوجھی ہوئیں سرخ متورم آنکھیں تھیں۔

دونوں سیڑھیوں کے آغاز پر آمنے سامنے رک گئے تھے۔جیا کی سانسیں بھی ساتھ ہی تھمی تھیں۔

کچھ ہوا ہے کیا؟"بالاج نے اسکی آنکھوں میں جھانک کر استفسار کیا۔

کچھ۔۔ بھی تو۔۔ نہیں۔۔ہوا۔۔""جیا نے واضح آنکھیں چرائی تھیں مبادا وہ اسکی آنکھیں ہی نہ پڑھ لے۔

لگتا ہے اداس ہو رہی ہو ماما کی وجہ سے۔؟"بالاج نے اپنی طرف سے اندازا لگایا

پتہ نہیں۔۔"جیا نے اوپر سیڑھیوں کی جانب دیکھا تھا۔گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔

اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے میں نے تمہیں کچھ کہا بھی نہیں۔" بالاج نے سینے پر ہاتھ باندھے۔لہجے میں ہلکے سے طنز کا عنصر نمایاں تھا

خوش رہنے کی لیے کسی خاص وجہ کا ہونا ضروری ہے۔" جیا نے آنکھیں گھما کر بات رفع دفع کرنے کے سے انداز میں کہا

کیسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔؟" جیا کا انداز مایوس کن اور افسردہ سا تھا

مایوسی نہیں ہے۔بس اکتا گئی ہوں۔" جگ کے دہانے پر دائیں ہاتھ کی انگلی پھیرتے ہوئے کہا لہجے کی اکتاہٹ واضح تھی۔

اچھا کس سے۔۔؟" بالاج نے ٹانٹ کیا

شاید خود سے۔" انگلی ابھی تک جگ کے دہانے پر تھی۔اور نظریں جھکی ہوئی تھیں جن میں نمکین پانی کا سمندر بھرا تھا

کچھ کہنا چاہتی ہو۔۔؟" بالاج نے اسے کافی دیر خاموش دیکھ کر سنجیدگی سے استفسار کیا

کہنے کو الفاظ نہیں ہیں۔۔"" نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں

کیا ہو گیا ہے تمہیں کیسی باتیں کر رہی ہو آج۔ایسے تو کسی کا دل ٹوٹے وہ بات نہیں کرتا۔کہیں تمہارا بھی دل تو نہیں ٹوٹ گیا۔" بالاج نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا شاید اسکے چہرے پر مسکان آجائے

جیا نے ایک نظر بالاج کو دیکھا وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔لیکن وہ اسکی نظروں سے کنفیوژ نہیں ہو رہی تھی

کھلونا نہیں ہے جو کوئی بھی توڑ جائے گا۔" سرر کی آواز سے ناک کے ذریعے سانس اندر کھینچی

آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں تمہاری۔روئی ہو تم۔؟" بالاج نے اسکی روئی روئی متورم آنکھوں کو دیکھ کر کہا

نہیں وہ بس نیند نہ کی وجہ سے۔۔" جیا نے انگلی کے پور سے آنکھ صاف کی

تو سوئی کیوں نہیں۔؟" اب کی بار جیا واضح اکتا گئی تھی بلاشبہ وہ اسکا موڈ غارت کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا

پت۔پتہ نہیں۔اب ہٹیں میرے راستے سے۔۔" وہ عین سیڑھیوں کے بیچ میں کھڑا تھا

جیا کچھ ہوا ہے کیا۔۔؟" نرم لہجے میں ایک بار پھر پوچھا تھا اس نے۔شاید اب کی بار وہ بتا دے

کہانا کچھ بھی نہیں ہوا۔" یہ نادان دل کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا۔وہ تو بس جذبات کی تجارت تھی۔" آخری بات اسنے دل میں ہی کہی تھی۔

سر پرائیززز!!"" منہا کی کھنکتی ہوئی آواز نے دونوں کی گفتگو میں خلل ڈالا۔جیا اور بالاج دونوں نے ایک ساتھ گردن موڑ کر داخلی دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

دروازے کے بیچ و بیچ منہا اور ثانیہ بیگم کھڑے تھے معید سکندر یقیناً گاڑی سے سامان نکلوا رہے تھے۔ ثانیہ بیگم نے مسکرا کر جیا کی طرف دیکھا اور یہی جیا کی بس ہو گئی تھی ہاتھ میں پکڑا پانی کا جگ چھنا کے سے زمین بوس ہوا تھا اور وہ دوڑ کر ثانیہ بیگم کے گلے سے لگتی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ تو جیا کے اس قدر ری ایکشن پر بوکھلا گئی تھیں۔ اس لیے اسکی کمر تھپکتی چپ کروانے لگیں۔

جیا میری جان کیا ہوا ہے آپ کو۔" انہوں نے جیا سے کہتے ایک نظر بالاج پر ڈالی تھی جو انہی کی جانب بڑھ رہا تھا

کیا بالاج نے کچھ کہا ہے آپ سے۔ میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں۔" ان کی جانب آتے بالاج کے قدم ادھر کی رکے تھے۔ ثانیہ بیگم کی بات پر اس نے خونخوار نظروں سے جیا کو دیکھا۔ جو نا جانے کس بات پر اتنی رنجیدہ ہوئی تھی۔ معید سکندر نے ملازم سے کہہ کر سامان اندر رکھوا دیا تھا۔ اور جیا کو یوں روتے دیکھ وہ بھی پریشان ہوئے تھے

جیا بتاؤ بیٹا کسی نے کچھ کہا ہے۔؟" جیا نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ اسکے سر پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے بھی بالاج کی جانب دیکھا۔ منہا بھی بالاج کو گھورنے میں مگن تھی۔ بالاج ان سب کی نظریں خود پر محسوس کر کے سپٹپا گیا۔

آپ سب مجھے ہی کیوں گھور رہے ہیں میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔" بالاج شدید بد مزہ ہوا تھا۔

منہا بیٹا جیا کو روم میں لے کر جائیں آپ۔ اور تم میرے کمرے میں آؤ فوراً۔" بالاج کو سخت آواز میں تاکید کرتے معید سکندر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جبکہ منہا اور ثانیہ بیگم جیا کو لے کر کمرے کی جانب چلی گئیں۔

کیا کہا ہے تم نے جیا کو۔؟" اپنے کمرے میں ٹہلتے انہوں نے بالاج سے پوچھا جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بابا میرا یقین کریں میں نے کچھ نہیں بولا اسے وہ گھنی میسنی جان بوجھ کر سب کو تنگ کر رہی ہے۔"

شٹ اپ بالاج۔ جیا آج سے پہلے کبھی اتنی بری طرح سے نہیں روئی۔۔ اور تم کہہ رہے ہو تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"

تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔ ماں آپ۔" بالاج دل ہی دل میں جیا کو کوس رہا تھا۔ جو سب کو پریشان کیے ہوئے تھی

کچھ بتایا اس نے۔" معید سکندر کے استفسار پر ثانیہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا

بس فوراً جاؤ اور اس سے معافی مانگو۔" انہوں نے تنبیہی نگاہوں سے بالاج کو کہا

میں" گویا بالاج کو سننے میں غلطی لگی ہو۔

جی آپ۔" معید سکندر نے دانت پیستے اسے گھورا جس پر بالاج نفی میں سر ہلا گیا۔

ناٹ ایٹ آل۔۔ میں بالاج سکندر جا کر اس جیا سے معافی مانگوں۔ امپوسیبل۔" معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا

ٹھیک ہے بیگم جانے دو اسے یہ خوش ہے ہمیں دکھ دے کر تو ایسے ہی صحیح۔ وہ بن ماں باپ کی بچی ہے آج نہیں تو کل اپنے گھر کی ہو جائے گی تو سکون مل جائے گا اسے۔" ایموشنل کارڈ استعمال کیا تھا انہوں نے۔ والدین کے لیے ایک بہترین ذریعہ اپنی بات منوانے کا۔

اس بن ماں باپ کی بچی نے سب کچھ تو چھین لیا مجھ سے کوئی کثر باقی رہ گئی ہے۔ ہاتھ پیلے کریں اسکے جلد از جلد اور چلتا کریں اس گھر سے اسے۔ اور رہی بات معافی کی تو میں مانگ لیتا ہوں۔ خوش۔" بالاج نے کہتے ساتھ وہاں سے جانا مناسب سمجھا تھا۔ پیچھے معید سکندر کی آنکھیں نم ہوئی تھیں کیوں وہ آج بھی بدگمان تھا اس سے۔ اس سب میں اس معصوم کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ ثانیہ بیگم نے آگے بڑھ کر انکا کندھا تھپتھپا کر انہیں تسلی دی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اگر آپ بھی اپنا ناول یا کالم پبلش کروانا چاہتے ہیں تو ابھی ہمیں ہمارے انسٹاگرام اکاؤنٹ پہ رابطہ کریں۔

Ig@aestheticnovels.online

واہ جیا سکندر واہ!! نائس پلے۔" بالاج کمرے میں داخل ہوا تو اسے گم سم سا پا کر مزید طیش آیا۔

میں نے کیا کیا ہے؟" جیا نے بیڈ سے ٹیک لگائی

سوری۔" یک لفظی حرف بول کر بالاج نے واپسی کے قدم لیے۔ ورنہ جیا کے جواب پر اسکے غصے کا گراف مزید بلند ہوا تھا

سوری کس لیے۔" جیا کو معلوم نہ ہوا کہ یہ سوری کس لیے تھا۔

وہ اس لیے جیا سکندر کہ میرے بھولے ماں باپ تمہاری اس معصومیت میں آ گئے ہیں تمہارے ڈرامے کی وجہ مجھے گردان کر انہوں نے مجھے تم سے معافی مانگنے کا کہا۔ اب بتاؤ جیا کہ کیا تم نے میری معافی قبول کر لی۔؟" کمر پر دونوں ہاتھ جماتے دانت پیستے بالاج نے جواب دیا۔

نہیں۔" جیا نے اسکی حالت سے حظ اٹھاتے مسکراہٹ دبائی تھی۔

کیا کہا تم نے۔ دوبارا بولو زرا۔" بالاج کا سنجیدہ انداز جیا کا خون خشک کرنے کے لیے کافی تھا۔

تبھی فوراً سے بولی۔ بالاج نے ایک قدم اسکی جانب لیا تھا

نہیں میرا مطلب کہ ایئم سوری۔ میری وجہ سے یہ سب۔۔۔"جیا جو بالاج کو اپنی بات کی وضاحت دے رہی تھی اسے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ چپ ہو گئی۔

گل زرین سکندر کے منجھلے بیٹے واجد سکندر کافی لاپرواہ واقع ہوئے تھے۔انہیں ہمیشہ اپنے بیٹے کے مستقبل کی فکر رہتی تھی۔اس کی لاوبالی طبیعت کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی۔

گریجویشن کے لیے جب واجد سکندر امریکہ تشریف لے گئے تو واپسی پر وہ اکیلے نہ تھے۔ان کے ساتھ انکی ہمسفر صدف بھی تھیں۔

گل زرین سکندر نے جب دیکھا کہ صدف کی محبت واجد کو سدھار گئی ہے تو بغیر کسی واویلہ انہوں نے اور ان کی زوجہ نے صدف کو بہو کے روپ میں قبول کر لیا۔

صدف ملک نے اپنی گھر کی اکلوتی بیٹی تھیں ماں باپ اور بھائیوں کی مرضی کے خلاف جا کر انہوں نے واجد سکندر سے محبت کی شادی کی جو کامیاب ٹھہری لیکن زندگی کے نئے موڑ کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔

گل زرین سکندر کی سب سے چھوٹی بیٹی نائلہ کی شادی اپنے خاندان میں ہی سلمان جعفری سے ہوئی تھی۔اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹیاں عطا کیں۔

بڑی بیٹی مسفرا اور چھوٹی بیٹی عالیہ۔

واجد سکندر کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا۔

گیارہ سالہ انکا بیٹا ماہیر سکندر سب کی جان تھا اسکی اور بالاج کی بہت گہری دوستی تھی۔وہ دونوں ایسے ایک ساتھ رہتے جیسے گلاب کے ساتھ خوشبو جسے کوئی جدا نہ کر سکے۔

گیارہ سال بعد واجد سکندر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا۔چند ماہ کی جیا سکندر اپنی معصومیت سے سب کا دل موہ لیتی۔

زندگی میں بھونچال آیا کہ واجد سکندر اور صدف ایک شام اپنے بیٹے ماہیر سکندر کے ساتھ کسی آفیشل ڈنر سے واپس آرہے تھے کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں جان کی بازی ہار گئے۔

ان کی موت معید سکندر کے لیے اپنے ماں باپ کے بعد دوسرا بڑا دھچکا تھی۔

سات ماہ کی جیا کو جہاں ثانیہ بیگم نے گلے سے لگایا وہیں بالاج سکندر کو جیا سے نفرت ہونے لگی۔وجہ جیا کا ماہیر سے مشابہت رکھنا تھی ۔بہت کم عمری میں اس نے اپنے بھائیوں جیسے دوست کو کھویا تھا جو اسکی ذہنی طبیعت پر گہرا اثر ڈال گیا۔وہ جب جب جیا کو دیکھتا اسے

ماہیر سکندر شدت سے یاد آتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بالاج کی ں فرت تو کم ہوتی چلی گئی لیکن جیا سے کبھی اس نے آرام سے بات نہیں کی تھی بقول جیا سکندر کے وہ پیدا ہی اسکی ڈانٹ سننے کے لیے ہوئی تھی۔

جیا اٹھ جائیں بچے یونیورسٹی نہیں جانا کیا آج۔"ثانیہ بیگم نے کھڑکی سے کرٹن ہٹاتے جیا کو آواز لگائی جو بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی سو رہی تھی۔

سونے دیں نا مما۔"سورج کی شعاعیں اسکے چہرے پر پڑیں تو وہ دوسرے پلو سے چہرہ ڈھانپ گئی۔

اٹھ جائیں منہا کب کی کالج جا چکی ہے۔"انہوں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا۔

مما مم۔میری طبیعت نہیں ٹھیک مجھے نہیں جانا یونیورسٹی۔"جیا نے دہائی دی وجہ وہ یونیورسٹی جانا نہیں چاہتی تھی کہ وہاں اگر وہاج ہوا تو وہ کیا کرے گی۔جانے انجانے وہ خوفزدہ ہو چکی تھی۔

ثانیہ بیگم نفی میں سر ہلاتی کمرے سے باہر چلی گئی جانتی تھیں جیا نے ایک دفعہ کہہ دیا تو اب کوئی بھی اسے یونیورسٹی نہیں بھیج سکتا تھا ۔وہ ایسی ہی تھی بچپن میں جب بھی اسکا دل نہ کرتا سکول جانے کو وہ یونہی صحت خرابی کا بہانا بناتی تھی۔

کیا ہوا جیا ابھی تک اٹھی نہیں کیا۔"معید سکندر نے ثانیہ بیگم سے کہا جو ناشتہ کے ٹیبل پر انتظار کر رہے تھے انہوں نے نفی میں سر ہلایا

ہونہہ اتر گیا بھوت یونی ورسٹی جانے کا۔"بالاج منہ میں بڑبڑایا تھا۔

جیا واٹ آ سرپرائز۔کہاں تھی تم اتنے دنوں سے ہونی کیوں نہ آئی۔"جیا آج کافی دن بعد یونی ورسٹی آئی تھی۔تبھی انعم اسے دیکھتی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

کک۔کچھ نہیں بس طبیعت نہیں ٹھیک تھی۔"کہتے اس نے متلاشی نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔

وہاج کو ڈھونڈ رہی ہو۔وہ۔۔"انعم نے مسکراہٹ دبائی

نن۔نہیں بلکل بھی نہیں۔"جیا بوکھلا گئی کیونکہ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ویسے بھی اس اینجل نے جو اسکا حال کیا تھا اس کی یونیورسٹی آنے کی حالت بھی نہ تھی۔

اچھا جلدی چلو کلاس سٹارٹ ہو جائے گی۔۔""انعم کے ساتھ چلتی جیا اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

جیا نے باقاعدگی سے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ روزانہ بہت محتاط انداز میں یونیورسٹی جاتی تھی کہیں اسکا سامنہ وہاج ملک سے نہ ہو جائے ہاں وہ خوفزدہ ہو چکی وہ چاہ کر بھی اس واقعے کو زہن سے نہیں نکال پائی تھی وہاج کے الفاظ آج بھی ہتھوڑے کی مانند زہن پر لگتے تھے جنکا اثر یہ ہوا تھا کہ اس نے سکارف گلے میں ڈالنے کی بجائے سر پر اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن دور اندر دل کے کسی پنہاں خانے میں وہاج نام کا بیج آج بھی موجود تھا اور پھر کبھی وقت کے پاس بھی ہر زخم کا مرہم نہیں ہوتا۔

اج جب وہ اپنے ڈپارٹمنٹ سے نکلتی کیفے ٹیریا کی جانب آئی تو کسی جانی پہچانی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ جیا کا روا رواکان بن گیا۔

سامنے ہی وہاج ملک اپنی پوری شان و شوکت سے کسی لڑکی کے ساتھ براجمان تھا ایسے کہ لڑکی کا ہاتھ وہاج کے ہاتھ میں تھا۔ جیا کی آنکھیں شعلہ گیر ہو گئیں ایک پل کے لیے اس نے سوچا کہ وہ اس لڑکی کو وہاج ملک سے بچا کر چھپا کر رکھ دے لیکن اگلے ہی لمحے اسکا سر گھومنے لگا اسنے سہارے کے لیے دیوار کا سہارا لیا تھا۔

تبھی وہاج نے اسکی جانب دیکھا اور اس کی ایک مسکراہٹ ہی جیا کے اعصاب شل کر دینے کو کافی تھی۔ جب اپنے قدموں پر کھڑا ہونا محال ہو گیا تو اس نے یونیورسٹی سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

اپنے گھر پہنچنے تک جیا کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ یہاں کیسے پہنچی ہے اس نے ایک نظر اس حویلی نما گھر کو دیکھا اور پھر اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا اگلے ہی لمحے ایک باوردی گارڈ نے دروازا کھولا تھا۔

ارے بی بی جی آپ۔" چالیس کی عمر کے لگ بھگ چوکیدار نے جیا کو اندر آنے کا اشارہ دیا۔

اگر گھر سے کال ائے تو کہہ دینا یہاں کوئی جیا سکندر نہیں آئی۔" بے خیالی میں بولتے وہ پکی روش پر سے چلتے اندرونی دروازے تک آئی تھی۔

دونوں ہتھیلیاں دروازے کے دونوں پٹ پر جمائے اس نے دروازا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس در کا منظر آج بھی ویسا تھا۔ جیسا کبھی ہوتا ہو گا۔ پرانے طرز کا فرنیچر سفید چادروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی کچن کی جانب آئی۔

چونکہ وہاں کوئی رہتا نہیں تھا اس لیے کچن بند پڑا ہوا تھا اسے پانی کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ کیبنیٹ کھول کر ایک گلاس نکالا اور واش بیسن سے اسے دھو کر پانی پیا۔

سیڑھیاں چڑھتی وہ ایک کمرے میں آکر بند ہو گئی کیونکہ یہی اسکی جایے فرار تھی۔

کیا ہوا کچھ پتا چلا جیا کا۔"صوفے پر بیٹھی پریشان حال ثانیہ بیگم نے ادھر ادھر ٹہلتے معید سکندر سے استفسار کیا جس پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

آج جب ڈرائیور جیا کو یونی سے لینے گیا تو اسے پتا چلا کہ وہ وہاں پر نہیں ہے۔

حویلی فون کر کے پتا کیا ہے بالاج نے لیکن جیا اس بار وہاں نہیں گئی۔"ٹھنڈی آہ خارج کرتے وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

منہا بھی ثانیہ بیگم کے ساتھ بیٹھی انہیں تسلی دے رہی تھی۔

منہا آپکو کچھ بتایا جیا نے۔"معید سکندر نے اس سے پوچھا منہا نے خیالات سے چونکتے ایک نظر انہیں دیکھ کر ثانیہ بیگم کو دیکھا اور سر جھکا گئی

نہیں بابا جانی۔اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن میں نے اسے بہت دفعہ اکیلے بیٹھ کر روتے دیکھا ہے میں نہیں جانتی لیکن جب سے ہم واپس لوٹے ہیں اسکی یہی حالت ہے۔"منہا نے ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسری ہاتھ کی انگلی سے مسلتے ہوئے کہا۔

تبھی معید سکندر کا فون بزر ہوا تھا۔انہوں نے فوراً سے پیشتر کال اٹھائی۔

اچھا اوکے دھیان سے۔"بالاج کی بات کا جواب دے کر انہوں نے ایک نظر منہا کو دیکھا۔

اور کچھ۔"استفسار کیا

اور یہ کہ وہ یونیورسٹی جانے سے گھبراجاتی کافی عرصے سے میرے پوچھنے پر اس نے بات گول مول کر دی تھی۔لیکن میں جانتی ہوں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ اب یونی نہیں جانا چاہتی۔میں نے اس کی باتوں سے اخذ کیا ہے۔"منہا نے سر جھکائے کہا۔

بالاج نے اسے ہر جگہ ڈھونڈ لیا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھی حویلی رابطہ کرنے سے بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

لیکن ایک آخری امید تھی کہ شاید وہ وہاں موجود ہو

جیا سکندر اب تم میرا ضبط آزما رہی ہو۔"سٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مارتے اس نے دانت پیستے ہوئے کہا

اور گاڑی حویلی کے راستے پر ڈال دی۔

منہا کی بات غور سے سنتے معید سکندر نے ہنکارا بھرا۔

اس کا مطلب ہے وہ آگے پڑھنا نہیں چاہتی۔"انکی بات پر ثانیہ بیگم شانے اچکا کر رہ گئیں۔

اب اس بات کا ایک ہی حل ہے۔"انہوں نے غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور وہ کیا ہے۔"ثانیہ بیگم کے ساتھ منہا نے بھی تجسس کے مارے ان کی جانب دیکھا

اس سب کا ایک واحد حل یہی ہے کہ جلد از جلد جیا کی شادی کر دی جائے۔"معید سکندر نے سنجیدگی سے کہتے گویا ایک دھماکہ کیا تھا۔

منہا اور ثانیہ بیگم دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کرتا وہ دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔دل نا جانے کیوں دھک دھک کر رہا تھا اسے معلوم تھا اندر کا منظر کیسا ہو گا۔

یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔جیا کی شادی وہ ابھی اس زمداری کو نہیں نبھا سکتی۔"ثانیہ بیگم کا دل پسیج گیا تھا ان کے فیصلے پر۔

سامنے ہی وہ بیڈ پر اوندھے منہ گرنے کے سے انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔بالاج نے آگے بڑھ کر بیڈ کی پائنتی کے قریب اپنے قدم روک دیے۔

ایسی بات نہیں ہے جب سر پر آئے گی تو خود ہی زمہ داری کا احساس ہو جائے گا اور وہ نبھائے گی کیونکہ وہ میری بیٹی ہے۔"معید سکندر ایک ہی سانس میں اپنا اٹل فیصلہ سناتے یہ جا وہ جا ہوئے تھے۔اور وہ چاہ کر بھی انہیں یہ نہیں کہہ پائیں کہ زمہ داری بہت بھاری بوجھ ہوتی ہے جس کے اٹھانے والے کو مظبوط بننا پڑتا ہے۔کب سے ہونکوں کی طرح ان دونوں کو دیکھتی منہا نے ان کا سر اپنے شانے پر ٹکایا تھا گویا تسلی دی ہو۔

جیا اپنے والدین اور بھائی کا فوٹو فریم ایک گال تلے رکھے نیم سونے کی حالت میں تھی۔کسی کی موجودگی پا کر وہ تھوڑا کسمسائی۔بالاج نے اس کے نرم عارضوں پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشانات دیکھتے مٹھیاں بھینچیں۔

ازیت ہی تو تھی وہ جس سے اس کی حفاظت کا دعویٰ کیا تھا یہ نبھا رہا تھا وہ اپنا عہد۔

اس نے آگے ہو کر جیا کو کندھے سے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہا ایسے میں اسکا ہاتھ جیا کے کندھے کو چھوا۔

وہ تڑپ کر اٹھی تھی اور بنا سوچے سمجھے اسکا ہاتھ مقابل کے منہ پر اپنی چھاپ چھوڑتا چلا گیا۔ بالاج کا چہرہ دوسری طرف ہوا تھا آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ جس نے اج تک اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کی تھی آج اس کے منہ پر طمانچہ مار گئی تھی۔

اس نے شعلہ برساتی آنکھوں سے پلٹ کر اسے دیکھا

ہوش آنے پر جیا کی روح تک کانپ گئی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹنے لگی تھی کہ بالاج نے اسے اپنے ایک ہاتھ سے دبوچ لیا۔ جیا نے ایک نظر اسکی شعلہ برساتی آنکھوں میں دیکھا اور دوسری نظر اسکے ہاتھ پر ڈالی جس سے وہ اسے پکڑے ہوئے تھا۔

کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ جیا سکندر۔ کیوں سب کو پریشان کر رکھا ہے بولو۔ جواب دو مجھے۔" بالاج نے اسے جھنجھوڑا۔

میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔ بالاج سکندر۔" اونچی آواز میں دوبدو جواب دیتی وہ بالاج کو اپنی جگہ ساکت کر گئی۔ کئی لمحات وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔

کیا ہوا ہے جیا کیا چاہتی ہو تم۔" اپنے اشتعال پر قابو پاتے اُسنے دوبارہ نرم لہجے میں پوچھا۔ اور اس دوران وہ اُسکا بازو بھی چھوڑ چکا تھا۔ جیا نے نفی میں سر ہلایا اس سوال کا جواب دینے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔

میری ایک بات مان لیں پلیز۔" اُسکا لہجہ ملتجی تھا۔ بالاج نے اثبات میں سر ہلاتے پیچھے دیوار سے ٹیک لگائی

مم۔ مجھے یونیورسٹی نہیں جانا۔ اور۔ ا۔ آپ بھی مجھے فورس نہیں کریں گے۔" اپنا بازو سہلاتے اسنے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ نرم پڑ رہا تھا تو وہ کیوں نہ فائدہ اُٹھاتی ویسی بھی اگر یونیورسٹی نہیں جائے گی تو اس دلبر سے سامنا بھی نہیں ہو گا۔

اوکے۔ جیسا تم چاہو اگر ابھی تم یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تو مت جاؤ کوئی تمہیں فورس نہیں کرے گا۔" بالاج نے کندھے اچکائے گویا اسکی بات پر ایمان لے آیا ہو۔

ابھی نہیں میں کبھی بھی یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی۔" منہ بسور کر کہتی وہ بالاج سکندر کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ لانے کا سبب بنی تھی وہ مسکراہٹ جسے بالاج کمال مہارت سے چھپا گیا۔ اور دیوار سے ٹیک ہٹائی

اوکے۔ جیسا تم چاہو لیکن کیا میں وجہ جان سکتا ہوں۔" کہتے اسنے جیا کے ساتھ بیڈ کی دوسری جانب بیٹھنے لگا۔

نہیں۔ اور اٹھیں یہاں سے۔" اس سے قبل کہ وہ وہاں بیٹھ پاتا جیا کی غضب ناک آواز سن کر کرنٹ کھا کر سیدھا کھڑا ہوا اور دانت کچکچاتے اسے دیکھا جو اسکی تھوڑی سی نرمی سے بھی فائدہ اُٹھانا نہیں بھولتی تھی۔

تبھی بالاج کا موبائل رنگ ہوا۔

واٹسیپ پر منہا کا میسج جگمگا رہا تھا

جیا کہاں ہے بھائی کچھ معلوم ہوا۔" بالاج نے ہمم کا میسج کرتے موبائل واپس جیب میں اڑسا

میں باہر ویٹ کر رہا ہوں اپنا حلیہ ٹھیک کرو اور باہر آؤ جلدی۔" کہتے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک ٹھنڈی آہ خارج کرتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سامنے دیوار پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر سے آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔وہاں سب جگھر والوں کی مختلف تصاویر آویزاں تھیں۔ہنستے مسکراتے چہرے تھے وہ تب کسی کو کیا خبر تھی کہ زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آئے گا جس میں جیا سکندر تنہا ہو گی۔ہاں وہ تنہا تھی اتنے رشتے ہونے کے باوجود بھی وہ تنہا تھی۔

جیا پلٹ کر ڈریسنگ روم میں جانے لگی کہ بیڈ پر پڑی تصویر نے اسکی توجہ اپنی جانب کھینچی۔

کیوں کیوں اس اینجل کی آنکھیں آپ سے ملتی ہیں بھائی کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے اپنائیت کا سا احساس ہونے لگا تھا۔" آہ لیکن یہ کیوں تھا جس کا جواب دو اشخاص کے پاس تھا ایک تصویر میں دکھنے والے ماہیر سکندر تو دوسرا وہ اینجل۔

خیر ویسے بھی دنیا میں اٹھارہ فیصد لوگوں کی آنکھیں آپ سے ملتی ہیں۔میں کس۔کس میں آپکا عکس ڈھونڈتی پھروں گی۔" اگلے چند لمحات اسکا دھیان اسی بات پر رہا تھا۔

وہ جب باہر آئی تو بالاج چوکیدار کے پاس کھڑا اسے کچھ ہدایات دے رہا تھا کیا وہ نہیں جانتی تھی اس کے پاس انے پر بالاج اسے باہر کا اشارہ کرتا چلا گیا۔

بی بی جی۔ایک منٹ رکیں" جیا نے پلٹ کر اس چوکیدار کو دیکھا جو اب اپنے چھوٹے سے مکان میں گیا تھا۔

وہ وہیں کھڑی انتظار کرنے لگی جب وہ اگلے ہی پل اس کے سامنے آکر رکا۔

جی یہ کسی نے آپ کے لیے بھیجا تھا۔" اس نے چوکیدار کے ہاتھ سے وہ کارڈ نما چیز پکڑلی

اور آنکھوں کے سامنے کی وہ کارڈ ہی تھا آئی ڈی کارڈ کے جتنا لیکن اسکے اوپر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ماسوائے اس سکریچ کرنے والی جگہ کے۔اسنے وہ کارڈ مٹھی میں دبوچ لیا۔

وہ جب گھر پہنچی تو سب سے پہلے تو اسے ثانیہ بیگم سے خوب سننے کو ملیں کہ انکی وجہ سے وہ اتنا پریشان کو گئیں تھی انہیں منا کر وہ اب کمرے میں بیٹھی تھی سامنے منہا سٹڈی ٹیبل پر لیپ ٹاپ رکھے کام میں مصروف تھی۔

بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی جیا نے ہاتھ میں موجود کارڈ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سائیڈ ٹیبل سے پن اٹھا کر اسے سکریچ کیا۔

سامنے لکھی تحریر کو دیکھتے وہ دھک سے رہ گئ لمحوں میں سارا کھیل سمجھ آ گیا تھا مطلب وہ اسے اپنی کھوج لگانے کا کہہ رہا تھا لیکن کیوں۔

کارڈ پر انگریزی کے پانچ حرف کنندہ تھے۔ منہا نے ستانے کی خاطر رخ بدل کر دیکھا۔ جیا کی اڑی رنگت دیکھ اسنے استفسار کیا تو وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئ۔

زہن میں وہ الفاظ جیسے پیوست ہو گئے تھے۔

اے۔این۔جی۔ای۔ایل۔پانچ انگریزی حرف۔

ارے جیا بیٹا کتنی دیر لگاو گی اب جلدی کرو بچے وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"ثانیہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے کہا۔

جیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ مسکرا کر ثانیہ بیگم کی جانب دیکھا

ماشاءاللہ۔ میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے نصیب کرے۔"جیا کا چہرا ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے انہوں نے اسکے سر کا بوسا لیا وہ آنکھیں موند گئ۔

تبھی منہا اندر داخل ہوئی۔ ان دونوں کو یوں ایک دوجے میں مصروف دیکھ تلملا کر رہ گئ۔ مطلب وہ اتنی دیر سے تمام تیاریاں کر رہی تھی اور وہ دونوں مزے سے کھڑی اپنا پیار بانٹ رہی تھیں۔

مما جلدی چلیں وہ لوگ آ گئے ہیں۔"ثانیہ بیگم کو باخبر کیا تھا اس نے اور خود اپنا جوڑا لیے باتھروم میں بند ہو گئ۔

ثانیہ بیگم جیا کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہتی باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

لاونج میں وہ تمام نفوس بیٹھے تھے۔ بڑی تمکنت سے بیٹھیں آفرین جہاں اور انکے دائیں جانب براجمان انکا سپوت علی عمان۔ وہ وجیہہ شکل وصورت والا پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا انکے بلکل سامنے ثانیہ بیگم اور معید سکندر براجمان تھے۔

آپکا بیٹا نظر نہیں آ رہا۔"ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے آفرین جہاں نے پوچھا۔ سامنے میز مختلف لوازمات سے بھری ہوئی تھی جنہیں چھونے کی زحمت تک نہ کی گئ۔

جی دراصل ایک بہت اہم میٹنگ ہونے کی وجہ سے وہ نہیں آ سکا اور ویسے بھی ایسے معاملات تو گھر کے بڑے طہ کرتے ہیں۔"جواب معید سکندر کی جانب سے آیا تھا وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ دفعتاً دروازے پر ہل چل محسوس ہوئی تو سب کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں تھیں۔

سامنے سے ہی وہ ہلکے نارنجی رنگ کے جوڑے میں ملبوس چلی آرہی تھی۔ آفرین جہاں کی نگاہوں نے اچھے سے اسکا اسکین کیا تھا۔وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھی۔انہوں نے ایک نظر علی عمان کی جانب دیکھا لیکن وہ انکی جانب متوجہ ہی کہاں تھا وہ تو سامنے دیکھ رہا تھا۔اسکی نگاہیں جیا پر نہیں بلکہ اسکے ساتھ اسے پکڑے کھڑی منہا پر اٹک گئیں تھیں ساری دنیا سکے سامنے ساکت ہو کر رہ گئی جیا نے بھی اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کرتے پلٹ کر منہا کو دیکھا جو بالکل شل سی کھڑی تھی۔ جیسے میدان جنگ سے سارا ساز و سامان اکٹھا کر لینے کے بعد خالی ویران میدان ہو۔لٹا ہوا خالی میدان

ارے آؤ بیٹا یہاں بیٹھو میرے پاس۔۔"آفرین جہاں نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کی۔ منہا اسے لے کر آگے بڑھی اور نا محسوس انداز میں اسے ان کے دائیں جانب پڑے صوفے پر بٹھا دیا۔اسکی نظریں علی عمان پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ماحول میں تناؤ سا محسوس کرتے علی نے اپنے گریبان کے اوپری ایک بٹن کھولا تھا۔ گھٹن سی ہونے لگی تھی ایسا نہیں تھا کہ گرمی کی وجہ سے بلکہ منہا سکندر کی نظروں سے۔

تھوڑی دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ اور منہا واپس آ گئے تھے۔منیا کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی جسے جیا نے بخوبی محسوس کیا۔

مما۔"علی عمان نے تھوڑا سا آفرین جہاں کی جانب جھکتے آہستہ سے کہا۔انہوں نے سر کے خم سے مزید بولنے کی اجازت دی۔

آپ کو کیسی لگی وہ۔"خشک ہلک تر کرتے اس نے ایک بار پھر ہمت باندھی۔

کون جیا ماشاءاللہ پرفیکٹ ہے۔"دھیمے لہجے میں کہا

میں جیا کی بات نہیں کر رہا۔"آفرین جہاں نے رخ موڑ کر اسکی جانب دیکھا ان کی نظروں سے خائف ہوتے وہ پیچھے ہو گیا۔

کیا مطلب۔وہ وہ جو وہاں۔وہ علی۔اور تم۔"جیا نے بے یقینی سے منہا کی جانب دیکھا تھا وہ سر ہلا گئی۔

یا اللہ۔تم ہوش میں ہو منہا۔"جیا نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

منہا کے الفاظ کہ وہ شخص جو اس کا رشتہ لینے آیا بیٹھا تھا وہ حقیقتاً منہا سے شادی کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ اور منہا دونوں اکھٹے یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور یہ بات بہت عرصے سے چلی آرہی تھی۔

جی مما۔میں بالکل ہوش میں ہوں۔اور یہی منہا ہے منہا سکندر۔"اسنے ایک پل میں سالوں کا اٹکا تعارف کروا دیا تھا۔

تو تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا نا منہا اب کیا ہو گا۔"جیا نے اسے کوسا۔

میں نہیں جانتی جج۔جیا لیکن پلیز تن اس رشتے سے انکار کر دو۔"جیا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے اس نے منت کی تھی۔

ہمم۔پیاری ہے بلکہ یوں کہوں کہ بہت پیاری ہے۔"آفرین جہاں کی بات پر جہاں علی عمان کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی وہیں معید سکندر اور ثانیہ بیگم کو الجھتے دیکھ وہ گویا ہوئیں۔

دیکھیں بھائی صاحب۔جیا بھی ہماری بیٹی ہے لیکن ہمیں آپکی بیٹی منہا پسند آئی ہے کوئی زور وزبردستی نہیں ہے آپ سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔"حیرت کے دورانیے سے نکلتے وہ دونوں انکی بات پر لب سی گئے۔

لیکن منہا ایسے کیسے میں اچانک سے انکار کر دوں جبکہ میں ہامی بھر چکی ہوں۔"جیا نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

وہ ارادہ کر گئی تھی کہ منہا کے لیے وہ کچھ بھی کرے گی۔کسی ان چاہے رشتے میں بندھنے کا اسکا کوئی ارادہ نہ تھا۔

میں سوچ رہا ہوں انکو ہاں کر دیں ہم۔کیوں بالاج تمہارا کیا خیال ہے۔"معید سکندر نے کھانا کھاتے بات شروع کی۔بالاج نے ایک نظر خاموشی سے کھانا کھاتی جیا کے جھکے سر کو دیکھا لیکن وہ اسکے چہرے پر کچھ بھی نہ دیکھ پایا ناخوشی اور نہ ہی کوئی افسوس۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس معاملے میں اسکی اپنی کیا رائے ہے لیکن بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔

ہمم میں کیا کہہ سکتا ہوں جو آپ کو مناسب لگے۔"اسکا بات کرنے کا انداز آج کچھ الگ تھا۔ٹھہرا ہوا سا۔ بات کر کے اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا

کیا مطلب جو مناسب لگے بہن ہے تمہاری۔تمہاری رائے معنی رکھتی ہے۔"پانی پیتے بالاج کو پھندا لگا تھا اتنے زور کا کہ وہ اگلے چند لمحات کھانستا رہا۔جیا کی نظریں بے اختیار بالاج کی جانب اٹھی تھیں۔

انہوں نے ایسی بھی کیا بات کر دی تھی۔

سوری۔میرا مطلب تھا کہ اچھا لڑکا ہے میں نے کچھ جانچ پڑتال بھی کی تھی۔کافی شریف واقع ہوا ہے۔کسی بری کمپنی میں نہیں رہتا۔"بالاج نے ان کو اپنی رائے بتائی۔کھانے سے دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اسنے ایک بار پھر جیا کی جانب دیکھا وہ خاموش تھی اور عموماً لڑکیوں کی خاموشی کو مثبت معنی دیے جاتے ہیں۔

ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔کوئی بات نہیں جیا کے حق میں اس سے بہتر ہو گا۔میں ان سے بات کر کے منگنی کی بات طے کر دیتی ہوں۔"غائب دماغی سے وہاں بیٹھے بالاج کا ذہن اس سے بہتر والی بات پر اٹکا تھا۔

جیا بھی انہی کی جانب دیکھ رہی تھی جب سے وہ لوگ گئے تھے ثانیہ بیگم خانوش تھیں۔

میں نے آفرین جہاں سے بات کی ہے ان کا کہنا ہے کہ منگنی کی بجائے اگر جلد از جلد نکاح کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔"کھانے کے بعد سب لاونج میں بیٹھے تھے جب ثانیہ بیگم نے ان کی رائے بتائی۔

منہا وہاں سے اٹھ کر اوپر چلی گئی۔

اسے کیا ہوا۔"ثانیہ بیگم نے استفہامیہ نگاہوں سے جیا کو دیکھا تو وہ گڑبڑا گئی

ارے بیگم ایسے مواقع پر لڑکیاں اکثر شرما جاتی ہیں۔"معید سکندر کی بات پر وہ پر سکون ہوئی تھیں۔جیا اور بالاج نے الجھ کر ان کی جانب دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہے ہوں مطلب۔

ارے ایسے کیا دیکھ رہے ہو جاؤ جیا منہا کے پاس اور تم زرا اپنی گھوری بند کرو بہن کی شادی ہونے والی ہے اور اسے کوئی خوشی ہی نہیں۔"ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں معید سکندر نے کہا اور ساتھ میں خشمگیں نگاہوں سے بالاج کو دیکھا۔

بالاج کا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا تھا وہیں جیا بات کو سمجھتی اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی نہ روک سکی۔اور کھلکھلا کر ہنس دی۔یہ ہنسی منہا کی دعا قبول ہونے کی تھی۔پورے لاونج میں اسکی ہنسی کی جلترنگ گونجی تھی۔

جاؤ جیا منہا کے پاس جاؤ نہ۔"بالاج نے مسکرا کر جیا سے بولا دل سے ایک دم منوں بوجھ اتر گیا تھا۔وہ خود بھی حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔

دفعہ ہو جاؤ یہاں سے دھوکے باز۔"جیا کمرے میں داخل ہوئی تو بیڈ پر بیٹھی روتی ہوئی منہا نے پاس پڑا کشن اٹھا کر اسے دے مارا وہ اپنی ہنسی ضبط کرتی دکھی انداز میں اسے مزید تنگ کرنے کے موڈ میں آگئی۔

دیکھو منہا اس میں میرا کیا قصور ہے ویسے بھی جو اللہ کو منظور۔میں پوری کوشش۔۔۔"اس سے پہلے وہ مزید کچھ بولتی منہا بھوکی شیرنی کی مانند اس پر جھپٹی۔اپنا بچاؤ کرتی جیا منہا کے ساتھ بیڈ پر گری

میں تمہاری جان لے لوں گی جیا اگر تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی تو۔"منہا نے اسکے بال نوچنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

ارے ارے۔میں تو مزاق کر رہی ہوں انہوں نے مجھ سے رشتہ طے کرنے سے انکار کر دیا ہے اور انہیں تم پسند آگئی ہو۔"

اپنا بچاؤ کرتے جیا بیڈ کی دوسری جانب چھلانگ لگا گئی۔جیا کی بات پر منہا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔جس پر جیا ہنس دی۔

وہ بہت خوش تھی اپنی دوست اپنی بہن اور سب سے بڑھ کر اپنی کزن کے لیے۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑا گن کی میگزین بھر رہا تھا جب باہر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔یہ مخصوص قدموں کی چاپ تھی ۔ٹھہرے ہوئے چھوٹے قدم۔آنے والی ہستی کے کمرے میں داخل ہوتے ساتھ ہی اُسنے ٹھک کی آواز سے میگزین چڑھائی اور دراز میں رکھ کر سیدھا کھڑا ہوا۔

کمرے میں داخل ہونے والے شخص نے اُسکی یہ حرکت دیکھ لی تھی ایک نظر بند دراز پر ڈال کر اُسنے اپنے سامنے ہاتھ پشت پر بندھے کھڑے اُس خوبرو مرد کو دیکھا۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اُسکی اسیر ہو سکتی تھی وہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ انمول ملک باپ اور خدا کی علاوہ کسی تیسرے سے نہ ڈرنے والی۔

کہیں جانے کی تیاری ہے ملک۔" وہ قدم قدم چلتی ایک اُسکی سامنے رک گئی اور ایک بھرپور نظر اُسکے کہیں جانے کی لیے تیار سراپے پر ڈالی۔

آپ یہاں کیوں آگئیں کوئی کام تھا تو مجھے بولا لیا ہوتا۔" مقابل نے سر اثبات میں ہلاتے اس کے آنے کی وجہ جاننا چاہی۔

ارے اس میں تکلف کی کیا بات ہوئی بھلا۔ مشکل میں یہ مرید اپنے مرشد کے پاس ہی آئے گا نا۔" سبھاؤ سے کہتے وہ بیڈ پر بیٹھی کہ ایک ٹانگ دوسری کہ اوپر تھی۔ اور ایک طائرانہ نگاہ اُسکے کمرے پر دوڑائی۔

کیا مشکل پیش آگئی آپکو انمول ملک۔" کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اُسنے وہ اپنا نام اُسکے منہ سے سُن کر ہنس دی۔ وہ یونہی اُسکی باتوں پر ہنس دیا کرتی تھی۔ اور یہ عنایت بھی انمول ملک اپنے لیے انمول لوگوں پر کرتی تھی وہ لوگ جو اُسکے دل کے قریب ہوں اور سامنے کھڑا وہ شخص اُسکے دل کا قابض تھا۔

جانتے ہو نہ ایسی باتیں کر کے تم میرا دل فتح کر لیتے ہو۔" آنکھیں ٹپٹپائیں۔

آپ کا دل بازاری ہے جو مجھ جیسے عام بندے کو جگہ دیے ہوئے ہے۔ ورنہ انمول ملک کا معیار مجھ سے کئی اوپر کا ہے۔ خیر مجھے دیر ہو رہی ہے اگر آپ کو کوئی کام نہیں تو مجھے جانا ہو گا۔" اُسکا سنجیدہ لہجہ انمول کو انگاروں پر لپیٹ گیا۔

اور تم۔۔۔ تم خود کیا ہو ایک غدّار جو میرے ہی باپ کے ساتھ نمک حرامی کر رہا ہے انکو دھوک۔۔۔۔" کمرے سے باہر نکلتے اُسکے قدم انمول کی بات پر رکے تھے اس سے پہلے وہ آگے کچھ بولتی اُسنے پلٹ کر اپنی بھاری ہتھیلی اُسکے ہُنہ پر رکھی تھی۔ انمول ملک اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ دل کانوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

آئندہ اپنی حد سے تجاوز نہ کرنا ملک۔" لمحہ فنا ہوا تو وہ اُسکا ہاتھ جھٹکتی غصّے سے پھنکاری تھی۔

شیش۔۔" اُسکے خاموش کروانے پر اُسنے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اگلے ہی لمبی وہ کرنٹ کہا کہ سیدھی ہوئی۔

برخوردار ابھی تک تم نکلے نہیں تمہہ۔۔۔" جہان داد ملک نے کمرے میں داخل ہوتے کہا اور سامنے انمول ملک کو کھڑے دیکھ بات درمیان میں چھوڑ دی۔ سوالیہ نظروں سے اُسکی جانب دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہے ہو کہ یہاں آنے کا مقصد۔

وہ۔ وہ بابا سائیں میں اسے کہنے آئی تھی کل شام مجھے ایک تقریب پر جانا ہے تو گاڑی تیار رکھے کیونکہ مجھے تاخیر پسند نہیں۔" کہتی وہ جیسے ائی تھی نکلتی چلی گئی۔

جلدی جاؤ وہ لوگ انتظار کر رہے ہونگے اور ملک کبھی تاخیر نہیں کیا کرتے اور اس معاملے کو جلد نمٹا آو۔""اپنی بھاری رعب دار آواز میں کہتے وہ ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے واپس چلے گئے۔ان کی شخصیت میں بہت رعب و دبدبہ تھا۔انکے جانے کی دیر تھی کہ پیچھے کھڑے بقول "ملک" نے پاس پڑے شیشے کی میز سے ساری چیزیں پلٹ دیں۔

چند گہری سانسیں لینے کے بعد اُسنے دراز کھولا۔اپنی ریوالور نکال کر جیب میں اڑسی اور باہر نکل گیا ایک بار پھر وہ جا رہا تھا گناہوں کی دنیا میں جو اُسنے اپنے لیے خود نہیں چنی تھی بلکہ اُسے اس دنیا میں دھکیلا گیا تھا۔

فروری کے نصف میں نکاح کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔نکاح کے دو ماہ بعد رخصتی طے ہوئی تھی اور اس سب کی تیاریوں میں مگن منہا اور جیا کو کسی تیسرے کا ہوش نہیں تھا۔کل شام کو سادگی سے نکاح ہو جانا تھا۔خاندان بھر سے مہمان چلے آ رہے تھے جن کا رہنے کا انتظام ساتھ والے گھر میں کیا گیا تھا۔نائیلہ جعفری بھی اپنی دونوں بیٹیوں اور شوہر کے ہمراہ پہنچ گئی تھیں۔

رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں آپ نے جیا کے کیسے سب کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہے۔"عالیہ اس وقت غصے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنی بڑی بہن مسفرا سے ہمکلام تھی۔

کوئی جل رہا ہے؟"مسفرا نے ہتھیلی تھوڑی تلے رکھے آنکھیں ٹپٹپاتے قیاس لگایا۔ادھر سے اُدھر ٹہلتی عالیہ کے قدم تھمے تھے۔آنکھوں میں شعلے بھڑک گئے۔

ہاہاویری فنی۔میں عالیہ جعفری اس دو ٹکے کی یتیم مسکین جیا سے جلوں گی۔جلتی ہے میری جوتی۔ہنہہ "اس وقت جیا کے لیے اس کے دل میں بھری نفرت دیکھنے لائک تھی۔مسفرا نے افسوس سے سر جھٹکا وہ بارہا اپنی اس باؤلی بہن کو سمجھا چکی تھی۔

دیکھ لو پھر اس دو ٹکے کی یتیم مسکین لڑکی نے ہی سب کو اپنی انگلیوں پر نچایا ہوا ہے۔تم بتاؤ تمہیں کس بات پر حسد ہو رہی ہے اس سے۔"مسفرا کی بات پر اس نے ایک بار پھر ادھر سے اُدھر چکر لگانا شروع کر دیا

سمجھتی کیا ہے خود کو جب سے ہم آئے ہیں آج بالاج سے بات چیت کرنے کا موقع ملا تھا۔ٹپک پڑی میڈم رنگ میں بھنگ ڈالنے کو کہ ڈیزائینر سے اس کا ڈریس لے آئیں اور وہ بھی گھنا میسنا چل دیا اس کے حکم پر۔"اسے اپنی اور بالاج کی گفتگو ٹوکے جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔

افف عالیہ دل چھوٹا مت کرو۔یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔کچھ کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لے اڑے بالاج کو اور تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ۔"بالاج سے عالیہ کی دیوانگی کا علم اسے اچھے سے تھا اس لیے اسے سمجھانے لگی۔

بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا"بال جھٹکتے وہ باہر چل دی۔پیچھے مسفرا اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہو گئی۔

نکاح کی تیاریاں اپنے جوبن پر تھیں۔ مہمانوں کو دیکھتی ثانیہ بیگم۔ اور باہر آنے والے مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑے بالاج اور معید سکندر۔ معید سکندر سفید کرتے میں ملبوس آج بھی وجاہت کا شاہکار لگ رہے تھے۔ بالاج نے ان کے برعکس کالا کرتا پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا جس کے ساتھ ہم رنگ شال اس کے کندھوں کی زینت بنی ہوئی تھی۔

دفعتاً دروازے پر شور بلند ہوا تو جیا نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

وہ ہلکے گلابی رنگ کا شرارہ سوٹ پہنے ساتھ ہم رنگ دوپٹے کا ایک پلو کندھے پر ٹکائے اور دوسرا دوسرے بازو پر رکھے آسمان سے اُتری پری معلوم ہو رہی تھی۔

ائی ہائی۔۔ دولہے میاں تو بہت ہی خوبصورت لگ رہے ہیں۔ ویسے ہماری منوں بھی کسی سے کم نہیں لگ رہی۔" جیا نے نیچے سب سے ملتے علی عمان کو دیکھ کر کہا۔ اور پلٹ کر منہا کو دیکھا جو سنگھار میز کے سامنے بیٹھی سر پر دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔ بھاری بھر کم دوپٹہ پنوں کی مدد سے بڑی مشکل سے سلکی بالوں پر اٹکا ہوا تھا۔ منہا آج بہت خوش تھی اُسکی دِلی مراد جو پورا ہونے جا رہی تھی۔ سفید ٹخنوں کو چھوتی میکسی پہنے بھاری دوپٹہ سر پر ٹکائے ہلکے پھلکے میک اپ میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصرت لگ رہی تھی۔ جیا کی بات پر مسکرا کر سر جھکا گئی۔

جیا نے دوبارہ کھڑکی سے نیچے جھانکا بالاج اب علی سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی پوری طرح سے تیار آفرین جہاں کھڑی ہوئی تھیں علی سے گلے ملتے بالاج کی نظر اوپر کی جانب اٹھی تھی جہاں وہ اسیر دل کھڑکی میں کھڑی اُسی طرف دیکھ رہی تھی پل بھر کو دونوں کی نظریں مل کر چار ہوئی تھیں جیا چھپاک سے اندر غائب ہو گئی۔

اُسنے آج سے پہلے کبھی اُسے اتنا خوبصورت بنے سنورے نہیں دیکھا تھا یہ آج سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا اپنے دل کی حالت کو۔

جیا نکاح خواں آ رہے ہیں۔۔" کچھ دیر بعد بالاج نے آکر دروازہ پر دستک دے کر نکاح خواں کے آنے کی اطلاع دی۔

جیا سر ہلاتے منہا کو اچھے سے دوپٹہ اڑا گئی۔

نکاح خواں کے ساتھ معید سکندر بالاج سکندر اور ثانیہ بیگم کے ساتھ ساتھ آفرین جہاں بھی اندر آئی تھیں۔ منہا اب بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی جب نکاح کا مرحلہ طے پایا اور وہ منہا سکندر سے منہا علی بن گئی۔ اپنے تمام حقوق اس شخص کے نام کر دیے جسے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئی ایک خوشی کا آنسو اُسکی آنکھوں سے بہہ کر رخسار پر پھسلتا چلا گیا۔

جیا کی بھی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دل سے اسے اچھے نصیبوں کی دعا دی۔

بالاج نے ثانیہ بیگم کو اپنے ساتھ لگا کر ان کے سر کا بوسہ لیا اور نکاح خواں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اور پھر علی سے نکاح کی اجازت لے کر دستخط کروائے گئے۔

تھوڑی دیر بعد منہا کو بھی لا کر علی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔

سارے کزنز نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ بار بار شرما کر سر جھکا دیتی۔

بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" علی نے سامنے دیکھتے اس کی جانب جھک کر پشتو میں کہا تو وہ جھینپ گئی۔ البتہ اس کی کہی بات سر کے اوپر سے گزری تھی۔ سارا انتظام لان کی کھلی فضا میں ہوا تھا۔ خوشگوار موسم کے ساتھ پہلو میں بیٹھا من چاہا شخص وہ جتنا اپنے رب کا شکر ادا کرتی کم تھا۔

ارے شکریہ تو بولو۔" اسے چپ دیکھ کر اس نے حیرت سے کہا

لیکن مجھے تت۔ تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔" منہا نے زبان دانتوں تلے دبائی علی کا منہ حیرت سے کھل گیا لیکن سمجھ آنے پر اسکے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ مچل گئی۔

میں نے کہا کہ تم آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ بس میں نے کہا پشتو میں تھا۔" اس نے اس کے لاعلم ہونے کا لطف اٹھایا۔

کیا آپکو پشتو آتی ہے۔؟" حیرت کا پہلا جھٹکا لگا تھا۔

ہاں بھئی۔ اب خان ہوں پشتو نہیں آئے گی تو پھر کیا فائدہ میرے خان ہونے کا" علی نے سخت بدمزا ہونے کی اداکاری کی

وہاٹ!! آپ پٹھان ہیں۔؟" حیرت کا دوسرا بڑا جھٹکا لگا تھا اسے اور وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔

ہاں اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟؟" علی کو اسکی حیرت پر حیرت ہوئی۔

مجھے خان لوگ نہیں پسند۔۔" وہ اسے یہ نہیں کہہ پائی کہ اسے خان اس لیے نہیں پسند کہ وہ نہ جانے پشتو میں اسے کیا گالیاں دے جائیں اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔

دیکھ لو پھر اسی خان سے محبت کی ہے تم نے۔ خیر اب تو ہو گئی نا۔ ہاہا" علی نے اس کی حالت سے حظ اٹھایا

مت ماری گئی تھی میری۔۔" منہا روہانسی ہوئی تو علی کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔ آس پاس چلتے لوگوں نے رشک کی نگاہ سے ان دونوں کی جانب دیکھا تھا۔

ایکسکیوزمی۔"جیا ابھی منہا کے پاس سے اٹھ کر اندر کی جانب آرہی تھی جب راستے میں اسے کسی نے روکا اس نے غور سے اس نوجوان کو دیکھا وہ اسے کافی دیر سے علی کے ساتھ دیکھ رہی تھی یقیناً وہ انکا رشتے دار تھا۔

جی۔؟؟"اس نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا شکل سے ہی وہ اسے کوئی لفنگا لگ رہا تھا

میرا نام ثاقب ہے۔آپ میرے خیال سے منہا بھابھی کی بہن ہیں۔کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گی۔؟"جیا کے تو سر پل لگی تلوؤں پر بجھی سمجھتے کیا ہیں یہ آوارہ لڑکے خود کو۔

میری بات سنیں مسٹر عاقب۔راقب واٹ ایور۔ سمجھتے کیا ہیں آپ خود کو کوئی شہزادہ گلفام ہیں آپ یا پھر پرنس چارمنگ ارے شکل دیکھی ہے اپنی کس منہ سے آپ مجھے دوستی کی آفر کر رہے ہیں میں آپ جیسے لڑکوں کو اچھے سے جانتی ہوں۔اواراہ لچے لفنگے۔"جیا کو تو جیسے موقع مل گیا تھا اتنے دنوں کا دبہ غصہ نکالنے کا۔کسی نے پیچھے سے اسکا کندھا تھپتھپایا تھا جیسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہو۔لیکن وہ سن ہی کہاں رہی تھی۔

ایک منٹ زرا۔ہاں تم جہاں لڑکی دیکھی نہیں چل پڑتے ہو دوستی کا ہاتھ بڑھانے۔اتنی ہی غیر اہم ہوتی ہیں ہم تمہارے لیے جو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہو لیکن میں جیا سکندر۔"آخر میں اس کا لہجہ رندھ گیا تھا اس سے پہلے وہ ثاقب کو کچھ اور بھی سخت سست سناتی اسکی پشت پر کھڑے شخص نے اسک رخ پورا اپنی جانب موڑا تھا۔

اپنے سامنے بالاج کو کھڑے دیکھ اس سے آنسوؤں پر بندھ باندھنا مشکل ہو گیا تھا۔ہلک میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے اس نے جن تیوروں سے ثاقب کی طرف دیکھا اسکا تو خون خشک ہو گیا تھا

سس۔سوری بالاج بھائی وہ بس میں تو اپنی بہن کو تنگ کر رہا تھا۔مم۔میں وہ۔مجھے علی بلا رہا ہے"اپنی کنی کترا تا وہ رفو چکر ہو گیا۔

جبکہ جیا کا منہ اسکے بہن کہنے پر کھل گیا پلٹ کر اسے دیکھا جو اب دور جا چکا تھا۔

ہنہہ گھٹیا انسان۔ابھی دوستی کی آفر کر رہا تھا اور پل میں مجھے بہن بھی بنا ڈالا۔"اونچی آواز میں بڑبڑاتے اسنے بالاج کی جانب دیکھا جو اب اسے گھورے جا رہا تھا۔

جیا کی کہی گئی بات پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی جیا تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوئی تھی مطلب کہ یہ چنگیز خان اسکی بات پر مسکرایا تھا اور اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

بالاج اسے خیالوں میں گم دیکھ کر سائیڈ سے نکلتا اوپر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تو جیا بھی سر جھٹکتی منہا کی طرف چل دی۔

کیا میں اندر آجاؤں۔"عالیہ نے دروازے پر کھڑے ہو کر دستک دی اور اندر آنے کی اجازت طلب کی

تم اندر آچکی ہو عالیہ۔" اپنی وارڈروب میں کوئی چیز تلاشتے اس نے عالیہ پر چوٹ کی وہ مسکرا دی۔

یہاں آنے کا مقصد؟؟۔" کہتے وہ ایک بار پھر کچھ تلاشنے لگا۔

آپ۔۔ آپ ہیں میرا مقصد۔ آہ کاش میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔" وہ صرف سوچ ہی سکی کیونکہ کہنے کے لیے بہت ہمت درکار تھی جو اس میں نہ تھی

وہ مجھے آپ سے بات کرنی تھی لیکن اس دن بھی جیا آگئی تھی۔ اور بات بیچ میں رہ گئی۔۔" عالیہ کے افسوس کرنے پر بالاج وارڈروب بند کرتا مکمل اس کی جانب متوجہ ہوا وہ بھی تو دیکھے ایسی کون سی اہم بات تھی جو جیا کی موجودگی میں نہیں ہو پاتی تھی۔

بالاج آپ کو نیچے ماما بلا رہی ہے جلدی آئیں۔" عالیہ کی بات ایک بار پھر ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ جیا بالاج کا بلاوہ لے کر آن پہنچی اپنی بات ادھوری رہ جانے پر وہ تلملا کر ایڑھیوں کے بل گھومی لیکن جیا وہاں سے جا چکی تھی۔

رکیں آپ کو پہلے میری بات سننا ہو گی۔ کیا مصیبت ہے ہر دفعہ یہ جیا ٹپک پڑتی ہے بیچ میں اور آپ بھی اس کے پیچھے دم ہلاتے چل پڑتے ہیں۔" بالاج کو بھی اس کے پیچھے جاتے دیکھ وہ چیخ پڑی تھی اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔
بالاج اسکو اتنے گھٹیا الفاظ کا چناؤ کرتے دیکھ گنگ رہ گیا

یہ کیا بدتمیزی ہے عالیہ۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ اسکی گرفت سے نکالنا چاہا لیکن مقابل انتہا درجے کا بدتمیز تھا

آپ۔ آپ ہیں میری بدتمیزی کی وجہ۔ یوں جانے نہیں دے سکتی میں آپکو بہت محبت کرتی ہوں میں آپ سے۔ لیکن آپ کو اس جیا کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا کیوں" عالیہ کے الفاظ اسے بت بنا گئے تھے اسکا دل چاہا وہ اس بدتمیز کا منہ نوچ لے جو اس کے اور جیا کے رشتے پر کیچڑ اچھال رہی تھی۔

مائینڈ یور لینگویج عالیہ۔ دور رہو مجھ سے اور جیا سے بھی ورنہ تمہارے ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے میں ایک پل دیری نہیں کروں گا میں۔ تم ایک انتہا درجے کی نیچ لڑکی ہو جسے اپنی عزت نفس مجروح کرنے کا شوق چڑھا ہوا ہے اور ایسی لڑکیوں پر بالاج سکندر تھوکنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔" وہ اتنے سخت الفاظ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن مقابل کا ہیٹ دھرم ہونا اسے تیش دلا گیا۔

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالوا تا لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا۔

نکاح کی تقریب رات دیر تک جاری رہی تھی اور اس کے بعد تمام مہمان رخصت ہو گئے۔

انمول اپنی دوست کی سالگرہ کی تقریب سے واپسی پر بھی اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے اس نے بیک ویو مرر سے ایک نظر اس کو دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انمول باغی ہو رہی ہے اور یہ باغی پن اسکے ساتھ ساتھ اسے بھی لے ڈوبے گا۔

چچ افسوس۔ کہ تم آج بھی وہیں کھڑے ہو ملک۔"چند لمحات بعد انمول کی آواز ابھری تھی اس نے اپنی نظریں مرر پر ٹکا دیں

کیوں کر رہے ہو آخر ایسا کیا ہے جو تمہیں یہاں پر باندھے ہوئے ہے۔ میں نے تمہیں آج سے پانچ سال پہلے بھی بولا تھا کہ نکل جاؤ اس دنیا سے لیکن تم نے میری بات پر کان نہیں دھرے۔ کیوں ملک اس گناہوں کی دلدل میں رہ کر کیا ہاتھ آ رہا ہے تمہارے۔"انمول کی بات پر اس نے آنکھیں میچ کر کھولی تھیں۔ وہ آج پھر سے کٹہرے میں کھڑا کر رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج بھی اس کا جواب کیا ہو گا۔

کچھ راز ہیں انمول جن سے پردہ چاک ہونا ابھی رہتا ہے۔ اور یہ گناہوں کی دنیا میری اپنی چنی ہوئی ہے۔"

غلط۔ تم اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے یہاں لایا گیا تھا تمہیں۔۔ مجھے یاد ہے وہ روتا بلکتا بچہ جو کم عمری میں ہی زمانے کی دھوپ کا شکار ہو گیا۔"انمول کی آنکھیں نم ہوئی تھیں وہ چاہ کر بھی اس کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اتریں باہر نکلیں۔"اسکی بات پر "ملک" نے اسکی جانب کا دروازا کھولتے باہر نکلنے کا اشارا کیا مطلب صاف تھا کہ وہ اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ انمول نے آنکھوں میں افسوس لیے اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ خارج کرتی اپنا کلچ اٹھاتی باہر نکلی۔

آئندہ مجھے اس بات کا حوالہ مت دیجیے گا کیونکہ آپ کو اس بات سے فرق نہیں پڑنا چاہیے میں گناہ کا کام کروں یا نیکی کا۔ کم از کم آپ کو تو کوئی نقصان نہیں دیا۔ مجھے اپنے معاملات میں مداخلت پسند نہیں آئیندہ خیال رکھیے گا انمول 'ملک'۔""ملک پر خاصا زور دیتے وہ اسے اپنی حیثیت جتا گیا تھا

میرا نقصان تمہیں لگتا ہے کہ تم نے میرا کوئی نقصان نہیں کیا میرے دل پر اپنا ڈیرا جمائے بیٹھے ہو مزید نقصان کیا کرو گے تم میرا۔ ہمم بولو۔ جواب دو مجھے۔"شیرنی کی سی دھاڑ لیے وہ اس سے جواب طلب تھی جس کے سینے میں بقول اسکے سنگ دھڑک رہا تھا

میں آپ کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا پہلے بھی سمجھایا تھا ایک بار پھر سے وارن کر رہا ہوں اس دل اور دماغ کی جنگ میں آپ کا کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس خرافات کو اپنے دل سے نوچ پھینکیں کیونکہ میری چاہ ایک آسیب کی طرح ہے۔ لاحاصل اور لامحدود۔"اپنی کہتا وہ اسے اندر جانے کیلیے راستہ دے گیا۔ لیکن انمول کا تو مانو کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

تم بتاؤ گے اب انمول ملک کو کہ اسے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں۔"لیکن وہ بے حس بنا دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ وہاج ملک کا وہ حال تم نے کیا تھا۔؟"کاری ضرب لگائی تھی اس نے مقابل پر تیر کی تیزی سے وہ اسکی جانب متوجہ ہوا

آپ آپ کو کیسے۔"بولنے کے لیے الفاظ کم پڑے تھے

میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں سمجھے تم۔"اپنی کہتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

آہ ہ۔۔"غصے میں وہ گاڑی کو ٹھوکر مارتا اپنا ہی نقصان کر گیا۔

اپریل کے مہینے میں منہا کی رخصتی طے کی گئی تھی۔جیا منہا اور ثانیہ بیگم تو مانو بازار کی ہو کر رہ گئیں۔آج بھی وہ جیولرز سے اپنا آرڈر تیار کروا کر گھر واپس آ رہی تھیں۔جیا اور منہا فون پر کوئی وڈیو دیکھتے اس پر قیاس آرائیاں لگا رہی تھیں جبکہ ثانیہ بیگم کھڑکی سے باہر دیکھتی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔جب گاڑی ایک جھٹکے سے رکی کہ وہ گرتی گرتی بچی تھیں

کیا ہوا ہے کون ہے آگے۔"ثانیہ بیگم نے ڈرائیور سے پوچھا اس سے قبل وہ کوئی جواب دیتا انکی طرف کا دروازا کھول کر کسی نے بازو سے انہیں کھینچا تھا

جیا اور منہا کی چیخ بے ساختہ تھی اتنی دیر میں ان کی طرف کا دروازا کھول کر کسی نے انہیں بھی باہر نکالنا چاہا۔وہ دونوں نفی میں سر ہلاتی اندر کی جانب سرکی تھیں لیکن آنے والے نے انکی مزاحمت کسی خاطر میں نالاتے انہیں باہر نکالا۔وہ دن دہاڑے چوری کرنے والے ڈاکو تھے جو قانون کو کھیل سمجھتے ہیں۔

ابے او بڑھیا اپنا یہ رونا دھونا بند کر یہی سے کھوپڑی اڑا ڈالوں گا تیری۔"ایک تنومند مرد نے پستول کی نال اسکی جانب سیدھی کرتے کہا اور ساتھ ہی ان کے ڈرنے پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

تبھی کوئی گاڑی چرر رر۔۔کی آواز سے انکی گاڑی کے مقابل آ کر رکی۔

گاڑی کے ساتھ ایک قطار میں جیا۔منہا اور ثانیہ بیگم بت بنی کھڑی تھیں

ڈاکوؤں نے مڑ کر گاڑی سے نکلنے والی شخصیت کو دیکھا لیکن جس کی انہیں توقع تھی یہ وہ تو نہ تھا

اے ے کون ہو تم۔؟"ڈاکوؤں میں سے انکے کسی لیڈر نے آواز بلند کی تھی

تمہارا باپ۔"بھاری غصے کی آواز میں کہتا وہ ان میں سے ایک پر جھپٹا لیکن اسکی آواز جیا کے کانوں کی سماعت بنی تھی اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی

وہ آ گیا تھا۔آج بھی اسے بچانے وہی اینجل آیا تھا وہ جس کی کھوج وہ پچھلے چار ماہ سے لگا رہی تھی لیکن بے سود۔

لیکن آج وہ نقاب پوش نہیں تھا بلکہ سراپہ حسن تھا جسے دیکھتے ہی نگاہ ٹھہر جائے

اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسوؤں کا آبشار جاری ہوا تو وہ لڑ رہا تھا اس کے لیے وہ آج پھر ایک بار لڑ رہا تھا وہ انسان بلکہ اینجل جس کو دیکھتے ہی کسی اپنے کا گمان ہوتا تھا۔

وہ تیرہ سے بھی زائد افراد تھے اور وہ اکیلا تھا یقیناً وہ ان سے لڑنے کا متحمل نہیں تھا لیکن وہ محافظ تھا۔

ٹھاہ۔"اور تبھی اس سنسان سڑک کی سنسنی کو چیرتی گولی کی آواز سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہا اور ثانیہ بیگم جو کب سے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں ان کی چیخ بھی گولی لگنے کی آواز سے بلند ہوئی

ارے ے بھاگو جلدی نکلو یہاں سے مالک خود آکر دیکھ لیں گے سب۔۔"ان ڈاکوؤں کے سردار نے ان تمام کو للکارا اور وہ سارے آگے پیچھے جیپ میں سوار ہوتے دھول اڑاتے سڑک سے غائب ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

باب نمبر 3

"ٹھاہ۔"اور تبھی ہوا کی سنسنی کو چیرتی گولی کی آواز سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہا اور ثانیہ بیگم جو کب سے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں ان کی چیخ بھی گولی لگنے کی آواز سے بلند ہوئی

"ارے ے بھاگو جلدی نکلو یہاں سے۔۔مالک خود آکر دیکھ لیں گے سب۔۔"ان ڈاکوؤں کے سردار نے ان تمام کو للکارا اور وہ سارے آگے پیچھے جیپ میں سوار ہوتے دھول اڑاتے سڑک سے غائب ہو گئے۔

وہ آفس میں بیٹھا کسی فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا جب سائیڈ پر رکھا موبائل بزر ہوا

کسی انجان نمبر سے کال آتے دیکھ اس نے فون کان سے لگایا

"ہیلو۔"بھاری آواز اکتاہٹ لیے ہوئے تھی لیکن اگلی جانب سے کہے جانے والے الفاظ نے اسکو تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا

"تم۔ تم تو ٹھیک ہو نا۔ اور کہاں ہو اس وقت جیا۔ اور مام کہاں ہیں۔ ہیلو۔ ہیلو۔"اس نے کان سے فون ہٹایا اور تبھی واٹسیپ پر کوئی لوکیشن شئیر ہوئی تھی۔

فوراً سے بیشتر وہ آفس سے اس لوکیشن پر پہنچنے کے لیے نکلا تھا۔

"یا اللہ اس کی حفاظت کرنا۔ نا جانے کس ماں کا بیٹا کس بہن کا بھائی ہے۔ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا میرے اللہ۔" ہسپتال کے کوریڈور میں بیٹھی ثانیہ بیگم زیرِ لب اس فرشتے کے لیے دعا گو تھیں۔

منہا بھی کچھ دور فاصلے پر بیٹھی خاموش آنسو بہائے جا رہی تھی وہ اس واقعے سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے بالاج کو ہسپتال کے نمبر سے کال کر کے بلایا تھا۔ کہ اس ک اپنا موبائل تو گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔

جیا مظترب انداز میں ادھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھی اور وہ اندر ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر تھا۔ دفعتاً آپریشن تھیٹر کے دروازے واہ ہوئے اور ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر کے ساتھ ایک دو لیڈی نرس باہر آئیں۔

"ڈڈ۔ ڈاکٹر کیا ہوا وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔ آپ بتائیں پلیز۔" جیا کی بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی تبھی ڈاکٹر کو بولنے کا موقع دیے بنا شروع ہو گئی۔

"دیکھیں آپ نے انہیں لانے میں بہت دیر کی تھی لیکن پھر بھی ہم انکا ٹریٹمنٹ کر رہے ہیں آپ دعا کریں اللہ بہتر کرے گا۔" ڈاکٹر پروفیشنل انداز میں انہیں خبر کرتے اپنے کیبن کی جانب بڑھ گئے اور وہ چاہ کر بھی انہیں نہیں بتا پائی کہ اسے یہاں لانے کے لیے اسے کس مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سنسان روڈ پر آج کے دور میں کسی سے مدد مانگنا آ بیل مجھے مار کے متبادل تھا۔

لیکن بہت دیر بعد ایک رحم دل شخص کو ان پر رحم آ ہی گیا تھا اور وہ اسے اپنے توسط ہسپتال میں داخل کروا کر چلے گئے تھے۔

اسنے خیالات جھٹک کر سامنے دیکھا تو ثانیہ بیگم اور منہا ایک نرس کے ہمراہ کھڑی تھیں۔ وہ چل کر ان کے پاس آئی۔

"کک۔ کیا ہوا ہے سب ٹھیک تو ہے۔؟" ان دونوں کی پریشان صورتیں دیکھ کر دل کو ایک دھڑکا لگا تھا۔

دل ہی دل میں وہ دعاؤں کا ورد جاری رکھی ہوئی تھی۔

"پیشنٹ کو دیر سے لانے کی وجہ سے انکی بلیڈنگ کافی زیادہ ہو گئی ہے اور خون کی کمی کے باعث ہم کچھ کر نہیں سکتے ہسپتال کے بلڈ بینک میں اے۔بی۔ نیگیٹو خون موجود نہیں ہے آپ جلد از جلد اس کا بندوست کر دیں۔" نرس کی بات پر منہا اور ثانیہ بیگم کی نظریں جیا کی جانب اٹھی تھیں۔ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھتی وہ نرس کو پکار اٹھی۔

"سسٹر میرا بلڈ اے بی نیگیٹو ہے۔ آپ میرا بلڈ لے لیں لیکن انہیں بچا لیں پلیز۔" اندر پڑا وہ شخص زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، اسکی جان بچانے کے لیے اگر جیا سکندر کو اپنے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر دینا پڑتا تو وہ دریغ نہ کرتی۔۔

"ٹھیک ہے آپ چلیں میرے ساتھ۔۔" نرس اپنی کہتی آگے بڑھ گئی تو جیا بھی اس کی پیچھے ہو لی۔

منہا اور ثانیہ بیگم اس کے لیے دعا گو تھیں۔

ہسپتال کا دروازا کھلا تھا اور وہاں سے آفس والے حلیے میں ملبوس بالاج سکندر داخل ہوا تھا جو آکر منہا لوگوں کی جانب بڑھ گیا۔

"مام۔ منہا جیا کدھر ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔" جیا کو وہاں ناپا کر ایک خوف نے اسے اپنی زد میں لیا تھا۔

"بیٹا وہ اندر ہے۔ اس بچے کو خون کی ضرورت تھی اور جیا کا بلڈ اس سے میچ ہوتا ہے اس لیے۔" ثانیہ بیگم نے مختصراً بتایا۔

"کیا لیکن جیا کیوں۔۔۔ ہسپتال والے کیا مر گئے تھے۔۔" بالاج کا لہجے میں خود بخود تلخی گھل گئی تھی۔

"بس کر دو بالاج ایک تو اس فرشتے نے اپنی جان پر کھیل کر ہم سب کی جان بچائی۔ اور جب اسے نئی زندگی کے لیے خون کی ضرورت تھی تو ہم اسے اکیلے چھوڑ دیتے۔ ہسپتال کے بلڈ بینک میں اے۔بی۔ نیگیٹو خون دستیاب نہیں تھا اس لیے جیا گئی ہے اسکو خون دینے۔۔" ثانیہ بیگم کی بات سنتے بالاج کو شرمندگی نے آن گھیرا صحیح تو کہہ رہی تھیں وہ اگر آج وہ نہ ہوتا تو شاید جیا بھی۔۔۔۔۔ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر روتی ہوئی منہا کو گلے سے لگا کر تھپکا تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔

"بسس میرا بچہ۔ خاموش ہو جائیں۔ میں آگیا ہوں نا رونا بند کریں اب۔" پیار سے منہا کی کے بال سہلائے۔

"بب۔ بھیو۔ میں بہت ڈر گئی تھی وہ لوگ بہت زیادہ تھے۔ اور آپ بھی نہیں تھے ہمارے پاس میں بہت ڈر گئی تھی۔ اگر وہ نا آتے تو شاید۔۔۔۔" بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ رو دی تھی۔

وہ سچ میں بہت زیادہ ڈر گئی تھی اچانک سے ہونے والے اس حملے نے کچھ وقت کے لیے اس کے حواس معطل کر دیے تھے

وہ لوگ یقیناً ان کو لوٹنے آئے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ لوگ کچھ بھی نہیں لے کر گئے تھے۔

"مام آپ منہا کو لے کر گھر جائیں اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے کچھ دیر آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ادھر ہی ہوں جیا کے پاس۔" بالاج نے ثانیہ بیگم اور منہا کو ضد کر کے گھر بھیج دیا تھا۔

قطرہ قطرہ کر کے خون اس اینجل کی رگوں میں بھرتا جا رہا تھا۔ وہ بیڈ پر نیم مردہ حالت میں تھا چھے سات ڈاکٹروں نے اس پر گھیرا کیا ہوا تھا۔ بیڈ کے اطراف میں نیلے رنگ کے کرٹن لگے ہوئے تھے۔ جس سے باہر جھانکو تو دائیں جانب ایک سٹریچر پر جیا انکھیں موندے نیم دراز تھی بائیں ہاتھ کی پشت پر کینولا لگا ہوا تھا جس سے خون ایک باریک سی نالی میں سے ہوتا اس شخص تک پہنچ رہا تھا۔

"جیا۔ تم ٹھیک ہو۔" اپنے دائیں جانب سے بالاج کی آواز سنتے اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر بالاج کی طرف دیکھا جو پریشان صورت لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سر اثبات میں ہلاتے جیا نے ایک خاموش نظر نیلے پردوں کو دیکھتے واپس اس کی جانب دیکھا تھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گا جیا۔ ہماری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ بس صبر کرو بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اور اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا صبر کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔" اس کی نظروں کا سوال سمجھتے بالاج نے اسے حتی الامکان پُرسکون کر دیا تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی اس جانب بڑھ رہی تھی جیسے احتیاط سب سے زیادہ لازمی ہو۔

دراصل یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا جہاں اسکی قیمتی شے تھی جسے وہ چاہ کر بھی حویلی کے اندر نہیں رکھ سکتی تھی

چار کنال پر مشتمل اس حویلی کا عقبی حصہ بھی خاصہ بڑا تھا۔ایک جانب بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھی گئی تھیں تو مخالف سمت میں کچھ پنجرے تھے۔

وہ ان میں سے ایک چھوٹے پنجرے کے آگے آکر رک گئی۔

"ہیۓ۔ڈیزی کیسے ہو؟" پنجرے کی سلاخوں پر انگلیاں بجاتے اس نے اندر موجود جانور کو پکارا۔جو واؤواؤ کرتا لپک کر اسکی جانب آیا تھا۔

"آ۔ڈیزی آرام سے۔۔ارے۔" دراصل وہ ایک اعلیٰ نسل کا چھوٹا سا کتا تھا سفید بالوں سے اسکی آنکھیں تقریباً ڈھکی ہوئی تھیں ۔اور انمول ملک کی قیمتی اشیاء میں شمار ہوتا تھا۔

پس منظر میں گاڑی کے رکنے کی آواز نے ماحول کے سکوت میں ارتعاش پیدا کیا۔

انمول نے اسے باہوں میں بھرتے باہر نکالا۔پنجرے کی قید سے رہائی پاتے ہی ڈیزی اسکے منہ کی جانب لپکا۔ جیسے اس قید سے رہائی پانے پر وہ اسکا احسان مند ہوا تھا۔

اور تبھی پاس پڑے دوسرے بڑے پنجرے سے کسی شے کے دھاڑنے کی آواز آئی تھی

"آآآآآآ۔"انمول کی دلخراش چیخ میں ڈیزی کے بھونکنے کی آواز کہیں گل ہو گئی

"ہاہاہا۔۔بچے ڈر گئی اتنی سی شے سے۔" جہانداد ملک اپنی پوری وجاہت کے ساتھ وہاں آئے تھے جو گاڑی سے نکلتے وقت انمول کو اس جانب کھڑے دیکھ چکے تھے۔

"بابا سائیں یہ کوئی اتنی سی شے نہیں ہے بلکہ پورا چار من چار فٹ کا شیر ہے۔ہاہ دیکھیں زرا اسے کیسے گھور رہا ہے مجھے۔اس سے کہیں میرے سامنے سے ہٹ جائے ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جانا۔" یہ تو سچ ہی تھا کہ وہ جتنی بھی مضبوط کیوں نہ ہوتی ایک تنومند شیر سے مقابلہ اس کے بس سے باہر تھا اور شیر بھی ایسا جو اپنے مالک تک کی موجودگی میں اسے گھور رہا تھا۔

"چچ۔جہانداد ملک کی بیٹی ایک معمولی سے شیر سے ڈرتی ہے۔اس لیے اس جیسے کتے کو پال رکھا ہے تم نے" انکا اشارہ ڈیزی کی طرف تھا جو انمول ملک کی سخت ہوتی گرفت میں سے نکلنے کو پر تول رہا تھا۔پل میں اسکے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور ایک کینہ توز نظر اس شیر پر ڈالی جو بڑے مزے سے اسکے ڈیزی کو ایک "معمولی سا کتا" کہلوا کر اب اونگھ رہا تھا

"جج۔جی بابا سائیں ڈرتی ہوں۔ کیونکہ میں آپ کی طرح پتھر دل نہیں ہوں اور یہ کوئی کتا نہیں ہے ڈیزی نام ہے اسکا۔" مدھم لہجے میں اپنی کئی بار کہی گئی بات کو دہرایا تھا اس نے مبادا اس بار ہی وہ ڈیزی کو اس کے نام سے پکار لیتے۔ لیکن جانتی تھی ناممکنات کو ممکنات میں بدلنے کی تمام تر کاوشیں ناکام تھیں۔

جہانداد ملک نے اسے ہاتھ سے لان میں رکھی کرسیوں کی جانب اشارا کیا تھا اور خود بھی اس جانب چل دیے۔

تو وہ کچھ وقت بتانا چاہتے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ۔

کرسیوں کے قریب پہنچ کر وہ رکے تھے جیسے کوئی بات یاد آئی ہو۔

"جہانداد ملک کی بیٹی کو اتنا مظبوط ہونا چاہیے کہ وہ ایک کتا پالنے کی بجائے شیر پالے نا کہ شیر کی ایک دھاڑ پر سہم جائے۔ چچ" مڑ کر انمول کی جانب دیکھتے وہ اسکا ضبط آزما رہے تھے جواب بھی ڈیزی کو قیمتی شے کی طرح سینے سے لگائے کھڑی دوسرے ہاتھ کی مٹھیاں بھینچے ہوئے تھی۔

"آپ نے کبھی ماما کو قبول نہیں کیا تھا نا۔؟" غیر متوقع جواب آنے پر جہانداد ملک پل کو گڑبڑائے تھے جیسے اس سوال کی امید انمول ملک سے نہ ہو۔

"کیا تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے۔؟" دائیں آبرو اچکاتے اسکے خیالات جاننے چاہے جس پر انمول ملک میکانکی انداز میں سر ہلا گئی دل میں جکھر چلنے لگے تھے گویا وہ کیا جواب دیں اس عجیب سوال کا

چہرا ادھر اُدھر گھماتے چور نظروں سے انکے سپاٹ چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے چاہے لیکن کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"مم۔میں تو" جہانداد ملک نے ایک مضبوط قدم اسکی جانب لیا تو وہ ہکلاتی پیچھے کی جانب چار قدم لے گئی۔

"تو اپنی سوچ کی نفی کرو انمول ملک۔ تمہارا وجود ہی اس بات کا مجسم ثبوت ہے کہ میں نے تمہاری ماں کو بحیثیت بیوی تسلیم کیا تھا یا نہیں۔۔" طنزیہ وار اسکے دراز قامت سراپے پر کر کے اشتعال کی حالت میں کرسیوں میں سے ایک کرسی کھینچی اور بیٹھ گئے۔

ان کے کاندھے برابر آتی انکی اپنی ہی بیٹی یہ کیسا سوال کر گئی تھی۔

انمول بھی انکے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی جبکہ ڈیزی کو نیچے نرم گھاس پر کھلا چھوڑ دیا۔

"بابا۔" کہنی میز پر ٹکائی اور ایک ہاتھ تھوڑی تلے رکھتے بڑے انداز میں پکارا تھا اس نے اپنے بابا کو۔

جس پر وہ ہنکارا بھرتے دور افق پر نظر دوڑانے لگے۔ ایک باز تھا جو انکے اس محل نما گھر کی سب سے اونچی چوٹی پر آ کر بیٹھا تھا اپنی چونچ سے اپنے پنجوں میں موجود شکار کو اتھل پتھل کرتا وہ شام کے کھانے کا انتظام کر رہا تھا۔

"وہاج کو کب تک آپ یونہی نظر انداز کرتے رہیں گے بیٹا ہے وہ آپ کا اگر اس سے غلطی ہوئی ہے تو آپ کو چاہیے اسے اس سے سبق سکھائیں نا کہ یوں منہ پھیر لیں۔ پلیز بابا آئی ریکوئسٹ یو ٹو ٹالک ٹو ہم۔" ملتجی انداز میں وہ انہیں قائل کر رہی تھی

"آئی وونٹ ڈو دز۔ یہ اس کے حصے کا خسارہ ہے جو اسے بھرنا پڑے گا کیونکہ تم بھی جانتی ہو کہ جہانداد ملک سے ہوشیاری کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور یہ تو پھر ایک گناہ کرنے جا رہا تھا کیا یہ بھول گیا تھا کہ وہ لڑکی کتنی قیمتی تھی جسے اس نے میرے پاس پہنچانا تھا میں حیران ہوں اس بھیڑیے نے وہاج کو زندہ کیسے چھوڑ دیا۔" ان کی نظریں ہنوز اس چوٹی پر تھیں جہاں بیٹھا وہ باز اب اپنی چونچ صاف کر رہا تھا انہوں نے فوراً سے پیشتر اپنی نظریں وہاں سے ہٹائیں مطلب صاف تھا کہ اسکی یہ حرکت انکی نفیس طبیعت پر گراں گزری تھی۔

"وہ سب ٹھیک ہے مجھے بھی احساس ہے اس بات کا لیکن وہ میرا بھائی ہے میں کب تک اسے یوں دیکھوں گی وہ کہاں ہے مجھے اس بات تک کی خبر نہیں۔" انمول ملک آج انہیں اس بات پر قائل کر کے ہی دم لینے والی تھی کہ وہ وہاج ملک کو واپس بلائیں۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ اسکا بھائی اس لڑکی کے ساتھ بہت برا کرنے والا تھا لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ لڑکی اسکے باپ کے لیے کیونکر اتنی اہم ہو گئی کہ اپنے ہی بیٹے کو پچھلے پانچ ماہ سے خود سے دور رکھے ہوئے تھے۔ وہ کہاں تھا کیسا تھا انمول کو کچھ خبر نہ تھی اور ملک اس سے پوچھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہانداد ملک اس سے پہلے کہ انمول کو کچھ جواب دیتے جیب میں موجود موبائل تھرتھرایا۔

"ہمم بولو کیا ہوا کام ہوا یا نہیں۔ کیا کیسے تم لوگ کیسے یہ بات فراموش کر گئے کہ تم لوگوں کو گولی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا میں نے۔ بند کرو فون ہڈ حرام کہیں کے ایک کام ڈھنگ سے نہیں کر پائے تم لوگ اور الٹا میرا ہی نقصان کرنے چلے ہو۔" چہرے پر غصے کی تمازت سے انمول بھی کافی گھبرا گئی تھی جو اپنے پیروں کے پاس بیٹھے ڈیزی پر ہاتھ کی ہتھیلی سے کچھ لکھ رہی تھی۔ چونک کر انہیں دیکھنے لگی جو ابھی کسی اور کو کال ملا رہے تھے۔ شاید کسی کو گولی لگی تھی خیر یہ تو انکا روز کا کام تھا اسے کیا وہ خیالات جھٹکتی دوبارا اپنی انگلیاں چلانے لگی۔

م۔ل۔ک۔ ملک ڈیزی کے وجود پر ابھرے نرم و ملائم بالوں پر انگلی سے یہ تین حروف کنندہ کر کے وہ دل جان سے مسکرائی تھی۔

"ہاں ہیلو۔ ندیم میں نے جو ابھی تمہیں اڈریس سینڈ کیا ہے فوراً سے اس ہسپتال پہنچو اور تمام انتظامات سنبھالو کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور ہاں پولیس تک بات پہنچی تو اپنے سانس گن لینا۔" دو منٹ ٹھہر کر مقابل کی بات سنی۔

"ہاں ملک کو لگی ہے گولی خیر کچھ نہیں ہوتا ملک کو بچ جائے گا ملکوں کا خون ہے سخت جان تو ہو گا نا۔۔" مسکرا کر کہتے وہ کسی اور وجود کو انگاروں پر لپیٹ گئے تھے۔

ڈیزی کو گود میں اٹھاتے اسکے ہاتھ ساکت رہ گئے ایک دم سے اسے چھوڑتے وہ جھٹ کھڑی ہوئی تھی۔

"کک۔ کیا ہوا ہے ملک کو وہ ٹھیک تو ہے نا۔" باپ کا بازو ہلاتے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا جو کسی کو خاص تاکید کر رہے تھے۔

ایک دن سے چھوڑے جانے پر ڈیزی زمین پر گرا کرا ہا تھا لیکن پرواہ ہی کسے تھی۔

"ارے کچھ نہیں ہوا ملک کو دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے اسے تسلی دی تھی۔

"اا۔ آپ جا رہے ہیں نا اس کے پاس۔ مجھے بھی جانا ہے۔ آپ دو منٹ رکیں میں بب۔ بس" انکا ہاتھ جھٹکتے وہ اندر جانے لگی تھی تا کہ جلدی سے اپنی چادر لا سکے۔

"میں کہیں نہیں جا رہا انمول ملک اور تم بھی کہیں نہیں جا رہی کہا نا وہ بڑی سخت جان ہے سب جھیل لے گا۔" ان کی بات سے جیسے انمول کے اندر شرارے پھوٹے تھے وہ اسے موت کے منہ میں دھکیل خود لاپرواہ بن رہے تھے

"ملک کو کچھ نہیں ہونا چاہیے بابا سائیں کیونکہ اگر ملک کو کچھ ہوا تو جواب دہ آپ ہونگے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ اس کو بھی جس کی خاطر یہ سب ہو رہا ہے۔ میں دعا کروں گی۔" ڈیزی کو اٹھاتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی آنسو نکل کر سرخ گالوں پر بہہ گئے تھے کتنی آسانی سے وہ کہہ گئے سخت جان ہے؟؟

جہانداد ملک کی نظروں نے اسکے اندر گم ہونے تک اسکا پیچھا کیا تھا جو وہ سوچ رہے تھے ویسا نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر ویسا تھا تو کیا انکی بیٹی ایک بات بھول رہی تھی۔

گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ جیا کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اندر زیرِ علاج وہ شخص اس کے لیے دنیا کا آخری شخص ہو۔ اس کی بے چینی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھڑتی ہی جا رہی تھی۔

"فار گاڈ سیک جیا۔ بیٹھ جاؤ یہاں آرام سے کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو؟ ابھی ڈاکٹرز آ کر کوئی اچھی خبر ہی سنائیں گے۔" راہداری میں رکھے بینچ پر بیٹھے بالاج نے کوئی تیسری دفعہ جیا کو ٹوکا تھا جو گھن چکر بنی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

"جج۔جی۔" کہتی وہ بھی بالاج کے ساتھ ہی کچھ دوری پر بیٹھ گئی۔ کچھ گھنٹے پہلے ہی وہ اس اینجل کو خون دے کر آئی تھی کمزوری کے باوجود وہ اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی

"نا جانے کون ہے یہ اس کے پاس سے بھی کوئی چیز نہیں ملی جس سے ہمیں اندازہ ہو سکے کہ یہ کون ہے نا نام نا پہچان۔۔۔ ایک اجنبی جو خدمت خلق کے لیے تم لوگوں کی مدد کو پہنچ گیا۔" بالاج چاہنے کے باوجود بھی اس کے بارے میں کوئی جانت کاری نہیں لگا پایا تھا۔

"میں جانتی ہوں اسے اور وہ کوئی اجنبی نہیں ہے اینجل ہے وہ۔ اور۔۔" بے دھیانی میں جیا یہ سب بالاج کے سامنے بول گئی اس بات کا احساس بعد میں ہوا تھا اسے اگر جو بالاج نے اس کی بابت مزید پوچھ لیا تو وہ کیا بتائے گی کہ جو دن کی روشنی میں اسے بچانے کو آیا تھا وہ رات کے اندھیرے میں بھی اس کی مدد کے لیے پہنچا تھا اسے اس بھیڑیے سے بچانے کو۔

"اینجل یہ کیسا نام ہے کیا تم واقعی جانتی ہو اسے۔؟" بالاج نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"نن۔ نہیں بالاج میرا مطلب تھا کہ وہ اینجل ہی تو ہے ایک فرشتہ جو ہماری مدد کو پہنچ گیا اور ویسے بھی سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو وہ شخص اجنبی کیسے ہوا۔" جیا کی بات پر بالاج ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ تو مطلب وہ بات بدل گئی تھی لیکن کیوں خیر اسے کیا۔ یہی سوچ کر وہ پُر سکون ہوا تھا۔

"مسٹر بالاج سکندر۔۔" ڈاکٹر کی آواز پر جیا اور بالاج اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"جی۔ ڈاکٹر کوئی اپڈیٹ۔"

"دیکھیں میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ نے پیشنٹ کو لانے میں دیر کر دی تھی اس کے باوجود ہم نے ان کی جان بچالی ہے مگر۔۔" ڈاکٹر کے توقف کرنے پر جیا کی سانسیں سینے میں اٹکی تھیں بے اختیار اس کا ہاتھ بالاج کے کندھے تک رینگ گیا جیسے سہارے کی ضرورت ہو ورنہ وہ ڈھے جائے گی۔

"مگر کیا ڈاکٹر۔۔" ایک نظر جیا کو دیکھتے بالاج نے سخت لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا جو بلاوجہ ہی پریشانی بڑھا رہے تھے۔

"مگر یہ مسٹر سکندر کہ اگلے چند گھنٹے ان کے لیے خطرہ کے ہیں اگر انہیں ہوش نا آیا تو وہ کومہ میں بھی جاسکتے ہیں ایز آئی سیڈ آپ نے دیر کر دی تھی۔" ڈاکٹر ان کے سروں پر دھماکہ کرتے وہاں سے چلے گئے تھے جیا بے اختیار بینچ پر بیٹھ گئی تھی بالاج کو اس کی کنڈیشن حیرت میں مبتلا کر رہی تھی بھلا ایک اجنبی کے لیے خیر یہ لڑکیاں اور ان کے نرم دل۔۔۔

بالاج سر جھٹکتے جیا کو حوصلہ دینے لگا جو میڈم اب آنسو بہانے لگ گئی تھیں

تنگ تاریک کوٹھری میں دروازے کو جا بجا پیٹتا وہ کم سن بچا۔ ایک سکول کے باہر وہ ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑے کھڑا تھا اگلے منظر میں وہ گولی چلا رہا تھا ٹھاہ اور گولی پاس کھڑے بندے کے بازو میں دھنستی چلی گئی۔ اب کہ وہ بھاگ رہا تھا دور بہت دور اور ایک بار پھر سے وہ تنگ و تاریک کوٹھری۔ ایک مانوس سی نسوانی آواز۔ تیزاب کی بدبو۔ ایک چھوٹا سا بچہ اور سارے منظر اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو رہے تھے اور پھر گولی کی ٹھاہ کی آواز سے اسے لگا کسی نے اسکا بایاں حصہ تن سے جدا کر دیا ہو اور اسکی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی تھی۔

سب سے پہلے اس کی نظر چھت سے لٹکتی ان سرجیکل لائیٹس پر گئی تھی اور پھر پوری نظر ایک کمرے میں گھومی تو اسے ایک ایک کر کے سب یاد آیا تھا سر بھاری ہونے لگا تو اسنے واپس پلو پر ٹکا دیا کوئی اس کے پاس آیا تھا اور اسکی بائیں آنکھ کھول کر چیک کی یہی عمل دوسری آنکھ پر دوہرایا اور پھر اسے آواز آئی تھی اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے وہ ہلکا سا سر ہلا گیا۔

"کیا آپ کسی سے ملنا چاہتے ہیں۔؟" دوبارا آواز آئی تو اسنے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

سر میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی تھی اور پھر اسے اپنے بازو میں کوئی سوئی سی چبھتی محسوس ہوئی۔

"سسٹر میں نے انہیں انجیکشن لگا دیا ہے نا قابل برداشت تکلیف سے انہیں چھٹکارا حاصل ہو گا اور جب یہ ہوش میں آئیں گے تو قدرے بہتر محسوس کریں گے۔ اب آپ زرا انہیں دیکھیں میں باہر انکے لواحقین کو دیکھ لوں۔" بوٹوں کی ٹک ٹک سے اسے وہ ڈاکٹر دور جاتا محسوس ہوا۔ انجیکشن لگنے پر اگر وہ ہوش میں ہوتا تو یقیناً یہ ڈاکٹر اوپر پہنچ چکا ہوتا۔ آہستہ آہستہ وہ غنودگی میں جاتا گیا اور پر سکون ہو گیا۔

"مسٹر سکندر۔۔۔ پیشنٹ کو ہوش آگیا ہے۔۔" ڈاکٹر کی آواز پر جیا نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا ایک نظر سامنے لگی وال کلاک کو دیکھا جو رات کے دو بجا رہی تھی بلآخر اسے پورے چودہ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا تھا۔ بالاج اب اٹھ کر ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا جبکہ وہ تشکر سے سر پیچھے بینچ پر ٹکا گئی۔

ایک باغی آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر سرخ عارضوں پر بہہ نکلا کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا۔

"جیا اٹھو گھر چلیں۔" بالاج نے اس کے قریب آتے سائیڈ سے اپنا کوٹ اٹھایا آنکھیں واضح رت جگے کی نشاندھی کر رہی تھیں جبکہ جیا تو پھر کچھ دیر کے لیے سو گئی تھی اور وہ ایک پل بھی نہیں سو سکا کہ محترمہ انہیں کے کاندھے پر سر رکھے سو رہی تھیں اچھی بات تھی کہ وہ تھوڑی دیر آرام کر لیتی اس لیے بالاج نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔

"لیکن وہ اینجل اس سے تو مل لیں ہم۔" نا سمجھی سے اس کی جانب دیکھا کہ اتنی دیر اسکے ہوش میں آنے کا انتظار کیے بغیر کیسے بغیر ملے ہی چلیں جائیں۔

"اس اینجل نے کسی سے بھی ملنے سے منع کر دیا ہے اور ویسے بھی ہوسپٹل انتظامیہ خود اس کے لواحقین ڈھونڈ لے گی اب چلو گھر سب پریشان ہو رہے ہوں گے ڈیڈ کی بھی بہت کالز آچکی ہیں۔" ہاتھ میں موبائل نکالتے اس نے نمبر ملا کر کان سے لگایا دوسری جانب بیل جا رہی تھی لیکن کال ڈراپ ہو گئی لگتا وہ سو گئے تھے

"چلو۔" بالاج کے دوبارا کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے آگے آگے چلنے لگی ہسپتال میں دن کے برعکس اس وقت خاموشی تھی لیکن دور کسی وارڈ سے کسی کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں اس نے کانوں پر ہاتھ جما لیے اور تیز تیز قدم لیتی وہ ہسپتال کا دروازا کھول کر باہر نکلی

تو اسے احساس ہوا کہ وہ بنا کسی شال اور دوپٹے کے تھیں اور رات کے اس وقت ماحول کی خنکی بہت حد تک بڑھ چکی تھی جسم کو ٹھر ٹھرا دینے والی ہوا نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تو وہ ہاتھوں سے اپنے شانے تھام گئی جیسے ٹھنڈ سے بچنے کی ترکیب آزمائی ہو۔

ایک نظر مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ دروازا کھول کر باہر آگیا تھا ایک بازو پر کوٹ ڈالے۔

جیا کے اندر شدت سے خواہش جاگی کہ وہ کوٹ خود پہن لے اور اس ٹھنڈ سے بچ جائے

بالاج اس سے دو قدم کی دوری پر رک گیا اور اس سے پہلے وہ دوبارا اپنا رخ موڑتی بالاج نے جیسے اس کی دلی خواہش پر لبیک کہتے اپنا کوٹ اس کے شانوں پر پھیلایا تھا جیا نے چونک کر اسکی جانب دیکھا اور کوٹ پر اپنی گرفت مظبوط کر لی اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ وہ بالاج کے اتنا قریب کھڑی ہے اگر وہ سانس بھی لیتی تو وہ باخوبی سن سکتا تھا۔

بالاج نے ایک نظر اس کے جھکے سر کو دیکھا دروازے کے اس پار بالاج نے اس کا کانپنا اور پھر شانوں کو تھامنا دیکھ لیا تھا تبھی وہ اس پر اتنی عنایت کر گیا اس ایک پل میں ہی بالاج کی نظریں الجھ کر اسکے بھاری پپوٹوں پر گئیں اور وہ نظریں چرا کر اس سے دور ہٹ گیا۔

"چلو۔" یک لفظی کہتا وہ تیز تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھا تھا جیا ہوش کی دنیا میں واپس آتی اس کے پیچھے تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں گئی۔

وہ گاڑی باہر نکال رہا تھا جیا بھی جا کر اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

اور پھر واپسی کا سفر شروع ہوا تھا اس کا دل بار بار اس اینجل کی جانب جا رہا تھا جو شاید اسے جانتا بھی نہیں تھا اگر وہ اسے جانتا نہیں تھا تو اس کی مدد کو کیوں پہنچ جاتا تھا

"وہ چور نہیں تھے۔" گاڑی کی خاموش فضا میں اس کی آواز گونجی تھی گاڑی چلاتے بالاج نے اسے دیکھا اور پھر نظروں کا زاویہ بدل لیا

"میں سمجھا نہیں۔ اگر وہ چور نہیں تھے تو پھر؟؟" بالاج کے کہنے پر جیا نے اُسکی جانب اپنا رخ مورا

کندھوں پر پڑا کوٹ درست کیا

"میرا مطلب اگر وہ چور ہوتے تو ہمیں لوٹ کے جاتے جبکہ انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ وہ سب تو اپنے کسی مالک کا انتظار کر رہے تھے اور جب ان سے اینجل پر گولی چلی تو وہ وہاں سے بھاگ گئے یہ کہہ کر کے ان کا مالک آ کر دیکھ لے گا اور وہ گاڑی والا جو اسے ہوسپٹل لے کر آیا تھا مجھے تو وہ بھی مشکوک لگ رہا تھا۔"

"تم اپنا ریڈیو بند کر سکتی ہو پلیز۔ مجھے ڈرائیونگ پر فوکس کرنے دو پتا چلے کل کی ہیڈ لائنز کی سرخیوں میں ہمارا نام چل رہا ہو۔" بالاج نے تکان سے اس کی زبان بند کروائی چہرے پر دبا دبا غصہ تھا۔ جیا کی آنکھیں لبالب نمکین پانیوں سے بھر گئیں اتنی رات اور اوپر سے سنسان سڑک اگر وہ ڈر کی وجہ سے اس سے بات کر لیتی تو کیا ہو جاتا لیکن نہیں جیا سکندر تم کبھی بھی اس شخص کے لیے اتنی اہم نہیں ہو سکتی کہ وہ تمہاری فضول گوئی برداشت کرے۔ خود کو خود ہی جواب دیتی جیا نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا دل ہول رہا تھا لیکن پھر کیا ہوا وہ اس کے ساتھ تو تھا نا۔

انمول کب سے جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی بار بار داخلی دروازے کی جانب دیکھتی تو مایوسی کے سوا کچھ نا پاتی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں میں تمہارا۔" تبھی اس جانب سے ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کو آتا دیکھ وہ گویا ہوئی۔ مناسب قد کاٹھ اور ہلکے سانولے نقوش والا وہ نوجوان انہیں دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔

"معافی چاہتا ہوں بی بی جی دراصل ندیم کو اس بات پر قائل کرنا کہ میں سب سنبھال لوں گا بہت مشکل تھا وہ مجھ پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں وہاں سے بھیجنے میں تاخیر ہو گئی۔" وہ بولا۔

"اچھا چلو اب جلدی کرو اور سنو اگر کسی کو اس گھر میں بھنک بھی پڑی نا کہ میں ملک سے ملنے ہسپتال گئی تھی تو وہ پنجرہ دیکھ رہے ہو اس میں جو آفت ہے اس کی خوراک بنا دوں گی میں تمہیں سمجھے۔" سخت وارننگ جاری کر کے وہ بیک ڈور کی جانب بڑھی س کی پیچھے ہی مومن ابراہیم اپنی مسکراہٹ چھپاتا آیا تھا کہاں وہ شیر کے نام سے ہی کانپ جاتی تھی اور اب اسے دھمکیاں دے رہی تھیں انمول سے پہلے جا کر اس نے دروازا کھولا تو انمول نے اپنا قدم باہر نکالا مومن کو وہ دھمکی تو دے چکی تھی تو اس بات کی اسے پرواہ نہیں تھی کہ کسی کو خبر نا ہو جائے۔

"بی بی جی ایک بات بولوں میں آپ کو۔" گاڑی کا دروازا کھول کر وہ کھڑا اس سے بات کرنے کی اجازت چاہ رہا تھا انمول نے پچھلی سائیڈ پر بیٹھتے سر ہلایا۔

"وہ بھائی کو اچھا نہیں لگے گا آپ کا یوں اور وہ بھی اس وقت ان سے ملنے ہسپتال جانا میں بس ایسے ہی۔" انمول کی گھوری پر وہ کھسیانا سا ہو گیا

"میری بات سنو تم۔ میں انمول ملک کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔۔" سینے پر انگلی رکھے اسکا لہجہ کافی مغرور تھا

"لیکن اپنے باپ سے تو ڈرتی ہیں نا۔" مومن کی زبان بے ساختہ پھسلی تھی انمول کا چہرہ بے عزتی کی ہدت سے سرخ انار ہو گیا ٹھک سے دروازا پکڑ کر بند کیا دل تو چاہ رہا تھا اس بندے کو واقعی اس شیر کی کچھار میں پھینک دے لیکن دماغ نے نفی کی انمول ملک اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہارے ملک تک جانے کے سارے راستے مسدود ہو جائیں گے

مومن تو اس کے ری ایکشن پر بوکھلا ہی گیا اور فوراً اگلی سیٹ سنبھال کر گاڑی ہسپتال کے رستے پر ڈال دی۔ دل میں ایک ڈر تھا کہ اگر انہوں نے بھائی سے اس کی شکایت لگا دی تو نہیں نہیں وہ اس سے پہلے ہی معافی مانگ لے گا۔

وہ دونوں گھر پہنچے تو دور مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہو رہی تھیں رات کے خاموش ماحول میں حی یا الصلاۃ کی آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں جیا فوراً گاڑی سے اتر کر اندر بھاگی تھی بالاج کا کوٹ ابھی تک کندھوں پر تھا اس سے پہلے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں جاتی بالاج کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"جی۔" سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو داخلی دروازہ بند کرتا مڑ رہا تھا

"کھانا گرم کر کے دو بھوک لگی ہے مُجھے۔۔" یہ بات تو سچ تھی کہ کل دوپہر سے اس نے کچھ کھایا نہیں تھا اس لیے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے لیکن اگلا لمحہ حیران کن تھا۔

"سوری خود ہی کر لیں کہ اگر میں نے کیا تو کیا پتہ صبح ہیڈ لائنز کی سرخیوں میں آپ کا نام آ رہا ہو جسے کھانے میں زہر ملا کر قتل کیا گیا ہو۔" وہ بولی

"واٹ!!!" بالاج کا صدمے سے منہ کھل گیا غصے کی شدید لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی نظریں گھما کر اسے دیکھا جو دروازے کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔ بالاج سکندر کی انا کو کبھی یہ گنوارا نہیں کرتا تھا کہ وہ کل کی لڑکی اس کی یوں منہ پر بے عزتی کر جائے لیکن آج اسے جیا پر نہیں بلکہ خود پر غصہ آ رہا تھا اس نے جیا کو بولا ہی کیوں۔ ایک نظر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ خود کے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے کیا صحیح کیا اس نے بالاج سکندر تم یہی ڈیزرو کرتے ہو کہ پہلے اسے اتنی جھاڑ پلائی اور اب اسی سے کام کہہ رہے تھے۔ سر جھٹکتا وہ کچن کی جانب بڑھ گیا۔

اوپر جیا سکندر دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دروازے سے لگی کھڑی تھی دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ کس قدر ہمت سے یہ ایک جملہ بالاج کو کہہ کر آئی تھی یہ وہی جانتی تھی اور ایک بات تو طے تھی کہ جیا سکندر اگلے

ناجانے کتنے دنوں تک اس کا سامنہ نہیں کر سکتی تھی ایک گہرہ سانس بھر کر آگے بڑھنا چاہا تو کندھوں پر ڈلے کوٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی

کالر سے پکڑ کر اسے ناک کے قریب کیا تو مہنگے کلون کی دلفریب خوشبو اس کے اعصاب پر بیٹھتی اسے پر سکون کر گئی۔ اس خوشبو نے پچھلے دو گھنٹوں سے اس کے حواس معطل کیے ہوئے تھے کہ اگر وہ بالاج کے سامنے مزید کچھ دیر رکتی تو یقیناً بے ہوش ہی ہو جاتی۔ اپنی حالت پر افسوس کرتے اس نے سامنے دیکھا منہا میڈم گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھیں جیا بھی سونے کے لیے لیٹنے لگی تو باہر چھٹتے رات کے اندھیرے کو دیکھ وہ واش روم کی جانب بڑھی آج ناجانے کتنے دنوں بعد جیا سکندر اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری لگانے لگی تھی۔

وہ وضو کر کے باہر نکلی تو دوپٹہ اسکارف کی شکل میں خوبصورت ہالے کے گرد بندھا ہوا تھا جائے نماز بچھا کر وہ نماز پڑھنے لگی اور جب دعا کی باری آئی تو وہ رک گئی۔ کیا مانگتی اپنے رب سے وہ رشتے جن کا ملنا اس کے مقدر میں نہیں تھا یا ان گناہوں کی معافی جو اس سے جانے انجانے میں سرزد ہو گئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہونے لگے کہ کوئی اس وقت اس کی آنکھوں میں دیکھتا تو ڈوب جاتا۔

"اے اللہ تعالیٰ میں آج تک آپ سے دعا میں سوائے مغفرت کے کچھ نہیں مانگا لیکن آج میں آپ سے اپنے لیے بہتر مانگتی ہوں تو تو سب کو نوازتا ہے نا تیرے خزانے میں دیر ہے اندھیر تو نہیں تو مجھے بھی خالی ہاتھ نا لوٹائیں میرے مولا مجھ سے جو گناہ سرزد ہوا ہے مجھے اس کی معافی دے دے میرے اللہ آپ تو غفور الرحیم ہیں۔۔" آج اس کی دعا طویل ہو گئی تھی۔ آنسوؤں نے بہہ بہہ کر گال بھگو دیے لیکن ایک بات جیا سکندر جانتی تھی کہ اس کے یہ آنسو رائیگاں نہیں جائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے آسرے کی ڈور تھامے لوگوں کو بے آسرا نہیں چھوڑتا۔

"بالاج تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو بیٹے اور واپس کب آئے ہو۔" ثانیہ بیگم صبح فجر کے قریب اٹھ کر کچن میں آئی تھیں جہاں بالاج ان کی جانب پشت کیے کھڑا کوئی کام کر رہا تھا

"جی مام ہم کچھ دیر پہلے ہی گھر آئے ہیں اور مجھے بھوک لگی تھی تو سوچا کچھ کھا لوں۔ بس اسی لیے کھانا گرم کر رہا تھا۔" بالاج ان کی جانب دیکھتے بولا

"تو تم کیوں کر رہے ہو جیا سے کہہ دیتے بلکہ چھوڑو وہ بھی تھکی ہوئی ہو گی تم ہٹو میں کر دیتی ہوں گرم۔" ثانیہ بیگم نے اس کے ہاتھ سے باؤل لیتے اسے پیچھے ہٹایا تو وہ بھی بنا کسی تردد کے پاس پڑے ٹیبل سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ثانیہ بیگم کھانا گرم کرنے لگیں۔ کھانا گرم کر کے انہوں نے بالاج کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔

"اب کوئی لے آؤ ایسی جو تمہارے سارے کام کرے اور تمہیں کسی بات کی ٹینشن نا ہو۔" اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے وہ بھی اس کے ساتھ ہی ایک کرسی نکال کر بیٹھ گئیں۔

بالاج ان کی اس بات پر سر جھٹک کر ہنس دیا

"آپ کو لگتا ہے کہ کوئی آنے والی میری ساری ٹینشنز ختم کر دے گی۔ نہیں مام جب وہ آئے گی تو مجھ پر زمہ داریوں کے بوجھ بہت بڑھ جائیں گے اور اگر اس نے آپ کے بیٹے کو اپنے قابو میں کر لیا تو؟" سنجیدگی ست کہتے آخر میں اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"بیٹا وہ تمہاری بیوی ہو گی تم پر ہم جتنا حق رکھتی ہو گی اور تم کب تک اس ناشکری لڑکی کا سوگ مناتے رہو گے کیا چار سال کافی نہیں ہیں اس کے سوگ منانے کو۔" ثانیہ بیگم کا تو جیسے دل ہی سکڑ گیا تھا کیسے وہ اپنی خواہش کو ہنس کر جھیل رہا تھا۔

"چار سال۔ چار صدیاں بھی بیت جائیں تو یہ دل کسی اور کا رکھا مرہم نہیں جھیل پائے گا بس یہ سمجھ لیں کہ آپ کے بیٹے کے غم کا مرہم اس وقت کے پاس نہیں ہے۔"

"وقت کے پاس ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے بالاج۔ اور جب تک تم موو آن نہیں کرو گے کیسے بھول پاؤ گے اسے۔" ثانیہ بیگم کی بات پر اس نے سنجیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا کیا اتنا آسان تھا اسے بھول جانا وہ وقت وہ لمحات جو اس کی سنگت میں گزرے تھے اور کیسے وہ اس کے پیار کو لات مار کر گئی تھی۔ آہ یہ سب آسان نہیں تھا کوئی بالاج سے پوچھتا تو وہ کہتا کہ مشکل کچھ بھی نہیں ناممکن سب کچھ ہے۔

"کھانا دینے کے لیے بہت شکریہ لیکن پہلے منہا کی رخصتی اور جیا کی شادی ہو جانے دیں اس کے بعد دیکھی جائے گی۔ اور ہاں وہ جو کچھ دن پہلے رشتہ بھجوایا تھا پھوپھو نے اپنے خاندان سے ان کو آنے کے لیے ہاں کہہ دیں۔" امید کی ڈور ثانیہ بیگم کے ہاتھوں میں تھماتے وہ وہاں سے واک آؤٹ کر گیا ثانیہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نا رہا تھا مکمل نا سہی اس نے نیم رضامندی تو دے ہی دی تھی۔

انہیں یقین تھا کہ ان کی آنے والی بہو ان کے بیٹے کو سمیٹ لے گی اور وہ اپنے سارے دکھ درد بھول جائے گا۔

"تم باہر ہی رکو۔ اندر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ہسپتال پہنچ کر وہ دونوں اپنے مطلوبہ روم نمبر تک آئے تھے۔

"سوری۔۔ بٹ اٹس مائی ڈیوٹی۔" مومن ابراہیم نے کہتے دروازا کھولا اور ایک قدم اندر رکھا۔ جبکہ اس کی بات پر انمول کا خون کھول اٹھا تھا۔

"ارے ے یہ کیا کر رہے ہیں آپ بھائی میں پکڑا دیتا ہوں۔" ملک کو ساتھ پڑے ٹیبل سے موبائل پکڑنے کی تگ و دو کرتے دیکھ مومن نے فکر مندی سے کہا۔ ملک اس کی اتنی فکر دیکھ کر مسکرا دیا اور تبھی نظر پیچھے پڑی تھی دروازے میں کھڑی وہ اپنی غزالی

آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے انہیں پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ملک نے خون آشام نظروں سے مومن کو گھوراوہ سٹپٹا کر سائیڈ پر ہو گیا۔

"سنا نہیں تم نے میں نے کہا تھا باہر ہی رہو تم "انمول ملک نے اسے باہر کا راستہ دکھایا لیکن مقابل کافی ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ مومن نے ملک کی طرف دیکھا اور اس کے ایک اشارے کی دیر تھی وہ چپ چاپ پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر طنزیہ آبرو اچکایا۔

" سمجھتا کیا ہے یہ خود کو۔"

"آپ کا غلام انمول بی بی۔"جواب ملک کی جانب سے آیا تھا

"ہنہ۔مالک کا وفادار ہونے کی ٹریننگ لو جا کر کہ کوئی اصول و قواعد سیکھو۔"تمسخرانہ لہجے میں نوکر کو اس کی اوقات یاد دلائی

"چلیں پھر چلتے ہیں۔"مومن کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی ہاتھ پکڑ کر لے جائے گا اسے۔

"کہاں"انمول نے اس کی جانب دیکھا۔

"ٹریننگ لینے۔ آپ کو بھی ضرورت ہے نا ٹریننگ کی اپنے باپ سے وفادار ہونے کی۔"مومن کہتے ہوئے اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

عمر میں فرق کے برعکس مومن کا قد اس سے تین انچ لمبا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں گاڑے وہ اس کے جواب کا منتظر تھا انمول نے اس کی آنکھوں میں دیکھا لیکن کچھ تھا وہاں جو اسے بے چین کر گیا جیسے کوئی گہرا راز کوئی دفن داستان۔ ٹک ٹک ٹک لمحے سرکتے گئے ان کی محویت میں خلل ملک کے کھنکارنے نے ڈالا تو انمول اس کی جانب متوجہ ہوئی اور مومن ابراہیم دبے قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

آنکھوں میں خفگی لیے انمول نے ملک کو گھورا

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر ماموں کو پتا چل گیا تو اچھا نہیں ہو گا آپ کے اور میرے ہم دونوں کے لیے۔"ملک نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور موبائل پر انگلیاں چلانے لگا۔

"چپ کرو تم مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے میں اپنا اچھا برا جانتی ہوں۔"

"پھر تو آپ مجھے بھی جانتی ہوں گی"طنزیہ لہجہ انمول نے خود کو مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔ کیوں وہ انجان بنتا تھا اس سے اس کی دلی کیفیت سے۔

"اچھے سے جانتی ہوں تم حاکم ہو۔"پاس پڑی کرسی اٹھا کر اس کے زخمی بازو کے طرف رکھی اور اس پر براجمان ہوئی۔

"انمول ملک کے دل کے حاکم "اس کا بازو اپنی نرم۔ گرفت میں لے کر معائنہ کرنے لگی۔ اور تبھی ایک جھٹکے سے اس نے اپنا بازو چھڑایا اور درد کی ایک شدید لہر اٹھی تھی اس کے بازو میں وہ کراہتے ہوئے بیڈ پر سر ٹکا گیا آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"کون سا دو سو چالیس واٹ کا کرنٹ لگا ہے تمہیں میرے چھونے سے۔" دانت پیستے اس کے سامنے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ پلیز جائیں یہاں سے اور آئیندہ میرے ساتھ ایسی بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ خدا کی قسم لحاظ بھول جاؤں گا۔" انکھکے اشارے سے باہر کی جانب اشارہ کیا جبکہ ایک ہاتھ زخمی بازو کو سہارا دیے ہوئے تھا۔

"بکواس۔ تمہیں میری باتیں بکواس لگ رہی ہیں۔ کتنی دفعہ کہوں کہ اس دل پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے ملک یہ کم بخت خود بخود تمہاری جانب راغب ہو رہا ہے میں کیسے روکوں اپنے آپ کو کوئی ایک ترکیب بتا دو یا مجھے میری محبت کا جواب محبت سے دے دو۔" آج وہ ہر بات کلئیر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مکمل بات کرنا تھی آج اس نے چاہے پھر اپنا دل ہی کیوں نا مارنا پڑے۔

"آپ کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔ سوائے اس کے کہ میری محبت آپکے پیروں کی زنجیر بن سکتی ہے آپ کو ہمیشہ کے لیے قید کر سکتی ہے آپ کو جانا ہو گا انمول آزادی آپ کی منتظر ہے۔" ملک کے الفاظ نے اُس کو تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا تھا غصے کی ایک شدید لہر اس کے وجود میں دوڑی تھی

"مجھے تمہاری محبت کی قید میں رہنا ہے آگ لگے اس آزادی کو۔ سنا تم نے۔" وہ غرائی تھی۔ اس کی آواز باہر بینچ پر بیٹھے مومن ابراہیم کے کانوں تک باخوبی پہنچی تھی اور اس کا پورا وجود جیسے کان بن گیا نمک کی کان جسے انگلی کے پور سے چھونے پر بکھر جانے کا ڈر ہو۔ ملک نے انمول کی جامب دیکھا کیا نہیں تھا ان نظروں میں۔ افسوس دکھ درد مان ٹوٹنے کا غم اور سب سے بڑھ کر اس کی عزت کا احترام۔ انمول ٹکر ٹکر اس کی نظروں میں دیکھے گئ

"انمول ملک۔ یہ جو محبت ہے نا آسیب کی طرح ہے لے ڈوبے گی آپ کو۔ آپ کو میری بات بے معنی لگ رہ ہو گی لیکن یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ محبت ہی ہے جو آج میں اس حال میں ہوں۔ اس زندگی سے پیچھا چھڑانا مشکل نہیں ناممکن کام ہے مجھے اس گناہوں سے محض ایک چیز جدا کر سکتی ہے اور وہ ہے میری یا میرے دشمنوں کی موت۔۔۔" ایک نظر پیچھے دیکھا تھا دروازے میں استادہ مومن ابراہیم کی مثال اس ویران میدان کی سی تھی جو جنگ ہار جانے کے بعد خالی ہو۔ اس نے دیکھا مومن کی آنکھوں میں شعلے تھے سب کچھ تہس نہس کر جانے والے شعلے جنہیں محض ایک چنگاری کی ضرورت ہو اور وہ پورے میدان کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ ملک نے اپنی نظروں کا رخ انمول ملک کی جانب کیا جو خاموشی سے لب کاٹتے اپنے آنسو اپنے اندر اتار جانے کی ہمت خود میں مجتمع کر رہی تھی۔

"کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو آپ کی محبت کی بہت قدر ہے مجھے لیکن میں آپ کو خود کے ساتھ برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا میں ایک بھیڑیا ہوں اور ایک بھیڑیا اپنے ماں باپ سے وفادار ہوتا ہے مجھے اس وفاداری کی قیمت چکانی ہے انمول ملک اور آپ

بھی خود کو متوقع حالات کے لیے تیار کر لیں کہ میں بھی ایک "ملک" کا خون ہوں اور بقول آپ کے والد اور میرے ماموں ملک کبھی اپنا بدلہ نہیں چھوڑتے۔ آپ جائیں انمول سورج طلوع ہونے میں کچھ ہی لمحات باقی ہیں اس طلوع آفتاب کے بعد آپ کو ایک نئی زندگی شروع کرنا ہو گی۔ جایئے ماموں کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔" انمول نے پاس پڑا اپنا بیگ اٹھایا لیکن اس کا بوجھ اس بوجھ سے بہت کم تھا جو آج اس کے دل پر پڑا تھا کتنی آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ خود کو تیار کر لیں وہ کیسے تیار کرے گی خود کو کتنا ظالم تھا وہ اسے موت کی وعید سنا گیا تھا لیکن یہ بھی تو سچ تھا نا کہ کہنے والے سے زیادہ سہنے والے پر گزرتی ہے اور یہ انتہا تھی انمول ملک کے عشق کی انتہا۔ اپنے ہاتھ پر اسے کسی کا لمس محسوس ہوا تھا پلٹ کر دیکھنا آج اسے دنیا کا مشکل ترین کام لگا لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ ملک کی گرفت میں تھا نظریں اوپر کی جانب اٹھتی گئیں اور اگلے ہی لمحے غزالی آنکھوں کا گرین ہیزل آنکھوں سے زوردار تصادم ہوا۔ ملک نے انمول سے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

"آپ بہت قیمتی ہیں انمول خود کو یوں بے مول نا کریں۔" وہ جو کچھ اور سننے کا ارادہ رکھتی تھی ملک کے الفاظ اس ارادے پر پانی پھیر گئے اس نے زور سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا

کتنی آسانی سے اس نے اسے بے مول کر دیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ انمول ہے قیمتی ہے۔ جدائی میں ملنے والا غم وفادار ہوتا ہے عمر بھر ساتھ نبھاتا ہے یہ بات آج انمول ملک پر ثابت ہو گئی تھی

وہ جسے کبھی ناہارنے کا دعویٰ تھا وہ ہار گئی تھی آج ہاں وہ ملک کی محبت میں اپنا سب کچھ ہار گئی تھی اپنا دل ملک کی محبت کی قید میں دے کر وہ آزادی کی جانب چل دی تھی۔

ملک نے ایک نظر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا اور دوسری نظر دروازے پر گئی جہاں سے اس کا آنچل غائب ہوا تھا۔

اور اگلے ہی لمحے درد کی ایک شدید لہر اس کے سینے میں اٹھی تھی مومن بھاگ کر اس کے قریب آیا

دروازے کی دہلیز پار کرتی انمول نے شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ ایک بار صرف ایک بار وہ اپنے خالی ہاتھ کو دیکھ کر اسے پکارے گا لیکن وہاں موت کا سا سناٹا تھا نا کسی نے پکارا اور نا اس کے کانوں نے کسی کی پکار سنی وہ آگے بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ اس کوریڈور سے باہر نکلی اور وہ ساکت رہ گئی ہسپتال کے داخلی دروازے سے جہانداد ملک اپنے پورے رعب و جلال کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے ان کے ساتھ ان کا خاص بندہ ندیم بھی تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل پائی۔۔ ہلتی بھی کیوں آنے والی ہستی اسے دیکھ چکی تھی

جہانداد ملک کا چہرہ غصہ ضبط کرنے سے سرخ ہو چکا تھا انمول کے قریب آ کر وہ رک گئے بمشکل خود کو کسی بھی اقدام سے باز رکھا۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں۔۔" دھیمی آواز میں غراتے ہوئے انہوں نے اسے بازو سے دبوچ لیا

انمول کی سانسیں اٹک کر رہ گئیں اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ کبھی یوں اس کا مقابلہ ان کے روبرو کھڑے ہو کر ہو گا۔ اس نے اپنے پیچھے دیکھا شاید کوئی آ جائے مومن یا ملک لیکن نا کسی کو آنا تھا اور نا آیا اس نے جہانداد ملک کو دیکھتے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے لیکن اس کے لفظوں کا گلا گھونٹتے جہانداد ملک نے جارحانہ انداز میں اسے اپنے ساتھ گھسیٹا تھا اور لا کر باہر کھڑی گاڑی میں پٹکا۔

ندیم بھی ان کے پیچھے آیا تھا۔

"کچھ بھی کرو اگلے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ملک کو حویلی پہنچاؤ۔" ندیم کو حکم جاری کرتے انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ندیم واپس اندر چلا گیا۔

"بھائی کیا ہوا آپ کو آپ ٹھیک ہیں۔؟" مومن اس کے پاس آ کر استفسار کرنے لگا جو ایک ہاتھ سے اپنا سینا مسل رہا تھا۔ لیکن درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جج۔ جاؤ انمول بی بی کو گھر چھوڑ کر آؤ۔ میں نے کہا جاؤ مومن جاؤ یہاں سے۔" اس کا ہاتھ دور جھٹک کر اس نے اسے اس دشمن جان کے پیچھے جانے کا بولا تھا۔ مومن تیر کی تیزی سے باہر نکلا لیکن اس سے پہلے وہ ڈاکٹروں کے عملے کو اندر بھیج چکا تھا۔

باہر پورا کوریڈور سنسان تھا جیسے کوئی یہاں آیا ہی نا ہو اس نے باہر جا کر لیکن وہاں نا انمول تھی نا انمول کی زات۔ بگڑے تنفس کے ساتھ وہ اندر آیا تھا جب اس کے پیروں کو بریک لگی سامنے ریسیپشن ڈیسک پر ندیم جھکا اس لڑکے سے بات کر رہا تھا مومن کو سارا کھیل پل میں سمجھ آ گیا۔ اپنا سر پیٹتا وہ اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر ملک کو دیکھ رہے تھے وہ بھی ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ان۔ انہیں کیا ہوا ہے۔" سرسراتی آواز میں لڑکھڑاہٹ واضح تھی۔

"پینک ڈس آرڈر۔" ڈاکٹر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا

"وہ کیا ہوتا ہے۔؟" اب اس مارشل آرٹس میں رہنے والے کو کیا معلوم پینک ڈس آرڈر کیا تھا۔

"یہ بھی انزائیٹی کی ایک قسم ہے۔ جس میں بار بار پینک اٹیکس آتے ہیں اور انسان کو لگتا ہے اب وہ صورتحال پر قابو نہیں پا سکتا عموماً کسی شے کے چھن جانے یا دور ہو جانے کے بے جا خوف کی وجہ سے انسان کے سینے میں درد شروع ہوتا ہے جسے پینک ڈس آرڈر کہا جاتا ہے۔ ویل اب یہ ٹھیک ہیں۔" ڈاکٹر مومن کو تفصیل سے سمجھانے کے بعد باہر نکل گئے۔ اور وہ جو آنکھیں موندے لیٹا تھا پٹ سے آنکھیں کھول کر مومن ابراہیم کی جانب دیکھا مومن اپنا سر جھکا گیا

"کیا ہوا؟" وہ بولا

"بب۔ بھائی جب میں باہر گیا تو انمول بی بی وہاں کہیں نہیں تھیں ا۔ اور میں نے ندیم کو ریسیپشن ڈیسک پر دیکھا تھا یقیناً۔" مومن نے بات ادھوری چھوڑ دی اب وہ اتنی سی بات تو سمجھ ہی سکتا تھا۔

"شٹ۔ مومن۔ مومن تمہیں انہیں یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔" ملک نے ماتھا مسلتے اسے بولا وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

"معاف کر دیں بھائی آپ اچھی طرح جانتے ہیں وہ کسی کی نہیں سنتی اور تو اور انہوں نے یہ بھی بولا کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتی تو میں کیسے حکم عدولی کر سکتا تھا" معصومانہ لہجے میں انمول کی بات ملک کے گوش گزار کر وہ اس کے قریب آیا اور پاس پڑی دوائیوں کو ٹٹولنے لگا

"مومن۔ جلدی سے تیاری کرو ملک کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے" ندیم نے کمرے میں داخل ہوتے کہا اور وہ جو اپنے کام میں مشغول تھا پلٹ کر اسے دیکھا وہ چہرے پر سپاٹ تاثرات سجائے ملک کو گھور رہا تھا جو رخ موڑے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"لیکن سر آپ ان کو ایسے نہیں لے جا سکتے ان کی کنڈیشن سٹیبل نہیں ہے۔ آپ۔" ایک نو عمر نرس اندر داخل ہوا اور ندیم کو بولتے ہوئے ملک کی حالت سے آگاہ کرنے لگا۔

"تمہیں ہمارے کام میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔۔" قمیض کی جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور کندھا تھپتھپاتے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کھسیانا ہو کر باہر نکل گیا۔

مومن نے سر جھٹکا آج کل تو ہر طرف پیسہ بولتا ہے امیر ہو یا غریب پیسے کے پیچھے سب پاگل ہیں۔

اس نے جلدی سے دوائیاں سمیٹیں اور ملک کو سہارا دیے باہر چلا گیا۔

صبح آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی تھی آنکھیں مسلتے وہ اٹھ بیٹھی۔ منہا وہاں کہیں نہیں تھی یقیناً اب تک نیچے چلی گئی ہو گی۔ وہ اٹھ کر باتھروم میں بند ہو گئی۔

سنگھار میز کے سامنے کھڑے بالاج سکندر کی سوچیں ابھی تک رات والے واقع میں الجھی ہوئی تھیں۔ سفید شرٹ پر سیاہ پینٹ پہنے وہ کسی ریاست کا شہزادہ معلوم ہوا تھا۔ اوپر سے غضب اس کی آنکھیں جو سنہری کانچ سی تھیں کہ کوئی بھی اسے اس حالت میں دیکھ لیتا تو دیوانہ ہو جاتا۔ ترچھی مسکان ہونٹوں پر سجائے وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ جیا نے بالکل درست کہا تھا کہ وہ لوگ کوئی لٹیرے نہیں تھے بلکہ انہیں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا تھا لیکن ان کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ انہی تانوں بانوں میں الجھتے پیاس پڑی ورسٹ

واچ اٹھا کر کلائی میں باندھی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر گئیں جہاں آٹھ بج کر تین منٹ ہو رہے تھے وقت بہت کم تھا نو بجے میٹنگ شروع ہو جانا تھی۔

جیا باتھروم سے باہر نکلی تو گلابی رنگ کی قمیض شلوار زیب تن کیے ہوئے تھی۔ وہ آ کر سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی نظر بھر کر خود کو دیکھا ایک تو وہ اتنی خوبصورت تھی اور اوپر سے اس کے سیاہ لمبے بال اس کے حسن کو دلکش بنا رہے تھے دل ہی دل میں اس نے خود پر آیت کا ورد پڑھ کر پھونکا تھا کیا معلوم اس کی نظر ہی نا لگ جائے۔

بیڈ پر رکھا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلا لیا۔ اور قدم باہر کی جانب بڑھائے تبھی وہ ٹھٹھک کر رکی سامنے صوفے پر بالاج کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا لے جا کر اسے واپس کر دے لیکن پھر اپنی ہی سوچ کی نفی کر دی نہیں اگر اس نے اس کو ڈانٹ دیا تو

"سارا موڈ غارت کر دیں گے وہ۔" لیکن پھر اپنے دل کی سنتی وہ کوٹ اٹھاتی بالاج کے کمرے میں چل دی۔

خود پر اچھے سے پرفیوم کا چھڑکاؤ کر کے بالاج نے اپنا کوٹ اٹھایا اور دروازے کی جانب آیا

ہینڈل گھمایا، دروازا کھولا اور سامنے ہی اس حسن کی دیوی کو منتظر پایا جیسے وہ اس کے دروازہ کھولنے کے انتظار میں کھڑی ہو۔

"کیا ہے یہ۔؟" بالاج نے آئبرو اچکاتے اس سے پوچھا جو اس کا کوٹ دونوں ہتھیلیوں پر جمائے اس کی جانب کیے ہوئے تھی

"جو رات آپ نے مجھ پر عنایت کی تھی اس کے لیے شکریہ اور یہ رہا آپ کا کوٹ قسم سے میں نے سنبھال کر رکھا تھا۔" وہ بولی

تو اب بھی سنبھال کر رکھ لو۔" ہونٹ پھیلاتے اس نے اسے ایک نئے کام سے نوازا

"ہیں۔۔؟؟ کیا مطلب رکھ لوں۔" جیا کو سمجھنے میں دقت ہوئی تھی

"مطلب یہ ہے" جیا سکندر" کہ یہ کوٹ تم واپس لے جاؤ کچرے میں پھینکو یا آگ میں جھونک دو لیکن اب مجھے یہ نہیں چاہیے۔" ہاتھ میں پہنہ گھڑی پر نگاہ دوڑائی یہ لڑکی اس کا قیمتی وقت ضائع کر رہی تھی

"لیکن کیوں مم۔ میرا مطلب اچھا بھلا کوٹ پھینک دوں ایسے کیسے؟" حیرانی سے آنکھیں پھیلائے جیا نے پوچھا بالاج نے اس کی جانب دیکھا اس کی کاجل لگی سیاہ رات کی تاریکی سی آنکھیں غضب ڈھا رہی تھیں۔

"ایسے۔" بالاج نے کوٹ اس کے ہاتھوں سے چھینتے زمین پر پٹک دیا جیسے اچھوت ہو کوئی۔

"دیکھا تم نے اب یہ میرے کسی کام کا نہیں رہا جانتی ہو کیوں۔ کیونکہ بالاج سکندر کسی کی اترن نہیں پہنتا اور بیچارا یہ کوٹ ان فورچونیٹلی ساری رات تمہارے کاندھوں پر رہا ہے۔ اس میں تمہارے سینٹ کی خوشبو سما چکی ہے تو تمہیں کیوں لگا کہ میں اب بھی اسے واپس رکھ لوں گا۔ اب ہٹو میرے راستے سے کیوں بت بن کر کھڑی ہو۔" اسے سائیڈ پر کرتے اس نے قدم آگے بڑھائے چمکتے بوٹ کے نیچے کوٹ کا کنارا آیا تھا لیکن وہاں پر وا کسے تھی۔

"اور اگر کبھی زندگی میں۔۔۔۔"سیڑھیوں کی جانب بڑھتے بالاج کے پیروں کو بریک لگی تھی ایڑھیوں کے بل گھوما تھا وہ ایک ہاتھ ریلنگ پر جمائے

"میں کیا؟"استفسار کیا بے شک وہ اس کا وقت بہت برباد کر چکی تھی

" کبھی زندگی میں کسی اور شخص کی اترن آپ کے نصیب میں آئے تو۔تو آپ کیا کریں گے۔"جیا نے بہت سا تھوک نگلتے اس سے پوچھا بالاج مڑ کر اس کی جانب واپس آیا۔

"تو اس کی اوقات میری زندگی میں اس کوٹ کی طرح ہو گی۔پیروں میں روندے جانے کی اوقات کیونکہ بالاج سکندر مرنا تو قبول کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے شخص کی اترن کبھی نہیں۔"جیا کا دھیان اس کوٹ پر کروا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا باہر نکلتا چلا گیا۔

جیا نے سیڑھیوں کی جانب دیکھا اور پھر جھک کر کوٹ اٹھایا۔اس پر لگی نادیدہ گرد کو جھاڑا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"دیکھتے ہیں پھر بالاج سکندر کے تمہارا مان کب تک قائم رہتا ہے۔"کوٹ کو الماری میں ٹھونستے وہ بڑبڑا رہی تھی اچانک کسی شے کا گمان ہوا جیسے کوٹ میں کوئی چیز موجود ہو جیبیں ٹٹولتے اس کو اندرونی جیب سے ایک والٹ ملا تھا

جیا نے واپس رکھنا چاہا اسے ہنسی بھی آئی کہ اب وہ خود ہی اس کوٹ کو واپس لینے آئے گا بیچارا لیکن والٹ کو کھولے بغیر جیا سکندر کا گزارا ہی کہاں تھا اس لیے اسے کھول کر دیکھا

اے۔ٹی۔ایم کارڈ۔۔۔پیسے۔۔۔آئی ڈی کارڈ کے ساتھ کوئی ویزیٹنگ کارڈ بھی تھا لیکن وہاں کوئی اور شے بھی تھی جیا نے وہ پاسپورٹ سائز تصویر نکال کر دیکھی۔

شاک تھا یا حیرت کا جھٹکا جو جیا سکندر کو لگا تھا اس سے پہلے وہ مزید دیکھتی باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی جلدی سے والٹ واپس رکھتے وہ کوٹ الماری میں رکھنے لگی۔

بالاج سکندر کمرے میں داخل ہوا اور تیزی سے آ کر اس کے ہاتھوں سے کوٹ جھپٹا جیا دو قدم دور ہو گئی

"میری کچھ ضروری چیزیں تھی اس میں وہی چاہیے۔"والٹ نکال کر کوٹ واپس جیا کو پکڑاتے وہ جتنی تیزی سے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا

کھڑوس۔چنگیز خان۔"القابات سے نوازتی وہ کوٹ کو الماری میں رکھنے لگی۔

"ماما بہت بھوک لگ رہی ہے پلیز جلدی سے کچھ کھانے کو دے دیں آپ کو پتا ہے میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔" کچن میں داخل ہوتی جیا نے دہائی دی برتن دھوتی منہا نے پلٹ کر دیکھا اور ثانیہ بیگم جو کسی سے فون پر محوِ گفتگو تھیں انہوں نے بھی اسے گھوری سے نوازا تو وہ آرام سے منہ پر انگلی رکھے چلتی ہوئی منہا کے ساتھ آکر کھڑی ہو گئی۔

"کون ہے کال پر۔" مدھم آواز میں پوچھا کہیں ثانیہ بیگم کے کانوں تک آواز نا چلی جائے۔

"حسینہ آنٹی ہیں۔ اور تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے لڑکا دبئی میں سیٹل ہے بقول ان کے تم راج کرو گی راج۔" منہا نے بھی اسی کے انداز میں بات اس کے گوش گزاری

"واٹ!! پھر سے یار کیا ہے کوئی مجھے سکھ کا سانس کیوں نہیں لینے دیتا اور یہ نام کی حسینہ خود کے رشتے کروائے نا جا کر۔ جب دیکھو کسی نا کسی کو بلایا جا رہا ہوتا ہے مانو لڑکی نا ہو گئی بھیڑ بکری ہو گئی۔ بھئی آجاؤ اور بیاہ کر لے جاؤ۔" اب کی بار جیا کی آواز اونچی تھی یقیناً اس کی بات فون پر موجود ہستی کو بھی سنائی دی تھی اور ثانیہ بیگم جو اس کے سگھڑپن کی کتاب کھولے بیٹھی تھی دھری کی دھری رہ گئی کیونکہ دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی تھی۔

ثانیہ بیگم نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا جو زبان دانتوں تلے دبائے اب معصوم بن کر کھڑی ہوئی تھی۔

" صحیح کہتا ہے میرا بیٹا اس لڑکی کی زبان نان سٹاپ چلتی ہے نا موقع دیکھا نا محل شروع ہو جاتی ہے۔ کیوں مجھے ذلیل کروانے کا ارادہ ہے تمہارا۔۔" ثانیہ بیگم اس کے پاس آتے ہوئے بولیں اور جیا نے قدم پیچھے لینے چاہے لیکن ہائے رے یہ پھوٹی قسمت پیچھے تو شیلف تھی۔

"اور کیا کہہ رہی تھیں تم بھیڑ بکری تو بیٹا جی تیار ہو جائیں اسی بکری کے بیوپاری آرہے ہیں آج۔۔ کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے جیا ورنہ میں بہت سختی سے پیش آؤں گی۔" ثانیہ بیگم نے جیا کا کان پکڑ کر موڑا تھا لیکن اتنے زور سے نہیں جتنا وہ ڈرامہ کر رہی تھی۔

""سس۔ مما چھوڑیں یار کان جدا کرنے کا ارادہ ہے کیا افف درد ہو رہا ہے۔۔" سسکیاں بھرتی جیا نے اپنا کان ان کی ڈھیلی سی گرفت سے آزار کروایا منہا یہ شو پوری طرح انجوائے کر رہی تھی اس سب کے زیرِ اثر وہ کل ہوا واقع بھول چکی تھی۔

"ایک سیکنڈ نہیں لگاتی ہیں آپ اس چنگیز خان کی ماں بننے میں۔ نہیں کروں گی ناشتہ۔" جیا کان مسلتی جانے لگی

"منہا میرا ناشتہ روم میں لا دو قسم سے کان میں شدید درد ہو رہا ہے اور شاید میں آج آنے والے مہمانوں سے بھی نہ مل پاؤں۔۔۔" بغیر مڑے کہتی وہ بھاگ گئی ثانیہ بیگم نہ میں سر ہلاتی رہ گئیں تھی یہ لڑکی کبھی نہیں سدھر سکتی تھی۔

منہا بھی کھی کھی کرتی ناشتہ ٹرے میں لگاتی اس کے پیچھے چل دی۔

"با۔بابا سائیں میری بات تو سنیں آپ۔" گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے جہانداد ملک نے اس کی جانب کا دروازا کھولا تھا اور اسے گھسیٹ کر باہر نکالا

جس پر وہ دہائیاں دینے لگی تھی لیکن انہوں نے بھی آج نہ سننے کی قسم کھار کھی تھی اس کی چادر وہیں پورچ میں گر گئی اور دوپٹا ڈھلک کر شانوں پر بکھر گیا

"ان۔انمول بیٹا کیا ہوا صاحب آپ۔۔" ایک ادھیڑ عمر خاتون اس کو پکارتی ان کے پیچھے آئی تھی

دھاڑ سے انمول ملک کے کمرے کا دروازا کھولتے انہوں نے اسے اندر پٹخا تھا وہ ہتھیلیوں کے بل نیچے گری صد شکر کہ بیڈ کی پائنتی سے نہیں لگی تھی وہ۔

"کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔" ان کی دھاڑ حویلی کے کونے کونے میں پہنچی تھی اور جیسے ہر شے نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لو وہ ادھیڑ عمر خاتون جن کا نام شائستہ تھا وہیں رک گئیں اور جہانداد ملک نے کمرے کا دروازا اندر سے بند کر دیا۔

انمول اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی ہاتھ میں موجود بیگ بھی گر گیا آج وہ اپنے باپ کے روبرو کھڑی ہوئی تھی وہ باپ جس سے اس نے نظر اٹھا کر کبھی بات نہیں کی تھی۔

"چٹاخ" کی آواز سے لگنے والے جہانداد ملک کے تھپڑ نے اسے واپس زمین بوس کر دیا تھا۔اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون بہنے لگا۔

"کیا کرنے گئی تھی تم وہاں۔بولو جواب دو۔" بالوں سے پکڑ کر اس کے سر کو جھٹکا دیا انمول ملک نے ازیت سے آنکھیں میچ لیں۔وہ جانتی تھی زندگی میں کبھی نا کبھی یہ لمحہ ضرور آئے گا لیکن اس نے کبھی خود کو ان حالات کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔

"مم۔ملک سے ملنے اس کی خیریت دریافت کرنے گئی تھی میں وہاں بابا سائیں۔" ایک ہاتھ سے اپنے بال آزاد کروانے کی کوشش کرتے انمول نے جواب دیا۔لیکن گرفت بہت مضبوط تھی کیونکہ آج شاید جہانداد ملک کی آنکھوں میں خون سوار ہو گیا تھا۔

"ایک معمولی سے انسان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے جانا کم از کم جہانداد ملک کی بیٹی کو زیب نہیں دیتا۔" وہ اس کے منہ پر غرائے تھے اور انمول ملک کو اس لمحے سے نفرت ہوئی جب اس کا سامنہ ان سے ہوا تھا۔

"سچ سچ جواب دو کیا رشتہ ہے تمہارا اس بدزات کے ساتھ۔۔۔" اس کے بالوں کو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور اسے دور جھٹکا جس کی وجہ سے اس کا سر بیڈ کی پائنتی سے لگا تھا اور یہاں انمول ملک کی بس ہوئی تھی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"محبت کرتی ہوں میں اس سے اور وہ کوئی بدزات نہیں انمول ملک کی محبت ہے۔سن لیا آپ نے۔انمول ملک کی محبت اسے اس دنیا کا بہترین شخص بناتی ہے۔آپ کے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" انمول کے الفاظ نے جہانداد ملک کو پتھر کا بنا دیا تھا۔

وہ اس کے چہرے پر جھکے تھے۔

"تم نے بہت غلط کیا انمول ملک تمہیں محبت نہیں کرنی چاہیے تھی اور اس بدزات سے تو کبھی نہیں۔ کیا تم محبت کرتے ہوئے یہ بات بھول گئی کہ ملکوں پر محبت حرام کی گئی ہے۔" ایک ایک لفظ پر زور دیتے انہوں نے گویا انمول ملک کو یاد دلایا تھا

"محبت حرام اور حلال کا فرق نہیں دیکھتی۔" انمول ملک کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا چیخ چیخ کر دہائی دے رہا تھا کہ وہ اگلے سو جنم بھی ملک سے ہی محبت کرتی رہے گی۔

"چچ چچ۔ انمول ملک تمہاری سوچ محبت کے معاملے میں بہت غلط ہے۔ تم کبھی سمجھ ہی نا سکی کہ محبت کیا مانگتی ہے یہ محبت ہی ہے جو قربانی مانگتی ہے کبھی جان کی تو کبھی پالینے کی اور تمہیں بہت مبارک ہو تم پالینے کی قربانی دے آئی ہو۔ آئیندہ تم اس حویلی سے تو کیا اس کمرے سے بھی ایک قدم میری اجازت کے باہر نکالا تو تمہاری ٹانگوں کی گارنٹی نہیں دے سکتا میں۔۔۔" جہانداد ملک اپنا فیصلہ سناتے کمرے سے باہر نکلے انمول بھی ان کے پیچھے بھاگی تھی مبادا وہ دروازا بند ہی نا کر دیں۔

لیکن وہ دروازا بند کر چکے تھے

"بب۔ بابا سائیں آپ ایسے نہیں کر سکتے دروازا کھولیں بابا سائیں۔" دروازا پیٹتے اس کے ہاتھ درد کرنے لگے تھے کہ آج تک ایک سوئی بھی نا چبھی تھی اسے۔

"اگر میری اجازت کے بنا کسی نے اس کمرے میں جانے کی یا اسے کھولنے کی کوشش کی تو اپنے انجام کا زمہ دار وہ خود ہو گا۔" چابیاں ہاتھ میں بھینچے انہوں نے وہاں کھڑے تمام ملازموں کو خبر دار کیا تھا۔

شائستہ بی ایک جانب کھڑی آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ انہوں نے انمول کو بیٹی کی طرح پالا تھا اور اس وقت وہ ازیت میں تھی۔

"میں نے آپ سے ساری زندگی کچھ نہیں مانگا بابا سائیں۔" آگے بڑھتے جہانداد ملک کے قدم کمرے سے آتی انمول کی آواز پر تھمے۔ وہ رک گئے تھے جیسے اسے آج بولنے کا موقع دے رہے ہوں۔

"آج آپ میری ایک خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ کیسے باپ ہیں آپ۔ اس نے مجھے کہا کہ اس کی محبت مجھے قید کر سکتی ہے غلط وہ جھوٹ بولتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی محبت میرے جینے کی آخری وجہ ہے۔ اس کے بغیر انمول ملک کا وجود کچھ بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز میں درد تھا ایک آس تھی جہانداد ملک نے سختی سے اپنے خیالات کو ڈپٹا اگر ان کی بیٹی باغی ہو رہی تھی تو وہ اسے روکنے کی تدبیر بھی کر چکے تھے۔

"وہ کہتا ہے میں خود کو تیار کرلوں۔" جہانداد ملک کا وجود نمک کا مجسمہ بن گیا وہ جانتے تھے اگر انمول ملک نے آگے ایک لفظ بھی بولا تو وہ اپنے دماغ پر کنٹرول کھو دیں گے۔ وہ مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اندر جاری اس کی ہچکیوں کی آواز نے انہیں دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"خود کو پیش آنے والے متوقع حالات کے لیے تیار کرلوں کتنا ظالم ہے نا وہ میری سانسیں چھیننے کی بات اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی۔ لیکن یہ بات آپ کو خبر دار کرنے کی ہے کہ وہ بچہ جس نے آپ کی شاگردی میں اس دنیا میں قدم رکھا تھا نا وہ آج آپ کے مقابل آرہا ہے۔ آپ یہ بات کیوں بھول گئے بابا سائیں کہ فرعون کے محل میں پرورش پانے والا موسیٰ ہی اس کے زوال کا سبب بنا تھا۔۔" وہ چیخ رہی تھی اور آسمان کا موسم بدلنے لگا۔ ہر طرف گھٹائیں چھا گئیں جیسے تمام راز دفن کر دینا چاہتی ہوں۔ جہانداد ملک کے دل کی طرح سیاہ گھٹائیں۔۔

"آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ میں کیا چاہتی ہوں وہاج کیا چاہتا ہے خیر وہ تو خود آپ کے لائف سٹائل کی بھینٹ چڑھ گیا اس سے بھی کیا گلہ لیکن میں میں نے تو کبھی نہیں چاہا تھا کہ سب کچھ یوں برباد ہو اور انمول ملک خالی ہاتھ رہ جائے۔ کیوں ں ں ں ں!!!""" ماتم کناں انمول ملک کی آواز نے جیسے حویلی کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے تھے۔ دروازے سے لگ کر کھڑا ہونا بھی اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"کیوں بابا سائیں کیوں۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔۔ آپ ہی کی بیٹی ہوں نا میں لیکن۔۔۔ نہیں میں تو آپ کی بیٹی ہوں ہی نہیں ہاہاہا زبردست۔۔۔ نام کی بیٹی تھی میں تو جسے بوجھ سمجھ کر آپ نے ہمیشہ گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہنے دیا کسی بے کار اور بے جان شے کی طرح۔۔ میں کبھی آپ کی بیٹی نہیں تھی۔ آپ نے کبھی مجھے سمجھا ہی نہیں۔۔۔ آپ۔۔" انمول ملک کی آواز انہیں دور سے آتی محسوس ہوئی آخری چند الفاظ کے بعد دروازے کے اس پار خاموشی تھی بارش کا پہلا قطرہ زمین پر گرا اور مٹی سے مل کر خاک ہو گیا۔ کیا اتنی سی تھی اس کی زندگی اور کیا آج کا موسم انمول ملک کے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔ وہ مزید کچھ بھی کہے سنے بنا ایک نگاہ غلط دروازے پر ڈالتے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

اندر کمرے کے دروازے سے لگ کر بیٹھی انمول ملک کی آنکھ سے ایک آنسو کا قطرہ ٹپکا تھا بارش کے پہلے قطرے کی طرح اسی وقت اسی لمحے اور گر کر فنا ہو گیا۔ وہ یک ٹک کھڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کے باہر نظر آتے مناظر دھندلا گئے تھے۔ لیکن اسے ان میں عکس نظر آرہا تھا ماضی کے ماہ و سال کا عکس کسی فلم کی طرح اس شیشے پر چلنے لگا

لیکن وہ ان مناظر میں کھونا نہیں چاہتی تھی جانتی تھی کہ وہ ملک کی تکلیف کی یاد دلاتے تھے اور اس کی تکلیف میں ہی انمول ملک کی بے سکونی تھی۔

""تم میری پسند نہیں ہو ملک۔ تم میری پورے پندرہ سال کی جمع پونجی ہو جسے میں نے اپنے دل میں سجا کر رکھا تھا۔ تم انمول ملک کا عشق ہو۔ تمہارے بغیر میری جان زرہ بے نشان ہے۔ تم انمول ملک کی شناخت ہو۔" گھٹنوں میں سر دیے وہ سسک رہی تھی اور اسکے لبوں پر صرف ملک کا نام تھا۔

﴿اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا

جانے کیوں آج ترے نام پہ رونا آیا

یوں تو ہر شام امیدوں میں گزر جاتی ہے

آج کچھ بات ہے جو شام پہ رونا آیا

کبھی تقدیر کا ماتم کبھی دنیا کا گلہ

منزل عشق میں ہر گام پہ رونا آیا

مجھ پہ ہی ختم ہوا سلسلۂ نوحہ گری

اس قدر گردش ایام پہ رونا آیا

جب ہوا ذکر زمانے میں محبت کا شکیلؔ

مجھ کو اپنے دل ناکام پہ رونا آیا۔﴾

☆☆☆☆☆

"کہاں ہیں وہ سب۔۔" جہانداد ملک نے باہر کھڑے ندیم سے دریافت کیا۔

"سر نیچے طہ خانے میں بند کیا ہوا ہے انہیں کل شام سے۔" تابعداری سے جواب دیتے ندیم بھی جہانداد ملک کے پیچھے ہو لیا۔ وہ حویلی کی عقبی جانب بنے طہ خانے میں کا رہے تھے وہاں ان تمام لوگوں کو قید کیا گیا تھا جو کل کے واقعے میں شامل تھے بے شک وہ تمام جہانداد ملک کے بھیجے ہوئے تھے مگر بقول جہانداد ملک انہوں نے ایک غلطی کر دی تھی اور ندیم اچھے سے جانتا تھا وہ غلطی ملک پر گولی چلانے کی تھی۔

"ندیم زرا ہمارے شیر کو تو لاؤ۔۔" کرسی پر بیٹھتے جہانداد ملک نے ندیم کو اشارا کیا اگلے ہی لمحے دھاڑتا ہوا شیر طہ خانے میں داخل ہوا اس کی دھاڑ سے سامنے زنجیروں سے بندھے کھڑے وہ لوگ جی جان سے کانپ گئے۔

جہانداد ملک نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت پر پھیرا اور وہ سر جھکا کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ایک مسکان نے جہانداد ملک کے ہونٹوں کا بسیرا کیا تھا یہ بات ہی بہت دلکش تھی کہ ان کا جانور بھی ان کے ساتھ وفادار تھے۔

انہوں نے خونخوار نظروں سے سامنے دیکھا جہاں ان کا ہلک خشک ہو گیا تھا

"کیسے۔۔؟؟ کیسے زندہ بچ گیا وہ بولو۔" ندیم کے ہاتھ سے گن چھینتے انہوں نے ان سب کے سردار کو گولی ماری جو اس کی بائیں ٹانگ پر لگی تھی۔

وہ درد سے کراہا۔ ندیم کا منہ حیرت اور شاک سے کھل گیا وہ اس کی جان کینے کی بات کر رہے تھے لیکن کیوں ایسی کیا خطا ہوئی تھی اس سے اور پھر وہ اپنی سوچ کو جان کر شاطرانہ مسکرا دیا۔

"مم۔مالک۔۔مالک آپ نے ہی تو کک۔ کہا تھا کک۔ کہ صرف ان کو ڈرانا ہے جب تک آپ نہیں وہاں پہنچ جج۔ جاتے اور پھر پتا نہیں کیسے وو۔ وہ ملک وہاں آگ۔ گئے اور انہیں گولی لگ گئی۔۔ مم۔ میں معافی چاہتا۔۔۔" وہ بیچارا اپنے خون آلود ہاتھ جوڑ کر اپنی جان کی بھیک مانگنے لگا جب جہانداد کی دوسری گولی سے دم توڑ گیا۔

اب ان کا نشانہ دوسرے بندوں کی جانب تھا جو پہلے اس ڈر سے کانپ رہے تھے کہ آج وہ اس شیر کی خوراک بنیں گے اور اب اپنے سردار کی حالت دیکھ کر تھر تھر کپکپا رہے تھے

"تم جانتے ہو میرے شیر کی خاص بات کیا ہے۔" جہانداد ملک اٹھ کر اس شخص کے پاس گئے جو اس دنیا میں اب باقی نہیں بچا تھا۔

"وفاداری۔۔ یہ ہے اس کی خاصیت۔۔ اور مجھے بے وفا لوگوں سے سخت نفرت ہے بلکل اسی طرح اسے بھی ان سے نفرت ہے ورنہ آج اس کے لیے بڑی دعوت کا انتظام کیا جاتا۔" "جہانداد ملک نے کہتے ہوئے اس شخص کے خون سے اپنی ایک انگلی رنگی اور شیر کو پاس بلایا۔

"چچ۔ چچ میرے شیر کو بھی اس بے وفا کا خون پسند نہیں آیا۔ افسوس ہوا یہ جان کر کہ اب تم لوگوں کا مقدر میری گن میں موجود گولیاں ہیں۔" شیر نے پاس آکر جہانداد ملک کی انگلی پر لگے خون کی مشک لی اور پھر ناپسندیدگی سے چہرہ موڑ گیا

اس کی یہ عادت جہانداد ملک کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئی طنزیہ مسکراہٹ۔

وہ کھڑے ہوئے اور باہر کی جانب بڑھتے ہوئے ندیم کے ہاتھ سے ٹشو پکر کر انگلی پر لگا خون صاف کیا۔

شیر بھی ان کے پیچھے آرہا تھا اسے معلوم تھا کہ اب اسے اس کا کھانا مل جائے گا۔

"یہ تمام کی تمام گولیاں ان کے وجود کے آر پار کر دو۔۔" گن ندیم کے ہاتھ میں تھماتے وہ طہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتے اوپر چلے گئے شیر بھی ان کی تابعداری میں باہر نکل گیا۔

موسم سکندر ہاؤس کے مکینوں کے لیے بھی ایک سا تھا۔ ٹپ ٹپ برستی بارش اور بارش کے قطروں کی طرح فنا ہوتے پرانے جزبات کسی کے دل کی امنگ کو بڑھا دینے والے تو کسی کے دل کو روگ لگا دینے والے۔

"ارے آپ لوگوں نے تو کچھ کھایا ہی نہیں کچھ لیں نا۔" ثانیہ بیگم نے مہمانوں کے سامنے لگی مختلف اقسام کی اشیاء کو دیکھ کر کہا جنہیں چھونے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ یہ لوگ بھی آج جیا سکندر کے رشتے کے لیے آئے تھے۔

"ارے نہیں بہن اس تکلف کی کیا ضرورت بس آپ لڑکی کو بلا دیں وہ دراصل ہمیں ایک دعوت پر بھی جانا ہے۔" رشتہ لانے والوں کی طرح وہ بھی سیدھا مدعے پر آئی تھیں۔

"جی۔جی ضرور منہا بیٹا جاؤ جیا کو بلا لاؤ۔" منہا ہاں میں سر ہلاتی جی کو لینے چلی گئی۔

"آپ کا بیٹا نظر نہیں آ رہا کیا نام بتایا تھا آپ نے بالاج ہاں بالاج سکندر۔" نصرت بیگم بولی تھیں۔

"جی بالاج اسے آفس میں بہت ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی تو وہ اور اس کے بابا وہی پر ہیں۔" ثانیہ بیگم کے لاکھ کہنے کے باوجود ان کی واپسی ممکن نہیں ہوئی تھی

"اچھا اچھا ارے ماشاءاللہ ماشاءاللہ۔ دیکھو راحم کتنی پیاری لگ رہی ہے ہماری بہو۔" نصرت بیگم نے اپنے بیٹے کو متوجہ کیا۔ منہا جیا کے ساتھ لاونج میں داخل ہو رہی تھی راحم صاحب نے بھی غور سے اسے دیکھا

"اور بیٹا کیا کرتی ہیں آپ۔" نصرت بیگم نے جیا کو اپنے اور راحم کے ساتھ صوفے پر زبردستی بٹھاتے استفسار کیا۔

"کچھ بھی نہیں۔۔" جیا کی زبان بے ساختہ پھسلی اور اپنی غلطی کا احساس ہوا جب ثانیہ بیگم کی نظریں خود پر محسوس ہوئیں۔ منہا کی بھی بتیسی نکلی تھی

"ہاہا۔ بیٹا کیا کیا بنا لیتی ہو آپ۔" نصرت بیگم اس کے جواب پر کھجل ہوتی سوال ہی بدل گئیں

"بیوقوف بہت آسانی سے بنا لیتی ہوں میں۔" معصومیت کی تو انتہاہ تھی ثانیہ بیگم سر پکڑ کر رہ گئیں یہ لڑکی ضرور نہیں یقیناً انہیں زلیل کروائے گی۔ اب کی بار منہا نے اپنا قہقہہ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہوتا چہرہ ہی موڑ لیا۔

"کیا!!" راحم اور نصرت بیگم ایک ساتھ بولے

"مم۔ میرا مطلب تھا کہ سب کچھ با آسانی بنا لیتی ہوں۔" جیا نے جلدی سے بات سنبھالنا چاہی ثانیہ بیگم کی گھوریاں تو وہ برداشت کر لیتی اور اگر اس کی شکایت چنگیز خان تک پہنچ گئی تو۔۔ وہ لاحولا ولا قوۃ پڑھ کر رہی گئی۔

"اچھا اچھا تو بہن آپ کی بیٹی ہے تو بہت خوبصورت اللہ تعالیٰ اس کے نصیب بلند کرے۔" انہوں نے جیا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ثانیہ بیگم سے کہا۔

"آمین۔" منہا اور ثانیہ بیگم ایک ساتھ بولیں۔ اس کے نصیب کی دعائیں تو ثانیہ بیگم ہر لمحے کرتی تھی اور انہیں یقین تھا کہ وہ نصیب کی دھنی ہی نکلے گی۔

"تو پھر ہم کب آئیں منگنی کی تاریخ لینے۔" اب وہ اصل بات کرنے لگی تھیں۔ جیا کے کان بھی ادھر ہی لگے تھے اور منہا جیا کو اتنا شریفانہ انداز میں بیٹھے دیکھ مسلرا رہی تھی

"جب آپ کو مناسب لگے ہماری تو کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔" خلوصِ دل سے انہوں نے ہاں کی تھی اس معاملے میں تو پہلے ہی بالاج سکندر اور معید سکندر اپنی رائے دے چکے تھے۔

"لیکن ہماری ہیں بھئی اب اتنے بڑے گھر کی بہو بیاہ کر لے جا رہی ہوں تو خالی ہاتھ اچھا تو نہیں لگتا نا بس منگنی کی تاریخ لینے آئے گے تو آپ کو اپنی ڈیمانڈ بتا دینگے۔" جیا نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا منہا کے اندر بھی غصے کا وبال آیا تھا وہ لوگ یقیناً لڑکی کا رشتہ نہیں بلکہ اے ٹی ایم سے اپنی مطلوبہ رقم نکلوانے آئے تھے۔ ثانیہ بیگم کو بھی ان کی بات بھلی نہیں لگی لگتی بھی کیوں اتنے خلوص کے بعد وہ اپنی اصلیت دکھا رہی تھیں۔

"جی۔ ضرور میں بالاج اور اس کے بابا سے بھی مشورہ کر لوں گی پھر آپ آجایئے گا منگنی کی تاریخ لینے۔" ثانیہ بیگم کی بات پر جیا وہاں سے اٹھ کر جا چکی تھی اور منہا اور ثانیہ بیگم پیچ و تاب کھا کر رہ گئی وہ ضرور اس رشتے سے ناخوش ہو گئی تھی۔ کچھ دیر مزید سوال و جواب کے وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ثانیہ بیگم کو مزید پریشانی لاحق ہو گئی تھی اس حسینہ کو تو وہ بعد میں پوچھیں گی پہلے اپنے بیٹے اور شوہر کو تو سمجھا لیتیں۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"آرام سے بھائی۔" مومن ابراہیم "ملک" کے کمرے میں داخل ہوتے بولا اس نے کہا بھی تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ اسے پکار لے لیکن یہ بھی کوئی ڈھیٹ انسان ہی واقع ہوا تھا۔

"ارے کوئی بات نہیں مومن اتنی سی تکلیف میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں ٹھیک ہوں۔" ملک نے کوفت سے اپنی چوٹ کو دیکھا اور مسکرا کر مومن کو تسلی کروائی۔

"جی اسی لیے تو فٹ بال کی طرح اچھل رہے ہیں۔" مومن نے اس کے بیڈ پر بیٹھے رہنے پر چوٹ کی۔

"اتنے حاضر جواب کیوں ہو تم۔" ملک نے اس کے بال بکھیرے اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے بالوں سے نکالا۔

"آپ ہی کی شاگردی میں ہوں۔" مومن ابراہیم کی بات پر ملک نے قہقہہ لگایا مصنوعی چھوٹا سا قہقہہ

"اچھا بتائیں کیا کھائیں گے میں آج آپ کی پسند کا پلاؤ بنالیتا ہوں کیسا؟؟" ملک نے تشکر سے اسے دیکھا ہاں وہ اس کے لیے بھائیوں جیسا نہیں بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ ملک کو شرارت سوجھی۔

"ہاں یار واقعی میں تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے تمہاری کبھی نہ ہونے والی بیوی راج کرے گی۔" مسکراہٹ ضبط کرتے ملک نے مومن کس چھیڑا۔ اس کی کان کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔ سٹپٹاتے ہوئے مومن اس کی بینڈج چینج کرنے لگا۔ اس بات کے جواب میں وہ اگلی صبح تک بھرپور شرمانے والا تھا۔ ملک کا قہقہہ ابھرا اب کی بار وہ مصنوعی نہ تھا بلکہ اس میں پیار تھا اپنے پیارے کے لیے۔

"بڑے خوش نظر آرہے ہو ملک۔ خیر تو ہے کون سا خزانہ ہاتھ آگیا۔" دروازے میں ایستادہ وہاج ملک نے اندر آتے ہوئے طنز کیا تھا۔

ملک نے مٹھیاں بھینچ کر اس کو دیکھا اگر اس وقت وہ بے بس نہ ہوتا تو یقیناً اس کو اندر داخل نہ ہونے دیتا۔

ملک نے آنکھ کے اشارے سے مومن کو باہر جانے کا بولا۔ وہ مصنوعی خفگی سے باہر چلا گیا ایسی بھی کیا راز و نیاز کی باتیں تھیں جو بھائی نے اس کی موجودگی میں نہیں کرنی تھیں۔

وہ باہر گھر سے ہی باہر نکل آیا دراصل یہ حویلی سے ملحقہ انیکسی تھی جو حویلی کے اندر ہی موجود تھی وہ وہاں شیڈ تلے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اور قطرہ قطرہ برستی بارش کو دیکھنے لگا کوئی اور بھی اپنی پرانی پوزیشن میں سامنے حویلی کے اوپری منزل کے کمرے میں لگی کھڑکی کے اس پار بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا ساکت ہو کر۔ انمول ملک کا دل اس بات کو جھٹلا رہا تھا کہ وہ قید کو مسترد کر کے آزادی میں آچکی ہے۔ ہاں اصل قید تو یہ تھی جس سے رہائی موت کے بنا تو ممکن نہ تھی۔

جب ملک کو گھر لایا گیا تو اس کے اندر ایک پل کے لیے جزبات ابھرے تھے کہ وہ جا کر اسے دیکھے اسے اپنا حال سنائے لیکن وہ ہرجائی شاید تمام حدیں محدود کر گیا تھا۔

وہ وہیں بیٹھی رہی جب اسے باہر سے شور کی آواز آئی کہ وہاج ملک واپس آگیا ہے اس کا دل کیا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لے وہ ان تمام آوازوں کا گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں۔۔؟؟" ملک کے جواب پر وہاج ملک کی باچھیں پھیلی تھیں اس کا دل کیا وہ اس کی بے بس حالت پر قہقہے لگائے۔

کیوں ما۔۔ نانانا" ملک "کیسا لگ رہا ہے اس بات پر پڑے رہ کر ہائے میرا دل سینے میں اچھل کود کر رہا ہے تمہاری بے بسی پر۔ افف یار۔۔" وہاج نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنس رہا تھا۔

"تمہارا دل بھی تمہاری طرح ایک نمبر کا کمینہ ہے۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔" کوفت سے اس وہاج نامی بلا کو غائب ہونے کا بولا۔ لیکن مقابل کا انداز ایسے تھا جیسے اسے اس بات سے رتی برابر فرق بھی نہ پڑا ہو۔

"ڈیر یسٹ کزن۔ تم کیوں یہ بات بھول رہے ہو کہ یہ تمام جگہ۔۔۔" وہاج اپنے اندر کا غبار قابو کرتا دانت نکوستے بولا لیکن ملک نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

"میرے سگے ماموں کی ہے۔ اور اس پر شاید تم سے زیادہ وہ مجھے حق دیتے ہیں اب پلیز اپنا یہ مکروہ چہرا لے کر چلے جاؤ ورنہ شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے انجام کے زمہ دار تم خود ہو گے۔" ملک نے اسے باہر کا راستہ دکھایا لیکن وہ باہر کی بجائے اس کی جانب آتا اس کے چہرے پر جھکا۔

"ابھی شائستہ بی کے منہ سے انمول کی بابت استفسار کر کے آرہا ہوں۔ اور مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری محبوبہ اس وقت کس ازیت میں ہے۔ پھٹے ہوئے ہونٹ۔" وہ وہاج ملک ہی کیا جو اس کو سکون لینے دے اپنی حالت کا اچھا خاصا بدلہ بھی تو لینا تھا نا اس نے۔

ملک کا دل انمول کی بات پر دھڑکا تھا ہاں وہ اس کا حال جاننا چاہتا تھا لیکن اس جیسے شخص سے نہیں۔ ملک کا دل انمول کی حالت سن کر ہی پسیج گیا۔ جبکہ وہاج آگے بول رہا تھا

"ماتھے پر چوٹ" اس نے سو مرتبہ خود کو لعنت بھیجی کیا ضرورت تھی اتنا سب کچھ کہنے کی۔ صحیح طریقے سے انکار بھی تو کر سکتا تھا۔

"چچ۔ تم شاید پہچان ہی نہ پاؤ کہ وہ انمول ہے یا کوئی اور۔" آخر میں وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا ملک کو اس شخص سے ایک بار پھر نئے سرے سے نفرت ہوئی تھی۔

"کتنے بغیرت بھائی ہو نا تم بہن کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہو رہے ہو۔" ملک نے بند مٹھی بستر پر ماری

"ہاں کیونکہ ساری غیرت تم میں جو ہے۔" وہاج کی آنکھوں سے جیسے شرارے پھوٹ رہے تھے

"افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہیں اس حال میں دیکھ کر تم تو ترس کھائے جانے کے بھی قابل نہیں ہو۔" ملک نے اس کی ہٹ دھرمی کو سراہا وہ اسے ازیت دے رہا تھا الفاظی ازیت۔

"ہاہاہا اور مجھے تم پر یاد کرو کیسے تم نے مجھے جلایا تھا تب تمہیں ترس نہیں آیا تھا۔۔۔" وہاج ملک بھی دھاڑا تھا شاید اپنے ساتھ ہوئی نا انصافی پر لیکن ملک نے تو اس کا انجام اچھا کیا تھا۔

"بلکل بھی نہیں آیا تھا میرا بس چلتا تو تمہیں اسی تیزاب سے بھسم کر دیتا لیکن پھر تم سے بنا رشتہ آڑے آگیا۔ ورنہ اتنی بھول تمہیں تو نہ تھی کہ میں کون ہوں۔" ملک نے وہاج کو دیکھتے اپنے دل کی بات کہی

"میں اچھے سے جانتا ہوں۔۔ تم کون ہو۔ تم میرے باپ کے۔۔۔۔۔۔۔" وہاج کے زبانی پھونکے جانے والا صور اس کے لیے آب حیات بن کر ثابت ہوا تھا اس کے الفاظ نے تو ملک کو ہمت دلا دی تھی۔ ملک نے وہاں کی مکمل بات سنی تھی اور تبھی وہاج کو اپنے کاندھے پر مومن ابراہیم کی سخت گرفت محسوس ہوئی وہ اسے باہر گھسیٹ رہا تھا۔ مومن خفا بھی تھا لیکن ملک کو ازیت نہیں پہنچنے دے سکتا تھا اس نے کھینچ کر وہاج کو کمرے سے نکال دیا۔

پیچھے ملک نے تکان سے آنکھیں بند کی تھیں۔ ایک تو وہاج ملک کی باتیں دوسرا مومن ابراہیم کی ناراضگی۔ اب اسے بھی منانا تھا ایسے جیسے اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو منانا۔

"گڈ ایوننگ ڈیریسٹ وائیفی۔۔ کیا یار آپ تو بھول ہی گئی ہیں کہ آپ کا ایک عدد معصوم سا شوہر بھی ہے۔" آج علی عمان نے منہا کو خود کال کی تھی ویسے تو نکاح کے بعد سے ان دونوں میں اچھی بات چیت تھی لیکن آج بہت دنوں بعد اس نے منہا کو یاد کیا تھا

"ایم سوری۔ علی آپ جانتے ہیں ناجیا کا پروپوزل آنا تھا اور پھر میں اس دن والے واقعے سے بھی بہت ڈر گئی تھی۔" منہا بالکونی میں کھڑی پودوں کو پانی دیتے ہوئے عمان سے باتیں بھی کر رہی تھی۔

"ویسے کیا بنا پروپوزل کا۔ ہو گئی ڈیٹ فکس۔" فون جے سپیکر سے علی عمان کی آواز ابھری

"جی بھائی اور بابا کا کہنا ہے کہ نیکسٹ ویکیں مڈ ان لوگوں کو منگنی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے بلا لیا جائے۔" منہا بولی۔ کیونکہ ثانیہ بیگم نے اسی دن سب سے بات کر لی تھی۔ جس پر بالاج کا رویہ بہت خشک تھا وہ اگنور کر گئیں۔

"ہاں یار جلد از جلد کرو اس کی شادی کی بات پھر ہم بھی سوچے اپنا کچھ۔" علی عمان کی بات پر منہا کا چہرا پل میں سرخ ہوا۔

"صبر نہیں ہو رہا آپ سے۔؟" اپنی خفت چھپاتی وہ اسی پر اترائی تھی۔ علی عمان نے گھور کر فون کو دیکھا جیسے اسے یہیں سے کھا جائے گا

"جی بالکل بھی نہیں ہو رہا پچھلے دو سالوں سے انتظار ہی کیا ہے مزید چند دن اور سہی۔" علی کی ٹھنڈی آہ بھرنے پر منہا ہنس دی اس کے بعد وہ دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

بالکونی سے اندر جھانکو تو جیا سکندر سٹڈی ٹیبل پر لیپ ٹاپ رکھے اس پر انگلیاں چلا رہی تھی۔

"شٹٹ!! یار۔۔ عجیب بندہ ہے سوشل میڈیا پر کوئی سراغ تک نہیں ہے اس کا۔ کیا کروں میں۔۔" در حقیقت وہ اس اینجل کی انفارمیشن نکالنے کی کوشش کر رہی تھی جو ناممکن سی بات تھی اور پھر وہ مسکرائی۔ شرمائی اور سر جھکا کر ہنس دی مدھم سا ورنہ اس کی ہنسی کی جلترنگ تو ہر کوئی سنتا تھا۔ وہ اپنی شادی کا سوچ کر ہنس دی۔

عام لڑکیوں کی طرح اس کی سوچیں بھی اپنی شادی کے حوالے سے بہت بڑھ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ بھی ایک عام سی لڑکی تھی کچھ خاص تو نہ تھا اس میں۔

"جیا سکندر۔۔ کیوں تم میرے حواسوں پر حاوی ہو رہی ہو۔ کیوں دماغ تمہارے علاوہ کسی دوسرے کو سوچ ہی نہیں رہا۔" اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز بالاج سکندر نے اپنی سوچوں کو ڈپٹا۔

"اس کی شادی ہو جائے گی بالاج سکندر ہوش کے ناخن لو۔" اندر سے آواز آئی اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"تو ہو جائے مجھے کون سا فرق پڑتا ہے وہ دوسرے کسی کو تو بھا سکتی ہے لیکن بالاج سکندر کو نہیں۔۔۔" وہ بہت دیر سے اس کو سوچ رہا تھا اس کا کام کرنے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا

کہ بار بار وہ لڑکی اس کی سوچوں پر غالب آجاتی۔ وہ چاہ کر بھی جان نہیں چھڑا پایا تو کام بند کر کے اسے سوچنے لگا اور پھر دل اقر ضمیر کی جنگ ہوئی اتنی زیادہ کہ ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی اس کا دل فتح ہو گیا جو اس بات کی گردان کر رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لیے اہمیت رکھتی جا رہی ہے۔

"جیا سکندر سونے دو مجھے۔۔" سوچوں میں غلطاں اس نے جیا سکندر کے تصور کو ڈپٹا لیکن ایک بار پھر سے اس کی ہنسی گونجی تھی ہر جانب اور پھر وہ اسی کے خیال کے ساتھ نیند کی وادیوں میں گم ہو کر رہ گیا

"یا اللہ خواب میں بھی افف۔ آپ سے روزانہ کسی حسین خواب کی دعا کر کے سوتی ہوں لیکن پھر بھی ہر بار کی طرح آپ اس کھڑوس سوری بالاج کو بھیج دیتے ہیں۔" دھیمی آواز میں بڑبڑاتی وہ کوفت سے نیند سے بیدار ہوئی۔

منہا دوسری جانب کروٹ لیے سو رہی تھی۔

اس لیے وہ دھیمی آواز میں بولی۔۔

"آپ نے دیکھا نا اللہ تعالیٰ وہ کیسے مجھے خواب میں بھی ڈانٹ رہے تھے ہمیشہ ڈانٹتے ہیں وہ۔ کل میری منگنی کی تاریخ طے ہونی ہے پلیز اللہ تعالیٰ ان کو میرے خیالات سے دور بھگا دیں نا۔" وہ اب بھی اپنے رب سے ہمکلام تھی۔ جب اس کے پاس کوئی نا ہوتا کہنے اور سننے والا تو وہ اپنے رب سے باتیں کرتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مؤذن کی صدا بلند ہوئی تو وہ اٹھی اور نماز کی نیت سے وضو کرنے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

انمول ملک ڈھلتے سورج کے وقت اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑی تھی ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے اس کی نظریں نیچے موجود انیکسی کی جانب تھیں۔ جب اسے دوسری طرف سے ملک آتا ہوا دکھائی دیا اس کا زخم ابھی پوری طرح سے بھرا نہیں تھا اس لیے اس کا بازو پلستر میں قید تھا۔

بالوں میں ہاتھ پھیرتے اس کی نگاہ اوپر کی جانب اٹھی اور پھر تو جیسے پلٹنا ہی بھول گئی۔ آج اتنے دنوں بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

سفید رنگ کا جوڑا پہنے اس کے بال ہوا کے ساتھ پیچھے کی جانب اڑ رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر اس قدرت کے شاہکار کو دیکھے گیا انمول نے بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی غلطی نہیں کی تھی وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اتنی دور سے اسے اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں کوئی جزبہ نظر نہیں آیا یا پھر وہ کمال کی اداکاری کرتا تھا اس نے دل میں سوچا۔

"ہاں انمول میں ایک اداکار ہی ہوں" ملک کے بھی دل نے صدا بلند کی۔ بالکنی میں کھڑی وہ ملک کو ڈھلتی شام کا حصہ معلوم ہوئی تھی۔ اس کا دل اس بات پر ایمان لے آیا کہ اسے کھو کر وہ اپنا بہت بڑا نقصان کر چکا تھا۔

"ملک۔ تم نے تو مجھے آزادی بخش کر عمر بھر کا وہ غم دیا ہے جو ساری زندگی مجھے اندر ہی اندر کھاتا رہے گا۔" انمول نے ایک ہاتھ سے چہرے پر اتے بال پیچھے کیے۔

"یہ غم ہجر کا حصہ ہے انمول اسے ہمارے بیچ آنا ہی تھا۔" ملک نے جیسے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔ انمول ملک کی آنکھوں میں کرچیاں ابھری۔

"لیکن محبت تو شراکت داری برداشت نہیں کرتی تو پھر تمہارے اور میرے بیچ یہ جدائی کیوں۔" اس کا دل تو ملک نے اس دن ہی مار دیا تھا جب اسے آزادی کا پروانہ تھمانا چاہا تھا۔ لیکن وہ اس دن سے اس چار دیواری کے بیچ قید ہو کر رہ گئی تھی۔

"آپ کو میری طرح اس کو قبول کرنا ہو گا انمول۔ شاید ہمارا انجام یہی تھا۔" ملک کا دل جیسے تمام جوابات دینے کے ارادے رکھتا تھا۔ لیکن ایک دم اچانک سے وہ انیکسی کے اندر گم ہو گیا۔

طنزیہ مسکراہٹ نے انمول ملک کے لبوں کا بسیرا کیا وہ سختی سے آنکھیں میچ گئی لیکن اس بار کوئی آنسو نہیں گرا تھا کیونکہ وہ تمام آنسو اپنے اندر اتار چکی تھی۔

جہانداد ملک نے اس کو کمرے سے تو رہائی دے دی تھی لیکن وہ اس دن سے حویلی سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"جی تو پھر اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو جیا اور راحم کی منگنی کر دیتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے معید صاحب۔۔" نصرت بیگم اور راحم آج منگنی کی تاریخ لینے آئے تھے لینے کیا وہ تو خود ہی تاریخ بتا رہے تھے معید سکندر نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ثانیہ بیگم بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جبکہ جیا اور منہا کچن میں تھیں۔ اور رہی بات بالاج کی تو وہ آج بھی گھر پر نہیں تھا کوئی ضروری کام تھا اسے یا شاید اب کی بار وہ بہانہ کر رہا تھا۔

"مبارک ہو پھر آپ سب کو۔ اب منگنی کی تاریخ طے ہو ہی گئی ہے تو کچھ جہیز کے متعلق بھی بات چیت ہو جائے ظاہر ہے بھئی تیاری میں وقت تو لگتا ہے نا۔" نصرت بیگم نے ان دونوں سے اجازت چاہی۔ جبکہ راحم بھی ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا

جی ضرور آپ لوگ اگر لسٹ۔."

"لل۔ لسٹ یہ رہی لسٹ ہم نے بنا کر رکھی ہوئی تھی پہلے سے ہی۔" نصرت بیگم نے معید سکندر کی بات بیچ میں ٹوکتے جلدی سے لسٹ نکال کر سامنے کی۔

ثانیہ بیگم تو شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔ معید سلندر نے لسٹ پڑھنی شروع کی

ایک گھر۔ گاڑی اور ساتھ میں ملازم بھی رکھ کر دینے ہیں۔ جہیز کا سارا سامان اور سکندر سن آف انڈسٹریز میں راحم کے لیے اچھی پوسٹ۔۔

معید سکندر نے لب بھینچ کر ان دونوں ماں بیٹا کی جانب دیکھا جو بے خبر بنتے ادھر ادھر دیکھنے میں مصروف تھے۔ تبھی باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

"بہن مانا کہ لڑکی کو جہیز دیا جاتا ہے لیکن اتنا سب کچھ دیکھ کر تو آپ کا لالچ نظر آ رہا ہے آپ میری بیٹی کو بیاہیں گی یا لاٹری سمجھ کر رکھیں گی۔" ثانیہ بیگم نے ان کے لالچ پر چوٹ کی۔ وہ دونوں ماں بیٹا گڑبڑا گئے۔

بالاج بھی گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا

"جیا۔ جیا ایک گلاس پانی پلا دو۔۔" وہ شاید سمجھ رہا تھا کہ مہمان جا چکے ہونگے اس لیے کچن میں کھڑی جیا کو حکم دیتے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا جب اسے لاونج سے ثانیہ بیگم کی آواز آئی وہ دروازا کھولتا اندر داخل ہوا۔

"ہاں تو آپ کی بیٹی کو کون سا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ارے آپ کو تو شکر کرنا چاہیے کہ ہم آپ کی بیٹی کو بیاہ رہے ہیں۔" ان کو تو پتنگے ہی لگ گئے تھے۔ بالاج نے نا سمجھی سے پہلے اپنے ماں باپ کو دیکھا اور پھر جیا کو جو پانی کا گلاس ٹرے میں رکھے دروازے پر ایستادہ تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ہماری بیٹی میں کوئی عیب نہیں ہے جو آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔۔" ثانیہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جیا کو بیٹی سے بڑھ کر چاہا تھا اور اس وقت ان کے اندر غصے کا بھونچال آ گیا تھا۔

بالاج کی بھی پانی کے گلاس پر گرفت سخت ہوئی کسی بھی غلط کام سے خود کو باز رکھا جبکہ جیا بھی وہیں سر جھکائے کھڑی تھی۔ منہا شور کی آواز سن کر وہاں آگئی تھی۔

نصرت بیگم اور راحم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساتھ ہی معید سکندر بھی کھڑے ہو گئے وہ اس عورت کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے ورنہ اتنی سی چیزیں تو وہ اپنی بیٹی پر سے وار کر پھینک دیتے۔

"ارے عیب نہیں تھا تو اسے اپنے بیٹے سے کیوں نا بیاہا۔ میں بتاتی ہوں یقیناً اس نے کوئی نا کوئی گل کھلایا۔۔۔" سر جھکائے کھڑی جیا نے اپنا آنسو صاف کیا اور یہیں بالاج سکندر کی بس ہوئی تھی

"انففف۔" گلاس زمین پر پٹکتے وہ دھاڑا تھا جیا اور منہا سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"اپنی زبان کو لگام دیں آپ۔ اس الزام تراشی کا جواب مجھے بہت اچھے سے دینا آتا ہے۔۔۔" وہ ان کے مقابل جا کھڑا ہوا تھا۔ معید سکندر نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے بالاج سکندر کیونکہ شاید تم بھی اس کی اصلیت سے۔۔" بالاج نے ایک زوردار پنچ اس کے جبڑے پر مارا۔

راحم کے منہ میں خون کا ذائقہ گھل گیا تھا۔ نصرت بیگم نے بالاج کو پیچھے ہٹانا چاہا۔

"ایک لفظ اور نہیں۔۔" اس کا گریبان جکڑتے وہ ایک بار پھر سے دھاڑا تھا۔ راحم کا خون کھول اٹھا اس تزلیل پر۔

"اتنی ہی پاکیزہ اور بے عیب تھی تو خود کیوں نا کر لی تم نے اس سے شادی۔" اپنا گریبان اس کی گرفت سے آزاد کرواتے وہ باز نہیں آیا تھا۔ جیا نے غصے سے اس کی جانب دیکھا۔

"کر لوں گا میں اس سے شادی۔۔ تم سے پوچھ کر نہیں کرنی۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے مار کر نکالوں گا۔" گریبان چھوڑتے بالاج نے اسے باہر کی جانب دھکیلا۔

"چل بیٹا چل یہاں سے ایسے ذلیل لوگوں میں رشتی کرنے سے بہتر ہے تو کنوارا ہی مر جا۔" منہ میں جو آیا وہ بولتی نصرت بیگم نے راحم کو بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ چلایا۔

دروازے میں کھڑی جیا پر ایک نخوت بھری نظر ڈالتے وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

بالاج نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنا غصہ کنٹرول کرنا چاہا۔

معید سکندر گہری سانس بھرتے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"ایسے نیچ اور گھٹیا لوگوں میں رشتہ کر رہے تھے آپ لوگ جیا کا۔ کم از کم تھوڑی سی تو جانچ پڑتال کر لینی چاہیے تھی آپ کو۔ اور تم بہت شوق ہے تمہیں یوں سج دھج کر۔۔۔ شوپیس کی طرح لوگوں کے سامنے آنے کا۔" معید اور ثانیہ بیگم سے بات کرتے آخر میں اس کی توپ کا رخ جیا کی جانب تھا جو ہونٹ کاٹتی اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بالاج کی بات پر ایک پر شکوہ نظر ان سب پر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

"چلو جی۔ شروع ہو گیا اس کا ڈرامہ۔" بالاج نے کوفت سے کہتے صوفے پر سیٹ سنبھالی اور منہا کو اس کے پیچھے جانے کا اشارا کیا۔ وہ ہاں میں سر ہلاتی اس کے پیچھے چلی گئی۔

"بہت غلط بات ہے بالاج آپ کو اسے ڈانٹنا نہیں چاہئے تھا بچی کو دکھ ہوا ہو گا۔" ثانیہ بیگم نے بالاج کی کلاس لی۔

"چھوڑیں آپ اسے اور ایک بات میری کان کھول کر سن لیں۔۔ آج کے بعد آپ کو جیا کے متعلق ٹینشن کینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے رشتے کی زمہ داری آپ مجھے دیں۔" وہ بولا

"اچھا بیٹا جی اور یہ تم نے ابھی کیا بات کی تھی۔ کہ تم کر لو گے جیا سے شادی۔۔۔۔ (توقف کیا) کیا تم واقعی اس سے شادی کرو گے۔" معید سلندر کی آنکھیں چمک گئی تھیں بالاج کی بات پر۔۔ بالاج نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اس نے ایسا کب بولا تھا اوہ اسے یاد آیا۔

"یا اللہ۔" ٹھنڈی آہ بھرتے وہ ان کے خیالات پر پانی پھیر تا وہاں سے باہر نکل گیا۔ جبکہ معید سکندر ثانیہ بیگم کی جانب دیکھ کر مسکرا دیے۔ ان کی نظروں میں چھپے مفہوم کو سمجھتی ثانیہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

"اللہ کرے جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی جیا کے لیے۔

بیڈ پر دراز انمول ملک کی سماعتوں میں دروازا کھلنے کی آواز پڑی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

سامنے ہی جہانداد ملک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"کب تک یہ سوگ منانے کا ارادہ ہے تمہارا۔ ویسے تمہاری اس اداسی کا حل نکال لیا ہے میں نے۔" جہانداد ملک نے اس کے سامنے بیڈ کی پائنتی کی جانب بیٹھتے اس سے کہا۔ بے شک انمول کی یہ حالت انہیں اندر ہی اندر گلٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کیسا حل۔۔" اس کے ہونٹوں سے پژمردہ سی آواز نکلی تھی۔ نا جانے اب کون سا حل ڈھونڈ لیا تھا انہوں نے۔

"میرے ایک پرانے بزنس پارٹنر کے بیٹے کا رشتہ آیا ہے تمہارے لیے۔ لڑکا بہت اچھا ہے لندن سے ایم بی بی ایس کر کے آیا ہے۔" انہوں نے حل بتایا اور انمول ملک کو لگا وہ اس کی باقی ماندہ سانسیں نکال لینے کی بات کی ہو۔

"کبھی نہیں بابا سائیں میں ایک دفعہ پہلے ہی اپنی بات مان چکی ہوں لیکن آپ میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتے۔ میں کبھی کسی دوسرے سے شادی نہیں کروں گی سن لیں آپ۔" وہ پہلی مرتبہ ان کے سامنے چیخی تھی جہانداد ملک نے خود کو قابو کیا ورنہ وہ اس کی بدتمیزی کبھی برداشت نہیں کرتے

"تمہیں میری بات ماننا پڑے گی انمول ملک۔ کیونکہ تمہاری زندگی کا فیصلہ میں کروں گا تم نہیں تمہاری من مانیاں میں پہلے بھی بہت برداشت کر چکا ہوں۔" وہ اپنی بات کہتے باہر جانے لگے۔

"آپ کو سنائی نہیں دیا میں نے کیا بولا میں یہ شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گی۔ چاہے آپ میری جان ہی کیوں نا لے لیں بلکہ آپ تو اس چیز کا بھی حق نہیں رکھتے۔" وہ ایک بار پھر سے چیخی تھی۔

جہانداد ملک نے آگے بڑھ کر اس کا منہ اپنے ہاتھ کی سخت گرفت میں لے لیا۔

"بلکل تمہیں جان سے مارنے کا میں کوئی حق نہیں رکھتا وجہ جاننا چاہتی ہو کیوں۔۔ چلو آج تمہیں تمہارے سوالات کے جواب دیتے ہیں۔۔" انہوں نے انمول کو اپنے ساتھ کھینچا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

حویلی کی عقبی جانب بنے طے خانے کی جانب بڑھتے انہیں مومن ابراہیم نے دیکھا تھا اور وہ فوراً ملک کو آگاہ کرنے کے لیے بھاگا۔

سیڑھیوں سے اترتے جہانداد ملک نے آکر ایک کمرے کا دروازا کھولا۔

انمول حیرانی سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی وہ یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ جس کمرے کا دروازا کھولا گیا وہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا شاید ہی آج تک وہاں کوئی آیا ہو۔

دروازا کھلنے سے کمرے میں چوکھٹ سے آتی روشنی پھیلی۔ انمول ملک کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس روشنی کی سیدھ میں کوئی گٹھڑی کی مانند بیٹھا ہوا تھا۔

"پچیس سال انمول ملک۔۔ پچیس سال۔۔" انمول نے چونک کر جہانداد ملک کو دیکھا تو مطلب وہ اس کی جان نہیں لے رہے تھے بلکہ ایک ایک کر کے اس کی سانسیں لے رہے تھے۔ اسے تباہ کر رہے تھے آج اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنے ہی وجود سے نفرت محسوس ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"یار منہا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" جیا نے منہا کا ہاتھ تھامتے ایک بار پھر سے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"یار کیا ہو گیا ہے تمہیں انہوں نے کوئی ضروری بات کرنا ہو گی تم سے اسی لیے بلا رہے ہیں تمہیں۔۔" منہا نے بھی سو بار کی کہی بات کر کے اس کو ریلیکس کرنا چاہا۔

جیا اب پہلے سے کافی بہتر تھی جس میں سب سے بڑا کاتھ منہا کا ہی تھا جس لیے اسے اپنی شادی کی تیاریوں میں الجھا کر رکھا ہوا تھا کیونکہ آج سے پورے ایک مہینے بعد اس کی رخصتی تھی جس کے کیے سب ہی بہت خوش تھے۔

ایسے میں آج صبح جیا کو بالاج کا میسج آیا۔ ایک کیفے کی لوکیشن کے ساتھ اسے پورے دو بجے وہاں پہنچنے کا پیغام آیا تھا اور تب سے وہ خوفزدہ تھی۔

ناجانے اب اس سے کیا گناہ ہو گیا تھا جو اسے بلا رہا تھا وہ۔ منہا اس کو مطمئن کر رہی تھی کہ پریشان مت ہو لیکن وہ مزید پینک ہوئی جا رہی تھی۔

نیلے رنگ کا جوڑا پہنے وہ تیار تو ہو چکی تھی لیکن منہا نے زبردستی پکڑ کر اسے اچھا خاصا تیار کر دیا تھا۔

"تم بھی ساتھ چلو پھر۔" جیا نے آخری حل پیش کیا۔

"مم۔ میں لیکن بھائی نے تو تمہیں بلایا ہے نا۔ تو تم اکیلی ہی جاؤ میں نہیں جا رہی۔" وہ صاف انکار کر گئی تھی۔ جیا نے وقت دیکھا۔ دو بجنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اسے اب نکلنا چاہیے تھا۔

" کبھی بات نہیں کروں گی میں تم سے۔" ہاں ہا سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتی باہر نکل گئی۔

پیچھے منہا اس کے چہرے کے زاویوں کو دیکھتی ہنس دی۔ یہ ناراضگی زیادہ دیر کی نہیں ہوتی تھی۔

وہ اس کیفے میں بیٹھا کب سے جیا سکندر کا انتظار کر رہا تھا۔ آس پاس لوگوں کی بھن بھن جاری تھی۔ اسے شدید کوفت ہونے لگی تھی کیونکہ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

اور تبھی اس نے سامنے سے آتی ہستی کو دیکھ اپنی آنکھیں بند کیں۔ شاید اس کا وہم تھا اور اب دوبارا آنکھیں کھولنے پر وہ خیال چھٹ جائے گا

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں کھولیں لیکن یہ اس کا وہم نہیں تھا حقیقت تھی جو شاید آج پھر اس کے سامنے آگئی تھی اس کا دماغ ماضی کے جھمیلوں میں کھونے لگا تو اس نے اپنے بے اختیار ہوتے خیالات کو ڈپٹا۔

" آہ۔۔ بالاج سکندر۔۔ واٹ آ پلیزینٹ سرپرائز۔" "وہ شاید آگے بڑھ رہی تھی لیکن بالاج کو وہاں بیٹھے دیکھ وہ اس کی جانب آگئی۔

وہ آج بھی ویسی تھی کچھ بھی نہیں بدلا تھا اس میں۔ "حریم ناز" ہاں وہ ویسی ہی تھی جیسا وہ تھا وہ تو کبھی اسے بھول ہی نہیں پایا تھا۔

"لانگ ٹائم نو سی۔۔ مسٹر بالاج سکندر۔" ڈھیلی سی شرٹ پر چست پینٹ پہنے وہ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر براجمان ہوئی۔

بالاج پہلو بدل کر رہ گیا۔ کتنے دعوے کیے تھے اس نے دوبارا ملاقات کے لیکن اب اسے سامنے دیکھ کر وہ سب کچھ بھل گیا تھا۔

"ہمم لانگ ٹائم۔ کیسی ہو؟" وہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تماشا بھی نہیں بنا سکتا تھا

"ہائے ظالم مت پوچھو ہم پر کیا بیتی۔ آہ" ایک ادا سے کہا تھا اس نے بالاج کو بیتے ماہ و سال یاد آئے اس کے ساتھ گزرے وہ خوشگوار لمحات یاد آئے لیکن وہ سر جھٹک گیا۔

"اوکے نہیں پوچھتا۔" وہ کندھے اچکا کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"اوہ کم آن بالاج ڈونٹ پریٹینڈ لائک آسٹرینجر۔ ہم دونوں اچھے دوست رہ چکے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔ یقیناً مقابل کو بات سمجھ آچکی تھی۔

"ہم اچھے دوست تھے۔ وہی دوستی جس کو تم لات مار کر گئی تھی حریم ناز۔" وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آج تک اسی بات نے تو اسے تکلیف دی تھی۔

"یاد ہے تم مجھے حری بلاتے تھے تمہیں مجھے اس نام سے بلانا بہت اچھا لگتا تھا۔" جان بوجھ کر پرانے لمحات کھینچ لائی تھی وہ بیچ میں۔ بالاج کو اس پر شدید تاؤ آیا

"ہاں لیکن تھا۔ اور اس وقت مجھے تمہاری شکل تک دیکھنا پسند نہیں آرہا۔" ضبط سے جواب دیا تھا بالاج سکندر نے اور چاہ کر بھی اپنی نخوت چھپا نہیں پایا۔

"ہاہا۔ ویسے بہت مزے میں ہو تم تو۔ اور ایک میں ہ حریم ناز نے ٹھنڈی آہ بھری

"تمہیں کیا ہونا ہے بلکہ تم جیسی لڑکی کو ہو ہی کیا سکتا ہے اچھی بھلی تو ہو تم۔" بھلا اسے ہو بھی کیا سکتا تھا وہ تو شادی کر کے آگے بھی بڑھ چکی تھی۔

"ہمم بٹ زندگی میں کچھ مشکلات آگئی ہیں تمارے جانے کے بعد۔۔" وہ بولی

"مثلاً؟؟" بالاج کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔

"میری شادی ہو گئی تھی آج سے تین سال پہلے لیکن وہ شخص دھوکے باز نکلا مجھے محبت کے جال میں پھنسا کر خود کسی دوسری عورت سے عشق معشوقی کرتا رہا۔" اس نے دیکھا کہ بالاج اس کی بات نہیں سن رہا یا یوں کہا جائے کہ وہ اسے برداشت کر رہا تھا لیکن وہ بھی ڈھیٹ مہا ڈھیٹ تھی۔

"اوپوزیٹ کرواس کا۔وہ نہیں تم شاید تم ایسی نکلی اوراب وہ تمہیں چھوڑنے والا ہے۔"یقیناًوہ شخص کتنا عظیم ہو گا جس نے اسے اپنایاہو گالیکن یہ توسدا کی دھوکے باز تھی اسے بھی چونالگادیاہو گااس نے۔بالاج کی نظریں باہر لگے دروازے پر تھیں۔وہ اسی جانب دیکھ رہاتھاجب شیشے کے اس پار کسی کا عکس ابھرابالاج نے حریم کو دیکھاوہ بول رہی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔اوروہ مجھے کیاچھوڑے گامیں خود اسے چھوڑنے والی ہوں۔"شیشے کے اس پار کھڑے زی روح نے ان دونوں کوساتھ بیٹھے دیکھ لیاتھا۔اسے غصہ آیاشدید والاہاتھ کی مٹھیاں بھینچ لیں۔بالاج نے بے چینی سے اسے دیکھا

"اچھی بات ہے ایسے ٹاکسک ریلیشن کو ختم ہوناچاہیے۔"اس نے بات رفع دفع کرنے کے انداز میں کہا

"ایساروبہ تومت رکھومیرے ساتھ میں جب سے پاکستان آئی ہوں تمہیں ڈھونڈرہی ہوں اور دیکھو کتنی آسانی سے تم آج مجھے مل گئے۔"وہ جانتایہ بھی اس کی منگھڑت کہانی ہے لیکن وہ اسے سن ہی کہاں رہاتھا۔

"کیاچاہتی ہو۔؟"حریم ناز کی آنکھیں چمکیں۔

"تمہیں۔۔میرامطلب کہ تم آج تک مجھے بھول نہیں پائے یہ بات مجھے معلوم ہے۔اگر تم مجھے بھول چکے ہوتے تواب تک آگے بڑھ گئے ہوتے ناکہ میری محبت کو پیروں کی زنجیر بناکر وہیں کھڑے ہوتے۔"شیشے کے اس پار موجود عکس نے پیر پٹکااور غصے سے نتھنے پھیلائے واپسی کے لیے قدم بڑھادیے۔بالاج اسے دیکھتارہ گیا۔ایک لمحے کے لیے جیسے کسی نے اس کے دل پر پیر رکھ دیا۔

وہ اٹھ کھڑاہواحریم ناز کی باتیں اوراس شخص کابرتاؤاس کا سکون غارت کر گیاتھاخیر اسے تووہ گھر جاکر پوچھے گا۔

حریم بھی س کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔بالاج نے جبڑے بھینچتے اس کی جانب دیکھا۔

اورایک قدم آگے بڑھادیا

"میرے سوال کاجواب دو؟"اسے وہاں سے جاتے دیکھ وہ تڑپ کر بولی تھی۔بالاج نے اپناقدم واپس لیااوراس کے مقابل کھڑا ہوا۔

"میں نہیں جانتاتمہارے دماغ میں کیاخناس بھراہواہے۔لیکن ایک بات یادرکھو حریم ناز کہ بالاج سکندر کبھی اپنا تھوکا چاٹا نہیں کرتا۔رہی بات مووآن کرنے کی توہاں میں تمہیں بھول نہیں پایااور ناہی کبھی بھول پاؤں گالیکن تم سے کس نے کہاں کہ میں وہیں پر کھڑاہوں۔چچ۔چچ۔میں بالاج سکندر آگے بڑھ چکاہوں اور جلد ہی شادی بھی کرنے والاہوں۔""کمال کاجواب دیاتھااس نے حریم ناز کے لب حیرت سے واہ ہو گئے

"کک۔کس۔سے کس کے ساتھ کرنے والے ہو تم شادی۔؟"پہلے اسے لگاکہ شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے لیکن بالاج سکندر کے چہرے کے سپاٹ تاثرات نے اسے سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

"جیا سکندر کے ساتھ۔۔۔۔"گریبان میں اٹکی عینک آنکھوں پر لگاتے وہ ایک ادا سے اس کے سامنے سے غائب ہوا تھا۔

"جیا سکندر۔"یہ نام ہاں یہ وہی تھی بالاج کی کزن تو کیا وہ واقعی میں اس سے شادی کر رہا تھا۔حریم ناز سوچ رہی تھی اور پھر وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔اچھی بھلی ہاتھ لگی آسامی بھی وہ گنوا بیٹھی تھی۔۔

☺_☆☆☆_☺

باب نمبر 4

"پچیس سال انمول ملک۔۔پچیس سال۔۔"انمول نے چونک کر جہانداد ملک کو دیکھا تو مطلب وہ اس کی جان نہیں لے رہے تھے بلکہ ایک ایک کر کے اس کی سانسیں چھین رہے تھے۔اسے تباہ کر رہے تھے آج اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنے ہی وجود سے نفرت محسوس ہوئی۔

اسے اپنا آپ آج سے پہلے کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں ہوا تھا جتنا آج ہو رہا تھا۔جہانداد ملک نے آگے بڑھ کر کمرے میں لگے واحد بورڈ پر لگے بٹن پر دباؤ بڑھایا تو پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

روشنی کے زیر اثر وہاں موجود گٹھری نما وجود کی دید ہوئی۔

سیاہ لمبے بال جو جڑوں سے سفید ہو کر بڑھاپے کی نشاندھی کر رہے تھے اس وقت پورے وجود کو ڈھانپے ہوئے تھے۔

جبکہ اس شخص کا سر گھٹنوں میں تھا جیسے وہ اس جگہ سے عاجز ہو۔اس تنگ خوفناک ماحول سے۔لیکن انمول جان گئی وہ جو کوئی بھی ہوں گی بے شک حسین نہیں حسین ترین ہوں گی۔انمول ملک دروازے کی دہلیز میں ایستادہ اس وجود کو گھور رہی تھی۔

کھٹکے کی آواز پر اس نے دائیں جانب دیکھا۔جہانداد ملک ایک لکڑی کی خستہ حال کرسی نکال کر وہاں رکھ رہے تھے۔

پھر وہ انمول ملک کی جانب آئے اور اس کی پشت پر کھڑے ہو گئے۔انمول کو اس وقت خوف محسوس ہوا ایسا خوف جو ہر چیز کو اپنے سحر میں جکڑ لے۔

انہوں نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھایا۔وہ بنا چوں چڑا کے وہاں بیٹھ گئی۔

اس وجود نے ایک بار بھی چہرہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا شاید وہ سننا نہیں جانتا تھا یا اسے محسوس نہیں ہوا تھا۔

"جانتی ہو میرے نزدیک بغاوت کی کیا سزا ہے۔؟" وہ بولے اور اس کی کرسی کے گرد ایک چکر کاٹا

"موت "لیکن تم فکر نہیں کرو میں تمہیں اتنی آسانی سے موت نہیں دوں گا۔ بلکہ ایسے بلکل ایسے ہی تڑپو گی تم اور جب تمہیں اپنے غلط فیصلے کا ادراک ہو گا تو تم واپس آؤ گی میرے پاس۔۔ اور میں اتنا سنگدل تو نہیں ہوں کہ بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔" ان کا اشارہ اس وجود کی طرف تھا جس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا

انمول ملک کی پتلیاں ساکت تھیں

"فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے انمول تمہیں کسی ایک کو چننا ہو گا۔ موت یا زندگی۔" جہانداد ملک کی آواز پر اس وجود میں ہلچل ہوئی جیسے بہت سارا خوف اس کے اندر سمٹ گیا ہو

انمول نے خشک لب تر کرتے ادھر ادھر نظریں گھمائیں وہاں محض ایک چھوٹا سا بیڈ اور الماری تھی۔ ساتھ ہی ایک دروازا تھا شاید باتھروم کا۔

"فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے انمول۔ دس۔ نو۔" انہوں نے انگلیوں پر گنتی شروع کی دس سے ایک تک۔

"آٹھ۔ سات۔" انمول ملک کو گویا آج سکون ملا تھا اسے کسی ایک کو چننا تھا کسی ایسی چیز کو جو اسے رہائی دلوا سکے اور اس نے چن لیا تھا۔

"موت۔" ہاں اس نے موت کو چن لیا تھا کہ اس دنیا سے اسے موت ہی رہائی دلوا سکتی تھی اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

جہانداد ملک کے اندر گویا لاوا ابلنے لگا ایک ہی جست میں انمول ملک کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"ایک بار پھر سے سوچ لو تمہارے فیصلے کا بہت احترام کروں گا میں۔" انمول کو جبڑے سے پکڑے ان کی گرفت سخت تھی

"سوچ لیا اگر اگلے سو جنم بھی مجھے کسی ایک کو چننا پڑا تو وہ ملک ہو گا اور اس کے نام سے جڑی موت۔" ان کی گرفت سے خود کو ازاد کروانا چاہا لیکن گرفت اور مضبوط ہوتی گئی۔

"انمول ملک تمہیں تمہاری موت مبارک ہو۔" اسے زمین پر دھکا دیا وہ اس وجود کے پیروں میں گری ہتھیلیوں کے بل سر اونچا اٹھا کر جہانداد ملک کو دیکھا آج اس کی آنکھوں میں دکھ تھا انہوں نے اپنی سگی بیٹی کی سانسیں چھین لینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وہ ان کی سگی اولاد تھی اور اس کے ساتھ ایسا سلوک انمول کی فہم سے باہر تھا۔

"پل پل تڑپو گی تم یہاں لیکن افسوس تمہاری تڑپ اس کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتی اور رہی بات ملک کی تو موت اسے بھی دی جائے گی بس کچھ دن اور۔" جہانداد ملک پھنکارتے ہوئے وہاں سے باہر نکل گئے۔

"منہا۔۔جیا کہاں ہے؟" بالاج نے کچن سے اندر جھانک کر پوچھا

"وہ اپنے روم میں ہو گی بھائی۔" منہا جو آج کچھ نیا ٹرائی کر رہی تھی اسی کے اجزاء دیکھتی بالاج سے گویا ہوئی

منہا کی بات پر بالاج نے اپنے قدم اوپر کی جانب بڑھا دیے۔

جیا جب سے گھر واپس آئی تھی بنا کسی سے بات کیے اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں لیکن اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا

"ہنہ۔پرکٹی کبوتری۔۔۔" حریم ناز کا عکس ذہن میں اترا تو وہ اسے ایک نئے نام سے نواز گئی۔

تبھی دروازا ناک ہوا اور اگلے ہی پل بالاج سکندر اندر داخل ہوا۔جیا نے اپنا رخ دوسری جانب موڑ لیا

بالاج نے اسے دیکھا پھولے ہوئے نتھنے اس کے غصے میں ہونے کی عکاسی کر رہے تھے۔وہ زیر لب مسکرایا۔

"تمہیں بلایا تھا میں نے آئی کیوں نہیں۔" ماتھے پر تیوری چڑھائے اس نے جیا سے پوچھا اور اس الزام پر تو وہ بل کھا کر رہ گئی۔

"آئی تو تھی جب آپ اپنی اس سو کالڈ گرل فرنڈ کے ساتھ بزی تھے۔" دونوں ہاتھوں سے اشارے کرتی وہ لڑاکا عورتوں کی طرح اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"مائینڈ یور لینگویج جیا۔وہ میری کوئی گرل فرنڈ نہیں ہے۔" بالاج کو گرل فرنڈ کا لفظ سخت ناگوار گزرا تھا جس عورت کے ذکر سے بھی وہ شرما رہا تھا جیا اسے اپنے ہی انداز میں اس سے وابستہ کر رہی تھی۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی۔وہ آپ کی کوئی گرل فرینڈ تھوڑی ہے بلکہ وہ تو آپ کا سچا اور پکا عشق ہے۔" اب کی بار لہجے میں ایک شکوہ تھا جسے بالاج محسوس کر کے بھی انجان بن گیا وہ جانتا تھا وہ بات کو غلط سمجھ رہی ہے۔

"کہہ سکتی ہو۔" وہ کندھے اچکا گیا۔جیا سر تا پیر سیخ پا ہوئی

"تو پھر مجھے کیوں بلایا تھا وہاں؟ اپنی اس سو کالڈ محبوبہ سے گپیں الاپنے کو۔۔" اس کی اواز میں جلن کی آنچ واضح تھی۔بالاج کو آج اس لڑکی کی سمجھ پر جی بھر کر افسوس ہوا تھا۔

"ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔

"ہاہ مجھے معلوم ہے آپ کو کیا بات کرنی تھی یہی نا کہ آپ اس پرکٹی مم۔میرا مطلب 'حریم ناز' سے شش۔شادی کرنے والے ہیں اور مجھے اس لیے بلایا تا کہ میں ماما، بابا کو راضی۔۔۔" اپنی ہی دھن میں کہتی وہ وہاں سے جانے لگی معلوم نہیں لیکن آنکھوں میں

نمکین پانیوں کا سمندر بھر آیا تھا کیوں وہ اتنی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ اس کی بلا سے وہ جس مرضی سے شادی کرے۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاپاتی بالاج نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما۔ جیا سکندر کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو اپنے کوٹ کی جیب سے کوئی شے نکال رہا تھا۔ وہ پل گزرا تو جیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مخملی ڈبیا سے ایک خوبصورت انگھوٹی نکال کر بالاج نے اس کی رنگ فنگر کی زینت بنائی تھی۔ جیا یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی

"اس کام کے لیے بلایا تھا تمہیں۔۔ اور اس عورت کو میں نہیں جانتا نہ ہی کبھی تمہارے منہ سے اس کا ذکر سننا چاہوں گا۔ مائنڈ اٹ۔" اس کا ہاتھ بالاج کی گرفت میں تھا جسے اسنے جھٹکا دیتے چھوڑا۔ جیا نے تیر کی تیزی سے اس انگھوٹی کو اتارنا چاہا لیکن بالاج سکندر نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ آنکھیں رات کے سیاہ جھلملاتے ستاروں کا عکس پیش کر رہی تھیں

"خبردار اگر یہ انگھوٹی تمہاری انگلی سے جدا ہوئی آئی سویر تمہاری انگلی کو تمہارے ہاتھ سے جدا کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگاوں گا۔" سختی سے جبڑے بھینچے اس سر پھری لڑکی کو وارن کیا

"لل۔ لیکن یہ سب۔ آ آپ ہوش میں تو ہیں نا؟" بھلا کیوں وہ اس جیسی لڑکی کو بنا سوچے سمجھے یوں پرپوز کرے گا اور تبھی جیا سکندر کا دماغ سن ہوا کچھ لمحات نے اس کے زہن میں اپنی چھپ دکھائی تھی

"جیا سکندر میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں اور ایک آخری بات جب مام ڈیڈ تم سے رضامندی پوچھیں تو تمہارا جواب صرف ہاں میں ہونا چاہیے۔" وہ کیا بات کر رہا تھا کیا ماما بابا کے درمیان یہ بات ہو چکی تھی۔ اسے منہا کی بات یاد آئی وہ اسے اکیلے کیوں بھیجنا چاہ رہی تھی اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

"مم۔ مگر ایسے کیسے میں مر جاؤں گی لیکن آپ سے شادی نہیں کروں گی سن لیں آپ۔" جس بات کے تصور کو بھی وہ جھٹلاتی آئی تھی اس کا روپ حقیقت بن کر اس کے سامنے تھا۔ جسے وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

"میک اٹ فاسٹ بے بی۔" بالاج کے اس نئے انداز نے اس کے چہرے پر پل بھر میں سرخیاں گھول دی تھیں۔

"کیوں کہ تم مر بھی جاؤ تو میں شادی تو تمہی سے کروں گا۔" بالاج چند پل تو اس کے اس روپ کو دیکھ مبہوت ہوا تھا لیکن پھر خود پر سو بار لعنت بھیجتے اس نے وہاں سے جانا چاہا۔

"ایک مری ہوئی لڑکی سے شادی کر لیں گے آپ۔" جیا نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ بالاج زیر لب مسکرایا۔ یہ لڑکی پاگل تھی اور عنقریب شاید اسے بھی پاگل کر دینے والی تھی۔

بالاج اسے ایک گھوری سے نواز تا باہر نکل گیا۔ جیا خود کو لعنت ملامت کرتی بستر پر ڈھے گئی

اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھے بالاج کی سوچیں رات والے واقع میں الجھی ہوئی تھیں۔جب وہ، معید سکندر، ثانیہ بیگم اور منہا معید سکندر کے کمرے میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔

بالاج نے ان سب کو اکٹھا تو کر لیا تھا لیکن وہ لوگ وجہ نہیں جانتے تھے۔

مجھے آپ سب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" بالاج نے بات کا آغاز کیا تو معید سکندر نے سر اثبات میں ہلایا گویا اسے بات جاری رکھنے کی اجازت دی ہو۔

میں کوئی تمہید نہیں باندھوں گا صاف اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ میں جیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"رک کر ان سب کے تاثرات جانچے۔ان تمام نفوس پر تو گویا صور پھونکا گیا تھا بالاج کو خدشہ لاحق ہوا۔

"واٹ!'رئیلی بھائی آپ سچ کہہ رہے ہیں۔؟"سب سے پہلے منہا کو ہی ہوش آیا

"ایسی بات میں مزاق میں تو نہیں کروں گا۔" بالاج کا سنجیدہ انداز سب کو چونکا گیا۔

"تو بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔" منہا تو من ہی من میں عش عش کر اٹھی تھی۔

لیکن ہمیں قبول نہیں ہے۔"معید سکندر جو بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کچھ سوچ کر گویا ہوئے۔

"کوئی ٹھوس وجہ جان سکتا ہوں۔"

"ٹھوس وجہ تم اچھے سے جانتے ہو بالاج۔تم نے کبھی اس کے وجود کو اس گھر میں برداشت نہیں کیا کجا کہ اس سے شادی کرو گے۔ تمہاری باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔برخودار تم کب اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹ جاؤ ہمیں کیا معلوم اور وہ بیٹی جیا اس کے معاملے میں ہم اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتے۔"ثانیہ بیگم بھی اس بات سے سو فیصد متفق تھیں۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا بابا۔اگر میں جیا سے شادی کروں گا تو وہ میری زمہ داری ہو گی اور یہ بات آپ بھی اچھے سے جانتے ہیں کہ بالاج اپنی زمہ داریاں بخوبی نبھاتا ہے۔آپ ایک آخری بار جیا کے معاملے میں مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔" بالاج کی بات پر معید سکندر نے ہنکارا بھرا اور آخری فیصلہ جیا کا ہو گا کہہ کر محفل برخاست کی۔

"فائینلی جیا سکندر تم بہت جلد میری زندگی میں شامل ہونے والی ہو اور مجھے اس لمحے کا شدت سے انتظار ہے جب تم جیا سکندر سے جیا بالاج سکندر ہو جاؤ گی۔" مسکراہٹ اس کے چہرے سے جدا نہیں ہو رہی تھی اور پھر اس کا خیال جیا کی رضامندی کی جانب گیا اگر تو اس نے انکار کر دیا پھر نہیں وہ انکار کبھی نہیں کرے گی یہ بات تو وہ بھی جانتا تھا۔

اور پھر تادیر اس کی سوچوں پر جیا سکندر نے اپنا ڈیرا جمائے رکھا تھا۔

اس وقت وہ دونوں اس کمرے میں موجود تھے۔ سفید اور زرد بلب کی روشنی سے کمرے کو منور کر رکھا تھا۔ ملک کمرے کے عین وسط میں کرسی رکھے بے چین سا بیٹھا ہوا تھا اس کی سامنے ایک کرسی خالی پڑی تھی جس پر کچھ لمحے پہلے مومن براجمان تھا۔ اب کہ مومن ابراہیم اس کے سامنے دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک مار کر پکڑے شاید وہ دونوں کسی اہم موضوع پر بحث کر رہے تھے۔

"تہہ خانے تک رسائی آپ کے علاوہ محض دو لوگوں کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ نمبر ایک پر ہے ندیم جو کہ جہانداد ملک کا رائٹ ہینڈ اور اس کا وفادار غلام ہے۔ اور نمبر دو پر جہانداد ملک بذات خود ہے۔" دیوار پر چسپاں ایک نقشے سے مومن ابراہیم ملک کو سمجھا رہا تھا وہ نقشہ پوری حویلی کا تھا اور مومن کو تو اس کی اشد ضرورت ہوتی تھی کیونکہ آج تک وہ کبھی اس تہہ خانے میں نہیں گیا تھا۔

"ندیم کسی صورت اپنا ایمان نہیں بیچے گا کیونکہ وہ اپنے مالک کے ساتھ کتے سے بھی زیادہ وفادار ہے۔ اور جہانداد ملک اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ فلوقت یہ دونوں ہی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہونگے۔ اس لیے ہمیں کچھ ڈفرنٹ سوچنا ہو گا۔" عادتاً بالوں کو مٹھیوں میں بھینچتے ملک نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

اور بے چینی سے نظر ادھر ادھر دوڑائی جب سے مومن نے اس کا انمول ملک کا بتایا تھا وہ ایک سیکنڈ بھی سکون نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور وہ دونوں حویلی میں نہیں تھے بلکہ یہ جگہ ملک کی کچھ پوشیدہ جگہ تھی جس کے بارے میں جہانداد ملک کو علم تو تھا لیکن پتہ نہیں معلوم تھا۔

"پھر کیا کیا جائے۔؟" مومن نے ٹیبل پر رکھی پانی کی بوتل سے ایک گھونٹ بھرا۔

"انتظار۔" اس کی بات کا اشارہ مومن ابراہیم سمجھ گیا تھا تبھی گویا ہوا

"انمول بی بی موت کو گلے لگانا پسند کریں گی لیکن اس جہنم سے رہائی کبھی نہیں کیونکہ وہ کوئی بھی فیصلہ اپنے باپ کے خلاف جا کر نہیں کرتیں۔ اور۔۔" گلا کھنگار کر دوبارہ کلام باندھا

"وہاں ایک اور وجود بھی قید ہے بھائی جسے رہائی دلوانا ہمارا اولین مقصد تھا اور ہے۔" مومن کی بات پر ہیزل گرین آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔

وہ کیسے بھول جاتا کہ وہاں قید وہ دوسرا وجود کس اذیت میں ہو گا جو پچھلے تئیس سالوں سے اس قید میں تھا نا جانے وہ زندہ کیسے ہو گا؟

کہاں جا رہے ہیں آپ بھائی۔؟" ملک کے ایک دم کھڑے ہونے پر مومن پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"اس کھیل کی شروعات جہانداد ملک نے کی تھی لیکن اس کا اختتام میں کروں گا بہت ہو گیا چوہے بلی کا کھیل اب وقت ہے کہ سب کچھ کھل کر سامنے آہی جائے۔" اس کی بات دوٹوک تھی اور لہجہ پر عزم۔

آپ۔ آپ کیا کرنے والے ہیں۔؟"

جہانداد ملک نے اپنی پرانی تمام کشتیاں جلا کر یہ زندگی حاصل کی تھی۔ یہ پیسہ یہ عیش و عشرت یہ سب حرام کا ہے 'مومن ابراہیم' اسے اپنی طاقت پر بہت زعم ہے نا تو میں اس کی تا حال تمام قوتیں اکھاڑ کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں گا یہ اس ملک کا تم سے وعدہ ہے کہ تم بھی اپنی محرومیوں کا ازالہ ہوتا دیکھ پاؤ گے۔" کہہ کر وہ مڑا تھا اور سامنے بالکل سامنے دیوار پر نظر گئی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔ پوری دیوار تصاویر سے بھری ہوئی تھی کہیں ہنستے مسکراتے چہرے تھے تو کہیں خون میں لت پت لاشیں تھیں۔

"ب۔ بیٹا۔ جاؤ تت۔ تم جاؤ یہاں سے بھاگ جج۔ جاؤ بچا لو خود سے جڑے رر۔ رشتوں کو۔" کوئی نسوانی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑتی اسے ازیت سے دوچار کر گئی تھی۔

"نن۔ نہیں ماما آپ کو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ ب۔ بابا۔ ماما اٹھیں اپ۔ اپنے بیٹے کی بات مان لیں۔ 'ماما! بابا!" انگلی کے پور سے ایک ایک تصویر کو چھوتے وہ ماضی کی تلخ یادوں میں کھو چکا تھا۔ ماما اور بابا الفاظ کی بازگشت نے اسے اس کے ماضی میں دھکیلا تھا وہ چیخ رہا تھا... بلک رہا تھا... رو رہا تھا۔

اور تبھی کسی نے زور سے پکڑ کر اسے کھینچا تھا اپنی جانب وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا لیکن مقابل نے اسے گرنے سے بچا لیا تھا۔

"چچ۔ بچے تمہارے والدین نے اپنی غداری کی سزا پالی ہے۔ آہا تمہیں کیا معلوم غداری کی سزا کیا ہوتی ہے آؤ میں تمہیں بتاؤں گا کہ جہانداد ملک سے غداری کی سزا کیا ہوتی ہے۔" وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے ہاں وہ جہانداد ملک تھے جن کی ڈکشنری میں غداری کی سزا موت تھی۔

"تیار ہو جاؤ جہانداد ملک اس شطرنج کی بساط کو الٹنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔" ماضی کے جھروکوں میں کھوئے ملک کی آواز مومن کو بے چین کر رہی تھی۔

"آپ یہ بات کیوں بھول رہے ہیں بھائی کہ اس شطرنج کی بچھی بساط پر ایک اہم ترین پیادہ میرا بھی ہے۔" ملک کے قدم زنجیر ہوئے ۔ مومن کا سر جھکا ہوا تھا ملک اس کے قریب آیا۔

"میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا بھائی پلیز یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔" وہ ملک سے لپٹ گیا۔ ملک اس کے رندھے ہوئے لہجے اور اس کی محبت پر مسکرا دیا وہ جانتا تھا کہ اس دنیا میں مومن ابراہیم کے پاس واحد رشتہ ملک کی زات تھی۔ لیکن آنے

والے وقت میں کون کس کا خون نکلتا؟ یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا۔ ملک نے اس کی پیٹھ تھپکی اور اسے خود سے الگ کیا۔ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"وہ جو ٹیم میں نئی لڑکی شامل ہوئی ہے کیا نام تھا اس کا۔ ہاں۔ بسمہ شارک اس پر نظر رکھنا۔۔" مومن ابراہیم کے منہ میں کڑوے بادام کا ذائقہ گھل گیا

"مجھے تو وہ شکل سے ہی مشکوک لگتی ہے۔"

"تمہیں تو ہر تیسرا بندہ مشکوک لگتا ہے۔" ملک نے ناک سے مکھی اڑائی

"جس دن وہ ہماری انفارمیشن اپنے باپ تک پہنچائے گی ناتب پوچھوں گا میں آپ کو۔" مومن نے خبر دار کیا

"ہاں ہم تو آئی ایس آئی ایجنٹ ہیں ناں، جن کی خفیہ معلومات وہ اپنے نام نہاد باپ تک پہنچائے گی، زیادہ سر پر سوار مت کرو اس لڑکی کو۔" کمرے سے پہلے والے ماحول کا اثر زائل ہوا تو ہر سو جیسے تازگی ہی بھر گئی پھر وہ دونوں تادیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

جس وقت آسمان پر ستاروں کا تھال بچھ گیا اور چاند اپنی روشنی سے دھرتی پر موجود ہر شے کو چمکانے لگا اس وقت جیا اپنے بستر پر بیٹھی مسلسل ماضی کو ہی سوچے جا رہی تھی بیڈ کی دوسری جانب منہا کروٹ لیے سو رہی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی ہلکی ہلکی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ جو اس ماحول کو خواب ناک سا تاثر دے رہی تھی۔

"بالاج سکندر مرنا تو قبول کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے شخص کی اترن نہیں۔" بالاج کے کہے جملے کی بازگشت اسے سنائی دی۔ کتنے مان سے بولا تھا اس نے کہ وہ کبھی بھی کسی دوسرے کی اترن نہیں لے گا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

وہ بھی تو کسی کی اترن ہی تھی جس کی عزت کو پامال کرنے کی کوشش کی گئی تھی اگر اس دن بروقت وہ اینجل نہ آتا تو شاید وہ آج کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہتی اور یہ (رنگ فنگر میں چمکتی انگوٹھی آنکھوں کے سامنے کی) جو شخص اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا دعویٰ کر گیا تھا وہ اس پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتا۔

"یا اللہ میری اس نادانی کو کبھی میری ذلت و رسوائی کا ذریعہ نہ بنایئے گا، میں آپ سے اپنے راز کو راز رکھنے کی بھیک مانگتی ہوں مجھے اس شخص کے سامنے رسوا نہ کریئے گا" کھڑکی کے ہلتے پردوں سے چاند کی روشنی منعکس ہو کر اندر آئی تھی۔ اس کے گالوں پر لڑیوں کی مانند بہتے آنسو واضح ہوئے۔

وہ کچھ دیر مزید انہی سوچوں میں غلطاں رہی اور پھر تہجد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سورج کی کرنیں آسمان پر اپنے پنکھ پھیلائے زمین پر موجود ہر شے کو روشن کر رہی تھیں۔ آج موسم کافی خوشگوار تھا۔ ویسے بھی مارچ کے اختتام اور اپریل کے اوائل میں موسم متناسب ہوتا ہے۔

جیا اپنے بستر میں دبکی پڑی ہوئی تھی۔ تبھی کسی نے آکر کھڑکی کے سامنے لگے پردے وا کر دیے۔ تیز دھوپ سے ایک دم جیا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"جیا بیٹا اٹھ جائیں کب تک سونے کا ارادہ ہے۔؟" بالوں میں چلتی ثانیہ بیگم کی انگلیاں اسے مزید سکون دے رہی تھیں۔

"ماما سونے دیں نا اپنی پرنسس کو۔" وہ پھر سے آنکھیں موند گئی۔

"اٹھ جائیں میری پرنسس۔ آپ کا پرنس آپ کو لینے آنے والا ہے۔"

کک۔ کیا۔ کیا مطلب۔" وہ فوراً سے پیشتر کمفرٹر پھینکتی اٹھ بیٹھی۔ ثانیہ بیگم اس کی بوکھلاہٹ دیکھ مسکرا دیں۔

"آپ اٹھ کر فریش ہو جائیں پہلے پھر نیچے آجایئے گا۔ مجھے اور آپ کے بابا کو ایک ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔" ثانیہ بیگم اسے حکم دیتی چلی گئیں۔

"یا اللہ اب کیا ہو گیا مجھ سے۔" وہ اٹھ کر باتھروم میں چلی گئی۔

اگلے چند لمحات میں وہ ہشاش بشاش سی معید سکندر اور ثانیہ بیگم کے سامنے بیٹھی تھی، ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھائے، آج اس نے سفید رنگ زیب تن کیا تھا جو اس کے حسن کو مزید نکھار رہا تھا مگر بے فکر رہنے والی لڑکی کا چہرہ پریشانی کا تاثر دے رہا تھا

۔

"جیا آپ جانتی ہیں نا ہم آپ کے لیے جو بھی فیصلہ لیں گے وہ درست ہو گا۔" معید سکندر نے بات شروع کی

"جی بابا بھلا ماں باپ کا فیصلہ اولاد کے حق میں کبھی غلط ہو سکتا ہے۔" جیا کی بات نے ان دونوں کی ہمت بندھائی تھی۔

ہمم بٹ چوائس از یورز.... جیا آپ انکار کرنا چاہیں تو آپ کی خواہش سر آنکھوں پر لیکن ہمیں بھی اس سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں لگا یا یوں کہا جائے کہ میری اور تمہاری ماما کی تو دلی مراد بر آئی ہے۔" جیا نے نا سمجھی سے ان کی جانب دیکھا ایسی بھی کون سی بات تھی؟

"کھل کر بات کریں بابا کون سا فیصلہ کیا ہے آپ نے۔؟"

"بیٹا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی شادی بالاج سے کر دی جائے۔ (جیا کے چہرے کا رنگ فق ہوا) آخری فیصلہ آپ کا ہی ہو گا۔

"ثانیہ بیگم نے بالاج کی خواہش کو اپنے فیصلے میں بدل دیا تھا

"جب مام ڈیڈ تم سے رضامندی لیں تو تمہارا جواب صرف ہاں میں ہونا چاہیے۔" زہن میں بالاج کا کہا گیا فقرہ گونجا۔ دل کی دھڑکن ایک دم سے تیز ہوئی تھی

"مم۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ماما جو آپ دونوں کو مناسب لگے۔ آپکی رضا میں ہی میری رضا ہے۔" مشرقی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی ان کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا تھا۔

جیا کی رضامندی پر ان دونوں کے چہرے پر پُر سکون مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"یار منہا مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں صبح سے میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔" جیا اور منہا اس وقت ٹیرس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سامنے ٹیبل پر چائے کے برتن پڑے تھے۔ اور جیا منہا کو ایک بار پھر سے ٹوک رہی تھی۔ جس نے اسے تنگ کرنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔

"گھنی۔ میسنی نہ ہو تو میرے بھائی کو لے اڑی ہو اور مجھے کہتی ہو "دماغ خراب مت کرو" بلا بلا بلا" منہا نے جیا کی نقل کی اور اب کی بار جیا صحیح معنوں میں چڑ گئی تھی۔

"میں کوئی چیل تھوڑی ہوں جو تمہارے بھائی کو اپنا شکار سمجھ کر لے اڑوں گی۔"

"مجھے کیوں لگتا ہے کہ تمہیں اس معاملے کی پہلے سے خبر تھی۔" منہا نے مشکوک نظروں سے جیا کو گھورا

"ہاں پہلے سے ہی خبر تھی مجھے آخر یہ ڈائمنڈ رنگ ایسے ہی تو نہیں مل گئی نا۔" جیا نے بتیسی کی نمائش کرتے ہاتھ منہا کے سامنے لہرایا۔ منہا کو حیرت ہوئی۔

"واٹ! اور تم نے مجھے بتانا بھی گنوارا نہیں کیا۔" اس سے پہلے منہا اٹھ کر اس کا سر پھاڑ دیتی جیا وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ منہا بھی اس کے پیچھے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چائے اپنی ناقدری پر آنسو بہاتی رہ گئی۔

دن سے رات، رات سے پھر صبح، صبح سے دن اور دن سے ایک بار پھر رات ہو گئی تھی۔ انمول ملک کو اس کوٹھری نما کمرے میں آج دوسرا دن تھا۔ اس وقت وہ دروازے کے قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی شاید کوئی سراغ مل جائے۔ کمرے کو روشنی سے منور کرنے کے لیے ایک بلب روشن تھا لیکن اس کی روشنی اس کمرے کو مکمل روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔

"جو تم ڈھونڈ رہی ہو وہ تمہیں یہاں سے نہیں ملنے والا۔" کمرے میں موجود دوسرے نفوس کی آواز ابھری انمول نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس سنگل بیڈ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج ان کا چہرا ڈھکا ہوا نہیں تھا بلکہ واضح تھا۔ جھریوں زدہ چہرے کی رنگت سفید تھی اور آنکھیں گہری بھوری جن میں دیکھنے سے بھی کوئی راز نہیں تلاشا جا سکتا تھا۔

انمول ان کے قریب ہی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور غور سے انہیں دیکھا۔ وہ کیوں کچھ نہیں بولتی تھیں؟

پہلے پہل تو اسے ان کے گونگے ہونے کا گمان ہوا پھر جب وہ انہیں آوازیں دیتی رہی تو اسے لگا کہ شاید وہ بہری بھی تھیں لیکن آج اسے معلوم ہوا تھا وہ غلط تھی اس کے اندازے غلط تھے۔ انمول نے تھکن زدہ سانس خارج کی۔

"آپ کا نام کیا ہے۔؟" اس کے مخاطب نے اپنی نظریں سامنے موجود دیوار پر ٹکائی ہوئی تھیں جو گہرے نیلے رنگ میں مزین تھی۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے۔؟" اسے لگا مقابل نے اس کی بات نہیں سنی تھی لیکن اس بار بھی وہ غلط تھی۔

"صوفیہ۔۔ صوفیہ ابراہیم۔" ان کی پژمردہ آواز گونجی۔ انمول ملک نے شک کی نگاہ ان پر ڈالی۔

"آپ مومن ابراہیم۔۔۔" آواز حلق میں ہی ٹوٹ گئی تھی

"ہاں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ مومن ابراہیم کی بدقسمت ماں۔" انمول ملک کی نظریں ان کے نورانی چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"آپ اس قید میں کب سے ہیں۔؟" نیا سوال داغا

"پچھلے تئیس سال سے یہ قید میرے مقدر میں ہے۔" صوفیہ ابراہیم نے اس کی جانب دیکھا۔ ان مول ملک کو اس لمحے سے خوف آیا ان کی آنکھوں میں کچھ تھا کچھ مایوس کن سا۔

"آپ کا کیا جرم تھا۔؟"

"بے وفائی۔" یک لفظی جواب آیا تھا ان کی جانب سے۔ انمول ملک کے چہرے پر تمسخرانہ تاثرات ابھرے تو اس کے باپ نے اس عورت کو بھی نہیں بخشا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے میں کون ہوں۔؟" اس کی بات پر صوفیہ ابراہیم نے اثبات میں سر ہلایا

"اور مومن کیا وہ جانتا ہے کہ آپ یہاں ہیں۔؟" اگر وہ جانتا تھا تو اب تک خاموش کیوں تھا اور اگر وہ ان سے باخبر تھا تو باخبر تو ملک بھی ہو گا۔ اوہ ملک تمہارے کتنے روپ ہیں۔

"مومن سب جانتا ہے لیکن جہانداد ملک نہیں جانتا"

کیا کیا نہیں جانتے بابا۔؟" انمول کو تجسس نے آن گھیرا

"یہی کہ مومن میرا بیٹا ہے۔" انمول کے آئبرو اکٹھے ہوئے۔

"کیا مطلب۔" صوفیہ ابراہیم نے لمبی سانس خارج کی۔

"اسے لگتا ہے کہ وہاج ملک میرا بیٹا ہے نہ کہ مومن ابراہیم۔۔" انمول ملک کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں

"کک کیا مطلب وہا۔ وہاج تو میرا بب۔ بھائی ہے میرا سگا بھائی۔۔" وہ ہکلائی۔ صوفیہ ابراہیم نے نفی میں سر ہلایا

"یہ میری کہانی ہے۔ تمہیں ضرور سناں ا چاہوں گی۔ سنو گی؟" انمول نے سر کو خم دیا وہ بھی اس راز سے پردہ اٹھتے دیکھنا چاہتی تھی۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے داد اس معصوم کو اتنی بڑی سزا مت دو۔" وہ چیخ رہی تھیں

"تمہیں میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو ایک بار ٹھان لوں وہ کر کے دکھاتا ہوں۔" وہ تیس بتیس سالہ نوجوان تھے آج کے مقابلے میں وہ بہت مختلف تھے۔ ان کی شخصیت میں جو رعب و دبدبہ آج تھا اس سے کئی گنا زیادہ تب تھا۔

"داد اوہ کسی کی بیوی ہے، کسی کے بچے کی ماں ہے اس کو برباد مت کرو خدا کا قہر نازل ہو گا تم پر۔" آنسو ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے لیکن وہ اس وقت اس جلاد صفت انسان سے کسی کی بخشش مانگ رہی تھی

"چٹاخ۔" متوقع تھپڑ سے وہ لڑکھڑائی تھیں جہانداد ملک نے انہیں بالوں سے جھپٹا

"گھٹیا عورت خود کیا ہو تم۔ میرے معاملات میں بولنے کی اوقات نہیں ہے تمہاری۔۔" وہ دھاڑے اور تن فن کرتے کمرے سے نکل گئے۔

"مم۔ بب۔۔" دروازے کے پیچھے چھپی دو سالہ انمول نے آواز لگائی

"انمول میری جان۔" ساحرہ ملک نے اسے اپنے سامنے کیا وہ ڈر کے مارے کانپ رہی تھی کیونکہ وہ آج کی انمول سے مختلف تھی۔

"مم۔ با۔ بابلے اے۔ بابا۔" (ماما بابا برے ہیں بابا) وہ اپنی توتلی زبان میں اپنی سمجھ کے مطابق بول رہی تھی۔

جو شخص اس کی ماں کو اذیت پہنچانے کا سبب بن رہا تھا وہ انمول ملک کی نظر میں تب بھی برا تھا۔

"ہاں انمول ملک میں برا ہوں بہت برا۔" راکنگ چیئر پر جھولتے جہانداد ملک نے آنکھ کا نم کنارا صاف کیا۔ اس وقت کوئی ان کی آنکھوں میں دیکھ لیتا تو ان کے قہر سے پناہ مانگتا۔ تئیس سال پہلے کا وقت ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہا تھا لیکن نہ انہوں نے تب کسی کی سنی تھی اور نہ ہی اب سننے والے تھے۔

"ڈیڈ۔" وہاج نے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت مانگی

"ہوں۔ آجاؤ۔۔" وہ سنبھل کر بیٹھے

"آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔؟" جہانداد ملک نے نفی میں سر ہلایا بھلا انہیں کیا ہو سکتا تھا۔

"آپ ٹھیک نہیں کر رہے ڈیڈ۔" وہاج ان کے سامنے بیڈ کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا۔ ٹھیک نہیں کر رہا میں۔۔؟" انہوں نے سگریٹ سلگائی اور تیکھی نظروں سے وہاج کی جانب دیکھا

"آپ انمول کو غلط سزا دے رہے ہیں جبکہ اصل سزا کا حقدار وہ ملک ہے۔" اس کے لہجے میں نفرت تھی جہانداد ملک نے غور سے اس کے چہرے کے نقوش جانچے اور آج بھی انہیں اس کے اور صوفیہ ابراہیم کے نقوش میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی

"جانتا ہوں کہ اصل سزا کا حقدار کون ہے۔ تم فکر نہیں کرو ملک کو بھی اس کے کیے کی سزا ملے لیکن صحیح وقت آنے پر۔" سگریٹ کا دھواں ان کی آنکھوں کے سامنے کے منظر کو دھندلا رہا تھا۔

"آپ اسے مہلت دے کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آپ کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔ نمک حرامی تو اس کے خون میں شامل ہے۔"

"جانتا ہوں اور میرے نزدیک غداری کی سزا موت ہے۔" ان کے تصور میں آج بھی وہ رات زندہ تھی۔ روتا بلکتا کم سن بچہ اور اپنی سزا پا چکے اسکے والدین۔

"اور وہ ملک۔۔۔ کیا وہ جانتا ہے کہ آپ اس کے ہر عمل سے باخبر ہیں۔"

"وہ بھی جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں۔" جہانداد ملک نے سر کو خم دیا

"اب اس جیا کا کیا کرنا ہے۔ مم۔ میرا مطلب تھا کہ۔" اس نے بات سنبھالنی چاہی

"جاؤ۔" جبڑے بھینچے اسے وہاں سے دفعہ ہونے کا اشارہ کیا وہاج گڑبڑا کر کھڑا ہوا اور باہر کی جانب قدم اٹھائے

"سنو۔" جہانداد ملک کی آواز پر وہ رکا تھا

"ملک عزت کے رکھوالے ہو سکتے ہیں لیکن عزت کے لٹیرے کبھی نہیں۔۔" جہانداد ملک نے جیسے خود کو باور کروایا وہاج سر جھٹکتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سیاہ کرتا زیب تن کیے آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی گلاسز لگائے وہ آج کے کام کے لیے مکمل تیار تھا۔

"ارے ارے۔ دیکھ کر ڈیئر کزن آج کل بڑے غلط بندوں سے ٹکرا رہے ہیں آپ۔" وہاج ملک جو اندر سے باہر آرہا تھا جان بوجھ کر عجلت میں آتے ملک سے ٹکرایا۔ ملک نے دانت پیس کر اس کی جانب دیکھا وہ اس کا وقت برباد کرنے اور طنز کے نشتر چلانے کے لیے سامنے تھا۔

"غلط بندے خود ہی آج کل غلط راہ پر چل رہے ہیں خیر ایسے بندوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے میری ایک عدد تیزاب کی شیشی ہی کافی ہو گی۔" تحمل کا مظاہرہ کرتے اس نے آنکھوں سے گلاسز ہٹا کر گریبان میں اٹکائے۔ اس کی بات پر وہاج قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"اوہ گاڈ۔ ملک ملک ملک۔۔۔ تمہیں پتہ ہے یہ بندہ کیا چاہتا ہے۔ بربادی۔ پورے سکندر ہاؤس کی" ملک کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرات اپنی چھپ دکھا کر غائب ہوئے۔ دل کیا اس وہاج کو اٹھا کر کہیں پھینک دے اور نہیں تو اس کا وجود جلا کر بھسم کر دے۔

"ویسے یار اس رات تم نے بہت جلدی کر دی تھی آنے میں یہ بھی صحیح کہ ملک کبھی تاخیر نہیں کرتے کاش اس دن تم کچھ دیر بعد آتے تو دیکھ پاتے یہ ملک اپنا بدلی بھی نہیں چھوڑتے ہر حال میں اپنا انتقام پورا کرتے ہیں۔" ملک نے اپنی مٹھیاں بھینچیں

پھر چاہے وہ جیا سکندر کی موت کی صورت ہی کیوں نہ ہو۔" خباثت سے مسکراتے اس نے ملک کے وجود میں حشر برپا کر دیا تھا۔ اپنا ضبط کھوتے ملک نے بند مٹھی کا ایک زوردار پنچ وہاج ملک کے جبڑے پر جڑ دیا ایک لمحے کے لیے وہاج کی آنکھوں کے سامنے ستارے جھلملا گئے

"غدار۔ نمک حرام۔ احسان فراموش۔" پھٹے ہونٹ کا کنارا صاف کرتا وہ ملک پر چڑھ دوڑا لیکن اس کی طاقت ملک کی طاقت کے آگے صفر تھی۔

"جانتے ہو نا میرا نام کیا ہے۔ مجھے کبھی کوئی اپنے کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتا میں وہ ہوں جس کو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور یہ زندگی میری اپنی چنی ہوئی ہے۔ "ملک اس کو گریبان سے جکڑے اس کے کان کے قریب جھکتے غرایا تھا

آئندہ مجھ سے یا سکندر ہاؤس کے مکینوں سے الجھنے کی غلطی مت کرنا آخری بار وارن کر رہا ہوں ورنہ اگلی دفعہ تمہارے جہنم کے ٹکٹ کٹوانے میں دیر نہیں کروں گا۔" اندرونی دروازے سے جہانداد ملک آتے دکھائی دیے وہاج کی ان کی جانب پشت تھی۔

ملک نے انہیں دیکھتے ہی اس کا گریبان چھوڑا اور اس کے کندھوں سے نادیدہ گرد صاف کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہہ کی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں۔" جہانداد ملک کی سخت آواز سنتے وہاج نے ملک کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا وہ زیرِ لب مسکرایا۔ وہاج اسے اکسا رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ ملک اپنے آپ کو ایکسپوز کرے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دفعہ اگر اس کے اندر جمع ہوا لاوا پھٹ پڑا تو اس کی لپیٹ میں وہاں موجود ہر فرد آئے گا۔

"کچھ خاص نہیں 'ماموں جان'۔ بس آپ کے 'بیٹے' کو سمجھا رہا تھا کہ اپنے سے بڑوں سے بگاڑنی نہیں چاہیے ورنہ وہ آپ جیسوں کو اپنے پیروں تلے کسی کیڑے کی مانند مسل دیتے ہیں۔" جہانداد ملک کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال بچھ گیا۔ وہاج کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا

"جا رہا ہوں بابا لیکن ایک بہت ضروری بات بتانی تھی۔" وہ دونوں وہاج کی جانب متوجہ ہوئے۔

"سنا ہے کہ سکندر ہاؤس کا 'اکلوتا' سپوت جیا سکندر سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ سوچا آپ لوگوں کو علم ہونا چاہیے۔ نہیں؟" وہاج کے چبھتے ہوئے لہجے پر ملک نے خود کو قہقہہ لگانے سے باز رکھا

"اور آپ محترم کی اطلاع کے لیے بھی عرض ہے کہ اسی ہفتے بالاج سکندر کا جیا سے نکاح ہو رہا ہے۔ میں نے بھی سوچا تمہیں علم ہونا چاہیے۔" وہاج نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسی ہفتے نکاح والی بات اسے نہیں معلوم تھی اور پھر وہ پیچ و تاب کھاتا وہاں سے واک آؤٹ کر گیا

"کال ملاؤ اے۔ ایس۔ پی کو۔ کہاں مر گیا تھا وہ جو اس کے ہوتے ہوئے ہمارے دونوں ٹرک پکڑے گئے جانتے ہو نا کتنا مال تھا ان میں اب اس کا نقصان کون بھرے گا۔" ملک نے سر اثبات میں ہلاتے کال ملائی جو اگلے ہی لمحے اٹھا لی گئی۔

"ہیلو اے۔ ایس۔ پی شرافت حسین۔" ملک کی تپتی نگاہوں کے جہانداد ملک کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔

"کون شرافت۔ کہاں کی شرافت۔ دیکھو ملک یہ جو تمہارا ماما ہے نا بہت ہی کوئی خبطی بندہ ہے کسی دن میں اسی کے ہاتھوں مارے جانا ہے اور پھر نہ ہو گا شرافت اور نہ ہو گی میری شرافت۔" ملک نے فون کو گھورا جس میں سے مردانہ آواز ابھر رہی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مریں آپ کے اور میرے دشمن۔ (جہانداد ملک نے سرد نگاہوں سے اسے تکا) اور کس کمبخت نے آپ کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ارے آپ جیسے شریف لوگ تو جنتی ہوتے ہیں۔"

کام کی بات کرو" جہانداد ملک اسے کہتے وہاں سے چلے گئے۔

"چلا گیا راسکل۔۔" ملک کی آنکھوں میں تنفر اور بیزاری عیاں تھی جیسے مردار کو دیکھ عقاب کی نظروں میں تنفر ابھرتا ہے بالکل ویسے ہی۔ کیونکہ عقاب کبھی مردار نہیں کھاتا

انسپیکٹر سے بات کرتے وہ حویلی کے عقبی حصے کی جانب نکل آیا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے اس نے لحظہ بھر رک کر اس کے لاک کو ملاحظہ فرمایا وہ ڈیجیٹل قسم کا لاک ہندسوں سے کھلتا تھا جس کا علم ملک کو نہیں تھا۔ اور اس دروازے کے پار (نظریں اوپر کی جانب اٹھیں) وہ تھی ہاں وہ جو اس کی رگ جان میں بسنے لگی تھی۔ جس کی خاطر وہ جہاندادملک سے دشمنی مول لینے کو تیار تھا۔ کانوں میں انسپیکٹر شرافت کی آواز گونجی تو وہ آگے بڑھ گیا ان پنجروں کی جانب جہاں انمول کی قیمتی شے قید تھی۔

وہ ڈیزی کے پنجرے کے پاس رکا اور اگلے ہی لمحے وہ آنکھیں میچ گیا۔ انسپیکٹر سے رابطہ منطقہ کرتے اس نے پنجرے کے اندر موجود ڈیزی کے بے جان وجود کو باہر نکالا۔ آج کتنے ہی دنوں سے اس کی دیکھ بھال نہیں کی گئی تھی اور وہ بے زبان جانور تڑپتا بلکتا آج اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا ملک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

اسلام آباد کے ایک قدرے غیر آباد علاقے میں واقع وہ بلند و بالا عمارت اپنی پوری آب و تاب سے کھڑی تھی۔ اس عمارت کے دائیں اور بائیں جانب لڑکے اور لڑکیوں کے رہنے کے لیے ہوسٹلز بنائے گئے تھے اور درمیان میں ایک گول حصہ تا حد بلندی تک جاتا تھا جس کی کم و بیش سات منزلیں تھیں۔ گیٹ سے اندر داخل ہو تو اس گولائی والے حصے کے ماتھے پر جلی حرف میں بڑا بڑا "ایم۔ ایس۔ مارشل آرٹس" لکھا نظر آ رہا تھا۔

(M.S Martial Arts)

یہ دراصل ایک ٹریننگ سینٹر تھا جس میں مارشل آرٹس سے متعلق نوجوان نسل کو بہت کچھ سکھایا جاتا تھا۔ اس گولائی دار حصے (ٹریننگ ڈپارٹمنٹ) کے عقب میں ایک گارڈن واقع تھا جس میں طرح طرح کے پھول اس سینٹر کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔

وہ اس وقت ٹریننگ ڈپارٹمنٹ کے بیسمنٹ میں موجود کنٹرول روم میں کھڑا تمام سی سی ٹی وی فوٹیجز کا جائزہ لے رہا تھا کمر پر ہاتھ باندھے اس کی نگاہیں سامنے چلتے مناظر پر تھیں ساتھ ہی ایک کرسی پر دبلا پتلا عینک لگائے لڑکا بیٹھا مومن ابراہیم کے ایک حکم پر تمام تو معلومات کھول کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ پورے کنٹرول روم کو اندھیرے نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا صرف مونیٹرز کی روشنی ہی کمرے کی تاریکی کو مٹا رہی تھی۔ تبھی مومن ابراہیم کی نگاہ پھسلتی ہوئی ایک سکرین پر جا ٹھہری اس نے اپنے دائیں جانب کھڑے مینیجر کو سخت چتونوں سے گھورا۔ اور پھر شرٹ کی کف فولڈ کرتا باہر نکل گیا۔ مینیجر نے افسوس سے سکرین میں نظر آنے والے منظر کو دیکھا۔

"اب پتہ چلے گا فریال کو کہ بسمہ شارک کسی سے نہیں ڈرتی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور سامنے لگے پودے سے آخری پھول بھی توڑ لیا۔ نگاہ ادھر ادھر گھمائی وہاں کوئی نہیں تھا۔ شکر کا کلمہ پڑھتی وہ آگے بڑھی۔ تبھی ہاتھ میں تھامے پھولوں کی ٹہنی اس کے گلابی آنچل سے اڑ گئی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ساتھ میں اپنا دوپٹہ ٹہنی کی زد سے آزاد کروانے کی کوشش کرتی چلی جا رہی تھی۔ الجھی الجھی زلفیں اس کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھیں تبھی وہ کسی شے سے بری طرح ٹکرائی کہ ہاتھ میں تھامے پھول زمین بوس ہو گئے۔

سامنے ہی وہ بلیک جینز پر بلو شرٹ زیب تن کیے آنکھوں میں سرد پن بھرے اسے گھور رہا تھا۔ ہاتھ سینے پر باندھے پیروں میں جوگرز اور گریبان میں اٹکی عینک۔

"کتنا بد تمیز ہے کیسے گھورے جا رہا ہے تمیز تو چھو کر بھی نہیں گزری ہو گی۔" اس نے دل ہی دل میں قیاس لگائی۔

وہ پھول اٹھانے کی غرض سے نیچے جھکی لیکن اس سے پہلے ہی مومن ابراہیم نے تمام پھول اکھٹے کر لیے۔ وہ پیچ و تاب کھاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی مسئلہ؟" استفسار کیا مومن نے ہاتھ لمبا کر کے اسے پیچھے کی جانب اشارہ کیا۔

"وہاں سامنے بورڈ پر کچھ لکھا ہے۔ ہوپ سو کہ آپ انگلش پڑھنا جانتی ہوں گی۔" بسمہ نے پلٹ کر دیکھا وہاں ایک تختی پر بڑا بڑا سیاہ رنگ سے "**Do not pluck the flowers**" لکھا ہوا تھا۔ ایک پل میں شرمندگی سے اس کا چہرہ جھک گیا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"تو؟" لیکن وہ بسمہ شارک تھی جو کافی ڈھیٹ واقع ہوئی تھی مومن ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"آپ کو سزا سنائی جا سکتی ہے۔"

"کس بات کی سزا۔؟" اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے پوچھا

"یہ جو آپ نے پھول توڑ کر اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے اس بات کی سزا۔" مومن کا لہجہ خار کھاتا تھا جیسے ابھی اسے کسی بڑے جرم کی پاداش میں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دے گا

"آپ ہوتے کون ہیں مجھے سزا یا جزا کا اندیہ سنانے والے۔؟" ایسا کون سا جرم کر دیا تھا اس نے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ پھول توڑنے سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔

"آئی ایم مومن ابراہیم۔ داسب ہیڈ آف یور ٹریننگ ڈپارٹمنٹ۔" مومن نے جیب سے کارڈ نکال کر بسمہ شارک کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے اب وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"اور ایک بات آپ کا یہ حلیہ ہوسٹل کے اندر تک ہونا چاہیئے۔ یہ آپ کے باپ کی جاگیر نہیں ہے جو یوں دھند ھناتی پھر رہی ہیں۔ آپ کی وارڈن سے کمپلین کی جاسکتی ہے۔بی کیئر فل فار دانیکسٹ ٹائم۔"مومن ابراہیم نے پھول ہاتھوں میں تھامے واپسی کے قدم اٹھانے چاہے لیکن اس سے پہلے ہی بسمہ شارک کی آواز ابھری۔

"اس بار عبید بھائی جیت جائیں گے۔"جانے انجانے میں اس کی زبان پر یہ حروف آہی گئے تھے۔وہ بہت دنوں سے سنتی آرہی تھی کہ اس بار ریس ٹورنمنٹ میں مومن ابراہیم ہی جیتے گا کیونکہ وہ ہمیشہ جیتتا آیا تھا۔

"سیریسلی۔؟"انداز چیلنجنگ تھا یا خبر دار کرنے والا وہ اندازہ نہیں لگا سکا

"ہاں۔کیونکہ آج تک سب عبید بھائی سے ہارتے آئے ہیں۔"اس بار عبید بھائی تھے اس کے مقابل بھلا یہ کیسے جیت سکتا تھا۔

"اور مومن ابراہیم سے آج تک کوئی جیت نہیں پایا۔"لہجہ طنزیہ تھا جیسے کہہ رہا ہو دیکھ لینا جیت تو مومن ابراہیم کی ہی ہو گی۔یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اسے وہاں سے سیدھا گھر پہنچنا تھا وہ جلدی سے آکر گاڑی میں بیٹھا ہاتھ میں تھامے پھول فرنٹ سیٹ پر رکھے اور گاڑی زن سے آگے بڑھادی۔سوچیں بسمہ شارک کے گرد طواف کر رہی تھیں کتنی عجیب لڑکی تھی وہ جس کے لیے پھولوں کا توڑے جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔پھول تعلقات جوڑنے کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔کسی سے محبت ہو جائے پھول پیش کر کے پرپوز کر دو۔کوئی اپنا ناراض ہو جائے پھول دے کر سوری بولو اور معاملہ رفع دفعہ ہو جائے گا۔

وہ پھول اپنے ساتھ ہی گھر لے آیا تھا ٹی وی لاونج میں پڑے ایک ٹیبل پر واز پڑا ہوا تھا جس میں لگے تازہ پھول اب مرجھا چکے تھے وہ اس تک آیا اور مرجھائے ہوئے باسی پھول نکال کر واز میں تازہ پانی بھرا پھر ایک ایک کر کے تازہ پھول اس میں رکھتا گیا اسے یقین تھا یہ کونپلیں جلد ہی پھوٹ کر پورا پھول بن جائیں گی۔

"پھول چور"وہ مسکرایا اور ایک لقب بسمہ شارک کی ذات سے جوڑ دیا۔

منہا کی رخصتی کے ساتھ ہی بالاج اور جیا کی شادی بھی طے کر دی گئی تھی۔ویسے بھی جیا تو ان کے اپنے گھر کی بیٹی تھی تو پھر وہ تاخیر کیونکر کرتے۔شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔آج سے ٹھیک پانچ دن بعد منہا کی مہندی پر جیا اور بالاج کا نکاح فکس کیا گیا تھا۔

آج موسم کافی گرم تھا اور اپریل کے نصف میں تو گرم ہوائیں چلتی ہی رہتی تھیں۔

"کافی عرصے کے بعد شکل دکھائی ہے تم نے اپنی ورنہ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ کوئی جیا سکندر بھی ہے۔" انعم نے اپنے سامنے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی جیا سے شکوہ کیا

"لو بھلا جیا سکندر بھی کوئی بھولنے والی چیز ہے۔" ٹھنڈا مشروب ہلک میں اتارا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی انعم سے ملنے اس کے گھر آئی تھی

"اور تم نے کون سا کہہ دیا کہ خود ہی دوست سے مل آؤں۔" وہ دوستی میں برابری کی قائل تھی اس کا ماننا تھا کہ دوستی میں اونچ نیچ انسان کو زیر کر دیتی ہے جس وجہ سے وہ اپنے دوستوں سے دور ہو جاتا ہے

"بس مصروفیات ہی کچھ ایسی تھیں وقت ہی نہیں مل سکا اور شادی کے بعد تو خیال ہی نہیں رہا کسی شے کا۔ اب تم سنگل لوگ کیا جانو شادی شدہ لوگوں کے مسائل۔"

"الحمدللہ میں بھی منگنی شدہ ہوں۔" جیا تڑخ کر بولی۔ انعم نے بے یقینی سے چہرہ اٹھائے اسے دیکھا۔ جو اسے حیرت کے سمندر میں دھکیل کر اب مزے سے سامنے پڑے لوازمات کے ساتھ انصاف کر رہی تھی

"یہ کب ہوا؟" کچھ دیر بعد انعم کی مری مری آواز نکلی۔ وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا کیونکہ اسے لگتا تھا وہ وہاج ملک کو کبھی بھول نہیں پائے گی لیکن وہ غلط تھی اس کا اندازہ غلط تھا۔

"یہی ایک ہفتہ پہلے انفیکٹ میں تو تمہیں اپنے نکاح کی انویٹیشن دینے آئی تھی۔" اب کی بار انعم سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔ جیا اس کی حالت سے محظوظ ہوئی تھی۔

"اور کس کے ساتھ ہوئی ہے تمہاری منگنی؟" ماتھے پر سخت تیوری چڑھائے انعم نے اسے گھورا وہ تو اپنی دوست سے بالکل غافل ہو چکی تھی۔

"بالاج کے ساتھ۔" انعم کی آنکھیں ابل باہر آئیں

"وہی تمہارا کزن نا؟ ویسے دکھنے میں کیسا ہے۔؟" بالاج کو اس نے دور سے یونیورسٹی آتے جاتے دیکھا تھا کبھی قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

"اچھا ہے۔" جیا نے اثبات میں سر ہلا کر انعم کو جواب دیا

"کیا صرف اچھا ہے۔ مطلب پرسنیلٹی کیسی ہے؟ زیادہ نہیں تو یہ ہی بتا دو اس کی آنکھوں کا رنگ کیا ہے۔؟" انعم نے جھنجھلا کر پوچھا یہ لڑکی اسے پاگل کر دینے والی تھی مجال ہے جو کبھی کسی سوال کا ڈھنگ سے جواب دے دے۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔" اس نے کندھے اچکائے

"کیوں؟"

"کبھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی میری۔" اسے یاد آیا کہ اس نے تو کبھی بالاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات ہی نہیں کی تھی۔

"جیا۔۔" انعم کی تنبیہہ کرتی نظروں سے بچتی جیا کھسیانی ہنسی ہنس دی

"اچھا اچھا بتا رہی ہوں۔ وہ دکھنے میں ایک دم میرے سپنوں کے راج کمار جیسا ہے۔" لب دبائے انعم کو سلگایا اور وہ واضح انداز میں چڑ گئی۔

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا لڑکی۔ سدھر جاؤ۔" اپنے قریب پڑا کشن اٹھا کر جیا کو مارا جو اس کے بروقت نیچے ہونے سے پیچھے رکھے کارنر ٹیبل سے ٹکرایا

'چھن' کی آواز کے ساتھ میز پر رکھا واز زمین بوس ہوا۔ انعم کی صورت رونے والی ہو چکی تھی وہ اس کا بہت قیمتی تحفہ تھا وہ دہائی دیتی اب اپنے واز کے لیے رو رہی تھی اور جیا کے قہقہے سے پورا گھر گونج اٹھا۔

وہاج اپنے کمرے میں دائیں سے بائیں ٹہل رہا تھا بار بار رک کر میز پر رکھے اپنے موبائل پر بھی نگاہ ڈال لیتا۔ اس کے چہرے سے بے چینی صاف واضح ہو رہی تھی۔

فون کے بزر ہونے پر اس نے لپک کر فون اٹھایا۔

"کیا مسلہ ہے۔ جب بندہ فون نہیں اٹھا رہا تو اس کا مطلب کہ وہ بزی ہے۔" دوسری طرف سے غصے میں بھری نسوانی آواز ابھری۔

"تم نے کہا تھا کہ بالاج جیا سے شادی کرنے والا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس ہفتے ان دونوں کا نکاح ہے۔" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"دیکھو وہاج ملک میری بالاج سے بہت مختصر ملاقات ہوئی تھی اور تمہارے کہنے کے مطابق میں نے اسے لبھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت سخت ہو چکا ہے اس کے دل میں حریم ناز کے لیے محبت کا نہیں بلکہ نفرت کا پودا جڑ پکڑ چکا ہے۔" بلاشبہ وہ آواز حریم ناز کی تھی وہاج نے لمبا سانس اندر کھینچا یہ معاملہ پیچیدہ ہوئے جا رہا تھا اور اگر اس بات کی ملک کو بھنک بھی پڑ جاتی تو وہاج کی موت پکا تھی۔ اسے جلد از جلد اپنا کام کرنا تھا۔

"اب تم غور سے میری بات سنو حریم۔" وہاج اسے آگے کے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا انمول اور صوفیہ ابراہیم آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ جو راز اسے اس دن معلوم ہوا تھا وہ ہر جذبات اور احساسات پر بھاری تھا۔

"آپ نے کبھی یہاں سے نکلنے کی خواہش نہیں کی۔؟" انمول نے ان کی آنکھوں میں دیکھا گہری بھوری آنکھوں میں صدیوں کی داستان رقم تھی وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"نہیں۔ یہاں سے فرار کا ویسے بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔" لہجے میں مایوسی کا عنصر نمایاں تھا

"آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی ورنہ اس قفس کی قید میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔" وہ خود بہت کوشش کر چکی تھی لیکن اسے کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ سارے راستے جیسے مسدود ہو چکے تھے۔

"یہ قید جنت ہے۔"

"کیسے؟" انمول ملک نے حیرت سے استفسار کیا

"تم نہیں سمجھ سکتی۔۔ اس جنت کی قید میرے لیے آب حیات ثابت ہوئی ہے جس نے مجھے موت سے دور کر کے میری زندگی بڑھا دی۔" انمول ملک ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی

"موت سے ڈر لگتا ہے آپ کو۔؟"

"اس دنیا میں کوئی بھی انسان اتنا بہادر نہیں ہے جو موت کو ہنس کر جھیل لے۔" انہوں نے تلخ مسکراہٹ سے انمول ملک کو دیکھا وہ کہیں نا کہیں اپنے باپ کا عکس تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ موت۔۔ رہائی ہے۔" انمول نے اپنا تجزیہ پیش کیا کیونکہ اس نے بھی تو موت کو چنا تھا۔

"ہاں۔ اس دنیا سے رہائی ہے لیکن جو پکڑا اس جہاں میں ہو گی اس کا کیا۔؟" وہ مسکرائی تھیں اور انمول ملک مسکرا بھی نہیں سکی۔ کچھ دیر خاموشی کی نظر ہو گئی

"تمہیں لگتا ہے وہ آئے گا۔؟" صوفیہ ابراہیم کے سوال پر وہ دم سادھ گئی

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک میری حفاظت کرے گا۔" ماضی میں کیا گیا ملک کا وعدہ اسے یاد آیا۔ اور وہ ساکت رہ گئی۔

"کیا ہوا؟" صوفیہ ابراہیم نے اسکا پریشان حال چہرہ دیکھا

"وہ آئے گا۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے آئے گا۔" وہ چہک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ملک کبھی اپنا وعدہ نہیں بھولتا چاہے وہ ماں باپ سے کیا گیا وعدہ ہو یا۔۔۔ انمول ملک سے وہ ہر حال میں اپنا کیا گیا وعدہ نبھاتا ہے۔"
اور اسی لمحے جیسے اسے ادراک ہوا کہ کوئی معجزہ ہونے والا تھا۔ اب وہ دائیں سے بائیں ٹہلتی جا رہی تھی اور زبان پر ایک ہی الفاظ کی گردان تھی

"ملک کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ آئے گا۔"

رات کی سیاہی نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ رات رازوں سے بھری ہوئی تھی۔ چاند اور ستارے ترحم سے زمین پر موجود حویلی کی جانب بڑھتے اس ہیولے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہیولہ چھوٹے چھوٹے پھونک پھونک کر قدم رکھتا حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھا۔ رات کے اس پہر حویلی کا کوئی گارڈ بھی سست نہیں ہوتا تھا لیکن آج کچھ نئی بات تھی جو تمام گارڈ گدھے گھوڑے بیچ کر اپنی اپنی جگہوں پر بے سدھ سوئے ہوئے تھے یا شاید کسی نے انہیں چائے میں نیند کی گولیاں گھول کر پلائی تھیں۔

وہ رات انمول ملک پر بہت بھاری تھی۔ رات کی تاریکی کی طرح اس کا اندر باہر بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی دیوار سے لگ کر بیٹھی وہ اوپر بنی چھت کو گھور رہی تھی۔ مایوسی اور ناامیدی اس کے قریب گھات لگائے بیٹھی تھیں۔ ایک اور دن ڈھل گیا تھا اور ابھی تک وہ اس زندان میں قید تھی۔ جس دیوار سے وہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اس کے اوپر چھت کے قریب ایک روشن دان نصب تھا جس میں سے چاند کی روشنی باہر رات کے اندھیرے کا پتہ دے رہی تھی۔

"کیا وہ ائے گا؟" یہ وہ سوال تھا جو اس کے دل و دماغ میں جنگ برپا کر رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

غرور، انا اور تکبر ان تین چیزوں نے برباد کیا تھا انمول ملک کو اور اس کی مثال ایک ہارے ہوئے جواری کی مانند تھی جس نے محبت کی بازی لگا کر اپنی 'محبت' کو ہار دیا تھا۔

دفعتاً کمرے کے باہر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ بھاری مردانہ اور عجلت میں اٹھائے جانے والے قدم۔ انمول ملک کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ اس چاپ کو پہچانتی تھی۔ بمشکل دیوار کا سہارا لیتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صوفیہ ابراہیم کو دیکھا تو وہ کروٹ لیے اپنے بستر پر دراز شاید گہری نیند میں جا چکی تھیں۔ پھر وہ آواز ٹھہر گئی اس نے دیکھا روشن دان سے آتی چاند کی روشنی چوکھٹ کے قریب پڑ رہی تا یک سیکنڈ گزرا اور کسی نے آکر چٹخنی کی آواز کے ساتھ کمرے کا لاک کھولا تھا۔ انمول ملک کو ڈھیر سارے خوف نے آن گھیرا۔ دروازہ کھلا اور نووارد نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

"کک۔ کون؟" ہلک سے پھسی پھسی آواز نکلی کیونکہ اس شخص کا چہرہ واضح نہ تھا۔ اس کے قدم آگے بڑھانے کے ساتھ انمول پیچھے کی جانب کھسکی لیکن پیچھے تو دیوار تھی وہ مزید پیچھے نہیں ہو سکتی تھی۔ تبھی چاند کی روشنی میں آکر نووارد کا چہرہ واضح ہوا۔ انمول نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"ملک" سرگوشی کی سے الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔ایک آنسو لڑھک کر گلابی گال کی زینت بن گیا کتنا انتظار کیا تھا اس نے ملک کا۔اس سے پہلے وہ مزید کچھ بولتی ملک نے اپنے منہ پر انگلی رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ملک کی نگاہوں نے ادھر ادھر کا سفر کیا اور پھر وہ آکر انمول ملک پر ٹک گئیں وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں آگے بڑھی۔ملک یک ٹک اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا اور وہ آکر ملک کے سینے سے لگتی سسک اٹھی۔ملک دم بخود رہ گیا آنکھیں حیرت سے واہ ہوئیں۔انمول کے آنسو ملک کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوئے اور وہ شدت سے انمول ملک کو خود میں بھینچ گیا۔

چند لمحوں کی بات تھی اور دل کے گرد جو بے حسی کا خول تھا وہ ٹوٹ گیا۔ تبھی ایک حقیقت ملک پر آشکار ہوئی کہ جس دل کو اس نے پچھلے بیس سال سے بے حسی اور سنگ دلی کے خول میں مقید کر رکھا تھا وہ تو روز اوّل سے ہی انمول ملک کا اثیر ہو گیا تھا۔ خیالوں میں گم ملک کا ارتکاز کسی کی ہچکیوں نے توڑا تھا۔اس نے نرمی سے انمول ملک کو خود سے جدا کیا اس کا پورا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔خود کو سو بار لعنت ملامت کرتے اس نے انمول کے آنسو صاف کیے۔اس کی آنکھیں قیامت خیز منظر پیش کر رہی تھیں۔ملک نے ایک گہری سانس بھرتے اس کا ہاتھ تھاما اور باہر کی جانب بڑھا۔لیکن انمول ملک نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ملک نے پلٹ کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اس کی آنکھوں کا سوال سمجھتے وہ اس کے قریب ہوا۔

"ہم اس وقت انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے انمول۔اگر آپ کے بابا کو صوفیہ آنٹی کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ تیسری جنگ عظیم کھڑی کر دیں گے۔اس لیے ہوش سے کام لیں اور چلیں میرے ساتھ۔یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ بہت جلد ہم انہیں یہاں سے نکال لیں گے۔" مدھم آواز میں اسے جواب دیا اور انمول کو لیے باہر کی جانب چل دیا۔اب کی بار اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

پیچھے رہ جانے والے صوفیہ ابراہیم کے وجود نے لمبی سانس خارج کی اور کروٹ بدل کر چت لیٹ گئیں۔اب ان کی آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں بہتا تھا کیونکہ آنکھ کا پانی تو پچھلے تئیس سال میں سوکھ چکا تھا۔وہ زیرِ لب ملک، انمول ملک اور مومن ابراہیم کے کیے دعاؤں کا ورد جاری کر گئیں۔

اس نے اوون کا ڈھکن الٹا تو چاکلیٹ اور وینیلا کی مکس بھینی بھینی خوشبو سارے میں پھیل گئی۔وہ ایسے ہی ٹرے اٹھائے ڈائننگ ٹیبل تک آیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"یا اللہ میں اتنا اچھا کک کیوں ہوں۔"خود کو تعریفی کلمات سے نوازتے اس نے ایک کپ کیک ہاتھ میں اٹھایا۔اس نے آج ایک نئے طرز کا کپ کیک ٹرائے کیا تھا یقیناً ملک کو وہ بہت پسند آنے والا تھا۔چمچ کی مدد سے اس کا کنارا کترا اور منہ کی جانب بڑھایا لیکن اگلے ہی لمحے وہ چمچ زمین بوس ہو گیا۔کوئی داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا وجہ وہ شخص نہیں اس کے پیچھے چلتی انمول ملک

تھی۔اس کا سانس تک رک گیا اس سے پہلے کہ ہاتھ میں تھاما کیک بھی زمین کی زینت بنتا ملک نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔ مومن ابراہیم نے آنکھیں مسل کر دوبارا سامنے دیکھا مبادا کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ حقیقت تھی اور ایسے خوفناک حقائق مومن ابراہیم کی زندگی میں بھونچال ڈالنے کو آتے ہی رہتے تھے۔

"انمول کو ان کا کمرہ دکھادو مومن۔" انمول نے ایک چور نگاہ ملک پر ڈالی جو فریج سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا اور پھر مومن کے اشارہ کرنے پر گیسٹ روم میں چلی گئی

"یہ یہاں کیسے ؟" ملک نے پانی پیتے اسے دیکھا وہ خود کو مومن ابراہیم کی ناراضگی کے لیے تیار کر کے آیا تھا

"تم نے ہی تو کہا تھا وہ موت کو گلے لگالیں گی لیکن اپنے باپ کے خلاف نہیں جائیں گی۔" گلاس سنک سے دھو کر واپس اپنی جگہ پر رکھا

"اور آپ نے میرے کہے کو غلط ثابت کر دیا۔" وہ ابھی تک حیران تھا

"نہیں میں نے صرف اپنا وعدہ نبھایا ہے۔" وہ اب اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا

"واٹ ایور۔" مومن نے سر جھٹکا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ ملک نے جو کیا سب کے بھلے کے لیے ہی کیا اگر تو وہ صوفیہ ابراہیم کو اپنے ساتھ لے آتا تو جہانداد ملک نے بڑا محاذ کھڑا کر دینا تھا۔

"اتنا میٹھا مت کھایا کرو۔ موٹے ہو جاؤ گے۔" وہ جاتے جاتے پلٹا اور اسے تاکید کی

"اللہ اللہ۔" مومن نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے ایک لمبی سانس خارج کی۔ مومن ابراہیم ناراض نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ ملک کو ملک سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی سائکی واحد مومن ابراہیم ہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ اوندھے منہ بیڈ پر گر گیا یہ زندگی اسے بہت دکھ دیتی تھی کبھی اپنوں کو چھین کر تو کبھی من پسند شے سے نواز کر۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ تھا وہ جو سب کے سامنے مظبوط نظر آتا تھا کوئی اس کے اندر جھانک کر دیکھتا کہ وہ کتنا درد چھپائے بیٹھا تھا۔

صبح کا وقت تھا اور حویلی میں انمول ملک کی غیر موجودگی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی اس وقت تمام گارڈ اور حویلی کے ملازم مؤدب سے جہانداد ملک کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

"تم لوگوں کے ہوتے ہوئے وہ کیسے لے کر جا سکتا ہے اسے۔؟" ان سب میں شائستہ بی نہیں تھی ان پر ویسے بھی کسی کا شک نہیں جاتا تھا وہ کبھی دھوکہ نہیں دے سکتی تھیں

"سر ہمیں نہیں معلوم شاید کسی نے ہمیں نیند کی دوا کھلائی تھی جو ہم سو گئے اور۔" جہانداد ملک نے سرخ انگارا آنکھوں سے ان تمام کو گھورا

"دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ورنہ جان لے لوں گا تم سب کی۔" وہ شرمندہ ہو کر وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ پیچھے ندیم رہ گیا تھا۔ جہاندادملک کا رائٹ ہینڈ۔ ان کے لیے جان قربان کرنے والا۔

"مالک حوصلہ رکھیں ہم اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" انہوں نے دائیں بائیں سر ہلایا

"نہیں وہ نہیں ملے گا وہ جہاں بھی گیا ہو گا بے شک وہ جگہ عام سہی لیکن بہت خفیہ ہے۔ ملک کے علاوہ کوئی دوسرا اس جگہ کا پتا نہیں چلا سکتا۔" انہیں اس وقت شدید تاؤ آ رہا تھا کیسے وہ شخص ان کی ناک کے نیچے سے ان کی سگی بیٹی کو لے جا سکتا تھا۔

"پھر ہم کیا کریں مالک وہ ہمیشہ ہم سے دو ہاتھ آگے ہوتا ہے۔" ندیم نے تاسف سے سر ہلایا

"تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے اب وہ خود آئے گا یہاں کب کیسے یہ میں طہ کروں گا۔ بس اتنا جان لو کہ اس کھیل کا اختتام بہت جلد ہونے والا ہے۔ تمام مہرے اپنی اپنی چال چل کر ہار جائیں گے اور آخر میں جیت بادشاہ کی ہو گی۔" ندیم اور جہاندادملک شاطرانہ ہنسی ہنس دیے۔

رات کا پہر تھا وہ دونوں ہاتھوں میں مگ تھامے ٹیرس کی جانب کھلتے دروازے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نظریں سامنے افق پر چمکتے چاند پر تھیں۔ دفعتاً اس کے ساتھ کوئی آ کر بیٹھا تھا۔ انمول نے چونک کر دیکھا تو ملک اپنا کافی کا مگ تھامے اس کے ساتھ بیٹھ رہا تھا۔

"کیا زندگی اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے؟" ملک نے اسے دیکھا ہوا کے تھپیڑوں سے اس کے بال اس کے چہرے پر گر رہے تھے وہ اپنی نظریں سامنے کر گیا جہاں پورا شہر جگمگا رہا تھا۔

"زندگی اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہو سکتی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی خوبصورت ہوتی نہیں ہے بلکہ اسے خوبصورت بنایا جاتا ہے کبھی دل سے جی کر تو کبھی اپنی پسندیدہ شے کے ساتھ جی کر۔" ایک چور نگاہ انمول ملک پر ڈالی وہ اپنی کافی کا گھونٹ بھر رہی تھی۔

"تمہیں مجھے یہاں لاتے ہوئے ڈر نہیں لگا۔؟" انمول نے کافی کا گھونٹ بھرا

"ڈر کے آگے جیت ہے انمول ملک۔" انمول نے بدمزہ ہو کر کپ پیچھے کیا۔ مجال ہے جو یہ اسے ڈھنگ کا کوئی جواب دے لے۔

"تم یہاں ڈیو کی ایڈ نہیں دے رہے ملک میں سیریس ہوں۔" ملک نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو لب دبائے لیکن وہ انمول ملک کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی۔

"اور میں ڈیم سیریس ہوں۔ اب اٹھیں اور چل کر آرام کریں رات بہت ہو گئی ہے۔" وہ اب بھی اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم جانتے ہو ملک تمہاری مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے۔" وہ جینز کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ کافی کا مگ تھامے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"میں نہیں جانتا میری مسکراہٹ زیادہ خوبصورت ہے یا آپ کے دیکھنے کا انداز۔" انمول ملک کا چہرہ سرخ کندھاری ہو گیا وہ سر جھکا گئی۔ کوئی ملک سے پوچھتا کہ اس کے لیے سب سے خوبصورت شے کیا ہے تو وہ بلا تاخیر کہتا۔'انمول ملک کا شرمانا'۔

وسیع و عریض سڑک پر اس وقت موت کا سا سناٹا تھا آس پاس کے درختوں میں پرندے دبک کر بیٹھے ہوئے تھے تبھی شوں کی آواز کے ساتھ سڑک کے ایک جانب سے بائک نظر آیا پھر اس پر سوار شخص کا سراپا واضح ہوا وہ مکمل طور پر سیاہ رنگ میں ملبوس بائک چلا رہا تھا دوسرے بائکرز کی طرح اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بازی جیتنے والوں میں سے تھا۔ اس کے پیچھے ایک پھر دو اور پھر ایک کے بعد ایک بائک سڑک پر دوڑنے لگے۔ اس خاموشی کو چیرتی آواز سن کر پرندے اپنے اپنے نشیمن سے پرواز کر گئے جانتے تھے کہ خطرہ ان کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔

سب سے آگے اس کی بائک تھی اسے دور سے فنش لائن نظر آئی یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور مشکل راونڈ تھا لیکن اس نے کر دکھایا تھا

"مومن۔ مومن۔ مومن۔" کی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی وہاں کھڑے تمام نفوس کی زبان پر اسی نام کی گردان تھی لیکن وہاں کوئی اور بھی تھا جو تیکھی نگاہوں سے سامنے سے آتے مومن ابراہیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے چند میٹر کی دوری پر عبید باجوہ اس ریس کو جیتنے کے جتن کر رہا تھا

جیسے ہی وہ فنش لائن سے چھے فٹ کی دوری پر پہنچا اس نے اپنے دونوں بازو وا کیے اور فنش لائن کی پٹی کو اپنے سینے پر لپیٹتا وہ آج کی ریس بھی جیت گیا تھا۔ ہر طرف سے مبارکباد کی صدا بلند ہوئی جس میں ہار جانے والوں کے قصیدے دب کر رہ گئے۔

وہ ابھی تک اس ہجوم کے درمیان کھڑی تھی۔ ریسنگ ٹریک اور تمام ناظرین کے درمیان لگائی گئی گرل اٹھا دی گئی تھی۔ سب دوڑ کر مومن ابراہیم کی جانب بڑھ رہے تھے کیا لڑکیاں کیا لڑکے تمام اس وقت ہجوم بنا کر تصاویر بنوا رہے تھے۔

مومن ابراہیم کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں جو بھرے مجمعے میں تنہا کھڑی تھی۔ ہجوم کو چیرتا وہ اس جانب بڑھا۔ زبان پر سیٹی کی دھن بجاتا وہ اس کے قریب سے گزرنے لگا لیکن پھر ٹھہر گیا۔ منہ اس کے کان کے قریب کیا اور صرف دو الفاظ کہے۔

"پھول چور۔" وہ سرگوشی تھی لیکن بسمہ کو لگا جیسے کسی نے اس بھرے مجمعے میں کھڑے ہو کر اس کو چیخ چیخ کر پھول چور بولا تھا۔ آنکھیں پل میں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا۔ مومن ابراہیم اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ چکا تھا لیکن وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے انسو صاف کرتی وہ مڑی اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اپنے موبائل پر مومن ابراہیم کے ساتھ کھنچوائی گئی تصاویر دیکھتی فریال ہڑبڑا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

"بسمہ۔بسمہ سٹاپ اٹ کہاں جارہی ہو۔؟"فریال اس کے قدم سے قدم ملانے میں کامیاب ٹھہری تھی۔اتنے میں ہی اس کا سانس پھول گیا تھا

"مرنے۔۔"وہ گولی کی طرح تیز چلتی جارہی تھی۔

"ہیں۔۔کیوں؟"فریال نے چونک کر اسے دیکھا اس کے چہرہ سرخ ہورہا تھا۔سورج کی تپش بھی اس کے چہرے کو جھلسارہی تھی۔

"میرے پیچھے آنے کی کوشش مت کرو۔"وہ دبادبا سا چلائی اس وقت وہ اکیلی رہنا چاہتی تھی

"کیوں ہم تو آئیں گے۔"اس کے عقب سے بھاری مردانہ آواز ابھری

"ہم؟"وہ چلتے چلتے پلٹی

"ہاں ہم۔۔یعنی میں اور فریال۔"عبید باجوہ اور فریال دونوں بتیسی کی نمائش کرتے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

اگلے منظر میں وہ تینوں ایک پارک میں بنے بینچ پر بیٹھے تھے۔بسمہ شارک بینچ پر بیٹھی ٹھنڈی آئیس کریم سے انصاف کررہی تھی۔جبکہ فریال اس کے پیچھے کھڑی اپنے موبائل میں گم تھی۔

"ہاہاہا مطلب سچ میں تم مومن ابراہیم کو چیلنج کرکے آئی تھی۔اوہ گاڈ۔ہاہاہا۔"عبید اس کے سامنے گھاس پر لوٹ پوٹ ہورہا تھا

"مذاق مت بناؤ میرا۔"اس کی آنکھیں اور ناک ابھی تک سرخ تھیں۔

"لو بھلا اب مذاق کا مذاق نہ بنائیں تو کیا کریں۔"وہ دونوں ایک بار پھر سے قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔اب کی بار ان کی ہنسی میں بسمہ کا قہقہہ بھی شامل تھا وہ خود اپنی بے وقوفی پر ہنس رہی تھی۔

"ویسے اتج کیا ہے تمہاری۔؟"عبید نے سیریس انداز میں سوال کیا

"اکیس سال۔ویسے آپ کیوں پوچھ رہے ہو۔؟"کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھا

"تم سے دو سال بڑا ہے وہ عمر میں بھی اور تجربہ میں بھی۔تمیز سے بات کیا کرو اس سے۔"بسمہ نے آنکھیں گھمائیں

"اور آپ کی عمر سے وہ دو سال چھوٹا ہے۔آپ کیوں اتنی عزت دے رہے ہیں اسے۔"

"وہ ہمارا انچارج ہے۔ہمارا استاد ہمیں ویسے بھی اساتذہ کی عزت کرنی چاہیے۔"بسمہ نے دو تین بار پلکیں چھپکیں یہ اس کا انداز تھا۔

"بسمہ کے دل میں جو آئے گا وہ کرے گی"والا انداز۔

"یار یہ دیکھو کتنا ہینڈسم لگتا ہے یہ۔"فریال نے اسے تپانے کو موبائل میں موجود تصویر اس کے سامنے کی

"اب بچ کر دکھاؤ تم مجھ سے۔" اب فریال سوری سوری کی گردان الاپتی آگے آگے تھی اور بسمہ شارک اس کے پیچھے۔ اس سب میں عبید باجوہ کا زندگی سے بھرپور قہقہہ واضح تھا۔

صبح مومن اور ملک کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا ناشتہ پلیٹ میں ڈھکا پڑا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ لذیذ ناشتہ اس نے آج تک نہیں کیا تھا۔ اب وہ چونکہ اس گھر میں رہ رہی تھی تو اس نے سوچا کیوں نا گھر کی صفائی کر دی جائے اس لیے وہ صفائی کرنے لگ گئی۔ صفائی کے بعد وہ تادیر ٹی وی لاونج میں بیٹھی ایک فضول سی ڈاکومنٹری دیکھتی رہی تھی۔ جب وہ تھک گئی تو اٹھ کر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں جانے لگی باہر آسمان پر ہلکی کالی گھٹا چھا رہی تھی ممکن تھا کہ کچھ دیر بعد بارش برسنے لگتی اور پورے اسلام آباد کو بھگو دیتی۔ وہ مومن کے کمرے کے دروازے کے سامنے رکی۔ اندر کمرے کی بتی جل رہی تھی وہ بتی بند کرنے کی غرض سے اندر داخل ہوئی۔ صاف ستھرا کمرہ اس کی نفیس طبیعت کی عکاسی کر رہا تھا وہ سوئچ بورڈ کی جانب بڑھی ہی تھی کہ نگاہ بھٹکتی ہوئی اس کی سٹڈی ٹیبل پر گئی وہاں ایک ڈائری رکھی تھی سیاہ جلد والی وہ ڈائری یقیناً اس کی ذاتی ڈائری تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈائری اٹھائی

"نہیں انمول یہ اخلاقیات کے خلاف ہے۔ تم کسی کی پرسنل چیزوں کو بنا اجازت نہیں چھو سکتی۔" اس نے خود کی سرزنش کی اور ڈائری واپس رکھنے لگی۔ ٹیبل پر اور بھی بہت سی کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا کچھ کتابیں ساتھ والی دیوار میں نصب بک شیلف میں ترتیب سے پڑی تھیں۔ تبھی کھٹکا ہوا اس نے اپنے قدموں میں جھانک کر دیکا سیاہ جلد والی ڈائری اس کے پیروں میں پڑی تھی جبکہ اس میں سے ایک ورق اڑتا ہوا اس سے دور جا گرا۔

اس نے جلدی سے ڈائری اٹھائی اور وہ صفحہ اٹھا کر ڈائری میں رکھنے لگی لیکن۔۔۔ وہ دنگ رہ گئی وہ کوئی ورق، صفحہ نہیں بلکہ تصویر تھی انمول ملک کی تصویر۔ اپنے دل کی دھک دھک اسے کانوں میں سنائی دی ایک خوف تھا جو اس کے نازک دل کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ وہ ساری اخلاقیات بالائے طاق رکھتی ڈائری لے کر سٹڈی ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

یکے بعد دیگرے صفحات پلٹاتی وہ مومن ابراہیم کی زندگی میں جھانک رہی تھی۔ وہاں سب لکھا تھا اس کی آپ بیتی اس کی زندگی کی روداد۔ حسین تو نہیں لیکن غمگین لمحات اور ان میں سرفہرست انمول ملک کا نام درج تھا۔ وہ ڈائری مومن ابراہیم کے جذبات بیان کر رہی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ مومن ابراہیم سر تا پیر انمول ملک کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا انمول ملک کی ہر حرکت و سکنات پر نظر رکھنے والا مومن ابراہیم انمول ملک کے دل میں اپنی نفرت کا بیج بو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جسے محبت مل جائے اسے قسمت کا دھنا جانو اور جو اپنی محبت کو ہار جائے اس سے بڑا بد قسمت اس دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ابھی تک شل بیٹھی تھی بالکل ساکت اور جامد نا جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اسے وہاں بیٹھے اتنا کہ باہر دن کا اجالا شام میں اور کالی گھٹائیں پانیوں سے بھرے بادلوں میں بدل گئی

تھیں۔ کوئی اپارٹمنٹ کا دروازا کھول کر اندر داخل ہوا تبھی آسمان پر گرج چمک کے ساتھ بجلی کڑکی انمول نے اپنے کانوں پر ہاتھ نہیں رکھے تھے کیونکہ مومن ابراہیم کے الفاظ کی بازگشت اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ کسی کے قدم دروازے کی دہلیز پر رک گئے جیسے چلتی ریل اپنی منزل پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ وہ کھڑی ہوئی اور پلٹی۔ اس کی ناک لال ہو رہی تھی اور غزالی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

مومن کی نگاہ اس کے ہاتھ میں تھامی ڈائری پر گئی وہ لب بھینچے آگے بڑھا۔ نظریں ہنوز جھک گئیں انمول کے قریب کھڑے ہو کر اس کے ہاتھ سے ڈائری لینی چاہی اسی وقت انمول بدک کر پیچھے ہوئی اور مومن کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کی جانب دھکیلا اس نے نظر اٹھا کر انمول کی جانب دیکھا

"چٹاخ" کی آواز کے ساتھ انمول ملک کا ہاتھ مومن ابراہیم کے چہرے پر اپنی چھاپ چھوڑتا چلا گیا۔ وہ تھپڑ مومن ابراہیم کے منہ پر نہیں بلکہ اس کی ذات پر کسی کوڑے کی مانند پڑا تھا۔ انمول ملک نے گہرا لمبا سانس لے کر خود کو پُر سکون کرنا چاہا۔

"تم تم۔ مومن ابراہیم تمہیں شرم نہیں آئی۔" وہ دبا دبا سا غرائی۔ مومن ابراہیم کے لب سل گئے تھے۔

"کیوں مومن ابراہیم کیوں۔ تم نے خود کو میری نظروں میں گناہگار کیا کیوں؟" وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز کہیں دب گئی۔ گلے میں خراش سی ابھر آئی

"محبت گناہ نہیں ہوتی۔ نہ ہی میں گناہ گار ہوں۔" مومن ابراہیم نے اپنی محبت کا دفاع کیا۔ کیا واقعی محبت گناہ تھی اور اسے کرنے والا گناہگار۔؟ جواب 'نہیں' میں تھا۔ محبت تو وہ جذبہ وہ احساس ہوتی ہے جو سنگدل کو بھی نرم دل کر دے جو آگ میں پانی بھر دے جو دور ہوتے ہوئے بھی اپنے ارد گرد منڈلاتی نظر آئے۔

"مومن ابراہیم تم نے تو مجھے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اگر اس ڈائری پر ملک کی نظر چلی جاتی تو جانتے ہو میں کبھی خود کو یا تمہیں معاف نہیں کر پاتی۔" آنسو بھل بھل بہنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ مومن اس سے محبت کرتا ہے۔ باہر آسمان پر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

"میں خود سے شرمندہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جو محبت میں نے کی وہ گناہ کہلائی جا سکتی ہے۔" اس نے زخمی نظروں سے انمول ملک کو دیکھا۔ وہ آج بھی انمول ملک کے لیے ایک بے ضرر سا ملازم تھا کیا؟

"ہنہہ۔ محبت اسے محبت نہیں غداری کہتے ہیں جو تم ملک کے ساتھ کر رہے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھے خود کو باور کروایا

"میں نہیں جانتا تھا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جب سے معلوم ہوا میں پیچھے ہٹ چکا تھا۔" وہ کسی شکست خوردہ انسان کی طرح اس کے سامنے سر جھکا گیا

"یہ۔(ہاتھ میں پکڑی ڈائری سامنے کی) یہ پیچھے ہٹے تھے تم۔" اب کی بار وہ چیخی تھی اور ڈائری کمرے کے ایک کونے میں پڑی کوڑے دان میں پھینک دی۔ ایک لمحے کے لیے مومن ابراہیم کا دل بند ہو گیا

"جائیں یہاں سے۔" چبے ہوئے جبڑوں کے ساتھ دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلی۔

"ایک بات یاد رکھنا مومن ابراہیم۔ جو شخص اپنی ماں کے لیے خود کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتا وہ اپنی دو کوڑی کی محبت کے لیے بھی کبھی سٹینڈ نہیں لے سکتا۔ تم جتنی مرضی مجھ سے محبت کر لو لیکن تا قیامت میری منزل ملک ہی رہے گا۔" وہ اپنا آنچل جھٹک کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اور پیچھے مومون ابراہیم خالی ہاتھ رہ گیا

'ایک محبت کو اس کی ماں نے ٹھکرایا تھا اور آج ایک محبت مومن ابراہیم کو ٹھکرا گئی تھی۔' اس نے سختی سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ وہ سرخ ہو رہی تھیں۔ کھڑکی پر پڑتی بارش کی آواز اس کی سماعت میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ محبت کا انجام اچھا نہیں ہوتا لیکن۔ اس کی محبت کی داستان تو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کا دل پھٹنے لگا۔ سانس جیسے سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ وہ کھڑکی کھول کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بارش اس کے چہرے کو بھگونے لگی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کیسے اس کی محبت کو دو کوڑی کا کر گئی تھیں۔

انمول ملک باہر ٹی وی لاونج میں رکھے صوفے پر بیٹھی تھی گھٹنوں پر سر ٹکائے۔ تبھی مومن ابراہیم کے کمرے کا دروازا کھلا وہ باہر نکلا ایک ہاتھ میں ہینڈ کیری تھامے اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور انمول ملک کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ انمول کی نگاہ اس کے جوگرز سے اوپر کی جانب اٹھتی گئی۔

"میں نہیں جانتا تھا یہ محبت میرا اتنا بڑا نقصان کر جائے گی۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ کبھی آپ کے اور بھائی کے لیے میرے دل میں چور نہیں تھا۔ مجھے جب اس دن معلوم ہوا کہ آپ بھائی سے محبت کرتی ہیں میں اپنا راستہ بدل گیا تھا۔" گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑا تھا

"کاش میں کچھ دیر سے آتا اور آپ آگے کے چند صفحات پڑھ لیتی تو آپ کو پتا چلتا کہ مومن ابراہیم کی وفاداری کا پرچم بہت بلند ہے۔
"انمول یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں صوفیہ ابراہیم جیسی گہری بھوری تھیں۔ ان آنکھوں میں رقم داستان تو وہ بہت پہلے ہی پڑھ چکی تھی۔

"خیر آپ سے محبت میری زندگی کا ایک بڑا خسارہ تھی۔اس یک طرفہ محبت کا انجام ایسا ہی لکھا تھا اس نے مجھے خواب دکھائے اور پھر درد دے کر خالی ہاتھ چھوڑ دیا۔میری دعا ہے کہ آپ کو آپ کی محبت جلد از جلد مل جائے۔"اس نے دیکھا مومن ابراہیم کی آنکھ کا گوشہ نم تھا۔وہ بہت ضبط کیے کھڑا تھا۔پھر اس نے گہری سانس بھری اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن مومن نے اسے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ فکر نہیں کریں اس بارے میں بھائی کو معلوم نہیں ہو گا۔خدا حافظ۔"اور پھر وہ چلا گیا۔انمول ملک نے لب کچلے کیا ملک کبھی اسے معاف کر پائے گا؟

جیا اس وقت لاونج میں بیٹھی ہوئی تھی گھر میں کوئی بھی نہیں تھا وہ اس وقت اکیلی تھی۔پرسوں اس کا اور بالاج کا نکاح تھا اور منہا کی مہندی۔جس کے لیے آنے والے مہمانوں کا انتظام برابر والا گھر رینٹ پر لے کر کیا گیا تھا۔وہ خوش بھی تھی اور اداس بھی بے شک اس کے پاس بہت رشتے تھے لیکن وہ تمام اس کے والدین کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔وہ دکھی دل سے مسکرا دی اب مسکرانے کا وقت تھا جو شخص اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہا تھا وہ یقیناً اسے خوشیوں سے بھر دے گا۔اسے یقین تھا کہ بالاج سکندر کبھی کوئی غم اس کے قریب نہیں آنے دے گا۔

وہ چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آ گئی۔باہر پورچ میں گاڑی کھڑی کرنے کی آواز آئی تھی اس نے وقت دیکھا معید سکندر لوگوں کے آنے میں ابھی وقت تھا یقیناً بالاج گھر واپس آ گیا تھا۔اس نے جلدی سے کیتلی میں پانی چڑھا کر چولہے پر رکھا اور اس میں چائے ڈالنے لگی۔

بالاج شادی کی تمام تر ارینجمنٹس دیکھ کر آیا تھا۔پرسوں کے فنکشن کی تیاریاں شام میں شروع ہو جانی تھیں۔وہ جانتا تھا جیا گھر پر اکیلی ہو گی اس لیے وہ آج جلدی واپس آ گیا تھا۔تبھی کچن کے پاس سے گزرتے وہ اندر داخل ہوا۔

"اسلام علیکم۔"گلا کھنکار کر سلام عرض کیا۔جیا کا رخ دوسری جانب تھا وہ جان بوجھ کر اس طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"واعلیکم السلام۔"آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"اس گریز کی وجہ جان سکتا ہوں۔؟"بالاج کو اس کے ناں دیکھنے پر چڑ ہوئی۔جیا سکندر کا دل زور سے دھڑکا

"آہاں۔ماما کہتی ہیں شادی سے پہلے دلہن اپنے دلہا سے نہیں ملتی۔"بالاج نے توسیفی انداز میں آبرو اکھٹے کیے

"میڈم یہ دلہن پچھلے بیس سالوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہے۔"جیا کا دل کیا اپنے کان لپیٹ لے۔

"آپ پلیز جائیں یہاں سے۔"بالاج کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے

"کیوں۔؟ میں تو نہیں جارہا۔" وہ وہیں ٹک کر کھڑا ہو گیا

"پلیز" اس کے اصرار پر بالاج نے 'اوکے' کہہ کر اثبات میں سر ہلایا۔ جیا نے قدموں کی چاپ سنی تو دل ہی دل میں شکر ادا کر گئی۔ تبھی اس نے برنر کی آنچ آہستہ کرتے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی بالاج سکندر کچن کے درمیان میں رکھے ٹیبل سے ایک کرسی کھینچے بیٹھا ہوا تھا ایسے کہ ایک ہاتھ تھوڑی تلے تھا وہ بہت فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ چیٹنگ ہے۔" جیا روہانسی ہوئی۔

"اور وہ کیا ہے جو تم کر رہی ہو۔ اگر تو آپ کو لگتا ہے کہ میرے سامنے نہ آکر آپ کے چہرے پر مزید روپ آئے گا تو آپ کی اور آپ کی ساسوماں کی یہ تھیوری غلط ہے۔" بالاج اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما۔

"مجھے تم ہر حال، ہر روپ میں قبول ہو کیونکہ مجھے تم پسند ہو تم سے جڑی ہر شے پسند ہے۔" جیا کا ہاتھ اب بھی بالاج کے ہاتھ میں تھا۔ جیا نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔

"جیا کوئی پریشانی ہے کیا۔؟" بالاج کا لہجہ بہت نرم تھا

"نن۔ نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس ماما بابا کی یاد آرہی تھی۔" جیا نے نظریں چرائیں

"اس کے علاوہ بھی کچھ ہے جو تمہیں ڈسٹرب کر رہا ہے۔ بتاؤ مجھے کیا مسئلہ ہے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا اس مسئلہ کو۔" بالاج نے اس کی ہمت بڑھائی

"حر۔ حریم ناز۔" اٹکتے ہوئے لہجے میں اس نے اپنا مسئلہ پیش کیا۔

"اس سے کیا مسئلہ ہے تمہیں۔؟" بالاج نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ جیا نے کیتلی میں پکتی چائے میں چمچ ہلایا۔

"وہ آپ کی پہلی محبت ہے۔ آپ اسے کبھی بھلا نہیں پاؤ گے۔" بالاج اسے دیکھتا رہ گیا جو اس خدشے کو اپنے دل میں جگہ دیے بیٹھی تھی۔

"تم سے محبت میرا نصیب تھی جو مجھ سے جڑنے جارہی ہے۔ اور حریم ناز میری پہلی محبت" تھی "میرا حال تم ہو جیا سکندر۔" تھی پر خاصا زور دیا گیا۔ وہ اب بھی پر شکوہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بالاج نے خود کو پُر سکون کرنا چاہا۔

"دیکھو جیا۔ میں بار بار صفائیاں پیش نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات وہ عورت میرا ماضی تھی جسے بھلا کر میں نے تمہیں چنا ہے۔ اس کی تمام یادیں دفنا کر اس کریہ ناچیز تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اب بولو جیا سکندر۔ کیا بالاج سکندر کو تم سے دوسری محبت کرنے کی اجازت ہے۔؟" بالاج نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلائیں

"ہاں" جیا نے نم آنکھوں سے اثبات میں سر ہلاتے اپنے دونوں ہاتھ اس کی ہتھیلیوں میں رکھ دیے۔ بالاج مسکرا دیا پرسوں وہ اس کی ہو گی۔ اس کی دسترس میں ہو گی۔ اس پر صرف بالاج سکندر کا حق ہو گا۔

جیا اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس نے اپنے والٹ میں لگی حریم ناز کی تصویر بھی پھینک دی ہے؟ لیکن وہ یہ پوچھ کر اس کا پارا ہائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس وقت ٹریننگ ڈپارٹمنٹ میں موجود ایک کمرے میں کھڑا تھا۔ یہ کمرہ مومن اور ملک کے زیرِ استعمال تھا وہ دونوں جب بھی کبھی لیٹ ہو جاتے تو یہیں ٹھہر جاتے تھے۔ اس وقت وہ بیڈ پر نیم دراز تھا کمرا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے یہاں آنے کی خبر ملک کو ہونے والی تھی لیکن اسے پرواہ نہیں تھی اب جو بھی ہو جائے۔ اس ہفتے سے ٹریننگ کی تمام کلاسز مومن ابراہیم نے لینی تھیں جس کے لیے وہ خود کو ہشاش بشاش رکھنا چاہتا تھا

"مومن۔" ملک نے دروازے پر دستک دی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھ کے نم کنارے صاف کیے اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"مجھے ابھی مینیجر سے پتہ چلا کہ تم یہاں ہو تو میں یہیں چلا آیا۔ تم ٹھیک ہو۔؟" ملک نے کمرے میں لگی لائیٹ آن کی۔ تبھی مومن ابراہیم کی آنکھیں چندھیا گئیں بیت دیر سے روری آنکھیں اس روشنی کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔

"مومن کیا ہوا ہے تمہیں۔؟" ملک نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھاما وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ملک سے لپٹ گیا۔

"ب۔ بھائی درد ہو رہا ہے دل میں بہت سخت۔" ملک نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"مومن بی بریو۔ یہ سب تو ہونا ہی تھا۔" وہ روتے ہوئے مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا

"میں نے تو دفن محبت کی تھی۔ وہ کیسے میری محبت کو دو کوڑی کا کر سکتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ سے بے وفائی کر رہا تھا۔ میں کچھ نہیں ہوں بھئی۔ میں کہیں نہیں ہوں" ملک کا دل پسیج گیا۔ وہ لب بینچے اسے خاموش کروا رہا تھا۔

"مومن میرے بھائی ادھر دیکھو میری طرف۔ تم بے وفا نہیں ہو تم میرے لیے اپنی جان سے زیادہ قیمتی ہو۔ میں تم پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں۔ تم نے کیسے سوچ لیا تم کچھ نہیں ہو۔" ملک نے اس کے ماتھے پر چپکتے بال پیچھے کیے اس کا پورا جسم جلتے کوئلے کی مانند دہک رہا تھا۔ ملک نے اسے بستر پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑا پُر سکون ہو چکا تھا۔

"مومن ابراہیم کبھی کسی کے لیے اہم نہیں رہا بھائی مجھے ایسی زندگی نہیں جینی جو مجھے دکھ کے سوا کچھ نہ دے سکے۔" وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"منہ توڑ دوں گا میں تمہارا۔ آئندہ ایسی بکواس بات مت کرنا۔ تم جانتے ہو تم اس ملک کی جان ہو۔" ملک نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگایا

"تم تھوڑی دیر آرام کرو مجھے اپنی کلاس لینی ہے۔ پھر بات ہو گی۔" مومن نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا

"کیا ہو رہا ہے یہاں پر۔؟" ملک نے دروازہ کھولا تو وہ گرتے گرتے بچی

"وو۔ وہ سر میں تو۔" بسمہ شارک سے بولا ہی نہیں گیا۔ اس کے چہرے سے صاف واضح تھا کہ وہ اندر ہونے والی گفتگو سن چکی ہے۔ اندر بیٹھے مومن ابراہیم نے اسے سخت گھوری سے نوازا تھا ملک نے ٹھک کی آواز سے دروازہ بند کیا۔

"کیا ہوا ہے اسے۔؟" بسمہ شارک نے حلق تر کیا

"دل ٹوٹا ہے اس کا۔ اس وقت زخمی ہے وہ۔" ملک نے گہری سانس بھر کے بتایا ساری گفتگو تو وہ سن ہی چکی تھی۔

"میں کوشش کروں اس سے بات کرنے کی۔؟"

"بہت شوق ہے تمہیں شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کا۔" ملک نے استہزائیہ سر جھٹک کر دروازے کا لاک کھولا اور وہاں سے چلا گیا۔ بسمہ نے مڑ کر دیکھا ملک دور جا چکا تھا

"کیا اسے جانا چاہیے یا نہیں۔؟" سارے خیالات کو پرے رکھتی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"کیا میں اندر آ جاؤں۔؟" کمرے کے نصف میں کھڑے ہو کر اجازت مانگی

"تم اندر آ چکی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہیں جاؤ یہاں سے۔" اسے اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر مومن اپنی جگہ سے اٹھا

"کیا چاہتی ہو تم۔؟" وہ دانت پر دانت جمائے بولا

"تم دکھی ہو۔" بسمہ شارک کو اس کی حالت پر ترس آیا

"ظاہر ہے میں دکھی ہوں۔ شرمندہ ہوں اپنی غلطی پر۔ تم پلیز جاؤ یہاں سے۔" لیکن وہ وہیں کھڑی رہی

"مجھ سے دوستی کر لو۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

"میں نامحرم لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔" مومن ابراہیم نے سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈالا

"بالکل تم تو نامحرم لڑکیوں سے محبت کرتے ہو۔" مومن نے زور سے گلاس ٹیبل پر پٹکا پانی چھلک کر ٹیبل پر گر گیا۔ وہ اس کی جانب آیا اور اسے بازو سے تھام کر باہر کی جانب دھکیلا

"تم جیسی لڑکی کو یہ بات سوٹ نہیں کرتی بسمہ شارک۔ کیا میں بتاؤں تمہارا باپ کون ہے۔۔۔۔؟"بسمہ شارک اپنی جگہ ساکت ہوئی تھی ہمیشہ اس کی ذات کو اس کے باپ سے جوڑ کر توڑا جاتا تھا اور آج بھی یہ شخص جس کی دل جوئی کے لیے وہ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر آئی تھی وہ اسے اس کے باپ کے نام سے جانتا تھا۔ وہ درست تھی سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔

آج موسم کافی ابر آلود تھا سڑک جگہ جگہ سے بھیگی ہوئی تھی۔ وہ ساری رات مومن ابراہیم کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ وہ بخار میں تپ رہا تھا اور وہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا شام ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ اسے پہلے مومن ابراہیم کو پک کرنا تھا۔ اور پھر اپنے اپارٹمنٹ جانا تھا۔ لیکن اس سب سے پہلے اسے ایک اور کام کرنا تھا اسے کسی کو باخبر کرنا تھا۔

وہ اس وقت جہانداد ملک کے ضروری کام سے سائڈ پر آیا ہوا تھا جب اس کے فون پر کسی شناسا نمبر سے کال آئی۔

"ہیلو۔ ہاں کیا خبر ہے۔" ندیم نے اپنے بھاری لہجے میں دریافت کیا۔ آگے سے کہے جانے والے الفاظ نے اس کے چہرے کی چمک کو مزید بڑھا دیا تھا

"یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ اور یہ خبر جہانداد ملک تک نہیں پہنچنی چاہیے۔" ندیم کا قہقہہ خاموش فضا میں گونجا

"ہاں مالک تو ہے وہ۔ لیکن کیا میں اس کا غلام ہوں۔ ارے نہیں جناب آپ نے غلط سن رکھا ہے۔ ہاہاہا۔" اب وہ مزید باتیں کرتا ساتھ میں اپنا کام نمٹا رہا تھا۔ چہرے پر خفیہ مسکراہٹ اور چالاکی جھلک رہی تھی۔

ملک کل صبح کا گیا ابھی تک نہیں آیا تھا نا جانے مومن ابراہیم نے اسے کچھ بتایا تھا یا پھر وہ خاموش رہ گیا تھا۔ وہ صبح سے اکیلی ہی گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دروازے پر بیل بجی تو وہ بھاگ کر دروازے کے قریب گئی۔ پریشانی سے پھولتا سانس درست کیا اور دروازہ کھولا

"اسلام علیکم۔" ملک نے سر کے خم سے جواب دیا۔ انمول ملک ابھی تک دروازے پر ایستادہ اس کے پیچھے کھڑے مومن ابراہیم کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔

"تیار ہو جائیں انمول۔ آج شام مغرب کے بعد نکاح ہے۔" انمول نے اس کی جانب دیکھا۔ تو بلآخر اسے اپنی محبت کی قربانی دینی ہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی اس محبت کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ وہ گہرا سانس بھر کر پیچھے ہٹ گئی۔

دن کا اجالا رات کی سیاہی میں تبدیل ہوا تو سیاہ تاریک آسمان پر پھلجھڑیاں بکھر کر روشنی کا سا گمان دکھانے لگیں۔ کہیں خوشیاں میسر تھیں تو کہیں غم اپنا ڈیرا جمائے بیٹھا تھا۔ اس پوش ایریا میں واقع سکندر ہاؤس کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری زرد گیندے کے پھولوں سے سجائی گئی تھی۔ برقی قمقموں اور فرشی فانوسوں سے رات کی تاریکی میں اجالا ہو رہا تھا۔ مہندی کی رسم جاری تھی سامنے اسٹیج زرد اور سبز رنگ میں سجا ہوا تھا۔ منہا اور علی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے آنے والے مہمانوں سے مل رہے تھے۔ مہمان آتے اور رسم کر کے چلے جاتے۔ شادی بیاہ کے موقع پر تو لوگ سب سے زیادہ خوش ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ گوسپس تو لوگوں کا اولین مشغلہ ہوتا ہے۔ بلے بلے" گانے کے بول ماحول میں سر بکھیر رہے تھے اسٹیج کے دائیں جانب ہی لڑکیاں اور عورتیں ڈھولک رکھے اپنا گانوں کا شوق پورا کر رہی تھیں۔ مہندی کی رسم سے فارغ ہوتے ہی بالاج اور جیا کے نکاح کی تیاری شروع ہوئی دو کرسیاں آمنے سامنے رکھ کر بیچ میں سفید پھولوں سے بنی چادر لگا دی گئی۔ علی اور تمام لڑکوں نے بالاج سکندر کو لا کر ایک جانب کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ سفید رنگ کا کرتا پہنے بال نفاست سے سیٹ کیے ہوئے تھا۔ نا جانے کتنی لڑکیاں اس کی جانب دیکھ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں جواب جیا کا نصیب تھا انہی سب میں ایک آہ عالیہ جعفری کی بھی تھی۔ جو دل ہی دل میں جلتی کڑھتی اپنا رونا رو رہی تھی۔ خوشی بالاج کے انگ انگ سے پھوٹتی نظر آ رہی تھی آج اس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں ایسی چمک معید سکندر نے اپنے بیٹے کے چہرے پر زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ تبھی سب کی پر شوق نگاہیں گھر کے داخلی دروازے کی جانب اٹھیں۔

جیا سکندر نے اپنی سہیلی انعم کے ہمراہ لان میں پہلا قدم رکھا۔ وہ سہج سہج کر قدم اٹھاتی اسٹیج کی جانب بڑھ رہی تھی۔ منہا اپنی دلی کیفیت سے مجبور ہوتی اٹھ کر اس کی جانب آئی اور اس کے سر پر چھت کی مانند کیے گئے دوپٹے کا کونا تھام لیا۔ بالاج نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اپنے دل کو ڈپٹا جو جیا سکندر کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت تھوڑی تک آتے گھونگھٹ میں تھی جو بالاج سکندر کو اپنا دشمن معلوم ہو رہا تھا۔ پھولوں کی چادر نے جیا سکندر کے سراپے کو مزید چھپا دیا یہ بھی ایک امتحان تھا جس سے بالاج سکندر کو گزرنا تھا اور بلآخر جیت تو اسی کی ہونی تھی نا۔ ثانیہ بیگم دل ہی دل میں اپنے گھر کی خوشیوں کی دعا مانگ رہی تھیں۔ قاضی صاحب جیا کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کلمات کا دور شروع ہوا اور پھر انہوں نے جیا سے اس کی رضامندی پوچھی۔

"جویریہ سکندر ولد واجد سکندر آپ کا نکاح بالاج سکندر ولد معید سکندر سے بلعوض دس لاکھ روپے کیا جاتا ہے کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟" بالاج کی نظریں پردے کی دوسری جانب جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ منہا نے پیچھے سے جیا کے کندھے پر ہاتھ رکھا

"قبول ہے۔" اس کی آواز بالاج سکندر کے کانوں میں رس گھول گئی۔ ایک سکون اور طمانیت نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا

"کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟" دوسری مرتبہ پوچھا گیا۔

"قبول ہے۔"

"کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟" تیسری مرتبہ استفسار ہوا

"قبول ہے۔" ایک باغی آنسو پلکوں کی باڑ توڑ تا سرخ و سپید گالوں پر بہتا چلا گیا۔ اس وقت وہ خوش بھی تھی اور غمگین بھی۔ اپنوں کی یاد نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ لمبے لمبے سانس لیتی خود کو پُر سکون کرنے لگی۔

اب قاضی وہی عمل بالاج کے ساتھ دوہرا رہا تھا جہاں قبول ہے کی تیسری دفعہ صدا بلند ہوئی وہیں مبارک باد کو آوازنے چار سو شور اٹھا دیا۔ جہاں فضا میں مبارک باد کی آوازیں سر بکھیر گئیں وہیں عالیہ جعفری اس منظر سے غائب ہو گئی تھی وہ یہ تماشا مزید نہیں دیکھ سکتی تھی۔ حسد کی آگ میں جلتی وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

جیا اور بالاج کے درمیان سے پھولوں کی چادر اٹھی تو منظر واضح ہوا۔ سامنے ہی جیا سکندر ہلکے گلابی رنگ کی میکسی زیب تن کیے اس کے دل پر بجلیاں گرانے کا کام کر رہی تھی۔ بالاج اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیا سکندر کا دل زوروں سے دھڑکا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ بالاج نے جیا کے چہرے سے دوپٹہ ہٹایا۔ گھونگٹ میں چھپا چہرہ واضح ہوا۔ ہر طرف سے سرخ پھولوں کی پتیوں نے ان دونوں کا بسیرا کیا ہر جانب سے ہوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ بالاج نے آگے بڑھ کر جیا کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے جیا کا سانس تھم گیا آس پاس کی ہر شے جیسے ساکت ہوئی تھی۔ بالاج نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور ان پر اپنے لب رکھ دیے جیا کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا اس سے دیکھا ہی نہیں گیا۔ ادھر سے منہا اور علی نے بالاج کو آڑے ہاتھوں لیا تو دوسری لڑکیوں نے جیا کو سامنے اسٹیج پر رکھت دوسرے صوفے پر بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد بالاج بھی اس کے پہلو میں آبیٹھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی تمہاری تعریف کیسے کروں۔" وہ اپنا رخ جیا کی جانب کیے بیٹھا تھا۔

"تو رہنے دیں مت کریں۔" جیا نے ناک بھوں چڑھائی۔ بھلا نئی نویلی دلہن کی تعریف کرنے میں کیسی کنجوسی؟؟

"تمہیں دیکھ کر تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید ہی کوئی آج سے پہلے میرے دل کو اتنا خوبصورت لگا ہو لیکن۔۔ تمہارا یہ روپ بہت بہت بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔" اس کے دل میں جو آیا وہ بولتا گیا جیا کا مدھم سا قہقہہ گونجا وہ واقعی تعریف کرنے میں کنجوسی کر رہا تھا۔

ایک دم سے جیا کی ہنسی سنجیدگی میں بدلتی گئی۔ آنکھوں میں ہنسی کی جگہ غصے نے لے لی وہ بالاج کی جانب پلٹی

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟" بالاج جو اسے دیکھنے میں مصروف تھا اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ حریم ناز نک سک سے تیار ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں سفید پھولوں کا بکے تھا۔

فوٹو شوٹ کرواتے علی اور منہا کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ میں چھوڑوں گی نہیں اس کو۔" منہا غصے میں اس کی جانب بڑھنے لگی لیکن علی نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"علی چھوڑیں مجھے۔ یہ میرے گھر کی خوشیاں تباہ کرنے واپس آئی ہے۔" لیکن علی نے اسے اپنی مظبوط گرفت سے آزاد نہیں کیا

"بالاج اسے خود ہینڈل کر لے گا منہا۔ ڈونٹ اوور ری ایکٹ۔" منہا پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

"نکاح مبارک ہو بالاج سکندر اینڈ مسز بالاج۔ یہ آپ کے لیے۔" حریم نے ہاتھوں میں تھاما سفید پھولوں کا بکے ان دونوں کی جانب بڑھایا۔ بالاج نے مٹھیاں بھینچ لیں وہ یہاں کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا کرنے آئی ہو تم یہاں؟" جیا سر جھکا گئی وہ اس لڑکی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی بالاج نے اس کے ہاتھ سے بکے تھاما اور دور پھینک دیا

"اگر تم نے کوئی تماشا کھڑا کیا تو اپنے ہاتھوں سے تمہاری جان لے لوں گا۔" انگلی اٹھا کر تنبیہ کی اور پھر وہ اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔ حریم نے اسے جاتے دیکھا

"چچ کون سا تعویذ گھول کر پلایا ہے بے چارے کو۔ یقین نہیں ہو رہا یہ وہی بالاج ہے جو حریم ناز کا نام لیتے نہیں تھکتا تھا۔" وہ جیا کے ساتھ براجمان ہوئی۔ جیا کھسک کر تھوڑا دور ہو گئی۔

"آپ ہمیشہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ وہ سب آپ کا اور بالاج کا ماضی تھا جسے وہ کب کا بھول چکے ہیں امید ہے کہ آپ بھی آئندہ احتیاط کریں گی۔" جیا نے اسے باور کرایا حریم ناز کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"وہ لڑکا ہے اس کا ماضی تو سبھی بھول جائیں گے لیکن تم جیا سکندر کیا تمہارا ماضی کوئی بھول پائے گا؟" جیا کے دل کی دھڑکن تھمی تھی۔ حریم ناز اپنی پہلی چال چلتی اب شاطرانہ مسکرا رہی تھی۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

"وہاج ملک۔ یاد تو ہو گا نا تمہیں بلکہ رکو کچھ دکھاتی ہوں تمہیں۔" حریم نے اپنے موبائل میں کچھ تصاویر نکال کر اس کے سامنے کیں۔

"یہ دیکھو ہے نا دھما کے دار۔ سوچو اگر میں نے یہ سب بالاج کو دکھایا تو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا۔" جیا نے سرخ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ایک عورت ہو کر ایسا کیسے کہہ سکتی تھی۔

"یہ سب میری غلطی تھی وہ کبھی مجھ پر شک نہیں کریں گے۔" اسے یقین تھا

"بہت مان ہے تمہیں اپنے بالاج پر۔ لیکن افسوس تم اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھول پائیں۔" حریم نے بجھی ہوئی آگ کو ہوا دی تھی شاید کوئی چنگاری بچی ہو جو اس سب کو خود ہی اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالے۔

"وہ میری محبت نہیں تھا۔ اس جیسا گھٹیا مرد کسی عورت کی محبت نہیں ہو سکتا۔" وہ چلائی تھی لیکن اس کی آہستہ آواز میں۔

"بالکل تو پھر تم اس ہوٹل میں کیا کرنے گئی تھی جب اس نے تمہارے ساتھ۔۔"

"شٹ اپ۔" جیا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سانس رکنے لگا تھا یا شاید گھڑی کی سوئیاں بارہ بجانے لگی تھیں۔

"آہستہ چیخو جیا بالاج سکندر اگر کسی نے سن لیا تو۔" جیا کی نظریں اپنے دائیں جانب اٹھتی گئیں۔ اسے لگا وہ اگلا سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی فنا ہو جائے گی۔ کیونکہ سننے والا سن چکا تھا۔ وہ پلک تک جھپکنا بھول گئی۔

باب نمبر 5

"آہستہ چیخو جیا بالاج سکندر اگر کسی نے سن لیا تو۔" جیا کی نظریں اپنے دائیں جانب اٹھتی گئیں۔ اسے لگا وہ اگلا سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی فنا ہو جائے گی۔ کیونکہ سننے والا سن چکا تھا۔ وہ پلک تک جھپکنا بھول گئی۔

اگر آپ کا بھید کوئی اپنا جان لے تو غم نہ کرو وہ تمہارا راز کسی تیسرے کو نہیں بتائے گا لیکن اگر وہ بھید کسی پرائے کو معلوم ہو جائے تو تمہارا غم کرنا بنتا ہے۔

جیا سکندر کی مثال بھی اس وقت ایسی ہی تھی وہ وحشت زدہ آنکھوں سے اپنے دائیں جانب کھڑی عالیہ جعفری کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر پھیلے حیرت کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ وہ کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو حرف بہ حرف سن اور سمجھ چکی ہے۔

"سو فائنلی جیا سکندر۔ تم بھی ان لڑکیوں میں سے نکلی جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نامحرم کی محبت میں جکڑ جاتی ہیں۔" عالیہ کے الفاظ نے اسے تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ شل سی ان دو عورتوں کو دیکھ رہی تھی جن کی آنکھوں میں اس کے لیے تنفر اور حقارت تھی۔

"آپ اپنے قیمتی الفاظ اپنے پاس رکھیں جیا سکندر اتنی گئی گزری نہیں ہے کہ اس جیسے بے غیرت انسان کے جھانسے میں آ جائے۔" اس کی بات پر سامنے بیٹھی حریم ناز کا مدھم سا قہقہہ گونجا جس میں طنز واضح تھا۔

"کس کس کا منہ بند کرواؤ گی جیا۔؟میرا جس کے پاس ٹھوس ثبوت ہیں،اس لڑکی کا جو تمہارا اعتراف اپنے گناہگار کانوں سے سن چکی ہے یا پھر وہاج ملک کا جو اس واقعے کا اہم کردار ہے۔؟"حریم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟کیا ملے گا آپ کو یہ سب کر کے۔؟"جیا کی بس ہوئی تھی۔

"بالاج سکندر۔"دونوں لڑکیوں نے یک زباں ہو کر بولا۔حریم نے جھٹکے سے عالیہ کی جانب دیکھا وہ سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ حریم ناز کا اگلا ہدف وہ بنے۔

"دیکھو جیا سکندر۔جتنا ہو سکے بالاج سے دور رہنا کیونکہ وہ صرف میرا ہے،چار سال پہلے بھی میرا تھا اور تا عمر بھی میرا ہی رہے گا۔"حریم ناز کی زبان سے یہ الفاظ ایک ادا سے نکلے تھے۔

"وہ بالاج سکندر ہیں کوئی سایہ نہیں جو پرچھائی کی طرح ساری زندگی آپ کے رہیں گے۔"جیا حریم کے سامنے سے ہٹ گئی۔سامنے سٹیج سے نیچے کا راستہ واضح تھا پھولوں سے سجی ایک راہداری جو داخلی دروازے تک جاتی تھی۔مطلب صاف تھا کہ وہ جا سکتی ہے۔ حریم لال بھبوکا چہرہ لیے سٹیج سے نیچے اترتی چلی گئی۔اس کی دیکھا دیکھی عالیہ بھی وہاں سے ہٹ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھی وہ۔؟"منہا جیا کے قریب آتی پوچھنے لگی۔

"وہ آج بھی بالاج پر نقب لگائے بیٹھی ہے۔"آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"بھائی صرف تمہارے ہیں جیا۔اب یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم ایک اچھی اور خوشحال زندگی جینا چاہتی ہو یا حریم ناز کو خیالات کا مرکز بنا کر اپنے اور بھائی کے درمیان دوریاں اور تلخیاں پیدا کرنا چاہتی ہو۔"منہا نے اسے واپس صوفے پر بٹھایا۔صد شکر کہ کوئی ان کی جانب متوجہ نہیں تھا۔

"میں ایسا نہیں چاہتی منہا۔لیکن جب بھی میری زندگی میں کچھ اچھا ہونے لگتا ہے کچھ یادیں میرے ذہن کو الجھا دیتی ہیں۔میں نہیں سمجھ پا رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"اس کی آنکھیں برسنے کو تیار تھیں جنہیں جھپکتی وہ آنسوؤں کے آگے پل باندھنے لگی۔منہا اس کی میکسی کا دامن درست کر رہی تھی۔

"تم جانتی ہو آج کے دور میں کامیاب انسان کون ہوتا ہے۔؟"اس نے لمبا گھیر دار دامن مزید پھیلایا۔

"کون؟"جیا نفی میں سر ہلاتی پوچھنے لگی۔

"وہ جو ماضی سے نکل کر مستقبل میں رہنا سیکھ جاتا ہے۔"منہا اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔اس نے سامنے دیکھا علی اور آفرین جہاں کسی رشتہ دار سے مل رہی تھیں۔ثانیہ بیگم اور معید سکندر ایک ساتھ کھڑے مہمانوں کا خیال کر رہے تھے۔بالاج وہاں موجود نہیں تھا نا جانے وہ کہاں تھا۔

"اور ایسے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں۔؟" وہ خیالوں میں گم بولی۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو تم بھی۔ ایسے لوگ ہمارے ارد گرد ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی آنکھوں پر لگی ماضی کی پٹی ہٹا کر دیکھیں تو یہ دنیا اور اس میں رہنے والے لوگ صاف نظر آئیں گے۔ بھائی کو دیکھو انہوں نے ماضی میں ایک غلط فیصلہ لیا تھا جس سے دستبرداری حاصل کرنا ان کے بس میں نہیں تھا لیکن تم ان کی اندھیر نگری میں اجالے کی ایک کرن بن کر آئی جو آج ان کا نصیب بن چکی ہے۔" منہا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما۔

"غلط۔۔ کچھ یادیں ہمارے زہن پر اس انداز سے اثر کرتی ہیں جنہیں بھلانا ہمارے بس کی بات نہیں۔" منہا گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔

"میں نہیں جانتی ایسی کیا شے ہے جو تمہیں اریٹیٹ کر رہی ہے لہذا اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال اپنا موڈ ٹھیک کرو اگر کسی نے دیکھ لیا تو بلاوجہ باتیں بنیں گی۔" منہا نے اس کے ہاتھ پر دباؤ بڑھایا تو جیا نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اپنے کمرے میں لگے سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ وارڈروب کی جانب آئی۔ ٹٹول کر ایک ہلکا کانسی رنگ کا جوڑا باہر نکالا۔ ملک اس کا تمام سامان اس تک پہنچا چکا تھا۔ کب کیوں کیسے یہ جاننے کی انمول نے خواہش نہیں کی تھی۔ اس جوڑے کے ساتھ ہم رنگ ہی دوپٹہ تھا لیکن اسے یہ دوپٹہ نہیں چاہیے تھا۔ اس نے وارڈروب سے ایک اور شاپنگ بیگ نکالا اور اسے لا کر بیڈ پر الٹ دیا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی چادر تھی جس کا رنگ خون سے بھی گاڑھا معلوم ہوتا تھا۔ انمول ملک کی نظریں اس کپڑے کے ٹکڑے میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔ گھڑی کی سوئیاں بھی ایک دم ٹھہر گئیں۔ وقت الٹے پاؤں چلنے لگا۔

وہ شام بھی سردیوں کی شاموں جیسی ٹھنڈی اور یخ تھی اسلام آباد میں سرد موسم کا دورانیہ جتنا کم ہوتا ہے اتنا شدید بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں انمول اپنے کمرے کی بالکنی کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے کھڑی تھی۔ نیلے رنگ کی بیل باٹم پر وہ گلابی گھٹنوں سے اوپر آتی شرٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے سیاہ بال آبشار کی طرح پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انیس سالہ انمول ملک آج کی میچور اور سادہ انمول سے مختلف تھی۔ وہ کسی ماڈل کی طرح سٹائلش لڑکی تھی جس کی اولین ترجیح کپڑے، جوتے اور کاسمیٹکس ہوتا ہے۔ دفعتاً اس کی نگاہ نیچے پھیلے سبز لان میں گھومتی ایک نقطے پر آ کر ٹھہر گئی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھامے وہ لڑکا سامنے کھڑی شائستہ بی کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ یک ٹک اس کی جانب دیکھے گئی پچھلی بار انمول کی اس سے لڑائی ہو گئی تھی اور اپنی ناک اونچی رکھتے ہوئے وہ اس شخص سے قطع کلام کر چکی تھی لیکن دل اور آنکھوں کی پیاس پانی تھوڑی مانگتی ہے۔ شائستہ بی سر ہلاتی حویلی کے اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ تبھی وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور بالکنی کا دروازہ کھول کر کمرے میں گم ہو گئی۔ نیچے اپنی انیکسی کی

جانب بڑھتے ملک نے سر اٹھا کر اس کے کمرے کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے کسی کی نگاہوں کی تپش وہ خود پر باخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

"شائستہ بی۔ یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔؟" پھولے تنفس کے ساتھ بھاگتی انمول ملک کے قدم سیڑھیوں کے آغاز پر آ کر سمٹ گئے۔

"انمول بیٹی یہ ملک نے دیا ہے کہہ رہے تھے کہ آپ نے منگوایا تھا۔" وہ آرام آرام سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ چکی تھیں۔

"میں نے۔" انمول کے لبوں نے بے آواز حرکت کی۔

"یہ لیں جی یہ رہا آپ کا سامان۔ مجھے دیکھو چولہے پر چائے رکھ کر آئی تھی ابھی تک تو ساری ابل چکی ہو گی۔" شاپنگ بیگ انمول کو تھما کر وہ ماتھا پیٹتی واپس چلی گئیں۔ اس نے تو ملک سے بات تک نہیں کی تھی کجا کہ کچھ منگوانا۔ اس کا مطلب یہ جو کچھ بھی تھا ملک نے بھیجا تھا۔ انمول کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ تحفہ آیا تھا ہاں ملک کی طرف سے تحفہ آیا تھا اس کا دل معمول سے زیادہ تیز دھڑکنے لگا۔ کمرے میں آ کر اس نے شاپنگ بیگ میں موجود شے باہر نکالی۔ وہ ایک مہرون رنگ کا کپڑا تھا۔ انمول کے آبرو تعجب سے اکھٹے ہوئے۔ اس نے ایک ہی جست میں اسے کھولا اندر ایک نفیس سی چادر تھی جس کی باؤنڈری پر سنہرے رنگ سے کڑھائی کی گئی تھی۔ انمول ملک کو وہ عام سی چادر دنیا جہاں کے کپڑوں سے افضل معلوم ہوئی۔ اس کا دل خوشی سے اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ وہ چادر سر پر جمائے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل اس بات کا گواہ تھا کہ آج سے پہلے وہ اتنا حسین کبھی نہیں لگی تھی۔ اس کی نظر بیڈ پر دھرے لفافے پر گئی وہاں کچھ لگا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور پلٹایا۔

"امید ہے کہ یہ چادر آپ کی زینت بڑھائے گی۔" اس چسپاں نوٹ کو پڑھتی انمول ملک کہیں ماضی میں ہی تحلیل ہوئی تو آج کی انمول کا سراپا واضح ہوا۔ وہ چادر اور اس نوٹ میں چھپی بات نے اسے بدل دیا تھا۔ اسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ محبت تبدیلی نہیں مانگتی لیکن اس نے خود کو بدلا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہ بھرتی چہرہ ہاتھوں میں گرائے بیڈ پر ٹک کر بیٹھ گئی جب ملک اندر داخل ہوا۔ انمول نے چہرہ نہیں اٹھایا۔

"آپ تیار نہیں ہوئیں ابھی تک ہے۔؟" اس نے پوچھا

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم بدلے کی آگ میں اس قدر اندھے ہو جاؤ گے کہ میری مجبوری کا فائدہ اٹھانے لگو گے" وہ اس کے روبرو اٹھ کھڑی۔ ملک نے آبرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"آپ کی کون سی مجبوری کا فائدہ اٹھایا ہے میں نے؟"

"تمہیں علم ہے کہ انمول ملک کو تم کتنے عزیز ہو۔ میں تمہاری محبت کی خاطر اپنے باپ کی محبت کو قربان کر سکتی ہوں۔ اسی لیے تم نے میرے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی ہے ملک۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا تھا وہ میرا باپ ہے اور مجھے اس سے محبت، عقیدت سب کچھ ہے لیکن دیکھو میں اتنی بے بس ہوں کہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی تمہارے لیے اپنے باپ کی محبت قربان کر رہی ہوں" ملک نے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں۔

"ایسی محبت کو کیا نام دیا جائے انمول جس میں محبت کے ساتھ ساتھ نفرت بھی برابر کی شریک ہو۔" انمول نے تند نگاہوں سے اسے دیکھا جو اب دیوار سے ٹیک لگائے پر سکون کھڑا تھا۔

"یہ ت۔ تمہارا مسلہ نہیں۔ ہے۔" اسکی زبان لڑکھڑائی۔

"کیا آپ اس نکاح سے خوش نہیں ہے؟؟" ملک نے بلآخر پتے کی بات کی۔

"تم بابا سے بدلہ لینے کے لیے کر رہے ہو نا یہ سب؟" ملک تیر کی تیزی سے سیدھا ہوا

"کیا آپ اس نکاح سے خوش نہیں ہیں۔؟" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ اعصاب تن گئے تھے۔

"تم یہ سب بابا سے بدلہ لینے کے لیے کر رہے ہو نا۔؟" وہ اونچی آواز میں چیخی۔

"ملک اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ اپنے دشمن سے بدلہ لینے کی خاطر اسکے گھر کی عزت سے کھیل جائے۔ رہی بات نکاح کی تو میں کوئی گن پوائنٹ پر آپ سے نکاح نہیں کر رہا آپ کی رضامندی ہی سب طے کرے گی۔ مرضی ہو تو قبول ہے کہہ کر نکاح نامے پر دستخط کر دیجیے گا ورنہ ایک ہی چھت تلے بغیر کسی رشتے کے رہنے سے آپ کو تو اعتراض نہیں ہو گا، لیکن مجھے ہے۔" کہتا وہ جیسے آیا تھا تیزی سے باہر نکل گیا۔ انمول ملک کو اس کی بات کسی طمانچے کی صورت لگی تھی۔ وہ ہَق دَق دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔

تبھی ایک سرمئی آنکھوں والی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ انمول نے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

"اسلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟" اس کی آواز اس کی شخصیت سے میل کھاتی تھی۔ شائستگی اور چاشنی لہجے میں ڈوبی ہوئی۔ اس کا حلیہ قابلِ دید تھا جو سفید رنگ کے کرتا اور شلوار میں ملبوس تھی لیکن انمول ملک اسے نہیں جانتی تھی۔

"وا علیکم اسلام۔ آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟" انمول نے بے دلی سے جواب دیا

"خوبصورت۔" یک لفظ جواب پر انمول نے منہ کے زاویے بگاڑتے بیڈ پر دھری چادر اٹھائی۔ اس کے سامنے کھڑی سفید کرتا شلوار میں ملبوس لڑکی کے منہ سے بے ساختہ ماشاء اللہ کا لفظ نکلا تھا۔

"دراصل مجھے سر نے بھیجا تھا آپ کو ریڈی کرنے کے لیے۔" اس لڑکی کی بات پر انمول نے ہنکارا بھرتے اپنا رخ اس کی جانب کیا۔

کچھ ہی دیر میں اسے باہر لاؤنج میں لگے صوفوں پر بٹھا دیا گیا۔ وہ کانسی رنگ کا جوڑا پہنے اوپر مہرون چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ ان دو رنگوں کا امتزاج اسے روپ بخش رہا تھا۔ اس کے دائیں طرف صوفے پر ملک براجمان تھا جب کہ ان کے سامنے قاضی صاحب کلمات پڑھتے دکھائی دے رہے تھے مومن ابراہیم بھی ملک کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کل والے واقعے کا شائبہ تک نہ تھا۔ سپاٹ تاثرات چہرے پر سجائے وہ اس نکاح میں شرکت کر رہا تھا۔

اگلے چند لمحات میں ان دونوں کا نکاح خیر وعافیت سے ہو چکا تھا۔ وہ انمول ملک سے مسز ملک بن چکی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ جس دن کا اس نے خواب دیکھا تھا وہ دن اس کی زندگی میں خوشی لے کر نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے اندر عجیب خالی پن اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ ذہن کے پردوں پر ملک اور اس کا بدلہ لینے کا جنون لہرا رہا تھا۔ اس کے برعکس ملک کے چہرے پر نرم گرم تاثرات تھے۔ کوئی بھی اسے دیکھنے سے اندازہ نہیں لگا سکتا تھا آیا کہ وہ خوش ہے یا سوگوار۔

مومن نے آگے بڑھ کر ملک کو گلے لگایا۔ مبارکباد پیش کی اور پھر وہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اس کا انداز بہت روبوٹک تھا۔ اس کے قریب کھڑی سفید کرتا شلوار والی لڑکی نے تاسف سے سر جھٹکا۔ کیسا مرد تھا وہ جو بخوشی اپنی محبت قربان کر رہا تھا۔ وہاں ایک بائیس تئیس سالہ لڑکی اور ایک چھبیس سالہ مرد بھی کھڑے ہوئے تھے۔ انمول ملک اپنی جگہ سے نہیں اٹھی وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ قاضی صاحب دعائیں دیتے جا چکے تھے ملک اپنے کمرے میں گیا تھا۔ تبھی دونوں لڑکیاں اس کے آس پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ انمول منہ پر قفل ڈالے گم سم بیٹھی ہوئی تھی۔

"بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔" سفید رنگ میں ملبوس بسمہ شارق نے انمول کو مبارکباد دی۔ وہ سر ہلا گئی۔ اس کا اتنا ٹھنڈا ردعمل دیکھ کر بسمہ وہاں سے اٹھ گئی۔ اب وہاں فریال ساجد اور باجوہ رہ گئے تھے۔

مومن کچن کاؤنٹر پر گلاس رکھے بوتل سے پانی اس میں انڈیل رہا تھا۔ چہرے پر اداس مسکراہٹ تھی ابھی وہ پانی پینے کو گلاس اٹھاتا کسی نے اس سے پہلے ہی اٹھا لیا۔

"اف۔ کتنی گرمی ہے ناں؟" پانی کا پورا گلاس وہ ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ بسمہ کی بات پر مومن نے جواب نہیں دیا۔ وہ پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

"تمہیں نہیں لگتا یہ نکاح بہت جلد بازی میں ہوا ہے۔ اس کے سائیڈ ایفیکٹس بہت برے ہو سکتے ہیں۔" اب کی بار مومن نے ایک نظر اپنے عقب میں ڈالی۔ انمول ملک وہاں نہیں تھی اب وہاں صرف فریال اور عبید کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"مجھے نہیں لگتا بھائی کو کوئی مسلہ ہو گا۔ وہ اس گیم کے ماہر کھلاڑی ہیں۔" اس کے لہجے میں ملک کے لیے احترام، عزت اور منہ بولتا غرور تھا۔

"دیکھ لینا۔ ویسے بھی جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" وہ کندھے اچکا گئی۔

"مطلب تمہارا۔" مومن نے زچ کرتی نگاہوں سے اسے تکا۔

"تم نے ان ڈائریکٹلی مجھے شیطان بولا۔؟"

"نہیں میں نے ڈائریکٹلی تمہیں شیطان کہا ہے۔" کمال کا اطمینان تھا مومن کے لہجے میں۔

"مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا بلاوجہ میں آگئی۔" مومن ایک سٹول پر بیٹھ گیا

"مجھے بھائی نے کہا تھا ورنہ تمہیں کبھی نہ بلاتا یہاں۔"

"ہاں بھئی مشکل میں تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔" وہ منہ بسور کر بولی۔ اس کی بات پر مومن ابراہیم کا قہقہہ چھوٹا۔ تینوں نفوس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ خجل ہوتا باہر نکل گیا۔ تبھی ملک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

اور ان تینوں کو اشارہ کرتا اپنے پیچھے آنے کا کہتا اپارٹمنٹ سے نکلتا چلا گیا۔

"جیا کیا ہوا تم سوئی نہیں ابھی تک ؟؟" منہا نے اسکے ساتھ ہی بیڈ پر دراز ہوتے استفسار کیا۔ وہ دونوں ہی پیلا جوڑا زیب تن کیے مایوں کی دلہنیں لگ رہی تھیں۔

"نیند نہیں آرہی۔ بے چینی سی ہو رہی ہے ؟" وہ آنکھیں موندیں چت لیٹی ہوئی تھی۔

"کس بات کی بے چینی۔؟"

"تم نے کہا تھا کہ ماضی میں رہنے والا انسان کامیاب نہیں ہوتا۔ ایسا ہے کیا؟" وہ اسکی جانب کروٹ بدل گئی۔

"ہاں میں نے ایسا بولا تھا۔ کیونکہ ماضی میں رہنے والا انسان بلائنڈ ہوتا ہے اسے مستقبل کی فکر نہیں بلکہ ہر لمحے اپنے ماضی کا خوف رہتا ہے۔ ایسے میں کامیابی ان لوگوں کا مقدر ٹھہرتی ہے جو اپنے آج کو کھل کر جیتے ہیں۔ جنہیں اپنے گزرے ہوئے کل کی بجائے آنے والے کل کی فکر ہوتی ہے۔"

"اور ایسے لوگوں کو کیا کہتے ہیں۔؟" جیا نے استفسار کیا۔

"فور سائٹڈ، پرو ایکٹو اور فیوچر سٹک۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ماضی کو پیچھے چھوڑ کر اپنے کل کی فکر کرتے ہیں۔ ماضی ہمیں ہر اساں کرتا ہے یہ ایک آسیب کی طرح ہمارے پیچھے رہتا ہے اس سے نکل جانے والے ہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔" وہ ہاتھوں پر لوشن لگا رہی تھی۔

"اچھی فلاسفی جھاڑ لیتی ہو۔" جیا کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"واٹ دا ہیل۔ یہ کوئی فلاسفی نہیں حقیقت ہے۔ کوشش کرو تمہارا شمار بھی ان لوگوں میں ہونے لگے۔ "منھا بد مزہ ہوتی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ جیا نے اسے دیکھا وہ آنکھوں پر ہاتھ دھرے سوتی بن رہی تھی۔ اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل پر گئی کیا اسے اس بات پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں؟ یہ سب اس کے دماغ کو الجھا رہا تھا۔ ایک طرف وہ شخص تھا جسے آج وہ اپنے تمام تر حقوق سونپ کر اس کے نام ہو گئی تھی۔ وہ جس کا نام جیا کے نام سے جڑ چکا تھا تو دوسری جانب حریم ناز تھی، وہاج ملک تھا جو چاہنے کے باوجود اس کے ماضی کو اس کے سامنے لا پٹکتا تھا اور ان سب میں عالیہ جعفری کا اضافہ اسے خطرے سے دوچار کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عالیہ کی نظروں میں وہ کبھی بھی اچھی نہیں رہی اور نہ ہی وہ جیا اور بالاج کے رشتے سے خوش تھی یہی بات جیا کو ہلکان کر رہی تھی اگر جو اس نے جیا کا راز بالاج کو بتا دیا؟ ان تمام حالات سے اس نے ایک بات سیکھی تھی اور وہ یہ کہ:۔

"اپنے راز خود تک رکھنا سیکھو۔"

رات کی تاریکی دن کے اجالے میں بدلی تو نارنجی سورج کی کرنیں آسمان سے پھوٹتی کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی سنہری تاثر دینے لگیں۔ جیا اپنے بیڈ پر دراز کمفرٹر سینے تک تانے لیٹی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں موبائل تھامے وہ اسے گول گول گھما رہی تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز منہا کی موجودگی بتلا رہی تھی۔ جیا نے موبائل تھامے بالاج نام کی چیٹ کھولی۔ آخری پیغام پر تھمس اپ کا نشان جگمگا رہا تھا۔ وہ یک لفظی پیغام 'سوری' کا تھا۔ جس کے اوپر ایک سطر میں پیغام تھا جو کچھ یوں تھا:۔

"میں اوپر چھت پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگلے پانچ منٹ میں تم میرے سامنے ہو۔"

پانچ منٹ تو کیا وہ پانچ گھنٹے بعد بھی وہاں نہیں گئی تھی۔ جس کا مداوا کرنے کی خاطر اس نے صبح سوری کا پیغام چھوڑا تھا۔

ناشتے کی ٹیبل پر بالاج سکندر کے سوا تمام سکندر ہاؤس کے مکین براجمان تھے۔ انہی سب میں نائلہ جعفری اور ان کی فیملی بھی تھی۔ جیا سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ سلام کرتی وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بالاج ابھی ناشتے پر نہیں آیا۔؟" یہ کہنے والی نائلہ جعفری تھیں۔ جیا نے سر اٹھایا لیکن ہائے رے قسمت سامنے ہی عالیہ جعفری تمسخرانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیا کا دل دھڑکا کہیں اس نے کچھ بتا تو نہیں دیا۔؟

اپنا راز دوسروں کو تھما دینے والے یونہی لمحہ بہ لمحہ خوف زدہ رہتے ہیں۔

"معلوم نہیں شاید ابھی اٹھا نہ ہو۔ رات دیر سے سوئے تھے اس لیے۔" ثانیہ بیگم پاس کھڑی ملازمہ سے ڈونگا پکڑتی بولی۔

"میں انہیں جگا کر آتی ہوں۔" عالیہ اپنا ناشتہ بیچ میں روکتی بول اٹھی۔

"آپ بیٹھیں عالیہ۔ ہم مہمانوں کو کوئی کام نہیں کہتے۔ میں جاتی ہوں 'اپنے شوہر' کو جگانے۔" عالیہ کے ساتھ ہی جیا تیزی سے کھڑی ہوئی۔ منہا اپنی امڈ آنے والی ہنسی چھپاتی پلیٹ پر جھک گئی۔

"بالاج۔" دروازہ نوک کیے بنا وہ بالاج کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے ہی سٹڈی ٹیبل پر لیپ ٹاپ رکھے وہ کام کرنے میں مصروف تھا۔ پلٹ کر دیکھنا تک گوارا نہیں کیا اس نے۔

"بالاج۔" وہ مزید قدم اٹھاتی اُس کے پاس گئی۔

"ہمم۔" وہ بولا بھی تو بس اتنا لیکن جیا کو ڈھارس ملی تھی۔

"آپ ناشتے پر نہیں آئے تو میں نے سوچا آپ کو بلا لاؤں؟" وہ بیڈ کی پائنتی کی جانب بیٹھی تھی۔

"تمہیں میری پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں کھاؤں جیوں یا مروں تمہارا اس سب سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئیے۔" بالاج کا لہجہ سرد تھا۔ جیا لب کچلتی اسے دیکھے گئی۔

"آئی ایم سوری۔" بالاج نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ کانوں کو پکڑے چہرے پر بلا کی معصومیت سجائے اس سے گویا تھی۔

"پلیز جاؤ یہاں سے" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ گیا۔ لیکن اس کی بات پر جیا کی آنکھیں نم ہوئیں تھیں۔

"میں سوری کہہ تو رہی ہوں نا پلیز معاف کر دیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" بالاج اس کی آنکھوں سے نظریں چراتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارا سوری نہیں چاہیے مجھے تنگ نہیں کرو۔ جاؤ یہاں سے۔" جیا نے حیرت سے اسے دیکھا یہ تو اس بالاج سے قطعاً مختلف تھا جسے اس نے پچھلے چند دنوں میں دیکھا تھا۔ مانا کہ اسکی غلطی ہے لیکن اتنی بے رخی اور بے اعتنائی کہ اگلا بندہ مرنے کی خواہش کرنے لگے ۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تمہاری زندگی میں صرف بالاج سکندر کی اہمیت ہونی چاہئیے جیا بالاج سکندر۔ یہ سب تمہیں احساس دلوانے کے لیے از حد ضروری تھا۔" بالاج نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اب وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ دل ہر کام سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کل شب منہا اور جیا کی رخصتی ہونا تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی تمام معاملات سلجھا لے گا اسے یقین تھا۔ ادھر اپنے کمرے میں داخل ہوتی جیا کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے۔ بندھ باندھے آنسو گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ رونے کے شغل سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دن تو جہانداد ملک کی حویلی پر بھی طلوع ہوا تھا لیکن اس سب سے یکسر بے نیاز وہ خود کو کمرے میں بند کیے ہوئے تھے۔ ملازم ناشتے کا پوچھ کر جا چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ تنہائی کا غم کتنا جان لیوا ہوتا ہے یہ آج ان کو پتا چل رہا تھا۔ را

کنگ چیئر پر جھولتے وہ ماضی کی یادوں میں گم تھے۔ سوچیں ان کے دماغ کا محور کیے ہوئے تھیں۔ کوئی شخص دروازہ بناناک کے اندر داخل ہوا۔ وہ اسے اسکی خوشبو سے پہچان گئے۔ اس لیے خاموش بیٹھے رہے۔

"السلام علیکم۔" ملک نے اس شخص پر سلامتی بھیجی جس کی بربادی کا مرتکب وہ خود بننے جارہا تھا۔

"سلام کا جواب دینا تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔" اس کے طنز پر جہانداد ملک نے سر جھٹکا، وہ اس کا ضبط آزمانے آیا تھا۔

"خیر۔ آپ تو مسلم نون مسلم کی باتوں کو رہنے ہی دیں میں یہاں آپ سے یہ کہنے۔۔۔" اس کے لفظوں کو بریک جہانداد ملک کی آواز نے لگایا تھا۔

"میری بیٹی کہاں ہے ملک۔؟" وہ سرد نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آہاں۔ لفظوں کا تلفظ درست کیجئے سسر جی۔ آپ کی بیٹی نہیں میری بیوی ہیں وہ اور اس وقت خیر خیریت سے اپنے شوہر کے گھر میں موجود ہیں۔" ملک کو جہانداد ملک کی یہ حالت جانے کیوں مزا دے رہی تھی۔

"تم نے اس سے نکاح کر لیا۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی اب کی بار حیرت نے ملک کے چہرے کا بھی احاطہ کیا تھا۔

"کیا آپ کو آپ کے وفادار ملازم نے نہیں بتایا۔ چچ۔ چچ۔ میں تو اسے کل شام میں ہی آگاہ کر چکا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ شخص بھی آپ کے ساتھ مخلص نہیں۔" جہانداد ملک جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئے تھے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ گہرے صدمے کا شکار تھے۔

"اسے میں نے ایک ضروری کام دیا تھا۔ اسی لیے شاید وہ بھول گیا ہو گا۔" جہانداد ملک کی بات پر وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"بیان بدل رہے ہیں؟"

"کام کی بات کرو۔" جہانداد ملک نے اسے ٹوکا۔

"چلیں پھر کام کی بات کر لیتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں یہاں پولیس آجائے گی جو آپ کو گرفتار کر کے اس گھر کو بند کر دے گی۔" بنا لگی لپٹی کے اس نے بات شروع کی۔

"پولیس۔ پولیس کا کیا کام یہاں۔" جہانداد ملک اضطراب کی کیفیت میں مستفسر ہوئے۔

"جو ٹرک اس دن پولیس نے ہائی وے سے بازیاب کیا تھا۔ ماشاءاللہ اس کا ڈرائیور دو کوڑے پڑنے پر ہی کروڑوں کا احسان بھول گیا اس لیے اب تمام ثبوتوں اور گواہوں کے تحت پولیس یہاں آئے گی اور آپ کو لے کر چلی جائے گی۔" ملک نے بڑے مزے سے گویا ان کے سر پر دھماکہ کیا تھا۔

"حل؟"

"حل تو کوئی بھی نہیں ہے لیکن ایک دوسرا آپشن ضرور ہے وہ کیا کہتے ہیں۔ہاں چور راستہ۔" ملک نے ہاتھ میں پکڑی فائل ان کے سامنے لہرائی۔

"آگے بولو" ہاتھ سے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا

"وہ یہ کہ ان دستاویزات پر سائن کر کے ڈیل ڈن کریں اور میں یہ معاملہ رفع دفع کر دوں گا۔" صلح جو انداز میں اس نے یہ بات جہانداد ملک تک پہنچائی۔انہوں نے فائل کو کھول کر دیکھا۔آنکھیں ابل باہر آئیں وہ ان کی آدھی پراپرٹی کے کاغذات تھے۔

"مجھے کچھ وقت چاہیئے ہو گا۔" انہوں نے فائل پاس میز پر رکھی۔زمین کا سودا عزت کے سودے سے بڑا نہیں تھا۔

"بالکل (ملک نے سر ہلایا) ایسے فیصلوں میں وقت تو لگتا ہے نا سو آپ دل کھول کر تین دن کا وقت لے لیں۔لیکن فیصلہ میری مرضی کا ہونا چاہیے۔" اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

"تم مجھے آپ کہہ کر کیوں مخاطب کرتے ہو؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"وہ اس لیے سسر جی کہ میرے ماں باپ کی گیارہ سالہ تربیت نے مجھے آپ سے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز سکھائی ہے۔ورنہ لائق تو آپ 'تم' کے بھی نہیں۔" آگ لگا تا وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔جہانداد ملک نے جھپٹنے کے سے انداز میں فائل اٹھا کر دوبارہ دیکھی۔ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے وہ صبر کے گھونٹ پی گئے۔انہیں اپنی بیٹی عزیز تھی اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔وہ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔انہیں فلوقت کسی سے بہت ضروری گفتگو کرنی تھی۔

سورج اپنے جوبن پر گرمی ڈھا رہا تھا۔وہ بار بار اپنے ماتھے پر آیا پسینہ دوپٹہ کے پلو سے پونچھتی کچن میں کھڑی کام کر رہی تھی۔بالاج کی پسند کی کوئی ڈش ایسی نہیں تھی جو اس نے بنائی نہ ہو۔

"جیا بیٹا بس کرو تھک جاؤ گی۔" ثانیہ بیگم نے اسے کوئی دسویں بار ٹوکا تھا۔لیکن وہ جیا سکندر ہی کیا جو کسی کی سن جائے۔وہ آج صبح سے کھانا بنانے میں جتی ہوئی تھی۔ثانیہ بیگم حیرت و بے یقینی سے اس کا یہ روپ دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوتا ماما۔بالاج کو منانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔" ثانیہ بیگم ٹھنڈی سانس بھرتی ٹیبل پر رکھی سلاد کاٹنے لگی تھیں۔نائلہ جعفری اور ان کی فیملی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھیں۔

"زرقہ بی۔ آپ جا کر بالاج کو بلا لائیں۔" کھانا ڈائننگ ٹیبل پر سیٹ کرتے اس نے ملازمہ کو حکم صادر کیا۔ اگلے چند منٹ بعد بالاج سکندر آتا دکھائی دیا۔ اب کہ ثانیہ بیگم اور بالاج ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جیا ہاتھ میں سالن کا ڈونگا پکڑے ہال میں داخل ہوئی۔

"مجھے کورمہ نہیں پسند۔" بالاج کی بات پر اسکے سالن ڈالتے ہاتھ رکے تھے۔

"اوکے پھر آپ یہ پلاؤ ٹرائی کریں بہت مزے کا بنا ہے۔" وہ اپنی نشست سنبھالتی بیٹھ گئی تھی۔ یہ بندہ اب کچھ زیادہ ہی نخرے دکھا رہا تھا۔

"یہ سب تم نے بنایا ہے؟" جیا کی حالت رونے والی ہوئی۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ جیا کو تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ پھر بھی سنگ دل بنا اسے مزید چوٹ دے رہا تھا۔ وہ آنسو پیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے اسے رہنے دیں۔ آپ مت کھائیں۔" وہ غصے سے نتھنے پھیلائے بالاج کے سامنے سے پلاؤ کی ٹرے اٹھانے لگی تھی جب بالاج نے وہ اچک لی۔

"ماما اپنے بیٹے سے کہہ دیں میری بنائی کسی شے کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ثانیہ بیگم سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں میری بیوی نے اتنے پیار سے بنایا ہے میں تو کھاؤں گا۔ اینڈ ٹرسٹ می میں ہاتھ سے نہیں منہ سے کھاتا ہوں۔" اس کی بات پر جیا نے اسے گھورا تھا جو مسکراہٹ ضبط کرتا اپنی پلیٹ میں سالن ڈال رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ جیا۔" وہ اپنی ساسوماں کے کہنے پر دوبارہ بیٹھ چکی تھی۔

"یہ تم نے روٹی بنائی ہے یا دنیا کا آٹھواں عجوبہ ایجاد کیا ہے؟" جیا گڑبڑائی تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ بالاج روٹی ہاتھ میں اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا جو بقول جیا کے روٹی تو تھی لیکن کسی بھی اینگل سے روٹی نہیں لگ رہی تھی۔

"یا اللہ! ایسی پھوہڑ بیوی مجھے ہی ملنا تھی۔" اس کی بات پر ثانیہ بیگم مسکرائی تھیں۔ جیا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"مجھے صرف روٹی ہی بنانی نہیں آتی نا باقی تو سب کر لیتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں وہ میں باہر سے لے آیا کروں گا۔" بالاج نے کھانے کا پہلا نوالہ جیا کی جانب بڑھایا۔ وہ سٹپٹا کر ثانیہ بیگم کو دیکھنے لگی جو خود کو لاتعلق ظاہر کر رہی تھیں۔ اور پھر وہ نوالہ نگل گئی۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ بالاج سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیا اس کی مصنوعی ناراضگی کو اتنا سیریس لے لے گی۔ خود کو ملامت کرتا وہ خود سے کبھی جیا سے نہ ناراض ہونے کا عہد کر گیا تھا۔

اس وسیع و عریض رقبے پر پھیلے مارشل آرٹ سینٹر میں گہما گہمی کا ماحول تھا۔لوگوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔جیسے عموماً اسکولوں اور کالجوں میں بے ہنگم شور ہوتا ہے ویسے ہی اس سینٹر کا ماحول تھا۔لڑکے اور لڑکیوں کے ہاسٹل کو چھوڑ کر اس گول عمارت میں آؤ تو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی چہل پہل اپنے عروج پر تھی۔وہ بھاگنے کے انداز میں اوپری فلور پر موجود کلاس روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا تنفس پھول چکا تھا۔کلاس روم کے دروازے کے قریب رک کر اس نے گہرا سانس لیا۔ہاں اس سرمئی آنکھوں والی لڑکی نے اور پھر وہ کلاس میں داخل ہوئی۔

"مے آئے کم ان سر؟"انگریزی میں اندر داخل ہونے کی اجازت طلب لی پروجیکٹر سکرین کی جانب رخ موڑے کھڑے 'سر' نے آواز کے تعاقب میں دیکھا۔پوری کلاس ڈسٹرب ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"نو۔گیٹ آؤٹ۔"مومن ابراھیم کی کرخت آواز پر وہ اسے ایک گھوری سے نواز گئی۔جس کا اثر نہ لیتے ہوئے مومن نے اپنا اور کلاس کا دھیان ایک بار پھر سکرین پر چلتی تحریر کی جانب مبذول کرایا۔

"پر سر۔۔"وہ تلملا کر مڑا۔گہری بھوری آنکھوں میں ناپسندیدگی پھیل گئی۔

"رول نمبر 1-پنکچوئیشن Punctuation عام الفاظ میں جسے وقت کی پابندی کہتے ہیں۔اور آپ پورے سات منٹ لیٹ ہیں۔(ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھی)اگلی دفعہ آپ اگر تیس سیکنڈ بھی تاخیر سے آئیں تو آپ کو کلاس سے بے دخل کر دیا جائے گا۔"تیسری قطار میں بیٹھی فریال نے بسمہ کو دیکھا تھا۔لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"واٹس رانگ وِدیو مِس۔؟ آئی سیڈ گیٹ آؤٹ۔"مومن نے دروازہ اسکے منہ پر بند کیا تھا۔کلاس کے باقی سٹوڈنٹس نے اپنا بیٹھنے کا انداز درست کیا تو کئی سٹوڈینٹس نے اپنا پورا فوکس 'سر' کی جانب کر لیا۔وہ تمام مومن ابراہیم کو مزید غصہ نہیں دلانا چاہتے تھے۔کیونکہ

'اصولوں کی پابندی مومن ابراہیم کے لیے زندگی سے زیادہ ضروری تھی۔'

تہہ خانے میں موجود اس کمرے تک کا سفر آج بھی ویسا تھا۔بمشکل وہ وہاں پہنچے تھے۔اندھیرے نے ان کا استقبال کیا تو بتی جلانے سے روشنی نے اپنا رقص دکھایا۔صوفیہ ابراھیم گٹھری کی مانند بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔جہانداد ملک ایک کرسی ان کے سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔اس کمرے میں صوفیہ ابراہیم کو ہر شے مہیا کی جاتی تھی ماسوائے ٹیکنالوجی اور دھاتی اشیاء کے۔

"کیسی ہو؟"نام لینے سے گریز کیا۔مقابل کان بند کیے بیٹھا تھا۔

"تم جانتی ہو میں نے کبھی سالوں سال اس کمرے کا رخ نہیں کیا تھا لیکن اس بار میں ایک مہینے میں دو بار یہاں آ چکا ہوں۔ وجہ جانتی ہو کیوں؟" وہ چند پل کو خاموش ہوئے تو ہر شے جیسے ساکت ہوئی تھی۔ نیلی پینٹ شدہ دیواروں نے دم سادھ لیا۔ سانسوں کی مدھم رفتار کی آواز خاموش فضا میں گونجنے لگی۔

"میری بیٹی۔ (وجہ بتلائی). وہ میری بیٹی تھی صوفیہ۔ انمول ملک جہانداد ملک کی بیٹی تھی۔ وہ میری طرح مضبوط اور بہادر تھی۔ بس اس سے ایک کوتاہی ہو گئی کہ وہ میرے دشمنوں کے بیٹے سے دل لگا بیٹھی۔ اور جہانداد ملک اتنا بے غیرت نہیں ہوا تھا کہ بخوشی اپنی بیٹی کو اس شخص کے ساتھ رخصت کر دیتا۔" وہ اپنے خالی ہاتھ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ نہیں پائے کہ وہ وجود کن نگاہوں سے انہیں تک رہا تھا۔

"لیکن دیکھو آج میں خالی ہاتھ رہ گیا۔ وہ بدذات میری بیٹی کو بیاہ کر لے گیا اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ اس معاملے میں میں بہت بد قسمت ہوں کہ کوئی بھی شخص جہانداد ملک کے ساتھ مخلص نہیں۔" وہ دم روکے انہیں سن رہی تھی۔

"نہ تم۔ نہ ملک۔ اور نہ ہی میری اپنی بیٹی۔" انہوں نے نظر اٹھا کر صوفیہ ابراہیم کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کرچیاں تھیں۔ کوئی خواب ٹوٹ جانے کی کرچیاں تو کوئی دل کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے ٹکڑے۔

"لیکن میں ہار نہیں مانوں گا تم سب کو مرنا ہو گا۔ جہانداد ملک کے عتاب سے کوئی نہیں بچ سکتا۔" وہ جنونی کیفیت میں یہ الفاظ دوہرا رہے تھے۔

"اللہ اکبر۔ (اللہ سب سے بڑا ہے)" زبان کا قفل ٹوٹا تھا۔ جہانداد ملک ساکت ہوئے تھے۔ جس آواز کو سننے کی چاہ انہیں پچھلے تئیس سالوں سے تھی وہ آج پوری ہوئی تھی۔ اب صوفیہ ابراہیم کو بولنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

"آج تئیس سال بعد تمہاری آواز سنی ہے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی پیاسا ایک عرصے بعد سیراب ہوا ہو۔ لیکن تم نے اپنے اور میرے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔ آج میں خاموش بیٹھوں گا اور ابراھیم کی بیوی بولے گی۔ یہ ملک آج صرف سنے گا۔" باہر سے کسی شے کی آواز آئی تھی۔ کسی شے کی بری طرح غرّانے کی آواز لیکن وہ دنیا جہاں سے غافل اپنے سامنے بیٹھی عورت سے ہمکلام تھے۔

"ہر عروج کو زوال ہے، ہر بہار کے بعد خزاں ہے، ہر محبت میں نفرت ہے اور ہر رشتے کا لہو رنگ سفید ہے۔" وہ بولنے لگی تھیں۔ جہانداد ملک نے سر جھٹکا۔ چہرے پر کرب کے تاثرات پھیلنے لگے تھے جنہیں وہ مہارت سے چھپا گئے۔

"تمہارا زوال آج سے شروع ہو چکا ہے ملک۔ تمہاری سب سے بڑی طاقت، تمہاری بیٹی تم سے چھین لی گئی ہے۔ پہلے تم تڑپو گے پھر سسکنے لگو گے۔ عنقریب تم روؤ گے اور پوری دنیا تمہیں روتا دیکھے گی۔ لیکن تمہاری پکار سننے والا کوئی نا ہو گا۔" جہانداد ملک کو اس کمرے سے گھٹن محسوس ہوئی کوئی ان دیکھی رسی تھی جو ان کے گلے کے گرد بندھی جانے لگی۔

"میرا رب بے غرض دیتا ہے وہ کیڑے کو پتھر میں رزق دیتا ہے۔ مچھلی کو پانی میں پالتا ہے۔ وہ بڑا عطا کرنے والا ہے۔ اس نے کافروں کو مہلت دے رکھی ہے اور ظالموں کی رسی ڈھیلی کر رکھی ہے۔ اور جب وہ یہ رسی کھینچے گا تو تم منہ کے بل گرو گے۔ تمہیں اٹھانے والا کوئی نہ ہو گا۔" رسی کا پھندا مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ جہانداد ملک کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

"تمہیں اس قید سے نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ صو۔ صوفیہ۔" وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے۔ یہاں بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔

"میرا بیٹا آئے گا۔" جہانداد ملک کے قدم تھم گئے چہرے پر تمسخرانہ تاثر ابھرا۔

"اسے معلوم بھی نہیں کہ تم اس کی ماں ہو۔ اس کی ماں آج سے تئیس برس قبل خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔" صوفیہ ابراہیم کی مدھم ہنسی گونجی۔

"میرا بیٹا آئے گا جہانداد ملک وہ اپنی ماں کو بچانے آئے گا وہ ضرور آئے گا۔" جہانداد ملک ان کی بات سن کر رکے نہیں تھے بلکہ باہر نکلتے چلے گئے تھے۔

"مومن ابراھیم میرا بیٹا ہے جہانداد ملک اور میں اس کی ماں ہوں۔" وہ دیوانہ وار کہے جا رہی تھیں۔ نیلے رنگ میں مزین دیواروں نے ترحم سے انہیں دیکھا تھا۔

وہ ابھی تہہ خانے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ملازم دوڑتا ہوا ان تک آیا۔ تپتی دھوپ میں بھی ان کی آنکھیں شعلہ بار ہوئی تھیں۔ وہ لب بھینچے حویلی کے عقب میں دائیں جانب لگے پنجروں کی جانب بڑھے۔ حویلی کے تمام ملازم وہاں جمع تھے۔ جہانداد ملک کے چہرہ سفید ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہارا زوال آج سے شروع ہو چکا ہے ملک۔" زہن میں الفاظ گردش کرنے لگے تھے۔

سامنے ہی ان کا وفادار جان سے عزیز، ان کا دوست ان کا پالتو چار مَن چار فٹ کا شیر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

"کس نے کیا ہے یہ۔؟" وہ بولے نہیں دھاڑے تھے۔ ایسی دھاڑ حویلی میں موجود لوگوں نے پہلی بار سنی تھی۔ وہ والہانہ انداز میں شیر کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئے۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ جبار۔ جلدی کرو۔" وہ چیخ رہے تھے۔ جبکہ ان کی گود میں سر رکھا جانور کب کا اپنی آخری سانسیں جی چکا تھا۔

"سس۔ سر۔ یہ مر چکا ہے۔" جبار جسے انہوں نے محض شیر کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"نہیں۔ یہ نہیں مر سکتا یہ بچ جائے گا تم دیکھنا یہ میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔" ان کی آواز میں نمی گھل رہی تھی جسے وہ بدوقت روکے ہوئے تھے ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ پوری دنیا تہس نہس کر دیں۔

"بابا۔ بابا کیا ہوا اسے ؟۔ صبح تک تو یہ بالکل ٹھیک تھا۔" وہاج بھی ان کی دھاڑ سن کر وہاں آن پہنچا تھا۔ کیا عورتیں کیا مرد سب وہاں جمع تھے ان سب میں شائستہ بی بھی تھیں۔

"میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں میں کسی کو۔" انہوں نے اپنا ہاتھ شیر کے زخم پر رکھا تھا۔ اس بات سے وہ انجان نہیں رہ پائے تھے کہ اسے گولی لگی تھی۔ ان کا ہاتھ اور دامن خون سے بھر چکا تھا۔ اگر تم اس وقت ان کی حالت دیکھو تو ان کے لیے رحم کی بھیک مانگو گے۔

"تم سب یہاں کھڑے تماشہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔" وہاج نے ان سب کو ڈپٹا جو خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔

"کیوں شیر و کیوں ؟۔ تم تو مجھ سے وفادار تھے اتنی جلدی کیوں دغا دے گئے۔" انہیں وہ پل یاد آیا جب ایک چھوٹا سا شیر کا بچہ ان کے پیر چاٹ رہا تھا۔

"تم تو ایک اعلیٰ نسل کے وفادار ساتھی تھے۔ تمہیں تو بے وفائی زیب نہیں دیتی تھی۔" انہوں نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم ٹھنڈا۔ بال جو ہمہ وقت روئی سے نرم اور تر و تازہ رہتے تھے اس وقت کسی مردہ جیسی حالت میں تھے۔ وہ اور جہانداد ملک ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ جہانداد ملک اس سے اپنی باتیں شئیر کر رہے تھے اور وہ کانوں کو چوکنا رکھے ہوئے تھا۔ اب وہ دونوں تھے اور آس پاس لوگوں کی لاشیں تھیں لیکن شیر ونے کسی کا خون تک نہیں چکھا تھا۔ وہ اپنے مالک سے وفادار، دھوکے باز اور فریب کاروں سے دور رہتا تھا۔

ایک کے بعد ایک منظر ان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔

"عنقریب تم روؤ گے۔" ایک آنسو ان کی آنکھ سے نکلا اور شیر کے بھورے بالوں میں جذب ہو گیا۔ وہاج ملک وہاں کھڑا دکھ اور ملال سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے اپنے 'باپ' کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"بابا اٹھیں اندر چلیں۔ وہ آپ کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔" وہاج نے ان کے کندھے پر دباؤ بڑھایا وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس حصے میں دھوپ نہیں تھی۔ وہاں چھاؤں تھی اور شیر کے لیے خاص طور پر ائیر کولر اور برف کا انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن سب کچھ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ برف گرمی کی وجہ سے پگھل رہی تھی اور ٹھنڈی چھایا سہ پہر ہونے کے باعث چھٹ رہی تھی۔ انہوں نے نفرت سے اپنی گود میں سر رکھے پُر سکون سوئے ہوئے شیر کو دیکھا۔

"تم بھی دھوکے باز نکلے۔ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ کوئی بھی جہانداد ملک کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔" آخری جملہ نہایت آہستگی سے ادا کیا۔ اور پھر کسی اچھوت کی مانند اس کے بے جان وجود کو خود سے دور کر دیا۔ آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے وہاج کو دیکھا وہ انہیں ریلیکس ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دکھ ان سے دیکھا نہیں گیا وہ حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ وہ قابلِ ترس نہیں بننا چاہتے تھے لیکن وہ بن رہے تھے۔

ملک اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ چھوٹی سی راہداری سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھکا تھا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی وال کلاک پر وقت دیکھا۔ گھڑی کی سوئیاں رات کا ایک بجا رہی تھیں۔ وہ جو سوچے ہوئے تھا کہ اس وقت تک انمول سو چکی ہو گی تو وہ غلط تھا۔ لیونگ روم میں پڑے سیاہ، سنہری پٹیوں والے صوفوں پر انمول ملک براجمان تھی۔ کل کے برعکس وہ آج ٹی پنک کلر کے پیروں کے ٹخنوں کو چھوتی قمیض اور شلوار میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ کندھوں پر ڈھلک رہا تھا۔ بالوں کی ہلکی پونی میں سے آوارہ لٹیں اس کے خوبصورت چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ملک کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں سے آرہے ہو تم۔؟" تیکھے چتونوں سے اسے گھورا جو ہاتھ میں کیز تھامے کچن کاؤنٹر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" ان دونوں باپ بیٹی کو کسی نے بات کرنے سے پہلے سلام اور سلام کا جواب دینے کے آداب نہیں سکھائے تھے۔' ایسا وہ صرف سوچ سکا کہنے کے لیے ہمت درکار تھی۔

"واعلیکم السلام۔ میں نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو تم۔؟" ملک کے خیالات کو آگ میں جھونکتے وہ اپنا سوال دوہرا گئی۔

"عموماً شوہر جب باہر سے گھر واپس آتا ہے تو بیویاں اس کو پانی اور کھانے کا پوچھتی ہیں۔" اس نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔ انمول کے سوال سے بہتر تو پانی لگ رہا تھا۔

"ان بیویوں کے شوہر آدھی آدھی رات تک باہر آوارہ گردیاں نہیں کیا کرتے۔" پانی پیتے ملک نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کم اور گھور زیادہ رہی تھی۔

"تم کل شام کے گئے آج آدھی رات کو گھر واپس آرہے ہو ملک۔ ایسا کون سا کام تھا کہاں گئے تھے تم۔؟" انمول نے دانت پیسے۔

"اپنے سسر جی سے ملنے۔" اس نے بھی تپ کر جواب دیا۔

"واٹ! تم نے بابا کو بتا دیا ہمارے نکاح کا۔؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی

"جی۔" وہ بیبے بچے کی طرح سر ہلا گیا۔

"اوہ گاڈ! ملک تمہیں زرا برابر بھی احساس ہے ان کا۔؟" وہ اس کے پاس آکر رکی تھی۔

"نہیں۔ مجھے ان کا رتی برابر احساس نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے میں کیا چاہتا ہوں۔ میں اُنہیں تڑپتا اور روتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ زندگی کی آخری سانس بھی نہ جی سکیں۔ جہانداد ملک کی موت میری جیت ہے۔ میں کچھ بھی دوہرانا نہیں چاہتا بہتر ہو گا کہ آپ اپنے باپ کی طرف داری کرنا بند کر دیں۔" وہ وہاں سے جانے لگا۔

"تمہیں یہ سب کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا ملک۔"

"حاصلِ وصول کی چاہ ہی کس کمبخت نے کی ہے انمول۔" وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور انمول گہری سانس بھرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

"تم نہیں سمجھ سکتے ملک۔ میں کیا ہوں۔ میرے اندر کیا ہے۔ میں بادام کی وہ گری ہوں جو اپنے خول میں محفوظ ہے۔ جب اس کا خول ٹوٹا تو گری کی اوقات دو کوڑی کی رہ جائے گی۔ جسے یا تو نگلا جا سکتا ہو گا یا کیڑا لگ جانے کے بعد ضائع کیا جا سکتا ہو گا۔ مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا میں خود بھی نہیں۔" وہ بازو باندھے کھڑکی میں کھڑی تھی سامنے روشنیوں میں نہایا شہر دکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ جس مقام پر تھی وہ زمین سے بہت بلند تھا۔

اللہ اللہ کر کے وہ دن بھی آ گیا تھا۔ جب ایک لڑکی رخصت ہو کر دوسرے گھر چلی جاتی ہے۔ یہ دن کسی بھی لڑکی کی زندگی میں بہت بڑا دن ہوتا ہے۔ اس دن کے حوالے سے اس لڑکی نے بہت سے خواب سجائے ہوتے ہیں۔ بیٹی کے مستقبل کا اندازہ کوئی ماں باپ نہیں لگا سکتا وہ اپنی طرف سے اپنی بیٹیوں کو 'بیسٹ' دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہوتا ہے۔ نہ ہی بیٹی کا نصیب بدلا جا سکتا ہے نہ قسمت۔ وہ اپنے میکے سے سسرال میں کچھ نہیں لے کر جاتی ماسوائے تعلیم و تربیت کے۔ 'تعلیم' جو اسے اپنے سسرال میں سر اٹھا کر چلنا سکھاتی ہے اور 'تربیت' جو اس کے کردار میں اس کی ماں کی تربیت کا عکس دکھاتی ہے۔ اسی لیے بیٹیوں کی قدر کرنی چاہیے کیا معلوم جو خواب انہوں نے اپنے نئے گھر کے کیے بن رکھے ہوں وہ ایک دھاگے کے ادھڑنے سے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ اللہ عزوجل ایک بیٹی کا نصیب دل کھول کر لکھتا ہے۔ لہذا شکر کیجیے اور صبر کیجیے۔

بارات کی تقریب کا انتظام میرج ہال میں کیا گیا تھا۔ سیاہ رات کی تاریکی میں ڈوبی سڑک پر وہ میرج ہال سنہری اور رنگ برنگی بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہو تو معید سکندر اور ثانیہ بیگم آنے والے مہمانوں کا پرتپاک استقبال کرتے نظر آئیں گے۔ دائیں اور بائیں جانب مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا تو سٹیج کے قریب نہایت اہم رشتہ داروں کے لیے سیاہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ جس پر اس وقت بیٹھی عالیہ جعفری اپنا دل جلا رہی تھی، اس کی بہن نے افسوس سے اسے دیکھ کر سر جھٹکا۔ وہاں کھڑے ہو کر اگر تم نگاہ اٹھاؤ تو دو صوفوں پر سنہری افشاں جیسی چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہاں تمہیں نئے نویلے دو جوڑے بیٹھے نظر آئیں گے۔

'بالاج سکندر اور اس کے ہمراہ اس کی بیگم جویریہ بالاج سکندر'

اور

'علی عمان خان کے ساتھ اس کی زوجہ منہا علی'

وہ دونوں خالص سرخ رنگ پہنے ہوئے تھیں۔ جبکہ بالاج سفید شیروانی اور علی گولڈن رنگ کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھا۔

ایسے مواقع پر مدعو لوگوں کا کام تو بس کھانا ہوتا ہے۔ ادھر کھانا کھلا ادھر رخصتی کے لیے گھڑیوں کی گنتی شروع۔

دونوں دلہنوں کو ایک ساتھ رخصت کیا گیا تھا۔ منہا کو قرآن کے سائے تلے رخصت کرنے والا اس کا بھائی 'بالاج سکندر' تھا تو وہیں جیا کی باری میں تمام گھر والوں کی آنکھیں نم ہوئیں۔ لیکن 'علی عمان خان' نے بھائی کا رول پلے کرتے اسے بھائیوں کی طرح قرآن کے سائے تلے رخصت کیا۔ ایسے موقع پر ہر دیکھنے والی کی آنکھ میں پانی تھا۔

جہانداد ملک اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھے۔ کسی عزیز کو کھو کر تمہارا کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہ بھی اس وقت بے حال تھے۔

"تمہارا زوال آج سے شروع ہو چکا ہے۔ ملک" اس جملے کی بازگشت انہیں اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دفعتاً ان کا فون بزر ہوا۔ وہ اٹھے اور جا کر سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"السلام علیکم۔ سسر جی۔" انہوں نے موبائل پر گرفت سخت کی۔ دوسری جانب ملک تھا۔

"کیوں فون کیا ہے؟" جبڑے تن گئے تھے۔ دماغ کی نسیں پھولنے لگیں۔

"آپ کے وفادار غلام کی تاذیت کے لیے تو بالکل بھی نہیں کیا۔" اس کا لہجہ شریر تھا۔

"بول بھی چکو۔"

"ایک دن گزر چکا ہے سسر جی۔ پھر کیا سوچا آپ نے۔" اس کا لہجہ حد درجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ جہانداد ملک کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

"ابھی دو دن باقی ہیں برخوردار۔ صبر کرو اتنا اتاولے کیوں ہو رہے ہو۔؟"

"یہ دو دن ختم ہونے سے پہلے ہی اگر میری مرضی کے مطابق جواب مل جائے تو آپ کا احسان ہو گا۔" اس نے وارن کیا۔

"ورنہ کیا کرو گے۔ پولیس بلواؤ گے۔ مجھے گرفتار کرواؤ گے۔ مت بھولو تم بھی اس دلدل میں برابر کے شریک ہو۔" دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی اور وہ ہیلو ہیلو ہی کرتے رہ گئے۔

"لگتا ہے، سسر جی کو ٹریلر دکھانا ہی پڑے گا۔" کہتے اس نے ایک کال ملائی۔

"ہیلو مومن۔ تمہیں جو کام کہا تھا وہ کر دو۔ آج ابھی اور اسی وقت۔" دوسری جانب سے حامی بھری گئی اور پھر رابطہ منطقہ ہو گیا ۔ملک کی آنکھیں اور پیشانی پر موجود سلوٹیں گہری سوچ کی عکاسی کر رہی تھیں۔

کمرے کو سرخ رنگ کی گلاب کی پتیوں سے سجایا گیا تھا۔ تاریکی میں روشنی فراہم کرنے کے لیے سینٹڈ کینڈلز جل رہی تھیں جن کی دلفریب خوشبورات کے اس پہر اعصاب کو تازگی بخش رہی تھی۔ چوکور بیڈ پر عروسی جوڑے میں ملبوس منہا علی بیٹھی ہوئی تھی۔ روایتی دلہنوں کی طرح وہ بھی گھونگھٹ اوڑھے ہوئے تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور علی عمان اندر داخل ہوا۔ بال جیل کی مدد سے نفاست سے سیٹ کیے ہوئے تھے۔ وہ چلتا ہوا بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ گھونگھٹ الٹا تو بے اختیار منہ سے ماشاء اللہ کا لفظ نکلا۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" اسکا لب ولہجہ پٹھانوں والا تھا۔ تبھی اس نے سائیڈ ٹیبل کے دراز سے ایک مخملی ڈبیا نکالی۔ جس میں ہیرے کی چمکتی ہوئی انگوٹھی رکھی گئی تھی۔ علی نے منہا کا ہاتھ تھاما اور انگوٹھی اس کی ایک انگلی کی زینت بنا دی۔

"شکریہ۔" منہا نے آہستہ آواز میں شکریہ ادا کیا۔ وہ انگوٹھی واقع ہی بہت خوبصورت تھی۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

جی بولیں" علی نے منہا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔

"زہ تاسرہ مینہ کم۔" وہ لب دبائے بولا تھا۔

"مطلب کیا ہوا اس کا۔؟" اتنا تو وہ جانتی تھی کہ جو بھی علی نے کہا ہے وہ پشتو میں تھا لیکن اس کا مفہوم نہیں جانتی تھی وہ۔

"اس کا مفہوم لاعلم ہے اگر جاننے نکلو گی تو عشق کے سات سمندر بھی کم پڑ جائے گے۔ لیکن اُردو میں اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" وہ مسکرا دی۔ خدا نے اسے بہترین مرد سے نوازا تھا۔ جس کے پاس منہا کے لیے محبت، عزت اور تحفظ تھا اسے بھلا اور کیا چاہئیے تھا۔

رات کا نا جانے کون سا پہر تھا جب ملک کی آنکھ کسی برے خواب سے کھلی۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے اپنا خواب یاد آ رہا تھا۔ پسینے میں شرابور جسم لیے وہ اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اں مول نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ ان کا رشتہ کھوکھلا ہوتا جا رہا۔ اور جب بنیادیں کھوکھلی ہوں تو تعمیر ڈھے جاتی ہے۔

اندھیر سڑک پر رات کے اس پہر خاموشی کا راج تھا۔ سیاہ ہنڈا سوک سڑک پر چلتی سڑک کے بائیں جانب بنے مارشل آرٹس سینٹر میں داخل ہوئی تو گارڈ نے دروازہ واپس سے لاک کر دیا۔ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتا ہوا وہ اس گول عمارت کے اوپری حصے کی جانب آیا تھا۔ چند سیڑھیاں مزید اور پھر وہ ٹریننگ ڈپارٹمنٹ کی چھت پر پہنچ گیا۔ بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے وہ آگے آیا اور وہاں کھڑے شخص کے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اگلے ہی لمحے وہ اس سے لپٹ چکا تھا۔ بال ماتھے پر چپک گئے۔ پسینے میں نہایا وہ شخص مومن ابراہیم کے آگے زرہ زرہ ہو کر بکھر رہا تھا۔

"خواب ہمیشہ مجھے کیوں ڈراتے ہیں مومم۔ مومن۔؟" مومن نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ اس کے دل کی دھڑکن مومن کے دل سے مل کر بے ہنگم ہو رہی تھی۔

"بھائی میں انمول نہیں ہوں" وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا مطلب؟" ملک نے دور ہو کر ناسمجھی سے اسے دیکھا وہ مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

"آآآ!" ملک کا پنچ اس کے ناک کی ہڈی توڑنے کے لیے کافی تھا لیکن وہ بروقت پیچھے ہوا۔

"میں نے کچھ غلط تھوڑی کہا ہے۔ آپ کے انداز مجھے شرم سے پانی پانی کر دیتے ہیں۔ اب تو آپ شادی شدہ ہیں یہ حرکتیں آپ کو میرے ساتھ زیب نہیں دیتیں۔" وہ نیچے کی جانب بھاگا تھا اور ملک حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کے پیچھے۔

سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا مومن ابراہیم کسی کے وجود سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" اپنا ناک سہلاتی بسمہ شارق نے تپ کر اسے دیکھا۔

"دراصل مجھے نیند میں چلنے کی بیماری ہے۔"

"اوہو۔ بڑی گندی بیماری ہوتی ہے یہ۔ چلو تمہیں ہاسٹل چھوڑ آؤں۔" ملک ان دونوں کو باتیں کرتا کھڑا دیکھ نیچے بیسمنٹ میں موجود کنٹرول روم کی جانب بڑھا تھا۔

"چھوڑو مجھے بدتمیز۔" بسمہ نے اس کے ہاتھ کی پشت پر تھپڑ رسید کیا جس سے اس نے بسمہ کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

"حد ہے۔ تم یہاں مارشل آرٹس کی ٹریننگ لینے آئی ہو یا جنگلی جانوروں کی ٹریننگ دینے۔؟" بسمہ نے مشکوک نظروں سے مومن کو دیکھا جس کے چہرے سے لے کر کان کی لوئیں تک سرخ ہو رہی تھیں۔

"یہ تم کیوں نئی نویلی دلہنوں کی طرح شرما رہے ہو۔؟"

"وہ اس لیے حضور کہ میرا دلہا آپ جو ہیں۔" مومن بغیر سوچے سمجھے بول رہا تھا۔

"استغفر اللہ۔" وہ اس کی ذہنی حالت پر شک و شبہات کا شکار ہوتی واپس چلی گئی۔ مومن کو چھت پر کھڑا دیکھ وہ بے اختیار یہاں آئی تھی لیکن شاید مومن اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔

وہ ہنستا ہوا کنٹرول روم میں چلا گیا۔ ملک ایک سکرین پر جھکا ساتھ بیٹھے لڑکے کو ہدایت دے رہا تھا۔ پھر وہ مومن کی جانب آیا اور دونوں گارڈن میں آکر بیٹھ گئے۔

"میں نے آج پھر اسے خواب میں دیکھا۔ بہت برا خواب تھا وہ۔" ملک نے بات شروع کی

"برے خواب نہیں بتانے چاہیے۔" مومن نے مشورہ دیا

"برے خواب تو آتے رہتے ہیں مومن لیکن آج کے خواب میں اس کا آنا ٹھیک نہیں۔" وہ شکست خوردہ سا کہہ رہا تھا۔

"اتنی محبت کرتے ہیں اس سے؟"

"بہت زیادہ۔ سب سے زیادہ۔" وہ جذب کے عالم میں بولا تھا۔

"انمول سے بھی زیادہ۔" مومن نے نیا سوال داغا۔

"میری اور اس کی محبت میں انمول کہیں نہیں ہیں مومن۔"

"بتا کیوں نہیں دیتے اسے۔ اگر اسے کسی اور سے معلوم ہوا تو وہ آپ سے بدگمان ہو جائے گی۔" ملک نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے بس میں کچھ نہیں ہے مومن۔ مجھے اس کا محافظ بننا ہے چاہے ساری زندگی بھی اس سے سامنا نہ ہو۔ میری اس سے الفت تا قیامت ہے۔"

"بھائی۔" مومن نے اسے پکارا ملک اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا مومن کیا بولنے والا ہے۔ مومن کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔

"آئی ایم سوری بھائی۔ آئم رئیلی سوری۔" ملک اس کی حرکت پر مسکرا دیا۔

"تم جانتے ہو سات سال کے بچے تھے تم جب میرے پاس آئے تھے۔ تم تو تلی زبان بولتے تھے حالانکہ سات سال کا بچہ اچھا بول لیتا ہے۔ تم سارا دن سوتے تھے اور ساری رات مجھے جگاتے تھے۔ اور پھر ایک دن۔"

"بس کر دیں بھائی۔ کیا ماضی کھول کر بیٹھ گئے ہیں آپ۔" وہ ملک کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں ا چاہتا تھا۔

"پھر ایک دن تم نے بولا تمہیں دولت چاہیے۔ تمہیں انمول سے بڑا بننا ہے جبکہ تم اس سے چھوٹے تھے۔ تمہیں اس کے قابل بننا تھا۔" مومن کی نظریں زمین پر گڑ گئیں۔

"اور آپ نے کہا تھا وہ سراب ہیں مجھے ان کی چاہ نہیں کرنی چاہیے۔" وہ بولا تو لہجہ نم تھا۔

"تب تم چھوٹے تھے لیکن پھر ایک دن وہی مومن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انمول کو چھوڑ کر آ گیا۔ اس کی محبت سے دستبردار ہو کر اپنی محبت میں کہے جانے والے الفاظ ڈائری میں اتارنے لگا۔" ملک بول رہا تھا اور وہ زمین میں خود کو دھنستا محسوس کر رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ شرمندہ تھا بس وہ خود سے عاجز تھا۔

"میں اپنی چیزوں کی حفاظت نہیں کر پاتا۔ نہ ماں کی کر سکا۔ نہ اپنی محبت کی اور نہ ہی اپنی ڈائری کی جو پہلے آپ کے ہاتھ لگی تو اس دن انمول نے اسے پڑھ لیا۔ "مومن کا اندر باہر اداس ہو رہا تھا۔ خالی اور کھوکلا۔

"اللہ تمہیں اس سے زیادہ نوازے گا مومن ابراہیم۔ تمہارا دل اور نیت صاف تھا اور صاف ہے۔ اس میں کسی اور کا عکس سما جانا مشکل نہیں بس اپنے دل کا دروازہ نئے سوالی کے لیے کھول دو۔" وہ اسے بنجر محبت سے نکلنا سکھا رہا تھا۔ مومن نے استہزایہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔ وہ محبت میں ٹھکرایا ہوا مرد تھا اس پر لازم تھا کہ وہ مر جاتا۔ لیکن کسی اور کی محبت کے لیے اپنے دل کے در کھولنا ناممکنات میں سے تھا۔

جیا مضطرب انداز میں انگلیاں چٹخاتی بالاج کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بلب کے زیر اثر کمرہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ پھولوں کی سجاوت پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل اور دماغ سن ہو رہے تھے۔ رہ رہ کر خیالات اور وسوسے اسے گھیرے ہوئے تھے جب بالاج کمرے میں داخل ہوا۔

"بالاج صرف میرا ہے جیا، آج سے چار سال پہلے بھی میرا تھا اور تاعمر بھی میرا ہی رہے گا" حریم ناز کے جملے نے کانوں میں ایک بار پھر سے پگلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔

"السلام علیکم!" جیا نے دھیمی آواز میں سلام کا جواب دیا۔ بالاج بیڈ پر جیا کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحات اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

"سمجھ نہیں آ رہی کیا بولوں۔؟" جیا حیرت سے اس بالاج سکندر کو دیکھا جو دوسروں کو لاجواب کر دیتا تھا اور آج خود بات کرنے کو الفاظ تلاش رہا تھا۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" وہ گلا کھنکار کر گویا ہوا۔

"اس کے علاوہ کچھ؟" جیا مستفسر ہوئی۔ اپنی تعریف تو وہ شروع سے سنتی آئی تھی۔

"اس کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں۔" وہ سر کھجا گیا۔

"کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" بالاج چونک گیا۔ یہ کیسا سوال تھا خیر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔

"محبت کرتے ہیں لیکن اظہار نہیں کرتے۔" جیا نے ناک پھلائی۔ سفید رنگت میں سرخیاں گھل رہی تھیں۔ حیا یا شرم سے نہیں بلکہ غصے سے۔

"مجھے اظہار کرنا ہی نہیں آتا۔" وہ کندھے اچکا گیا لیکن اس کی بات پر جیا سر تا پیر سلگ گئی۔

"واٹ!"

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے سچ میں اظہار محبت نہیں آتی۔" جیا نے دانت پیس کر بالاج کو گھورا جو چہرے پر مظلومیت سجائے اس کے جواب کا منتظر تھا۔

"پھر حریم ناز سے کیسے کی تھی اظہار محبت۔؟" وہ دل میں کہنا چاہتی لیکن الفاظ زبان سے ادا ہو گئے۔

"ناٹ اگین۔ ٹاپک چینج کرو جیا۔" بالاج کے چہرے پر ناگواری بھرے تاثرات چھا گئے تھے۔

"کیوں کیا نہیں کی تھی؟" وہ مزید گویا ہوئی۔ بالاج نے سر اٹھا کر اس سر پھری لڑکی کو دیکھا جو آج بھی حریم ناز کا پینڈورا باکس کھولے بیٹھی تھی اور تبھی سیاہ آنکھیں سنہری آنکھوں سے مل کر چار ہوئیں۔ کانچ سی سنہری آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔ سیاہ آنکھیں آج پہلی بار ان آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں جہاں محض جیا سکندر کا عکس لہرا رہا تھا۔ سنہری آنکھیں سیاہ آنکھوں کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئیں۔

"جیا۔ بالاج۔ سکندر" بالاج کی آواز نے پل میں سارا فسوں توڑا تھا۔ وہ جیا کے نام کو حرف بہ حرف بول رہا تھا۔ آنکھیں ابھی تک اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"میں نہیں جانتا کب کیوں اور کیسے لیکن تم دل بن کر سینے میں دھڑکنے لگی ہو۔ میرے دل کی ہر دھڑکن تمہارے نام کی لے پر دھڑکنے لگی ہے۔" جیا کا سانس تک رک گیا۔ اب کی بار چہرے پر حیا کی لالی چھائی تھی۔ لب کترتی وہ آنکھیں جھکا گئی۔

"کبھی کسی نے بولا تھا کہ اسے میرے چہرے سے بھی نفرت ہے۔" جیا کا لہجہ بدل گیا۔ انداز میں غرور در آیا۔ آج وہ معتبر ٹھہرائی گئی تھی۔

"ہاں کبھی مجھے تم سے نفرت تھی۔" جیا نے حیرت سے بالاج کو دیکھا جسے محبت کا اظہار کرتے ہوئے مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ با آسانی اپنی سابقہ نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔

"ایسے نہ دیکھو مجھے میں سچ کہہ رہا ہوں کیونکہ تمہارا چہرہ ماہیر سے مشابہت رکھتا تھا۔ میں جب جب تمہیں دیکھتا تو تم میں ماہیر کا عکس ڈھونڈنے لگتا۔ تمہارا چہرہ مجھے میرے دوست اور میرے بھائی کی یاد دلاتا تھا۔" جیا کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"تمہیں معلوم ہے اس نے بچپن میں مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا'تمہاری حفاظت 'کا وعدہ اور پھر اسی دن وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔ میں بہت رویا تھا تب۔ اس وعدے کو کبھی میں نے اتنا سیریس نہیں لیا مگر جانا تو معلوم ہوا کہ میں اپنے دل سے وعدہ خلافی کر رہا تھا۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جب جب تمہیں اذیت پہنچی تکلیف مجھے بھی ہوئی تھی۔" بالاج کی سنہری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ جیا کا دل زور سے دھڑکا۔ کون کہتا ہے کہ مرد روتا نہیں؟ وہ روتا ہے وہ اپنی محبت پر آنسو بہاتا ہے۔

"بالاج اگر میں آپ سے کچھ مانگوں تو کیا آپ مجھے دیں گے۔؟" جیا کی آنکھوں میں امید کے دیئے جل رہے تھے۔

"بالاج سکندر دنیا کی تمام خوشیاں جیا بالاج سکندر کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہے۔" جیا نے نفی میں سر ہلائے اس کے دونوں ہاتھ اپنے حنائی ہاتھوں میں تھام لیے۔

"مجھے آپ سے اعتبار چاہیے بالاج۔ اس رشتے پر، مجھ پر یقین اور اعتماد۔ جو آپ مجھ پر آنکھ بند کر کے کر سکیں۔"

"محبت کی پہلی سیڑھی ہی اعتبار ہے جیا اور مجھے تم پر خود سے زیادہ یقین ہے۔" وہ تر آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بالاج کی بات پر اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ اپنے رب کے حضور جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ اس کا نصیب بالاج سکندر سے جڑ چکا تھا جو تا قیامت اس کا رہے گا۔

گرلز ہاسٹل میں بنے سیکنڈ فلور کے اس کمرے میں زرد بلب روشن تھا۔ وہاں دو لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف نظر آتی تھیں۔ بسمہ شارق سٹڈی ٹیبل کے آگے براجمان اپنے سامنے کاغذوں کا پلندہ بکھیرے بیٹھی تھی۔

"ویسے یار سر مومن کو تمہیں باہر نہیں نکالنا چاہئیے تھا۔" فریال بیڈ پر بیٹھی ہاتھوں پر لوشن لگاتی کہہ گئی اور تبھی کوئی شے زور سے آ کر اس کے ناک پر لگی تھی۔

"اب اگر تم نے یہ بکواس دوبارہ کی تو تمہاری یہ خوبصورت ناک کا حلیہ بگاڑ دوں گی۔" بسمہ نے ایک پین اس کی جانب پھینکا تھا۔

"جنگلی بلی۔ تم سے کس نے کہا تھا لیٹ آؤ مجھے تو اب ایک موضوع مل گیا ناں بات کرنے کا ویسے عبید کہہ رہے تھے کہ سر مومن کا غصہ بہت برا ہوتا ہے۔" بسمہ نے خونخوار نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا سین ہے یہ؟" بسمہ نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔ فریال بلینکٹ کھول کر خود پر ڈال رہی تھی۔

"کون سا سین۔؟" فریال نے بلینکٹ کے اندر سے پوچھا۔

"عبید بھائی والا کیا سین ہے فریال ساجد۔؟" بسمہ نے بازو سینے پر باندھے فریال ایک جھٹکے سے بلینکٹ دور پھینکتی اٹھی تھی۔

"کک۔ کو۔ کوئی سین نہیں۔ ہے تم سے۔ ایسا کس نے کہا؟"

"اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔؟ میں نے تو سمپل سا ایک سوال پوچھا ہے۔" فریال نے غضب ناک تیوروں سے اسے گھورا لیکن سامنے بھی بسمہ شارق تھی۔

"دیکھو چند ماہ چھوٹی ہو مجھ سے۔۔ چھوٹی ہی بن کر رہو میری ماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" فریال نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

"اچھا تو پھر وہ سب کیا ہوتا ہے جب ہر وقت عبید بھائی تمہارے ساتھ ہوتے ہیں تم دھوپ میں کھڑی ہو تو وہ چھاؤں بن کر تمہارے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف سے تمہیں پروٹیکٹ کرتے ہیں۔" بسمہ کی بات پر فریال نے سنجیدگی سے اسے تکا۔ وہ ایک بہترین اوبزرور تھی۔

"مانا کہ تمہارا مشاہدہ درست ہے لیکن میرا کوئی محبت وحبت کا سین نہیں ہے وہ تو بس عبید مجھے لائک کرتے ہیں۔" چند سیکنڈ میں ہی فریال نے ساری بات اگل دی تھی۔

"دیکھا میرا تکا کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔" بسمہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فریال کو اس پر سراز نو غصہ چڑھا تھا وہ اس سے اگلوانے کے لیے جھوٹ بول رہی تھی۔ "میری چھوڑو تم بتاؤ اس دن رات کو ڈپارٹمنٹ کیا لینے گئی تھی۔؟"

"تم اچھے سے جانتی ہو میں وہاں کیوں گئی تھی۔" فریال نے اوہ میں لب سکیڑے۔

"لیکن بسمہ شارق کو مومن ابراہیم کی مدد کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔" فریال نے طنز کیا۔ وہ یہ نہیں کہہ پائی کہ بسمہ شارق کو اس کی مدد کی نہیں بلکہ مومن ابراھیم کی بذات خود ضرورت ہے۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے سو جاؤ چپ کر کے۔" بسمہ نے اپنے خیالات جھٹکتے سامنے پڑے کاغذوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔

"میں کیا کہہ رہی تھی کہ کہیں تم ان سے۔"

"فریال کی بچی۔۔!" بسمہ نے پے در پے ٹیبل پر رکھی چیزیں اسے مارنا شروع کی تھیں۔ وہ بلینکٹ سے خود کو کور کرتی اپنا بچاؤ کر گئی۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو شبنم نے مرجھائے ہوئے ہر پھول کو زندہ کر دیا۔ پرندوں نے چہچہاہٹ سے گیت گنگنانے گئے تو وہیں اینکر حلق پھاڑ پھاڑ کر ملک کے شرفاء میں سے ایک کے سیاہ کرتوت بتلانے لگی۔

"جی تو ناظرین آپ کو بتاتے چلیں مشہور نامور شخصیت جہانداد ملک کی وجہ شہریت سامنے آگئی۔" وہ شعلہ بار نگاہوں سے اپنے سامنے سکرین پر چلتی ہیڈ لائنز کی سرخ پٹی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک میز پر آج صبح کا نیوز پیپر رکھا ہوا تھا۔

"جہانداد ملک کی سیاہ کاریوں کا پردہ فاش"

اخبار کی شہہ سرخی کو دیکھ وہ لب بھینچ گئے۔رپورٹر چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

"چند روز قبل ہائی وے سے بر آمد ہونے والے ٹرکوں میں اسلحے اور منشیات کی موجودگی جہانداد ملک کے کالے کرتوتوں سے پردہ اٹھا گئی۔مُلک کی نسل برباد کرنے کا سبب بننے والی شخصیت کے خلاف اریسٹ وارنٹ جاری۔"رپورٹر کی آواز مدھم ہوتی گئی تو کسی کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ابھرنے لگی۔

"یہ سب کیا ہے ملک؟"وہ اس وقت ملک کے کمرے میں سراپا سوال بنی کھڑی تھی۔باہر لیونگ روم میں لگے ٹی وی پر ابھی تک کچھ بتایا جارہا تھا۔

"برے کا انجام برا ہوتا ہے ایک نا ایک دن تو یہ سب ہونا ہی تھا۔جو کل کرے سو آج۔"وہ بولتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔انمول بھی اسکے پیچھے بھاگ کر آئی تھی۔ملک نے ریموٹ اٹھایا اور سرخ بٹن پر دباؤ بڑھائے سکرین پر چلتے مناظر میں سیاہی بھر دی۔ہر طرف جیسے سکوت چھا گیا تھا۔

"میرے بابا سائیں جیل نہیں جائیں گے۔"وہ نفی میں سر ہلاتی بولی تھی۔ملک نے اس کی جانب دیکھا۔اس کی حالت قابل رحم تھی۔

"یہ سب ان کا اپنا کیا دھرا ہے جس کی سزا انہیں قانون دے گا۔میں یا آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"وہ نظریں چراتا بول رہا تھا۔

"کس کو دھوکا دے رہے ہو تم۔مجھے یا خود کو۔ان کی بربادی کے زمہ دار تم ہو ملک مان جاؤ اس بات کو یہ سب تم جان بوجھ کر کر رہے ہو نا تاکہ انہیں نقصان ہو اور وہ کہیں کے نہ رہیں۔کیوں کر رہے ہو ایسا کیوں مجھے تکلیف دیتے ہو ملک۔"وہ پھٹ پڑی تھی۔سفید عارضوں پر چمچماتے آنسو لڑھک گئے۔

"انہوں نے میرا خاندان برباد کیا تھا انمول اس سب کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔آپ کو یہ نظر آتا ہے کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہیں یہ کیوں نہیں دکھ رہا کہ میں کس قدر اذیت ناک زندگی جی رہا ہوں۔ایسی زندگی جس کی چاہ میں نے کبھی نہیں کی تھی۔"آج پہلی بار اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔انمول کا نازک دل سہم گیا۔ہچکیاں بندھ گئیں۔

"کاش میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی ملک۔"ملک ساکت رہ گیا۔

"بہتر ہوتا اگر آپ واقعی مجھ سے محبت نہ کرتیں۔"ملک نے زکام زدہ سانس اندر کھینچی۔

"کاش میں نے تمہارے خواب نہ دیکھے ہوتے ملک۔کاش اس رات تم بھی مر جاتے۔"وہ باقاعدہ چیخنے لگی تھی۔آواز حلق میں دم توڑنے لگی۔ملک کے دماغ میں خون جمنے لگا۔

"لیکن سب کاش ہی ہے انمول بی بی۔اس کاش کو حاصل کرنے کے لیے دعا کریں میری موت کی دعا کہ کاش میں مر جاؤں۔"وہ آنکھ کا نم کنارا صاف کرتا باہر نکل گیا۔پیچھے دروازہ ٹھاہ کی آواز سے بند ہوا تھا۔انمول وہیں بیٹھتی چلی گئی۔وہ بلک بلک کر رونے لگی

جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی ماں کے بغیر روتا ہے جیسے کوئی اپنے کے چھن جانے پر بین ڈالتا ہے۔وہ کبھی نہیں روئی تھی اس کے باپ نے اسے روں ما سکھایا ہی نہیں تھا لیکن اب وہ رو رہی تھی اور خاموش کروانے والا کوئی نہیں تھا۔

"السلام علیکم سر۔" اس کے اندر داخل ہونے پر تمام سٹوڈینٹس اٹھ کر سلام بجالائے۔وہ ان پر واپس سلامتی بھیجتا جا کر ڈیسک کے آگے کھڑا ہو گیا۔ہاتھ میں پکڑا لیپ ٹاپ کھولا اور آج کا لیکچر سٹارٹ کیا۔ٹریننگ ڈپارٹمنٹ میں مارشل آرٹس کے علاوہ بھی تعلیم کا بندوبست کیا جا سکتا تھا لیکِن یہاں آ کر رہنے والا ہر شخص ایجوکیٹڈ تھا۔ہر لڑکا لڑکی کے ہاتھ میں سند ہوتی تھی کیونکہ وہ کہیں سے اٹھا کر نہیں لائے جاتے تھے انہیں مجبوراً یہاں آنا پڑتا تھا۔ماں باپ کا کیا بھگتنے تو کبھی خود کو جڑ سے مظبوط کرنے وہ یہاں کا رخ کرتے تھے۔

"جیسا کہ آپ سب کہ ٹریننگ پچھلے ایک عرصے سے چل رہی ہے اور اس میں آپ سب کی کارکردگی بھی بہترین ہے اس لیے ہم نے آپ کو کچھ ٹاسکس دینے کا سوچا ہے۔" مومن کی بات پر کلاس میں موجود سٹوڈینٹس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"طاقت انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔اس کا استعمال انسان کی بقا ہے۔جس کے لیے میں نے ہیڈ سے بات کی اور آپ کے لیے مختلف ٹاسکس تیار کروائے گئے ہیں۔" سب نے دم سادھ لیا۔ٹاسک سے مراد کام نہیں 'ٹاسک' تھا۔مارشل آرٹس کے سینٹر میں کوئی بھی کام یا بندہ عام نہیں ہوتا تھا۔

"اگلے چند ہفتوں کے لیے آپ سب لوگ اس سینٹر سے باہر رہیں گے۔یوں سمجھ لیجئے جیسے لوگ وکیشنز پر جاتے ہیں۔آپ مزا کریں گے۔زندگی جئیں گے۔لیکن۔!" اس کا یوں تجسس پھیلانا تیسری قطار میں بیٹھے عبید باجوہ، فریال ساجد اور بسمہ شارق کو سخت ناگوار گزرا تھا۔

"اس دوران آپ میں سے کسی ایک کی موت یقینی ہو گی۔" کلاس میں موجود ہر شے ساکن ہو گئی۔مومن کی آواز صور کی مانند پھونکی جانے لگی۔

"آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔آپ آزاد ہوں گے۔لیکن آپ کو محتاط رہنا ہو گا۔کچھ ٹرینڈ ایکس سٹوڈنٹس آپ کے لیے چنے گئے ہیں جو رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کریں گے۔ان کا کام آپ پر حملہ کرنے کا ہو گا آپ نے مقابلہ کیسے کرنا ہے یہ آپ کے اختیار میں ہو گا۔اس دوران دونوں میں سے کسی ایک کی جان بھی جا سکتی ہے۔سو بی کیئر فل۔" تمام سٹوڈینٹس منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یا اللہ کیا چیز ہے یہ بندہ۔" فریال نے توصیفی انداز میں کہا

"موت کا پروانہ۔" بسمہ شارق کے لبوں نے حرکت کی۔ جبکہ باجوہ کی کاٹ دار نگاہیں اس پر ٹکی تھیں جو اب سٹوڈینٹس کے مختلف سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

ڈائننگ ہال میں لگی کھانے کی طویل میز پر صبح کے ناشتے کے لیے انواع واقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ وہاں بیٹھے آفرین جہاں، علی اور ہما کے علاوہ سکندر ہاؤس کے تمام مکین جمع تھے۔ وہ سب منہا کے لیے ناشتہ لے کر آئے تھے۔ خوش گپیاں جاری تھیں۔ پلیٹ میں چمچ چلاتی جیا کی کلائی میں کوئی شے چمکی تھی۔

"ماشاءاللہ۔ ڈائمنڈ اور وائٹ گولڈ؟" منہا نے جیا سے پوچھا وہ اس کے بلکل سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ جیا کے دائیں جانب بالاج اور منہا کے بائیں جانب علی بیٹھا ہوا تھا۔

"ڈائمنڈ وِد وائٹ گولڈ۔" جیا نے بالاج کی جانب دیکھا وہ مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بریسلٹ بالاج نے جیا کو منہ دکھائی کا تحفہ دیا تھا۔

ناشتے کے بعد سب لاؤنج میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب علی نے اپنا پلین سامنے رکھا۔

"میں اور منہا تو ہنی مون کے لیے مالدیپ جا رہے ہیں آپ دونوں کا کیا پلین ہے۔؟"

"ہم نے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔" بالاج نے دھیمی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"اوہ یہ تو پھر بہت اچھا ہے۔ منہا۔" علی کی باچھیں کھل گئیں۔ منہا کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔

"مطلب؟" بالاج کی پیشانی پر شکن آئی تھی۔

"مطلب یہ بھائی۔" منہا نے ایک لفافہ ان دونوں کی جانب بڑھایا جسے بالاج نے تھام لیا۔

"اس میں کیا ہے۔؟" جیا نے استفسار کیا۔ تینوں بڑے بھی مسکرا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ بالاج نے لفافہ چاک کیا جیا نے اس کے کندھے سے لفافے پر جھانکا۔ اگلے ہی لمحے ان دونوں کی آنکھیں حیران رہ گئیں۔

"یہ ہماری طرف سے آپ دونوں کے لیے چھوٹا سا گفٹ۔" منہا کے بتانے پر بالاج اور جیا نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ان دونوں کے ہنی مون کے ٹکٹس تھے۔

"آج شام کو ولیمہ ہو گا ہمارا اور ایک ہفتے بعد فلائٹ۔" وہ ان دونوں کو آگاہ کر رہے تھے۔ وہ سب اب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے تھے۔

وہ دونوں اس وقت اسلام آباد میں موجود 'دی بٹلرز کیفے' میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سیاہ دروازے سے اندر داخل ہوتے وہ دونوں دائیں جانب لگے ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سیاہ کرسیاں پورے کیفے میں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھا ایک ہاتھ ٹیبل پر رکھے اپنے سامنے بیٹھی عالیہ جعفری کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہ سیدھے کندھوں تک آتے بال، ستواں ناک اور گندمی رنگت والی عالیہ جعفری اتنی پرکشش نہ تھی لیکن اس کی بھوری آنکھوں کی کشش اسے خاص بنا رہی تھیں۔

"تمہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔؟" وہ مدعے کی بات پر آیا۔

"کیوں اور کیسے کو چھوڑو وہاج ملک۔ یہ بتاؤ کیا تم میری مدد کرو گے۔؟" عالیہ کی نگاہیں اپنے دائیں جانب گلاس وال سے باہر ٹکی تھیں۔ چند لمحات قبل وہ اسے اپنے ارادے سے آشنا کروا چکی تھی۔

"میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔" اس کے جواب پر عالیہ نے جھٹکے سے گردن موڑی۔

"کیا تمہیں جیا سکندر نہیں چاہیے۔؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔؟"

"مجھے جیا سکندر نہیں اس کی بربادی چاہیے۔ جس کے لیے میں حریم ناز سے بات کر چکا ہوں۔ بس کچھ دن مزید اور پھر۔۔۔ خلاس۔" وہ ہاتھ باقاعدہ جھاڑ کر بولا۔

"دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے بالاج سکندر ہر قیمت پر چاہیے۔" وہ اپنا ہاتھ زور سے ٹیبل پر مار کر چیخی۔ آس پاس کے ایک دو لوگوں نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ خجل ہوتی خود کو ریلیکس کرنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے جیا سکندر کو میں نئے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے مار سکتا ہوں۔" وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا تھا۔

"تو پھر مار دو دیر کس بات کی ہے۔" اس کی بات پر وہاج نے نفی میں سر ہلایا۔ جسم پر کوئی شے گرتی محسوس ہوئی۔ جلن کا احساس بڑھنے لگا وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"یہی تو مسلہ ہے کہ میں اسے مار نہیں سکتا لیکن تڑپتا ضرور چھوڑ سکتا ہوں۔" عالیہ کی بھوری آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تمہارے پاس جیا کی اور اپنی تصاویر ہیں۔ ہم ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ وہاج گہرا سانس بھر کر اسے دیکھنے لگا۔

"اگر تمہاری اس حریم ناز نے کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکی ہوتی۔ بالاج اور جیا ہنی مون کے لیے دبئی جا رہے ہیں۔ اب تو بالکل بھی وقت نہیں رہ گیا۔" وہاج کو اس کی بات کچھ مناسب لگ رہی تھی۔

"ہمم کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ سو۔ مجھے کچھ دیر سوچنے دو۔" وہ پر سوچ انداز میں بولا۔ عالیہ اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھتی اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"اوکے ڈیل ڈن۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ڈن۔ جیا تمہاری۔ بالاج میرا۔" وہ کلچ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہاج کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ غصے سے بپھر اوہ وہاں سے چلا گیا۔ عالیہ شاطرانہ چال چل کر ہنس دی۔ اب بالاج کو اس کا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

فون کی رنگ ٹون کب سے بج رہی تھی۔ لیکن مقابل نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ وہ کھٹ کھٹ کٹنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹ رہا تھا۔ فون کی رنگ ٹون دوبارا بج اٹھی۔ ملک نے ایک نظر پیچھے انمول کے کمرے کو دیکھا جس کا دروازہ بند تھا اور پھر سبز رنگ کے آئیکن کو پریس کرتا وہ فون کان سے لگا گیا۔

"سلام سسر جی۔ آج داماد کی یاد کیسے آگئی آپ کو۔؟" موبائل سپیکر پر ڈال کر وہ سبزیاں ایک برتن میں نکال رہا تھا۔

"آکر فائل لے جاؤ۔ میں نے سائن کر دی ہے۔" دوسری جانب سے جہانداد ملک کی آواز ابھری۔ ملک نے حیرت سے فون کو دیکھا۔

"ارے واہ۔ یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ چلیں اب میرا انتظار کریں۔" وہ کال کاٹ کر اپنے کام کی جانب متوجہ ہوا۔ پہلے مومن ابراہیم کے ہوتے ہوئے اسے کھانا خود بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن اب ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔

"کھانا تم کیوں بنا رہے ہو۔ مجھ سے کہہ دیتے میں بنا دیتی۔" انمول اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ ملک نے اسے دیکھا جو نیلے آسمان کے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔

"انڈا ابھی ابالنا آتا ہے آپ کو۔؟" وہ طنز سے گویا ہوا۔

"جی ہاں سب آتا ہے۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"اچھی بات ہے لڑکیوں کو سب آنا چاہیے سسرال میں کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن فی الحال آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" انمول نے غصے سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سبزیاں پکڑ لیں۔

"تم بیٹھو میں بناتی ہوں۔" وہ کندھے اچکا کر کچن سے نکل آیا۔

"میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔" اوپن کچن سے انمول کی آواز ابھری۔ لیونگ روم میں صوفے پر بیٹھے ملک نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا

"بابا جیل نہیں جائیں گے۔ تم نے اس بات کا جواب نہیں دیا تھا۔" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ گلے میں خراش سی تھی۔ غزالی آنکھوں تلے حلقے تھے۔

"آپ فکر نہیں کریں۔ پولیس آپ کے 'بابا سائیں' کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔" اس کے جواب پر انمول خاموشی سے کام میں جت گئی۔ اور وہ گہری سانس بھر تا ٹی وی آن کر گیا۔

بالاج اور علی کا ولیمہ اختتام پذیر ہوا تو مہمان واپس اپنے گھروں کے راستے پر گامزن ہونے لگے۔ چار دن بعد ان کی دبئی کی فلائٹ تھی۔ شادی کے بعد عزیز و اقارب کی طرف سے ملنے والی دعوتوں سے نجات کا یہ بہترین ذریعہ تھا۔ ایک مہینے کا وہ ٹرپ یقیناً اس نئے جوڑے کو پرانا کر دے گا اور پھر کسی کو دعوت کا خیال نہیں ہو گا، ایسی ان کی سوچ تھی۔ جیا اپنی اور بالاج کی پیکنگ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فلائٹ سے پہلے وہ تھکی ہوئی ہو اس لیے تمام انتظامات وہ پہلے ہی مکمل کر رہی تھی۔

وہ الماری میں سر دیے اپنے کپڑے منتخب کر رہی تھی جب بالاج کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ جیا نے پلٹ کر اسے دیکھا وہ سیاہ شلوار قمیض میں جاذب نظر لگ رہا تھا۔ جیا نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ بولا۔ بالاج اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔

"سنیں۔" جیا ہاتھ میں ہینگ ہوئے کپڑے اٹھائے ڈریسنگ روم سے نکل کر کمرے میں آئی۔

"سنائیں۔" جیا نے کپڑے بیڈ پر دھرے اور بالاج کو دیکھا۔

"آپ سیاہ رنگ مت پہنا کریں۔" وہ انگلیاں آپس میں الجھاتی حکم صادر کر گئی۔ بالاج نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں۔؟" وہ جیا کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے سوال پر وہ گڑبڑائی تھی۔ ایک تو وہ لگ اتنا خوبصورت رہا تھا اور اوپر سے اس کی سنہری آنکھوں کی چمک جیا کو نظریں اٹھانے نہیں دے رہی تھی۔

"نظر لگ جاتی ہے۔"

"اچھا تو تم نظر اتار لیناناں میری۔" بالاج کا انداز شوخ تھا۔ وہ اپنی پیشانی جیا کے ماتھے سے ٹکرا گیا۔

"مم۔ مجھے پیکنگ کرنی ہے ہاتھ چھوڑیں۔" وہ سٹپٹا کر بیڈ کی جانب دیکھنے لگی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"ویسے یہ تصویر یہاں بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔" بالاج نے ٹاپک چینج کرتے بیڈ کے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ جیا نے دیکھا وہاں سے بالاج کا پورٹریٹ ہٹا کر جیا اور بالاج کی تصویر لگا دی گئی تھی۔ جو واقعی میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"بہت۔!" وہ بولی۔ جبکہ دایاں ہاتھ بالاج کی گرفت میں تھا۔

"ہاں لیکن میں زیادہ پیار الگ رہا ہوں۔" لہجے میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"بہت برے ہیں آپ۔" وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرواتی دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

"بس کبھی غرور نہیں کیا لیکن تم سے پھر بھی کم برا ہوں۔" اس کی بات کو جیا 'ہنہ' کہہ کر جھٹک گئی تھی۔

"میرے ساتھ پیکنگ میں ہیلپ کروائیں۔" وہ غصے سے چند کپڑے اس کی جانب اچھال کر بولی۔

"یہ کام بیویوں کے کرنے والے ہوتے ہیں۔" وہ کپڑوں کو کیچ کرتا دوبارہ اس کی جانب پھینک گیا۔

"جی شوہر تو بس حکم چلانے اور تنگ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں ناں۔" اس کی بات پر بالاج کا قہقہہ چھوٹا۔ جیا اسے گھوری سے نوازتی چہرے پر نو لفٹ کا بورڑ لگا گئی۔ مسکراہٹ بالاج کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی وہ جانتا تھا اس کی یہ کم عقل، پھوہڑ اور غصیلی بیوی جلد ہی اپنی ناراضگی بھلا دے گی۔

ملک نے نا جانے کیسے جہانداد ملک کے خلاف کھڑے ہونے والوں کی سلا دیا تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ایک بات تو سب جانتے ہیں کہ پیسہ۔ پیسہ ہی ہر کام کرواتا ہے۔ ملک جہانداد ملک کی حویلی کے دالان میں کھڑا ہوا تھا۔ شائستہ بی اسے وہاں بیٹھا کر جہانداد ملک کو اطلاع دینے گئی تھی۔ کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز پر اس نے دیکھا جہانداد ملک اسی کی جانب رہے تھے۔ ہاتھ میں وہی فائل تھامے جو اڑھائی دن پہلے ملک کے ہاتھ میں تھی۔

"یہ لو فائل اور بیٹھو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" ملک نے ان کے ہاتھ سے فائل پکڑ کر دیکھی۔ وہاں تین مختلف جگہوں پر جہانداد ملک کے دستخط تھے۔

"بہت شکریہ آپ کا۔ لیکن میں چائے کے لیے بیٹھ نہیں سکتا۔ کام ہیں مجھے۔" وہ تپانے والے انداز میں بولا۔

"بیٹھ جاؤ 'ملک' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" ان کی بات پر وہ کندھے اچکاتا بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔

"انمول کیسی ہے۔؟" وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں باہم ملائے مرکزی صوفے پر بیٹھے تھے۔

"وہ بات کریں جو کرنے کے لیے بٹھایا ہے۔" وہ درشتی سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک گیا۔

"مت بھولو کہ وہ میری بیٹی ہے۔" ان کے نقوش تن گئے۔ ملک کا دل کیا یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے وہ مزید اس شخص سے کلام نہیں کر سکتا تھا۔ خیر جہاں اتنا کچھ دل کی مرضی کے بغیر کیا وہاں یہ بھی سہی۔

"اگر اس بیٹی کو آپ کے کارناموں کا علم ہو جائے تو وہ آپ کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جہانداد ملک نے دہل کر اس کی جانب دیکھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ملک کو ان کی حالت سے لطف آیا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔" ان کے الفاظ میں ڈر تھا۔ کچھ چھن جانے کا خوف۔ ملک مسکراہٹ دباتا ان کے قریب آیا۔ وہ سنگل سیٹ صوفے پر براجمان تھے۔ ملک نے اپنی ہتھیلیاں ان کے اطراف میں رکھیں اور پھر وہ وہ ان کے کان کے قریب جھک گیا۔

"اگر تو آپ چاہتے ہیں کہ جہانداد ملک کا یہ بھرم یونہی اپنی بیٹی کے آگے قائم رہے تو اس کا خیال اپنے دل، دماغ اور پھیپھڑوں سے نکال دیں۔ اچھا ہو گا۔" اس کی آواز میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"وہ میرا خون ہے ملک۔ تمہیں اسے طلاق دینا ہو گی۔" انہوں نے ملک کو پیچھے کی جانب دھکیلا۔

"طلاق کا لفظ تو اپنی زبان پر لائیں بھی مت۔ کیونکہ اگر جہانداد ملک میرے پیر بھی پکڑ لے تو میں انمول کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس کا نام موت کے بعد بھی میرے نام کے ساتھ جڑا رہے گا۔"

"پچھتاؤ گے تم۔" جہانداد ملک دھاڑے۔

"پچھتائے وہ جسے ڈر ہو۔ اور ویسے بھی پچھتاوا ان کے نصیب میں آتا ہے جو اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ اور میں جانتا ہوں میں نے جو کیا اپنے اور سب کے بھلے کے لیے کیا ہے۔ میری بیوی کے بارے میں آئندہ مت سوچیے گا۔ اپنے وفادار لوگوں پر دھیان دیں۔ ان کے ضروری کام طویل ہوتے جا رہے ہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ پیچھے جہانداد ملک تنہا بیٹھے رہ گئے تھے۔ پچھتاوا۔ ہاں وہ اس لفظ میں ڈوب گئے۔ شاید وہ سچ میں پچھتا رہے تھے۔ وہ اس بات پر پچھتا رہے تھے کہ انہوں نے دیر کیوں کی۔ انہیں اس شخص کو زندہ چھوڑ دینے کا ملال تھا۔ وہ انہیں ندیم کا طعنہ دے کر گیا تھا۔ ان کا بس چلتا وہ ساری دنیا کو جلا کر بھسم کر دیتے۔ اپنا فون نکالتے انہوں نے بٹن دبائے اور فون کان سے لگایا۔ چند مستطیل گھنٹیوں کے بعد دوسری جانب سے آواز ابھری تھی۔

"جی مالک۔" مہذب انداز میں بات کرنے والا ندیم تھا۔

"کہاں ہو تم۔؟" دوسری جانب سے کوئی لمبی داستان سنائی گئی تھی۔ جہانداد ملک اس کی بات پر یقین کرتے اسے ایک نئی زمہ داری سونپ گئے تھے۔

دور تک پھیلا وہ میدان کہ جسے دیکھنے سے کسی صحرا کا سا گمان ہوتا تھا۔ اس وقت سہ پہر کی چھٹ رہی پیلی اور نارنجی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس وقت تمہیں وہاں دو بائیکس کھڑی نظر آئیں گی۔ ایک سیاہ اور دُوجی سرخ۔ سیاہ رنگ کی بائیک پر بیٹھے شخص نے

ہیلمٹ کا شیشہ الٹا تو گہری بھوری آنکھیں سیاہ شیشے کے پیچھے چھپ کر رہ گئیں۔اس کے برابر کھڑی سرخ بائیک پر بیٹھی ہستی نے آنکھوں میں جلن لیے اپنا ہیلمٹ باندھا۔

"زووں" دونوں بائیکوں کی آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا لیکن مومن ابراہیم کے نام کی صدا میں وہ خاموش رہ گئی۔ سیٹی کی دھن بجی۔ سرخ جھنڈا لہرایا گیا اور پھر دونوں بائیکس ایک ساتھ آگے بڑھے تھے۔وہاں گئی ایک بڑی سی سکرین پر دونوں کھلاڑیوں کو دکھایا جارہا تھا۔ سرخ رنگ کی بائیک آگے تھی جبکہ سیاہ اس کے پیچھے اس سے آگے نکلنے کی کی تگ و دو کر رہی تھی۔

سرخ رنگ کی بائیک کو چیرتی سیاہ بائیک آگے نکل گئی تو سرخ بائیک نے بھی رفتار پکڑی۔ایک مکمل اور طویل راؤنڈ کے بعد وہ بائیکس واپس اس طرف آتی دکھائی دی تھیں۔

"بسمہ۔بسمہ۔بسمہ۔" سرخ رنگ کی بائیک سب سے آگے تھی۔ریس دیکھنے والوں نے بسمہ نام کی صدا بلند کی۔لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ایک پل آپ کے تو اگلے ہی پل وہ دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔

"بسمہ!۔" ان سب کے درمیان کھڑی فریال ساجد کی خوشی دیدنی تھی۔اس کے ساتھ کھڑا عبید باجوہ مسکرا کر بسمہ کو فنش لائن سے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔وہ مومن کے سے انداز میں پئی کو اپنے سینے پر لپیٹتی فنش لائن عبور کر گئی۔سیاہ بائیک میں پیچھے آتے مومن ابراھیم کی آنکھوں میں چمک تھی۔ہر دیکھنے والے نے مومن ابراہیم کو تاسف سے دیکھا تھا۔وہ کبھی کسی سے نہ ہارنے والا ایک معمولی سی لڑکی سے ہار گیا تھا۔

فریال اور باجوہ اس کے قریب کھڑے متبسم لگ رہے تھے۔مومن نے ہنس کر سر جھٹکا۔وہ آگے بڑھنے لگا تھا۔اس کے قریب سے کوئی گزرا۔

"لوزر۔" بسمہ شارق آنکھ ونک کرتی اس کے ساتھ سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی۔مومن نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا۔

وہ خود کو فاتح سمجھ رہی تھی لیکن اصل غازی تو وہ تھا۔اس نے آج تک بہت سی لڑکیوں سے ریس لگائی تھی اور ہمیشہ جیت اسی کا مقدر ٹھہری تھی لیکن اس بار ریس شروع ہونے سے قبل وہ اس کی سرمئی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک کو جھٹلا نہیں سکا تھا۔وہ خود تو ہار سکتا تھا لیکن ان جیت کی خوشی میں سرشار ہوتی اکھیوں کو نہیں ہرا سکتا تھا۔

وہ اس دن سرِ شام ہی گھر لوٹ آیا تھا جب کچن سے آتی اشتہا انگیز خوشبو اس کے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی۔انمول اس کی جانب پشت کیے کھڑی کھانا بنا رہی تھی۔وہ سلام کرتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔کچھ دیر بعد انمول اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی ۔وہ خاموش سا اٹھ کر کھانے کے لیے آگیا۔کھانا کھانے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے

کمرے میں چلا گیا۔ انمول نے بھی اس نے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا جب انمول کافی کا کپ ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپ پریشان نہیں ہوں وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ بلاوجہ میں پریشان ہو رہی ہیں۔" انمول کے کان 'ہو رہی ہیں' پر کھڑے ہوئے تھے۔

"آپ جیسی بہادر لڑکی کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بس دعا کریں اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ مجھے کہہ سکتی ہیں۔" ملک نے انمول کے ہاتھ سے کپ پکڑا وہ وہیں کھڑی رہی۔

"اوکے جیسے آپ کی مرضی میں کچھ دیر تک آتا ہوں۔" ملک نے کال کاٹ کر سوالیہ نظروں سے انمول کو دیکھا وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"کون تھی یہ؟" انہوں نے دانت کچکچائے۔

"کون؟ اچھا کال پر۔؟ تھی کوئی لڑکی۔" ملک نے گہری مسکراہٹ سے جواب دیا جیسے مقابل ہستی اسے جانے کتنی ہی عزیز ہو۔

"کس لڑکی کے ساتھ آئے ہو تم۔؟" نیا سوال کیا۔ وہ کھڑکی سے ملک کو اپنی گاڑی سے اترتا دیکھ چکی تھی۔

"میں جس مرضی کے ساتھ آؤں۔ آپ سے مطلب۔؟" ملک نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

"بالکل مجھے کیا مطلب ہو سکتا ہے تم جس مرضی کے ساتھ آؤ۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا سوال جواب کرنے کا۔" انمول آنسو پیتی واپس چلی گئی۔ پیچھے ملک سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"شٹ۔ ڈیم اٹ۔" اس نے کافی کا کپ غصے سے ٹیبل پر پٹخا۔

انمول لاؤنج میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اسے منانے آئے گا۔ لیکن ایک گھنٹہ بیت جانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا تھا۔ اس کا دل درد کر رہا تھا۔ اس نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔ مانا کہ وہ غلط تھی لیکن معافی بھی تو مل سکتی ہے ناں۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی غلطی ایک مرتبہ ہو تو سو دفعہ معافی مل جاتی ہے لیکن ہر بار کی غلطی پر بار بار معافیاں نہیں ملا کرتیں۔

"کلک" کی آواز سے ملک کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ انمول گھٹنے سینے سے ٹیکے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جب ملک آکر اس کے ساتھ براجمان ہوا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملک نے پھرتی سے اسے کلائی سے تھام کر دوبارہ بیٹھا دیا۔

"آئی ایم سوری انمول۔" وہ چار لفظ تھے لیکن انمول کو لگا جیسے زندگی بھر کے شکوے شکایات دور ہو گئے ہوں۔ سارے دھندلے مناظر صاف شفاف نظر آنے لگے ہوں۔ وہ پلکیں دوبارہ جھپک کر اسے دیکھنی لگی۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس کے سامنے براجمان شخص 'ملک' تھا۔

"میں کون ہوتی ہوں تمہیں معاف کرنے والی۔ معافی اپنی اس ہوتی سوتی سے مانگو۔" وہ رخ موڑے بیٹھی تھی۔ لیکن کن اکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میری کوئی ہوتی سوتی نہیں ہے وہ۔ اس کا نام ماہزین ہے اور وہ میری سٹوڈنٹ ہے۔ اور اس وقت اسے تسلی اور حوصلے کی ضرورت تھی۔" وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والا آج اس کے سامنے صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

"مجھے کیوں صفائیاں دے رہے ہو۔ میرا کیا حق ہے تم پر۔ لگتی ہی کیا ہوں میں تمہاری۔؟" وہ ملک کے الفاظ ملک کو ہی لٹا رہی تھی۔

"تمام حق ہی آپ کا ہے۔" ملک نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ وہ سوں سوں کرتی رو رہی تھی۔ اور ملک کو وہ آج سے سالوں پہلے والی انمول لگی۔

"جھ۔ جھوٹے ہو تم ایک نمبر کے۔"

"شکر نہیں کرتی کہ اس دو نمبری کے زمانے میں یہ بندہ ایک نمبر ہے۔" ملک نے اس کے دائیں گال سے آنسو صاف کیے۔

"اس بندے کو جوتوں کی کمی ہے بس۔" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"لاحولاولا قوۃ۔ اب آپ اپنے مجازی خدا کو جوتوں سے پیٹیں گی زوجہ؟" ملک نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔

"زوجہ۔؟" انمول کی سوئی زوجہ لفظ پر اٹکی ہوئی تھی۔

"ہاں ملک کی زوجہ۔ زوجۂ ملک۔" اس نے انمول کی ناک دبائی۔ انمول نے اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹاتے دونوں ہتھیلیوں میں تھام لیا۔

"تمہیں پتہ ہے میں بچپن سے کبھی نہیں روئی تھی۔" ملک غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جب کبھی مجھے چوٹ لگتی تو بابا سائیں مجھے رونے نہیں دیتے تھے لیکن یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں پچھلے چند ماہ میں اتنا روئی ہوں۔ تم نے مجھے بہت رلایا ہے ملک۔" وہ آنکھوں میں غم و غصہ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے رلایا ہے ناں۔ میں ہی مداوا بھی کروں گا ایک ایک آنسو ایک ایک تکلیف کا ازالہ کروں گا میں۔" ملک نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔ انمول کے دل نے لفظ محبت کی صدا لگائی تو ہر جانب جیسے بہار اتر آئی۔

"اب بندہ کیا ہی بولے تمہیں۔؟" وہ اپنے ہاتھ چھڑواتی تپ کر گویا ہوئی۔

"خوبصورت، پیارا، دلکش، حسین، دیدہ زیب اور ایسے بہت سے الفاظ مل سکتے ہیں آپ کو میری شان میں عرض کرنے کے لیے۔" ملک نے آنکھ ونک کی۔

"معذرت لیکن میں یہ الفاظ کہہ کر ان کا دل نہیں دکھا سکتی۔" انمول نے میٹھا سا طنز کیا۔

"اوہیلو ایسا پرنس چارمنگ بندہ تمہیں چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔" ملک نے دہائی دی۔

"شکر ہے تم نے خود کو ٹام کروز نہیں بول دیا۔" ملک نے دیدے پھاڑے اسے دیکھا۔ انمول اس کی حالت سے محفوظ ہوئی تھی

"واٹ!! وہ بڈھا۔؟"

"بڈھا ہی سہی لیکن ہے تو پیارا ناں" انمول صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ ساری بے زاری اور بے اعتنائی دور ہو گئی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی شوہر کے ہوتے ہوئے نامحرموں کو سوچتے ہوئے۔" ملک نے دانت پیسے۔ اس کی بیوی کو اس کے مدمقابل وہ ٹام کروز اچھا لگ رہا تھا۔

"جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔" دل جلانے والی مسکراہٹ سے بولتی وہ اندر اپنے کمرے میں گم ہو گئی تھی۔ ملک سر جھٹک کر رہ گیا۔ آہ یہ دن بھی آنے تھے۔

کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشنی کا ذریعہ وہاں لگی پروجیکٹر سکرین بن رہی تھی۔ جس پر انگریزی حروف میں مارشل آرٹس لکھا جگمگا رہا تھا۔ اس کے سامنے ہی ملک بلیک تھری پیس سوٹ میں ڈیسک کے سامنے کھڑا تھا ایسے کہ دونوں کہنیاں ڈیسک پر تھیں۔ اس کے سامنے پہلی قطار میں مومن ابراہیم، مینیجر اور چند ایک اعلیٰ ماسٹرز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جو مارشل آرٹس میں پورپور ڈوبے ہوئے تھے۔ جبکہ ان کے پیچھے اونچی ہوتی کرسیوں پر تمام سٹوڈینٹس براجمان تھے۔ آج ان کو مارشل آرٹس اور اس کی تعلیم سے آگاہ کیا جانا تھا۔ معمولی بات چیت کے بعد ملک آج کے لیکچر کی جانب بڑھا۔

"مارشل آرٹ کیا ہے۔؟" اس کی آواز پوری کلاس میں گونج رہی تھی۔

"مارشل آرٹ لڑائی کی ایک قدیم روایت ہے جو اپنے دفاع، مسابقت، جسمانی، ذہنی اور روحانی نشوونما کے لیے مشق کی جاتی ہے۔ مارشل آرٹس کا آغاز 3,000 سال پہلے سری لنکا میں ہوا، جو آہستہ آہستہ چین، ہندوستان، کوریا، مغرب اور امریکہ تک پھیل گیا۔ اور اب اس کا سلسلہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی اپنایا جا رہا ہے۔" بسمہ شارق نے توصیفی انداز میں آئبرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"مارشل آرٹس ہمیں اعتماد، ذہنی طاقت، ہمت، استقامت، کام کی اخلاقیات، عاجزی، ہمدردی، دیانتداری، مہربانی، احترام، عزت، نظم وضبط اور بہت کچھ سیکھاتا ہے۔ اس کی تربیت کے دوران میں پیدا ہونے والی دوستیاں اکثر زندگی میں کسی بھی چیز سے زیادہ حقیقی

ہوتی ہیں۔ یہ آپ کو کسی بھی جگہ کسی بھی مقام پر فیضیاب کر سکتی ہیں۔ اب چلتے ہیں اس کی تعلیم کی جانب۔" ملک نے سکرین کی جانب اشارہ کیا۔ اور پھر پاس لگے وائٹ بورڈ پر چند الفاظ گھسیٹے۔

"ایج رسٹرکشنز۔ Age Restrictions۔ کیا مارشل آرٹس کے لیے عمر مختص کی گئی ہے۔ نہیں بالکل بھی نہیں۔ مارشل آرٹس کو نہ صرف بچوں اور نوعمروں بلکہ بڑوں اور بوڑھوں کے مردوں اور عورتوں کے لیے بھی حتمی خود دفاعی طریقہ کار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ آج کل زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مارشل آرٹ صرف ایک قسم کا کھیل ہے۔ لیکن، جو بھی مارشل آرٹس سیکھتا ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ مارشل آرٹس صرف ایک قسم کے کھیل سے زائد ہے۔ اس کے فوائد جسمانی اور روحانی طور پر مثبت اثر کرتے ہیں۔" مومن ابراہیم نے آنکھوں کے اشارے سے اسے سراہا۔ باقی تمام نفوس چیرے پر سنجیدگی سجائے بیٹھے تھے۔ اور ملک بول رہا تھا۔

"اب چلتے ہیں اس جانب کہ یہ کیسے اور کب مدد کرتا ہے۔ نمبر ایک۔ سیلف ڈیفنس۔ جس کا اردو معنی خود کا دفاع کرنے کے ہیں۔ یہ ایک جوابی اقدام ہوتا ہے جو آپ خود کو نقصان یا خطرے سے بچانے کے لیے کرتے ہیں۔ مارشل آرٹس آپ کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ اس کی تربیت سے آپ ایک مضبوط انسان بن جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد ہی آپ کو چلنا سکھاتی ہے۔"

(وہ جینز کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا۔ بھوری اینٹوں سے بنی وہ گلی طویل تھی جس کے اختتام پر سٹریٹ لائٹس کی روشنی میں دمکتے سٹال نظر آ رہے تھے۔ جبکہ وہ جگہ اس کے برعکس تھی۔ وہاں ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا جب اسے اپنے عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ مڑا لیکن وہاں کسی کو نہ پا کر دوبارا آگے پلٹ کر دیکھا جب کسی نے ہاتھ کا مکا بنا کر اس کے چہرے پر وار کرنا چاہا۔ وہ ایک دم نیچے جھکا۔ مقابل کا وار چوک گیا اور اس نے اپنا گھٹنا زور سے اس کے پیٹ میں دے مارا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ ایک ماہر کھلاڑی تھا۔ وہ سفید کافتان پہنے ہوئے تھا جس کی کمر پر براؤن بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ گھما کر 'عبید باجوہ' کو مارنی چاہی لیکن اس سے پہلے وہ چھلانگ لگا کر اس پر حملہ آور ہو گیا۔ دو تین زوردار مکے مارنے کے بعد وہ اٹھا اور سامنے والے کو بھی اٹھانے لگا۔

"عبید باجوہ کے پاس آنے سے پہلے اپنے باپ سے لڑائی سیکھ کر آنا تھا۔" باجوہ نے اسے گردن سے دبوچ کر اسکے سر پر اپنے پیشانی دے ماری اور گرفت چھوڑنے پر وہ نیچے جا گرا۔ تو یہ تھا ان کا 'ٹاسک'۔

"باجوہ سے بچ کر رہو وہ تمہیں دنیا میں حشر دکھا دے گا۔" بڑبڑاہٹ جاری تھی اور وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا گلی کے اس حصے کی جانب جہاں روشنی تھی۔)

"مارشل آرٹس کا ایک ایک پہلو اہمیت کا حامل ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو اس کی تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے فوائد کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ یہ آپ کو جسمانی فٹنس اور ہم آہنگی فراہم کرتی ہے۔ اپنے دفاع کے لیے مہارت بخشتی

ہے۔انسان کے کردار کو پختہ کرتی ہے تو اس سب کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں محبت اور جہد وجہد کرنا سکھاتی ہے۔مارشل آرٹس محض لڑائی سیکھنے کے طریقے نہیں ہیں یہ ایک طریقۂ حیات ہے۔یاد رکھیں،مارشل آرٹس صرف جسمانی لڑائی نہیں؛یہ ذہنی اور روحانی ترقی بھی دیتی ہے۔آپ اپنی زندگی میں کوئی بھی مقام حاصل کر سکتے ہیں بڑی سے بڑی چیز پر آپ فاتح کی طرح قابض ہو سکتے ہیں۔"

(سورج اپنے جوبن پر نکل آیا تھا۔اگر تم اسلام آباد کے اس پوش علاقے میں موجود سٹریٹ نمبر 44 میں بنے اس سبز بیلوں سے ڈھکے سیاہ گیٹ والے بنگلے کو دیکھو تو ایک لمحے کے لیے تمہاری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ایک سیاہ مرسیڈیز کے لیے لمبا اور لوہے کا مضبوط گیٹ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی۔پتھر کی بنی روش سے ہو کر وہ ایک سوئمنگ پول کے قریب آکر رک گئی۔شوفر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو شارق کبیر نے اپنا پاؤں باہر نکالا۔

"سر میم آپ سے ملنے آئی ہیں۔"ایک ہاتھ باندھے کھڑی ملازمہ نے آگے بڑھ کر اطلاع دی۔وہ سیاہ گلاسز اتار کر ہاتھ میں پکڑے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھے۔

"ویلکم ہوم مائے ڈاٹر۔"وہ بانہیں پھیلائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔بسمہ شارق نے نخوت سے منہ موڑ لیا۔وہ قہقہہ لگاتے کوٹ کا سامنے والا بٹن کھول کر کروفر سے سفید صوفے پر براجمان ہوئے۔

"اتنی صبح صبح کہاں گئے تھے آپ؟"وہ سینے پر بازو باندھے کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یونو ناں میری کچھ ایکٹیوٹیز بھی ہوتی ہیں۔"وہ ہلکی مسکان چہرے پر سجائے ہوئے تھے۔

"یا میں یوں کہوں کہ ساری رات کی ایکٹیوٹیز کے بعد اب آپ کو فرصت ملی ہے گھر آنے کی۔؟"شارق کبیر نے تنبیہ نگاہوں سے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے روکا۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں ہے؟"وہ دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے کنپٹی سہلا رہے تھے۔

"اپنا حق لینے آئی ہوں۔"وہ دوبدو بولی۔

"کیسا حق؟"انہوں نے سوال داغا۔بسمہ نے چند کاغذات ان کے سامنے رکھے۔انہوں نے سرسری نگاہ ڈالنی چاہی لیکن نظروں نے ہٹنے سے انکار کر دیا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملے؟"اپنی ہی آواز کھائی سے آتی معلوم ہوئی۔

"کہاں اور کیسے کو چھوڑیں جلدی سے اس پر دستخط کریں مجھے جانا بھی ہے۔"اس نے ایک پین نکال کر ان کے سامنے کیا۔

"یہ میری سلطنت ہے بسمہ۔میں کنگال ہو جاؤں گا۔تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔میں باپ ہوں تمہارا۔"

"باپ نام کے لفظ سے بھی نفرت ہے مجھے۔اور یہ آپ کی حرام کی جائیداد کے کاغذات نہیں بلکہ میری ماں کی حلال کی پراپرٹی کے پیپرز ہیں دستخط کریں جلدی ورنہ کورٹ ویسے بھی مجھ پر مہربان ہے۔"اس کی بات پر وہ لب بھینچے دستخط کرتے گئے۔

"ایک بات کہنا چاہوں گی کہ عورتوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ان کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ان کی عزت کو پامال کرتے وقت آپ یہ بھول مت جایا کریں کہ آپ کی نسل میں فقط آپ کی بیٹی ہے۔"جانے سے پہلے وہ نپے تلے الفاظ ان کے گوش گزار کر گئی تھی۔جو ان کو زہر سے بھی زیادہ زہریلے معلوم ہوئے تھے۔)

"مارشل آرٹس جیت یا ہار کا نام نہیں ہے یہ خود کو دریافت کرنے کا طریقہ ہے۔یہ ہمیں چیلنجز کو قبول کرنے،رکاوٹوں کو عبور کرنے اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کے طریقے بلا تفریق سکھاتے ہیں۔ہمارے اس سینٹر کا مقصد ہی آپ کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا ہے۔آپ تمام لوگ اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئے ہوئے(یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ چھائی تھی)آپ کو مجبوری اور ضرورت یہاں کھینچ لائی تھی۔اور اب آپ اس سینٹر کا حصہ اس کے رہنے والے ہیں۔آپ کی پہچان ہی ایم۔ایس مارشل آرٹس سے ہوتی ہے۔پچھلے ایک لمبے عرصے سے آپ کی تعلیم جاری تھی جس میں بہت سے سٹوڈنٹس نے بعد ازاں شامل ہو کر اپنے ٹیلنٹ کو ابھارا۔ہمارے سینٹر کا نام روشن کیا جس میں اہم کردار۔سر مومن ابراہیم۔سر جنید حامد اور ہمارے سابقہ سٹاف کا تھا۔"

(ان دونوں کو دبئی آئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔دبئی اپنے مشہور مقامات اور بے جا ساحلوں کی وجہ سے دنیا میں ٹاپ لسٹ پر آتا ہے۔برج خلیفہ،دبئی مال،گہرے سوئمنگ پول اور اور لمبی ساحلی پٹیاں اسے مشہور ترین بناتی ہیں۔جیا اور بالاج اس وقت دبئی مال میں تھے۔یہ مال رقبے کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا مال تھا۔رات کا وقت تھا اور جو مزہ رات کو شاپنگ کرنے میں ہوتا ہے وہ دن میں کہاں۔دبئی مال کی حدود میں داخل ہو تو آئی لو دبئی سفید بتیوں سے چمکتا ہوا نظر آئے گا۔سامنے ہی برج خلیفہ اور آس پاس کی بلند و بالا عمارات نظر آتی ہیں۔وہ دونوں اس وقت مال کے اندر کھڑے تھے۔بہت وقت گزر چکا تھا لیکن جیا واپسی کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"جیا بس پلیز میں بہت تھک چکا ہوں۔"وہ ایسا بہت بار کہہ چکا تھا لیکن بے سود۔

"بالاج ابھی تو ہم آئے ہیں یہاں۔کچھ دیر مزید پلیز۔"وہ ڈھیٹ بنت ڈھیٹ تھی جو واپسی کا نام نہیں لے رہی تھی۔بالاج کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے جس میں ان کی شاپنگ کے ساتھ ساتھ گھر والوں کے لیے بھی تحفہ تحائف تھے۔جیا مزید آگے چلتی جا رہی تھی۔اور پھر ایک دم وہ مبہوت رہ گئی۔سامنے ہی دبئی مال میں موجود قابلِ دید واٹر فال(آبشار)تھا۔جیا نے سر اٹھایا وہ لاتعداد فلورز سے نیچے کی جانب چلتا آبشار دیکھنے والے کو ایک پل کے لیے اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔اور پھر جیا کا ایک طویل فوٹو شوٹ والا

مرحلہ شروع ہوا۔وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی نئی سے نئی شے اسے حیران کر رہی تھی۔کیا ایکویریم، کیا خوبصورتی ہر شے اپنی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔دبئی مال کے باہر ایک سمندر بھی تھا۔نیلے پانی کا سمندر۔جیا کا شاید آج واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔)

"آپ کی طاقت کو اُجاگر کرنے کے لیے ہم نے ٹاسک ریڈی کیے ہیں۔جس میں آپ اپنی سیکھی ہوئی صلاحیتوں کا استعمال کر کے خود کو منظر عام پر لائیں گے۔ان ٹاسکس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہو گی۔مقابلہ برحق ہے جو آپ کو کرنا ہو گا۔اور اگر اس دوران آپ میں سے کسی کو کچھ بھی ہو جائے تو سینٹر اس سب کا زمہ دار نہیں ہو گا۔ایسی صورتحال میں آپ فوراً سے پیشتر اس ڈپارٹمنٹ کے سب ہیڈ اور کوچ مومن ابراہیم اور مینیجر جنید کو کال کریں گے۔جیسے کہ آپ کو فوری طبی امداد کی سکلز دی گئی ہیں لہذا یہ سب بھی آپ کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔"اس کی آواز گونج رہی تھی۔کلاس میں پن ڈراپ سائلنس چھایا ہوا تھا۔

(وہ اور فریال ساجد ایک پارک میں بیٹھی ہوئی تھیں۔پتھر کی بنی اس جھونپڑی تلے ٹھنڈی چھایا اور ہوا کے جھونکے گرمی کے موسم کو معتدل کر رہے تھے۔ہوا ان کے چہروں پر سے بالوں کو ہٹاتی پیچھے کی جانب لہرا رہی تھی۔کچھ غیر معمولی سا محسوس ہونے پر بسمہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ سر نے کوئی ٹاسک دیا ہو گا ہمیں۔بلکہ میرے خیال میں اصل بات یہ ہے کہ وہ ہم سے اکتا گئے ہیں اس لیے ہمیں بریک دی ہے۔"فریال ساجد اپنے سامنے بیٹھی بسمہ شارق سے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا ہمیں چوکنا رہنا ہو گا۔کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"بسمہ کی تیز نگاہیں دور جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔

"بالکل ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔جیسے کہ تمہاری سر مومن سے بے عزتی بھی ہو سکتی ہے۔"بسمہ نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بہت فضول بولنے لگی ہو تم۔"بسمہ نے اسے لتاڑا۔

"ویسے یار ایک بات ہے سر مومن ناں ایک دم آئیڈیل قسم کے بندے ہیں۔میرا مطلب۔۔۔بسمہ.!!"بات کرتی فریال کی آنکھیں ایک دم سے پھٹ گئیں۔وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوتی چیخ اٹھی تھی۔فریال کی آواز پر اس سے پہلے بسمہ سنبھل پاتی کسی نے بے دردی سے اسے گردن سے دبوچا تھا۔اس شخص کے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کیے جا رہے تھے۔اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی جس کے ساتھ ہی بسمہ خود کو موت کی راہ پر گامزن پا رہی تھی۔

"فف۔فر۔یا۔ل۔؟"بامشکل آنکھیں کھول کر اس نے سامنے دیکھا۔فریال وہاں موجود نہیں تھی۔بلکہ وہ نیچے زمین پر بے ہوش اور بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔بسمہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس شخص کی گرفت کو اپنی گردن سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ دونوں میں سے کسی ایک کی موت یقینی ہو گی۔"

بسمہ نے دیکھا فریال کے وجود میں جنبش نہ ہونے کے برابر تھی۔اس کے دماغ کی شریانیں پھٹنے لگیں۔اس نے اپنی کہنی مقابل کے پیٹ میں دے ماری۔ گرفت زرا ہلکی ہوئی تھی۔بسمہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی پشت اپنی آنکھوں کے سامنے کی اور اسے اپنی گردن کی جانب لے جاتے وہ ایک دم گھومی گئی اس کے ہاتھوں کی ضرب کی بدولت وہ مقابل کی گرفت سے رہا ہوئی تھی۔اپنی ایک ٹانگ اس نے گھما کر مقابل کے منہ پر ماری اور دوسری ٹانگ سے اس کے سینے پر ضرب لگاتے پیچھے دھکا دیا۔وہ لڑھکتا ہوا تین سیڑھیوں سے نیچے جا گرا۔اس کی حالت بری ہو چکی تھی۔وہ بھاگ کر فریال کے قریب آئی اور اسے آواز دینے کی کوشش کی لیکن۔۔ حلق جامد تھا یوں جیسے کسی نے الفاظ کے آگے پل باندھ رکھے ہوں۔اس نے فریال کی نبض چیک کی۔وہ محسوس نہیں کر پائی کہ وہ چل رہی ہے یا نہیں۔

"ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" آنسو بسمہ کے گال بھگونے لگے۔اس نے فریال کا گال تھپتھپایا لیکن وہ نہیں اٹھی۔اب وہ کپکپاتے ہاتھوں سے ایک نمبر ڈائل کر رہی تھی۔دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔)

"جو سٹوڈینٹس اس ٹاسک کو پورا کریں گے انہیں بیسٹ اچیورز کا ایوارڈ دیا جائے گا۔اس کے علاوہ مارشل آرٹس میں، آپ اپنی ترقی اور تربیت کے خود ذمہ دار ہیں، لیکن آپ ایک بڑی کمیونٹی کا حصہ بھی ہیں۔جو آپ کو معاون ماحول دیتی ہے جہاں ہر کوئی اپنے اپنے مقاصد کے لیے کام کر رہا ہے، بلکہ ایک دوسرے کو خوش کر رہا ہے۔آپ اس قابل ہیں کہ اپنی قابلیت کا لوہا منوا سکیں۔"

(مومن برق رفتار سے ہاسپٹل پہنچا تھا۔کاریڈورز میں اسے ڈھونڈتے وہ ایک راہداری میں آکر تھم گیا۔سامنے ہی بسمہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔اس کا سر جھکا ہوا تھا۔"تم ٹھیک ہو۔؟"اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔بسمہ نے چونک کر سر اٹھایا۔مومن کو دیکھ کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔اور اندر آئی سی یو کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا ہوا اسے؟ کوئی انجری Injury؟"

"نرویس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔وہ شدید گھبرا گئی تھی۔"بسمہ نے اطلاع دی۔مومن نے آئی سی یو کی جانب دیکھا۔وہ ان سٹوڈنٹس میں تھی جن کا ریفلیکس ایکشن کام نہیں کرتا وہ یا تو خاموش رہتے ہیں یا اگلے ہی پل کسی سانحے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

"تم پریشان مت ہو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔۔ سسٹر۔"مومن نے پاس سے گزرتی نرس کو مخاطب کیا۔وہ ان کی جانب چلی آئی۔

"کوئی آئنمنٹ لگا دیں آپ اسے۔"وہ بسمہ کی گردن کی جانب اشارہ کر رہا تھا جہاں سرخ رنگ کی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔وہ چپ چاپ نرس کے ساتھ چلی گئی۔مومن نے ملک کو اطلاع کرنے کی خاطر اپنا فون جیب سے نکالا۔)

"آپ سب کی ٹریننگ ایک محدود وقت تک کی ہے جس کے بعد آپ تمام لوگ قابل بن کر اس سینٹر سے نکلیں گے۔ جو لوگ اپنے بل بوتے پر رہنا چاہتے ہیں وہ رہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو خطرے سے دوچار یا اپنے دوش پر کچھ نہیں کر سکتے انہیں یہ سینٹر ہَیون مہیا کرتا ہے۔"

(ساحلِ سمندر کی وہ پٹی دبئی کے شمال مشرقی سمت میں موجود تھی۔ المزر کا وہ ساحل سیاحوں کے لیے کشش کا باعث بنتا تھا۔ سہ پہر چھٹ رہی تھی وقت رفتار پکڑے شام کی جانب رواں دواں تھا۔ ایسے میں اگر تم دیکھو تو اس لمبی ساحلی پٹی کے ایک طرف تمہیں خوبصورت سی جگہ بنی نظر آئے گی۔ وہ خطہ چوکور ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے ہی دو کرسیاں اور ایک میز لگی ہوئی تھی جس پر اس وقت جیا اور بالاج بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس دوسرے سیاح بھی موجود تھے تو کوئی اپنے دن کو بہتر بنانے یہاں آیا ہوا تھا۔

"تو یہ تھا آپ کا سرپرائز جس کے لیے مجھے یہاں بلایا آپ نے۔" جیا نے داد دیتی نگاہوں سے آس پاس دیکھ کر کہا۔ وہ اس وقت سرخ رنگ کی فراک میں ملبوس تھی۔ جو کلائیوں اور دامن سے سنہری آرائش سے آراستہ تھی۔ بال کرل کر کے ایک جانب ڈال رکھے تھے۔

"جی ہاں۔ اب اپنی مسز کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں ناں۔" بالاج نے چھری اور کانٹے کی مدد سے پلیٹ میں موجود کھانے کا لقمہ توڑ کر جیا کی جانب بڑھایا۔ وہ آف وائٹ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

"میرے جیسے شوہر ہوتے ہیں جو بیوی کے منہ سے دو لفظ محبت کے سننے کو ترس جاتے ہیں۔" بالاج افسوس سے کہہ رہا تھا۔ جیا نے لب دبائے۔

"محبت میں دو نہیں چار لفظ ہوتے ہیں۔" جیا نے اپنی کہی بات پر فرضی کالر جھاڑے۔ بالاج نے تاسف سے سر جھٹکا۔ جیا کچھ دیر سوچ بچار کے بعد بولنے لگی۔

"آپ جانتے ہیں میں نے بچپن سے آپ کا وہ روڈ اور غصے والا روپ دیکھا تھا۔ آپ ہمیشہ مجھ سے بنام کی بات چیت کیا کرتے تھے۔ آپ کی روک ٹوک سے بعض اوقات میں اکتا جاتی تھی لیکن پھر آپ کی وہی روک ٹوک ایک محافظ کا روپ دھارنے لگی۔ آپ کا حوالہ مجھے معتبر کر دیا کرتا تھا۔ آپ نے کبھی مجھے تنہا نہیں رہنے دیا۔ غصے والے سہی لیکن کبھی غیروں جیسا سلوک نہیں کیا۔ پھر میرے جذبات بدلنے لگے میں نہیں جانتی تھی محبت کیا ہوتی ہے (آنکھوں کے سامنے وہاج ملک کا چہرہ چھا گیا) لیکن آپ نے مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔ مجھے ہمیشہ آپ کی اٹینشن گین کرنا اچھا لگتا تھا چاہے پھر چاہے آپ مجھے ڈانٹ ہی کیوں نہ دیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مجھے آپ سے ہمیشہ ایک نئے سرے سے محبت ہوئی ہے۔" جیا کسی جادوئی لمحے کی قید میں مقید بول رہی تھی۔

"اس سب کو تم ان تین الفاظ میں بھی سمیٹ سکتی تھی جسے سننے کی چاہ مجھے ازل سے ہے۔" بالاج کی بات پر اس نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"آپ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ آپ سے اظہارِ محبت کیا جائے۔" سرخ و سپید رنگت میں غصے سے سرخیاں گھلنے لگیں۔

اگلے چند لمحات میں وہ دونوں ساحل کنارے چہل قدمی کرتے نظر آرہے تھے۔پانی آتا اور ان کے پیروں کو چھو کر چلا جاتا۔جیا کو یہ سب بہت حسین لگ رہا تھا۔انہیں یہاں آئے ہوئے یہ تیسرا ہفتہ تھا۔)

"جی ہاں 'ہَیوَن Haven ایک پناہ گاہ۔جہاں آپ میں سے کوئی بھی جا سکتا ہے۔یہ ہیونز آپ کو پاکستان میں دستیاب نہیں ملیں گی بلکہ لندن، کینیڈا، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ جیسے ممالک میں دی جائیں گی۔یہ سینٹر محض ایک مارشل آرٹس ٹریننگ سینٹر نہیں ہے۔یہ ایم ایس ٹریننگ سینٹر ہے۔" وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا تھا۔

"آپ کے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات چل رہے ہوں گے۔اس کے لیے آپ اپنے تمام سوالات اس نوٹ پیڈ پر لکھ سکتے ہیں۔جن کا جواب جلد ہی آپ کو مل جائے گا۔" مومن ابراہیم نے ایک نوٹ پیڈ تمام سٹوڈینٹس کی جانب بڑھایا۔

"اس سینٹر کے اصول آپ سب پر لاگو ہوتے ہیں۔ان کی پیروی کرنا آپ پر فرض ہے۔مارشل آرٹس ایک کھیل ہے جس کے اصول آپ کو سیکھنے ہونگے اور پھر اس سے بہتر کر کے دکھانا ہو گا۔یہاں سے ہر سال سو کے قریب سٹوڈنٹس بلیک بیلٹس یا مارشل آرٹس کے کارندے بن کر نکلتے ہیں امید ہے آپ کا بھی یہ سال خوشگوار گزرے گا۔شکریہ۔" اور پھر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔اس کے پیچھے تمام سٹوڈنٹس نے ہوٹنگ شروع کی تھی۔

رات کے سیاہ آسمان پر ستاروں کا تھال بچھ گیا تھا۔سیاہ چادر پر مقیش کے موتیوں کا سا گمان ہونے لگا تھا۔سکندر ہاؤس کی اوپری منزل میں بنے اس کمرے کی بتی روشن تھی۔

"مجھے سیاہ رنگ پہننے سے منع کیا ہے اور خود سیاہ پہن رہی ہیں محترمہ۔" بالاج نے اس کے پیچھے کھڑے ہوتے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھ کر چوٹ کی۔وہ جو دونوں گالوں پر بلش ان لگا رہی تھی مسکرا کر کٹ واپس رکھی۔

"آپ تو غالباً مجھ سے زیادہ خوبصورت ہیں ناں۔تو سیاہ رنگ آپ پر ہی جچ سکتا ہے ہم پر کہاں۔" بالاج نے اپنی امڈ آنے والی مسکراہٹ ضبط کی۔

""میری نظر سے دیکھو تو جانو کہ اس دنیا کا خوبصورت انسان کون ہے۔" وہ اس کا خوبصورت روپ آنکھوں میں سموئے بولا۔جیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں ہمیں دیر ہو جائے گی ورنہ۔" وہ اب بیڈ پر بیٹھ کر ہیلز پہن رہی تھی۔جو کافی لمبی تھیں۔اس نے آج سے پہلے اتنی لمبی ہیلز نہیں پہنی تھیں۔

"اتنی اونچی ہیلز کیوں پہن رہی ہو۔؟ گر جاؤ گی۔" بالاج نے نتائج سے آگاہ کیا۔

"آپ کے زرافے جتنے قد کا مقابلہ کرنے کے لیے۔" بالاج نے حیرت سے اپنے سامنے سیاہ ٹخنوں کو چھوتی فراک میں ملبوس جیا بالاج سکندر کو دیکھا جواب بھی اس کے قد سے ایک انچ کم تھی۔ وہ ہنس دیا۔ جیا بھی اس کے ساتھ ہنس دی۔

"تم نے چوڑیاں نہیں پہنیں۔؟" بالاج کو اچانک خیال آیا۔

"آپ نے ہی منع کیا تھا۔" جیا کی بات پر بالاج نے حیرت سے آنکھیں کھولے اسے تکا جو منہ کے زاویے بگاڑے کانوں میں آویزے پہن رہی تھی۔

"میں نے کب منع کیا تھا۔؟" حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"کسی نے کہا تھا اسے میری چوڑیوں کی کھنک سے کوفت ہوتی ہے۔ ان کی آواز بری لگتی ہے" بالاج نے چونک کر جیا کو دیکھا وہ ماضی میں کہی گئی بات آج تک یاد رکھے ہوئے تھی۔ اور لفظ بہ لفظ اسے لوٹا رہی تھی۔ کاش وہ ماضی کو بدل سکتا۔

"دیوانہ ہو گیا تھا جو تم سے ایسا کہا۔ تمہاری ان چوڑیوں کی کھنک تو میرے کانوں میں کسی میٹھے سُر کی مانند رس گھولنے لگتی ہے۔ جو شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہے۔" بالاج کی بات پر جیا کا قہقہہ چھوٹ گیا۔ وہ بالی وڈ اور ہالی وڈ کے ہیروز کو بھی کراس کر گیا تھا۔

"اتنے چیزی (Cheesy) ڈائیلاگس کہاں سے سیکھ رہے ہیں؟" جیا نے استفسار کیا "محبت سب سکھا دیتی ہے۔" بالاج نے باکس سے سیاہ رنگ کی چوڑیاں نکالیں اور جیا کا ہاتھ پکڑ کر پہنانا شروع کیں۔

"تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" جیا نے لب دبائے کہا۔ وجہ اسے زچ کرنا تھا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ٹھہری تھی۔

"نہیں میرا دماغ خراب ہے جو تم سے محبت کروں گا۔" بالاج نے چوڑیاں اسکے دونوں ہاتھوں میں پہنا کر ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہزار عاشق دیکھے ہیں لیکن آپ کا مقام الگ ہے۔" جیا نے انگلی سے بالاج کے سینے پر دستک دی۔ بالاج نے اپنی نظروں سے اس کا صدقہ اتارا تھا۔ دبئی سے واپسی پر منہا اور علی نے خاص طور پر بالاج اور جیا کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا تھا۔ وہ دونوں دعوت پر جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ دعوت صرف چار لوگوں کی تھی۔ منہا، علی، اور بالاج سکندر ان کے علاوہ اس میں کوئی بڑا شریک نہ تھا۔

وہ اور انمول آج باہر نکلے تھے۔ دوپہر سے شام ہونے کو تھی لیکن ملک کی واپسی کی امید نہیں تھی۔ وہ مال میں بنی ایک راہداری میں چلی جا رہی تھی جب اسے لگا کہ ملک اس کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر پلٹی پیچھے ہی کچھ فاصلے پر وہ ایک لڑکی کے ہمراہ کھڑا تھا۔

لڑکی اپنی کوئی بات کہہ رہی تھی لیکن وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلائے جا رہا تھا۔ انمول کے تلووں پر لگی سر پر بجھی۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ ملک کو بازو سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

"جی باجی کیا مسلہ ہے آپ کے ساتھ؟" انمول نے اپنے سامنے کھڑی اس اکیس بائیس سالہ لڑکی سے کہا۔ وہ کبھی کسی سے بدلحاظی نہیں کیا کرتی تھی لیکن سامنے کھڑی وہ لڑکی اسے اپنی رقیب لگی۔

"باجی؟؟" مخاطب لڑکی نے انمول کو سر تا پیر جانچا۔

"ہاں جی باجی۔ اگر باجی نہیں تو کیا دودھ پیتی بچی ہو۔؟" انمول نے طنزاً کہا۔

"آریو سیریس میں آپ سے بھی کوئی 10 سال چھوٹی ہو نگی۔" وہ شاید اس کی بات کو دل پر لے گئی تھی۔ انمول نے ملک کی جانب دیکھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بہن جی یہ بس آپ سے تین سال ہی بڑی ہو نگی۔ آآآ" ملک کی بات پر انمول نے زور سے اپنا فلیٹ ہیل والا پاؤں ملک کے جوگرز میں مقید پیروں پر مارا۔ وہ تلملا وہ ہونہہ میں سر جھٹکتی آگے نکل گئی۔

"انمول رکیں انمول۔" وہ اس لڑکی سے معذرت کرتا انمول کے پیچھے بھاگا جو منہ پھلائے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

"یار ایسا بھی کیا ہو گیا وہ مجھ سے کسی شاپ کا پوچھ رہی تھی۔" انمول نے اس کی ایک نہ سنی۔

"تو تم سے ہی کیوں پوچھ رہی تھی ہزار مرد پھر رہے ہیں ان سے بھی تو پوچھ سکتی ہے ناں۔ اور تم بہت شوق ہے تمہیں اپنی یہ خوبصورت مسکراہٹ دوسروں کو دکھانے کا۔" وہ اس کے سامنے ٹھہر گئی- ملک نے سوالیہ نگاہوں سے اسے تکا۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی اگلا لمحہ شدید حیران کن تھا وہ ایڑھیوں کے بل اوپر اٹھی اور ملک کے چہرے پر پھونک ماری۔

"یہ سب کیا تھا انمول۔"

"نظر بد سے بچنے کی بد دعا۔ کیا کروں لگ بھی تو اتنے حسین رہے ہو اگر کوئی جونک چمٹ گئی تو میرا کیا ہو گا۔" ملک نے لب دبائے۔

"اسے میں تعریف سمجھوں۔؟" وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

"عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔" ملک نے سر کے خم سے اپنی تعریف وصول کی تھی۔ اگلے چند لمحات میں وہ فوڈ کارٹ میں بیٹھے کھانا کھاتے دکھائی دے رہے تھے۔ غصہ، بغض و بغاوت کے ختم ہو جانے پر جو خوشی ملتی ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ اس بات پر خوش تھی کہ اس کا بندہ اسے ایک ہزار مرتبہ بھی معاف کر سکتا تھا۔

وہ دونوں اس وقت تہہ خانے میں کھڑے تھے۔ جہانداد ملک کمر پر ہاتھ باندھے اپنے سامنے کھڑے ندیم کو سن رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کر رہا تھا۔ جہانداد ملک نے اثبات میں سر ہلاتے اس کی بات پر حامی بھری تھی۔

"ویسے آپ کو پتا چلا کہ شیر و کو کس نے مارا ہے؟" ندیم نے ساری بات بتانے کے بعد سرسری سا اعتراف کیا۔

"نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ کسی دشمن کا کام ہے جو مجھے جانتا نہیں۔ کسی نے سنائپر کی مدد سے گولی چلائی تھی۔ آس پاس کی سی سی ٹی فوٹیجز بھی اسے پکڑنے میں ناکام رہی ہیں۔" جہاندار ملک نے جانچتی نگاہوں سے اسے پرکھا۔ وہ سپاٹ تاثرات چہرے پر سجائے اپنے گن ہولڈر میں پسٹل ڈال رہا تھا۔

"اگر آپ کہیں تو میں کچھ مدد کروں آپ کی اس معاملے میں؟" اس نے اوپر اوپر سے پوچھا۔ وجہ ان کی رائے معلوم کرنا تھا۔

"تمہیں جو کام دیا ہے فی الحال وہی کرو کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔" جہانداد ملک کے کہنے پر وہ ادب سے سر ہلاتا تہہ خانے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

ان کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور پھر ان کے فون پر کسی کی کال آنے لگی۔ انہوں نے فون کان سے لگایا۔ دوسری جانب سے کچھ کہا جانے لگا۔

"ہیلو سر۔ ایک اہم خبر ہے۔ ندیم دارا، دارابیگ کا پوتا ہے۔" جہانداد ملک کی آنکھیں ہر نئے لفظ کے ساتھ کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ انہیں اس کی تمام تو تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

آج کی دنیا میں وفاداری، پیار اور محبت کچھ نہیں ہوتا سب دغا، نفرت اور دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو ڈس لیں تو وہ کہیں کا نہیں رہتا ۔بے وفائی کا غم ہڈیوں میں بیٹھنے لگتا ہے تو انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے۔ ان کی طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

"اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہو تم۔؟" انمول نے ملک کو باہر جاتا دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ایک ضروری کام ہے آپ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے گا۔" وہ ٹیبل سے کیز اٹھاتا اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے انمول نے آکر دروازہ بند کر لیا تھا۔ ملک نیچے پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک گرے رنگ کی ایک گاڑی کے قریب آیا۔

"بیلو مومن۔" ملک نے گاڑی میں بیٹھ کر مومن کو کال لگائی۔

"جی بھائی۔ سب خیریت ہے نا۔؟" مومن نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے تم بتاؤ فریال کیسی ہے۔؟" ملک نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"وہ ٹھیک ہے بھائی آج اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔" ملک نے مومن کی بات پر گہری سانس خارج کی۔

"اچھا سنو۔ بسمہ شارق کو کسی کے بھی علم میں لائے بغیر غائب کر دو۔ کسی کو بھی وہ اس زمین پر نظر نہ آئے۔" مومن نے حیرت سے فون کو گھورا۔

"میں کوئی جادوگر یا بچوں کو کرتب دکھانے والا نہیں ہوں جو میری ایک پھونک سے ہی وہ غائب ہو جائے گی۔" مومن نے توجیہہ پیش کی۔

"مومن میں سیریس ہوں اس وقت میں نے جیسا کہا ہے وہ کرو۔ بسمہ شارق کی جان کو خطرہ ہے۔" ملک نے سختی سے اسے ٹوکا۔ وہ پل میں سنجیدہ ہوا تھا۔

"اسے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے ہے۔؟"

"خطرہ اور مصیبتیں بتا کر نہیں آتیں۔ اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئے۔" ملک کی آواز میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔

"بھائی۔۔؟" مومن نے اسے آواز دی۔ اس کی آواز میں تنبیہہ تھی۔ ملک نے دو انگلیوں سے ماتھا مسلا وہ مومن سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

تہہ خانے میں موجود اس کمرے تک آؤ تو نیلی دیواریں ساکت آنکھوں سے صوفیہ ابراہیم کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ دروازے کے قریب کھڑی کھانس رہی تھیں۔ ان کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔ وہ دیوار پر ہاتھ رکھے دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"اللہ تمہیں غارت کرے جہانداد ملک۔" ان کے لبوں پر لفظوں کی گردان تھی۔ ان کو لگ رہا تھا جیسے ابھی ملک الموت وارد ہو جائے گا اور وہ بدقسمتی کا ٹیگ ماتھے پر سجائے اس دنیا فانی سے رخصت ہو جائیں گی۔ قیدِ قفس سے رہائی ممکن نہیں ہوتی لیکن ایک شے انہیں رہائی دلوا سکتی تھی۔

'موت' جو اس دنیا کے جھمیلوں سے رہائی دلوا دے۔

کچھ دیر پہلے ہونے والی ندیم اور جہانداد ملک کے درمیان گفتگو وہ سن چکی تھیں۔

کھانسی کا دورا شدید تھا۔ اب ان میں بولنے کی سکت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ تبھی نیلی دیواروں میں مقیم لوہے کا دروازہ کھلا اور نووارد نے اپنا قدم اندر رکھا۔ صوفیہ ابراہیم کی آنکھیں باہر سے آتی روشنی کے باعث چندھیا گئی تھیں۔

"مومن۔۔ میرے بیٹے۔" سرگوشی کی مانند الفاظ ان کے حلق سے نکلے تھے۔

سورج سکندر ہاؤس پر طلوع ہوا تو چڑیوں نے چہچہاتے ہوئے اپنے گھونسلوں سے باہر قدم رکھا۔ فجر گزر چکی تھی۔ جھٹپٹے کا وقت ہو رہا تھا۔ جیا کی آنکھ ایک برے خواب کے زیر اثر کھلی تھی۔ خواب وجدان ہوتے ہیں یہ ہمیں اشارہ دیتے ہیں، خبر دار کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب اس کی زندگی میں مزید کیا برا ہونے والا تھا۔ اس نے ایک نظر دوسری جانب پر سکون سوئے ہوئے بالاج کو دیکھا اور پھر وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرنیں زمین پر پڑنے لگی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں لان کے نرم اور ٹھنڈے گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ دل عجیب بے چین سا ہو رہا تھا۔ ثانیہ بیگم اور معید سکندر بھی یہاں نہیں تھے۔ نائلہ جعفری کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے وہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہ کافی دیر وہاں گھاس پر چہل قدمی کرتی رہی۔ صبح کا موسم اسے تازگی بخش رہا تھا۔

بسمہ شارق ہسپتال سے نکلی تھی۔ وہ اس وقت سفید رنگ کی ہیلز پر سبز رنگ جاڈریس پہنے ہوئے تھی۔ موبائل ٹون کی آواز پر اس نے موبائل سامنے کیا پھر میسج کھول کر دیکھا۔

"آپ اس وقت جہاں بھی ہیں فوراً سے سینٹر پہنچے۔ آپ کے ارد گرد خطرہ ہے۔" بسمہ نے میسج پڑھتے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ سڑک کے بیچ و بیچ آچکی تھی۔ لیکن وہاں تو کوئی ٹریفک کوئی گاڑی نہ تھی جس سے اس کو خطرہ ہوتا۔ صرف ہاسپٹل کے پارکنگ ایریا میں لوگوں کا رش تھا۔ وہ میسج پڑھتے پڑھتے سڑک کے درمیان میں نکل آئی تھی۔ اس نے میسج واپس بھیجنے کے لیے سر موبائل سکرین پر جھکایا۔ جب کوئی گاڑی تیزی سے اس کی جانب آئی تھی۔ دو سیکنڈ لگے تھے اور پھر سڑک پر سرخ سیال بہتا سیاہ تارکول کی سڑک کو بھگونے لگا۔ سفید ہیلز پل میں سرخ ہوئی تھیں اور تبھی کوئی شخص اس کی جانب بڑھتے لوگوں کے رش کو چیرتا آگے آیا تھا۔ وہ سفید شرٹ پہنے نیلی جینز میں ملبوس تھا۔

فون کی تیز گھنٹی نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا۔ نیند میں خلل ڈالنے کے لیے چھے سات میسجز ایک ساتھ وصول ہوئے تھے شاید۔ وہ آنکھیں مسلتا کسلمندی سے اٹھ بیٹھا۔ سائیڈ ٹیبل سے ہاتھ بڑھا کر موبائل پکڑا اور سکرین روشن کی۔ چند پل کے لیے آنکھیں چندھیا گئی تھیں لیکن پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ آنکھ کے سامنے کا منظر ایک دم شفاف تھا۔ اس نے واٹس ایپ پر کسی نئی چیٹ سے آئے میسجز کو کھولا۔ دھندلی ہوئی وہ کوئی تصاویر تھیں۔ انہوں نے ڈاؤنلوڈ ہونے میں وقت لیا۔ ایک دو تین چار پانچ سیکنڈ اور پھر وہ تصاویر واضح ہوئیں۔ بالاج جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا۔ آنکھیں مسلیں۔ اور دوبارہ سکرین کو دیکھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ تصاویر جیا بالاج سکندر کی تھیں۔ بالاج کے جبڑے بھینچ گئے۔ دماغ سن ہونے لگا۔ نیچے ایک پیغام جگمگا رہا تھا۔

"بالاج سکندر۔وہ بندہ جو کسی دوسرے شخص کی اترن برداشت نہیں کرتا وہ ایک بدکردار اور کسی دوسرے کی چھوڑی ہوئی لڑکی کو کیسے اپنے زندگی میں برداشت کر سکتا ہے۔"

"کون ہو تم۔؟" بالاج کا بس نہیں چل رہا تھا۔اس شخص کو اپنے سامنے لا کھڑا کرتا۔میسج جیسے واپس بھیجا آگے سے سین ہونے کے بعد بھی کوئی ریپلائے نہیں آیا تھا۔

بالاج کے دماغ کی رگیں پھولنے لگیں۔سر بھاری ہونے لگا۔اس نے اسی نمبر پر کال ملائی لیکن بے سود۔وہ برق رفتار کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔اس کی نظر دوسری جانب جیا کے خالی بستر پر گئی۔کہاں تھی وہ؟پہلا سوال جو اس کے ذہن میں اٹھا تھا۔

"جیا۔جیا۔جیا۔" وہ اونچی آواز میں اسے آوازیں دیتا کمرے سے باہر نکلا۔

جیا سیڑھیاں چڑھتی اوپر آرہی تھی۔گھبرا کر بالاج کی جانب دیکھا۔

"کیا ہوا بالاج آپ۔۔۔؟" بالاج نے اسے بازو سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"بالاج چھوڑیں مجھے۔" اسکے بازو میں درد شروع ہوا تھا۔بالاج کی جارحانہ گرفت بہت سخت تھی۔

"یہ سب کیا ہے جیا۔؟" بالاج نے موبائل کی روشن سکرین اس کی جانب کیا۔

"کیا۔؟" جیا نے سکرین کی جانب دیکھا۔اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں ابل باہر آئی تھیں۔چہرے پر خوف کا سمندر امڈ آیا۔جیا نے ہراساں نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"یی۔یہ۔" آن کی آن آنسوؤں نے سیاہ نین کٹوروں کا احاطہ کیا تھا۔وہ پلک جھپکنا بھول چکی تھی۔وہ تصاویر اس کی اور وہاج کی تھیں۔مسلہ وہ چہرے نہیں تھے بلکہ ان میں نظر آتے سین تھے۔کہیں وہ وہاج کے بہت قریب بیٹھی ہوئی تھی۔کہیں وہ دونوں یونی کے کیفے ٹیریا میں تھے۔ان تصاویر کو وہ جھٹلا سکتی تھی۔لیکن ان سب کے ساتھ اس ہوٹل سوئیٹ کی تصاویر بھی تھیں۔جو کچھ اس طرح لی گئی تھیں کہ دیکھنے والا ان پر اعتراض ضرور اٹھاتا۔یہ کیا ہو رہا تھا۔

"کچھ تو بولو جیا۔کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔" بالاج کی آواز ابھری۔مان ٹوٹ جانے کا غم موت کے مترادف ہوتا ہے۔اس وقت بالاج کو بھی وہی خوف اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

"بب۔با۔لاج۔یہ۔ایسا کچھ نہیں۔ہے۔یہ" اس کی زبان سے الفاظ نکلنے سے انکاری تھے۔

"ہاں یاناں جیا سکندر؟" بالاج نے زور سے موبائل سامنے دیوار میں دے مارا۔جیا سہم کر پیچھے ہٹی۔بالاج کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آشکار ہو رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے بالاج۔یہ تصویریں جھوٹی ہیں۔" اس کی زبان اور آنکھیں ایک دُوجے کے خلاف تھیں۔

"جیابالاج سکندر۔ہاں یاناں۔" بالاج نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ہہ۔ہاں۔" جیابامشکل بولنے کے قابل ہوئی تھی۔بالاج کے کندھے ڈھلک گئے۔آنکھوں میں بے یقینی سمٹ آئی۔مرد اپنی عورت سے وفا کے سوا مانگتا ہی کیا ہے۔

"واہ جیاسکندر واہ۔" بالاج نے ایک دم اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"لیکن یہ سب آدھا۔۔۔"

"خاموش!!" بالاج کی دھاڑ پر وہ لب کاٹتی خاموش ہوئی۔

"کتنے مان سے میں نے کہا تھا کہ بالاج سکندر مرمٹا تو قبول کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے شخص کی اترن کبھی نہیں۔" اسے وہ دن یاد آیا۔اسے حریم ناز یاد آئی تھی۔اسے عالیہ جعفری یاد آئی تھی۔ہاں عالیہ کے جذبات اس سے مخفی نہیں تھے۔اور ایک اس کے سامنے کھڑی عورت تھی جسے اس نے دنیا کی لاکھوں لڑکیوں پر ترجیح دی تھی۔وہ جسے اس نے ہاتھ کا چھالا بنایا تھا۔

"کیوں جیاسکندر کیوں؟" بالاج نے نفی میں سر ہلایا۔جیا کا نیا روپ اس پر کھلا تھا۔

"اس بار بھی تم ہی کیوں جیاسکندر؟" بالاج کی آنکھ سے آنسو نکلا۔جیا نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔لیکن وہ اسے کسی اچھوت کی مانند جھٹک کر دور ہوا تھا۔جیا کے دل کو اچھو کا لگا۔

"با۔لاج۔" وہ رو رہی تھی تڑپ رہی تھی۔

"تو تم نے ثابت کر دیا جیاسکندر کہ تم ایک ملک کا ہی خون ہو۔جس کی رگوں میں اپنوں سے دغا دوڑتی ہے۔بے وفائی تو تمہارے خون میں شامل ہے۔میں نے کیوں تم پر اعتبار کیا جیاسکندر کیوں۔" بالاج کی بات پر وہ دم بخود ساکت رہ گئی تھی۔اسے یقین نہیں آیا کہ اسکے سامنے کھڑا شخص وہ ہی تھا جس نے چند ماہ قبل اس سے کہا تھا کہ وہ اس پر خود سے زیادہ یقین رکھتا ہے۔

گاڑی سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی اور پھر اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔وہ فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔کال پر دوسری جانب مومن ابراہیم کی آواز گونج رہی تھی۔ملک سب سے جھوٹ بول سکتا تھا لیکن مومن ابراہیم سے ہرگز نہیں۔

"بھائی اگر آپ پر ایک کھروچ بھی آئی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" ملک دھیمے سے مسکرا دیا۔

"فکر کیوں کرتے ہو میرے بھائی۔وہ شخص میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

"پھر بھی میں بتائے دے رہا ہوں۔" مومن کی آواز میں فکر تھی۔ملک اس کے لیے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

"تمہیں یاد ہے ناں وہاج ملک نے مجھے کیا کہا تھا۔؟" ملک کی بات پر مومن کا ذہن پیچھے کی جانب دوڑنے لگا۔

"میں اچھے سے جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تمہارا میرے باپ سے کیا رشتہ ہے۔ تو سنو 'ملک' تم ماہیر سکندر ہو۔ صدف ملک کے بیٹے، میرے باپ کے بھانجے اور جیا سکندر کے سگے بھائی ہو تم۔ لیکن افسوس تمہارا یہ تعارف کسی کام کا نہیں۔"

"وہاج کے وہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میرا تعارف میرے کسی کام کا نہیں وہ یہ نہیں جانتا کہ ماہیر سکندر کیا بلا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ اور اگر تم اس کا چہرہ دیکھو تو تمہیں جیا سکندر کا عکس نظر آئے گا۔

"میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں مومن۔" ملک کی نگاہیں ونڈو سکرین سے باہر ٹکی ہوئی تھیں۔ گاڑی کی رفتار ایک دم سے تیز ہوئی اور پھر۔۔

"ہیلو بھائی۔۔؟ بھائی آپ ٹھیک تو ہیں ناں" مومن کو دوسری جانب سے گاڑی کے ٹائروں کی بری طرح چڑچڑانے کی آواز سنائی دی ۔ مومن کا دل کانپ کر رہ گیا۔ کیا واقعی اس کی زندگی میں خوشیاں اس سے روٹھ چکی تھیں جو ہر جان سے عزیز سے شخص کو وہ کھوتا چلا آرہا تھا۔ اس کے ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔

دن کے اجالے میں اپارٹمنٹ میں قدم رکھو تو کوئی بھی بتی تمہیں روشن نہیں نظر آئے گی۔ بھلا اجالوں میں بتیوں کا کیا کام۔؟

وہ جھاگ بناتی سنک میں پڑے برتنوں کو دھوئے جا رہی تھی۔ جب اس کا موبائل بزر ہوا۔ وہ دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی موبائل کے پاس آئی۔ مومن کے نام سے آتی کال پر اس نے لب بھینچے۔ پھر کسی سوچ کے تحت اس نے سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"کیوں فون کیا ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"ہیلو انمول۔ بھائی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہیں۔" مومن کے رندھے ہوئے لہجے پر اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے دل پر پڑا تھا۔ دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی۔

"دعا کریں میری موت کی دعا کہ کاش میں مر جاؤں۔" انمول نے سسکیوں کا گلا گھونٹنے کی خاطر منہ پر ہاتھ رکھا۔ آنسو گال بھگونے لگے تھے۔

"کاش اس رات تم بھی مر جاتے ملک۔ پھر دعا کریں میری موت کی دعا کہ کاش میں مر جاؤں۔ کاش اس روز تم بھی مر جاتے۔" الفاظ و خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے اور وہ ساکت سی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے تو کبھی اسے بد دعا نہیں دی تھی تو کیا اس دن بھولے سے کہی ہوئی بات عرش تک جا پہنچی تھی۔؟ وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

تاثیرِ عشقم

از قلم مہک عارف

باب نمبر 6

ماضی:

قاسم ملک کی کل کائنات ان کی دونوں اولادیں تھیں۔ بڑے بیٹے جہانداد ملک اور دوسری چھوٹی بیٹی صدف ملک۔ قاسم ملک کا شمار لندن کے مشہور و معروف بزنس مینز میں ہوتا تھا۔ وہ انیس سو کی دہائی میں لندن شفٹ ہوئے تھے۔ جہانداد ملک اپنے الگ بزنس کے چکر میں ملک در ملک سیر کر رہے تھے جبکہ صدف ملک لندن کی مشہور یونیورسٹی کوین میری میں زیرِ تعلیم تھیں۔

"صدف بیٹے ٹیک یور بریک فاسٹ فرسٹ۔" اس کی ماں دردانہ نے اسے بغیر ناشتہ کیے یونی جانے پر ٹوکا تھا۔ وہ بائیس سالہ چلبلی لڑکی اب کہ ڈائننگ ہال میں بیٹھی خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ کائی جیسی سبز۔

"ماں آئی گاٹ اٹ۔" وہ ناشتے سے ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے باپ کی ایکسرا کرتی نگاہیں وہ خود پر محسوس کر چکی تھی۔

"بائے ماں۔ بائے بابا۔" وہ ان دونوں سے ملتی باہر روانہ ہو گئی۔

"اس پر نظر رکھو دردانہ کہیں لندن کی کھلی ہوا نہ لگ جائے۔" اب کہ ان کی نظریں اپنی بیوی پر تھیں۔

"ڈونٹ وری قاسم۔ بیٹی ہے ہماری اچھے سے جانتی ہے کس کے ساتھ منسوب ہے یہ۔ حدید قریشی۔ اس کا فیانسی۔ آپ بلاوجہ پریشان مت ہوں۔ وہ ہماری بیٹی ہے۔" انہوں نے قاسم ملک کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے گویا انہیں تسلی دی۔ لندن کا ماحول انہیں تو راس آ گیا تھا لیکن وہ اپنی اولادوں کے لیے فکر مند تھے۔

یہ منظر مشہور زمانہ کوین میری یونیورسٹی آف لندن کا تھا۔ یہاں بیشتر ممالک سے طلباء ہائیر ایجوکیشن کے لیے تشریف لاتے تھے۔

"واجد آپ کب اپنی فیملی سے بات کریں گے۔؟" وہ دونوں یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے بنے سرسبز قطعے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ منہ بسورے بول رہی تھی۔ آس پاس طلباء مختلف ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے۔ ہر ٹولی کا ایک مخصوص نام تھا جبکہ وہ دونوں ان سب سے یکسر مختلف تھے۔

"صدف یونو میرے گھر والے پہلے ہی مجھ سے نالاں رہتے ہیں ایسے میں بھائی جان کی شادی سے پہلے میری شادی کی بات انہیں مزید مجھ سے نالاں کر دے گی۔ ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ۔ میں گھر والوں کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔" سیاہ آنکھوں والے واجد سکندر ولد گل زرین سکندر اپنی وجوہات پیش کر رہے تھے۔ صدف ان کی پہلی محبت تھیں۔ جس کی خاطر وہ اپنے گھر والوں کو منانے کی تگ ودو کر رہے تھے۔ واجد کی طرف سے بڑھایا جانے والا دوستی کا ہاتھ کب محبت میں بدل گیا اس بات سے صدف ملک انجان تھیں۔ ہوش تو تب آیا جب واجد کے لیے بدلتے جذبات پر نظر دوڑائی۔ ان پر ایک حقیقت آشکارا ہوئی تھی کہ وہ واجد سکندر سے محبت کرنے لگی ہیں۔ ان دونوں کے تعلقات دوستانہ جبکہ احساسات ایک پاک رشتے کے لیے تھے۔

حال:

"تو تم نے ثابت کر دیا جیا سکندر کہ تم ایک ملک کا ہی خون ہو۔ جس کی رگوں میں اپنوں سے دغا دوڑتی ہے۔ بے وفائی تو تمہارے خون میں شامل ہے۔ میں نے کیوں تم پر اعتبار کیا جیا سکندر کیوں۔؟" بالاج کی بات پر وہ دم بخود ساکت رہ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اسکے سامنے کھڑا شخص وہ ہی تھا جس نے چند ماہ قبل اس سے کہا تھا کہ وہ اس پر خود سے زیادہ یقین رکھتا ہے۔ کیا یہ تھا اس کا یقین؟

"کون ہے یہ شخص؟ میں نے پوچھا نام کیا ہے اس کا۔؟" بالاج ایک مرتبہ پھر سے چیخا تھا۔ جیا کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے ایک امید سے بالاج کی طرف دیکھا اگلے ہی لمحے اس کے بال بالاج کی سخت گرفت میں تھے۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

"بولو۔ جواب دو۔" وہ اس کے چہرے پر غرایا۔

"ووہا۔ وہاج۔" وہ سختی سے آنکھیں میچ کر بولی تھی۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اگلا مرحلہ صدمے کا تھا اسے جو لگا تھا کہ جیا بولے گی وہ صرف اس کی ہے اس سے محبت کرتی ہے یہ سب جھوٹ ہے۔ تو وہ غلط تھا۔ اور ہمیشہ ہماری خوش فہمی غلط فہمی ہی ہوتی ہے۔ بالاج نے نام سنتے ہی اس کے بالوں پر گرفت ہلکی کی۔ آنکھوں میں بے یقینی امڈ آئی۔

"چلی جاؤ جیا سکندر۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھالوں آئے سیڈ گو۔" وہ چاہ کر بھی خود پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ اس کی دھاڑ سن کر بھی جیا وہیں کھڑی رہی۔ بالاج نے سرخ انگارا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ کیسے اس کی محبت پر بے وفائی کا ٹھپہ لگا کر سکون سے کھڑی تھی۔

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ جیا۔" اس کا لہجہ ہارا ہوا تھا۔ ایک سانس آ رہی تھی تو دوسری باہر نکلنے سے انکاری تھی۔ عجیب کشمکش سی تھی۔

"بالاج۔ آپ پی۔ یقین کریں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر میری محبت کو ذلیل نہیں کر سکتے۔" وہ چیخ اٹھی۔ آخر کب تک اس کی بے اعتباری کا بوجھ سہتی۔

"آواز نیچی رکھو جیا واجد سکندر۔" وہ اپنا نام اس کے اسم سے ہٹا گیا تھا۔ جیا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کیا اتنا ازراں تھا اس کے لیے جیا کے نام کے ساتھ اپنا حوالہ جوڑنا۔؟

اسے اپنی جگہ پر جمے دیکھ کر بالاج کا پارا ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ وہ اتنی ضدی کیوں بن رہی تھی کیا وہ بالاج کے غصے سے واقف نہیں تھی۔ اس نے جیا کو بازو سے دبوچا اور پھر ایک دو تین چار وہ تمام سیڑھیاں اترتا آیا وہ اس کے ساتھ ہی کھنچتی چلی آئی تھی۔۔ اور پھر اندرونی دروازہ کھول کر اسے باہر کی جانب دھکیل دیا۔ جیا گرتے گرتے بچی۔ سامنے مین گیٹ کے قریب کرسی ڈالے بیٹھا گارڈ واضح تھا۔ تو کیا آج کا دن اس کی زندگی میں ذلت لے کر آیا تھا۔

"بالاج میری بات سنیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ محض ایک غلطی تھی۔ مجھے اس سب کی اتنی بڑی سزا مت دیں بالاج۔ پلیز" وہ رو کر اس سے بھیک مانگ رہی تھی۔ دروازے پر ہتھیلیوں سے ضربیں لگا رہی تھیں لیکن وہ ضرب بالاج سکندر کے دل پر لگی چوٹ کے سامنے صفر تھی۔ اس کا دل ایک ہی چوٹ پر ٹوٹ گیا تھا۔ دل ٹوٹ جائے تو پتا ہے کیا بنتا ہے۔؟ وہ بکھر کر کانچ کی کرچیاں بن جاتا ہے جو تکلیف کا باعث تو بن سکتی ہیں لیکن کبھی جڑ نہیں سکتیں۔

"میرا ضبط مت آزماؤ جیا سکندر۔ چلی جاؤ یہاں سے میں نے تمہیں اپنا غرور جانا لیکن تم نے مجھے ہی خاک کر دیا۔ تم جیسی لڑکیوں کی جانب میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور یہی میرا غرور تھا۔ چلی جاؤ یہاں سے مجھے میری ہی نظروں میں مزید رسوا مت کرو۔ میرا مان توڑ کر بھی تم اپنے فعل کی معافی مانگ رہی ہو۔ یہ بندہ تمہیں کس منہ سے معاف کرے۔؟" بالاج نے دروازے سے اپنی پشت ٹکائی جس کے پار جیا سکندر کے ہچکیوں میں رونے کی آواز آ رہی تھی لیکن وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔

"بالاج سکندر ایسی لڑکیوں پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔" آہ یہ تکلیف دہ ماضی۔ اپنے بیان پر وہ جی بھر کر شرمندہ ہوا تھا۔ کتنا مان تھا ناں اسے خود پر؟

"بالاج سکندر مرنا تو قبول کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے شخص کی اترن کبھی نہیں۔" جیا نے ٹھیک بولا تھا اگر کبھی زندگی میں کسی دوسرے شخص کی اترن اس کے نصیب میں آئی تو۔ تو وہ کیا کرے گا؟ بالاج کی آنکھوں میں مرچیاں بھرنے لگیں۔ سنہری آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے دیکھنے والے کو خوف میں مبتلا کر رہے تھے۔

اپنے ہی الفاظوں کی بازگشت اسے دلی تکلیف دے رہی تھی لیکن وہ بے حس بنا کھڑا تھا۔ الفاظ تھے یا کیا لیکن اس کی سماعتوں میں زہر بن کر اتر رہے تھے۔

اس کا مان ٹوٹا تھا۔ اعتبار کا خون ہوا تھا۔ یقین اور بھروسہ کبھی کسی پر نہ کرنے کے لائق رہ گئے تھے۔ وہ غرور وہ تکبر جو اسے خود پر تھا وہ اس کی سب سے عزیز ہستی نے ہی توڑ کر چکنا چور کر دیا تھا۔ اسے اس مرحلے سے نکلنے میں وقت درکار تھا۔

باہر سے ایک دم ہچکیوں کی آواز آنا بند ہوئی۔ بالاج سکندر کا دل زوروں سے سینے کی دیواروں میں سر پٹکنے لگا۔ اس کی ساکت پتلیوں نے حرکت کی۔ تیر کی تیزی سے بند دروازہ غیر مقفل کیا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں جیا سکندر تھی نہ جیا سکندر کا عکس۔ تکلیف کا کاری وار نئے سرے سے ہوا تھا۔

"واہ جیا سکندر تم نے میری یہ خوش فہمی بھی دور کر دی کہ بالاج سکندر کی تمہاری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ یہ دل ایک ہی شخص سے کتنی مرتبہ چوٹ کھائے۔؟" بدگمانیوں کا گراف بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"تم خود اپنے پیروں پر چل کر گئی ہو جیا سکندر اب واپس بھی تمہیں انہی پیروں پر چل کر آنا ہو گا۔" غلط فہمیوں نے اس کے دل کا موسم آبر آلود کر دیا تھا۔

اس تاریک کمرے کا رخ کرو تو تمہیں اس کی چوکھٹ پر ایک ہیولہ کھڑا نظر آئے گا۔ مکمل سیاہ اور رات سا تاریک۔ اس کے اطراف سے روشنی چھن کر اندر جا رہی تھی۔ جہاں صوفیہ ابراہیم کھڑی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں چھپک کر دوبارا کھولیں۔ سامنے کا منظر ان کی دید کا حصہ بنا۔

"تم۔ تم کیا کر رہے ہو یہاں۔؟" اپنے سامنے کھڑے ندیم دارا کو دیکھ وہ کانپ کر رہ گئیں۔ وہ شخص انہیں اذیت دینے میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن وہ یہاں کیا لینے آیا تھا۔؟

"مجھے یہاں جہانداد ملک نے بھیجا ہے۔" اس کی آواز نرم تھی۔ لہجہ چاشنی میں ڈوبا ہوا۔ صوفیہ ابراہیم کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔

"کیوں۔؟ مجھے مارنے یا زندہ درگور کرنے کو؟" وہ تیز آواز میں بولی تھیں۔ ندیم نے کمرے کی بتی جلائی۔ صوفیہ ابراھیم کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں اس نے کمرہ کا دروازہ آہستہ سے بند کیا۔ صوفیہ ابراھیم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اپنے قدم پیچھے لیتی گئیں۔

"د۔ دد۔ دیکھو میرے پاس مت آنا تم۔ تم۔" ندیم کو اپنی جیب سے کچھ تلاشتے دیکھ کر وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ گئیں۔ وہ صوفیہ ابراہیم کی جانب آیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔ نگاہ پھسلتی ہوئی اس کے دائیں ہاتھ میں موجود آلے کی جانب گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیچ کس تھا۔ چوڑے منہ والا پیچ کس۔

تو کیا یہ ان کی زندگی کا آخری دن تھا؟ ندیم آگے بڑھ رہا تھا جس کے ساتھ ہی وہ پیچھے کی جانب کھسکتی گئیں۔ وہ ان کے قریب آکر رک گیا۔ صوفیہ ابراہیم کے بائیں جانب بیڈ تھا۔ ندیم نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ایک ہی جست میں اس سنگل بیڈ کو کھڑا کر دیا۔ صوفیہ ابراہیم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"حیرت ہے آپ مجھ سے ڈر رہی ہیں۔ فکر نہیں کریں میں آپ کے بیٹے ہی کی عمر کا ہوں۔ آپ میری ماں جیسی ہیں۔" پھر وہ نیچے جھکا اور وہاں موجود سفید ماربل کی دو ٹائلوں کے درمیان پیچ کس کی نوک پھنساتے اسے اوپر کی جانب حرکت دی۔ وہ چار فٹ کی ٹائل اندر سے کھوکھلی تھی۔ صوفیہ ابراہیم نے جھانک کر دیکھا۔ ندیم نے ایک ٹارچ لائٹ روشن کر کے اس اندھیر اور تاریک جگہ پر ماری۔ وہاں نیچے کی جانب سیڑھیاں تھیں۔ اختتام پر اندھیرا تھا۔ کیا وہ جائے فرار تھی۔؟ لیکن ندیم ان کی مدد کیوں کر رہا تھا۔؟

ندیم نے صوفیہ ابراہیم کو اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئیں۔ اس شخص پر اعتبار کرنا مشکل تھا۔ لیکن انہیں اعتبار کرنا تھا۔ آج جو ایک پل کے لیے موت کے خوف سے ان کا دل لرزا تھا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اپنے بیٹے کی شکل و صورت دیکھے بنا ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ وہ آگے بڑھی۔ انہوں نے اپنے قدم سیڑھیوں پر مضبوطی سے جماتے نیچے اتارے۔

"میں نہیں جانتی تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ یقیناً اس کے پیچھے بھی تمہارا کوئی مقصد ہو گا۔ لیکن میں پھر بھی آنکھیں بند کر کے تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔" زینوں پر اندھیرے کی وجہ سے جھریوں زدہ چہرہ واضح نہ تھا۔ ندیم نے وہ ٹائل درست کرتے ان کی جانب دیکھا۔

"شش۔" اور پھر وہ آگے چل دیا۔ سیڑھیاں اتر کر اس تاریک راہداری میں رکھا جانے والا قدم دھپ کی آواز پیدا کر رہا تھا۔

"ایک تعمیر کو اس کے معمار سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا بالکل ویسے ہی جیسے کھانے کا ذائقہ صرف چکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے۔" راہداری کافی لمبی تھی۔ ایک سرنگ کی طرح۔

"تم اپنے باپ کے برعکس ہو۔" یہ سوال تھا یا تبصرہ لیکن ان کی بات پر ندیم دارا کے قدم تھم گئے۔ ہر سو سنّاٹا چھاتا چلا گیا۔

"ہاں میں اپنے باپ کے برعکس ہوں کیونکہ میں دارا کا پوتا ہوں۔ اور رہی بات باپ کی تو اس نے اپنی گناہوں کی زندگی سے توبہ کر لی تھی۔ آپ نہیں کہہ سکتی وہ میرے برعکس ہے۔" وہ سر جھٹک کر آگے چل دیا۔ جانتا تھا صوفیہ ابراہیم کا گہرا دکھ اس کے باپ سے جڑا تھا۔

انہوں نے استہزایہ نظروں سے اسے دیکھا۔ندیم دارا کے تعاقب میں رکھا جانے والا ہر قدم انہیں اس حویلی سے دور لے جاتا جارہا تھا۔

اسلام آباد کی اس مصروف شاہراہ پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔جس کی بدولت گاڑیوں کی آمد و رفت میں بھی خلل پیدا ہو رہا تھا۔ سفید شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس وہ شخص اس رش کو چیرتا ہوا آگے آیا۔

اس نے سامنے زمین پر اوندھے منہ پڑے کراہتے ہوئے شخص کو دیکھا۔یقیناً وہ شخص بسمہ شارق کو بچانے کی خاطر گاڑی کے سامنے آیا تھا۔ایک سیاہ گاڑی دور جاتی دکھائی دے رہی تھی۔بسمہ شارق دھکا لگنے کے باعث سڑک پر ایک جانب گری تھی۔یہ سڑک ہاسپٹل کی اوپن پارکنگ ایریا کے سامنے تھی۔ کہنیاں اور ہتھیلیاں تارکول کی سڑک پر لگنے کی وجہ سے زخمی ہو رہی تھیں۔لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔اس نے پلٹ کر دیکھا۔زخمی کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔کوئی افسوس کر رہا تھا اور کوئی اس سانحے کی وڈیو بنانے میں مصروف تھا۔مدد کرنے کی کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔وہ غصے میں لوگوں کے درمیان سے گزرتی آگے آئی۔سامنے پڑے وجود کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ شل ہوئی تھی۔

"آپ سب لوگ تماشا کیا دیکھ رہے ہیں اسے ہسپتال لے کر جائیں پلیز۔"وہ گھٹنوں کے بل اس شخص کے قریب بیٹھی۔بسمہ شارق کی بات پر نووارد نے اسے دیکھا وہ اس شخص کو کندھوں سے تھامے اس کا رخ پلٹا رہی تھی۔

"بسمہ۔"اپنے نام کی پکار پر اس نے سامنے دیکھا۔وہاں مومن ابراہیم کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"مومن۔پلیز اسے ہاسپٹل لے جاؤ۔یہ زخمی ہے۔"بسمہ کی آنکھوں میں آنسو جگمگا رہے تھے۔مومن نے ناپسندیدگی سے اس شخص کی جانب دیکھا جس کی وجہ سے وہ رو رہی تھی۔

"معمولی سی چوٹ آئی ہے اسے۔اتنا نازک نہیں ہے یہ کہ یہیں کراہتا ہوا مر جائے گا۔"مومن کی بات پر بسمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔کیا وہ سچ میں اتنا سنگدل تھا۔

"یو بلڈی۔جسٹ گو فرام ہئیر۔"وہ چیخی اور زخمی کو سہارا دینے کی خاطر اس کو کمر سے تھامنا چاہا۔

"Stay Away From Him"مومن نے آگے بڑھ کر اس شخص کو کھڑا کیا۔اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔آنکھیں تکلیف سے میچی ہوئی تھیں۔لیکن سانسیں چل رہی تھیں۔

"اسے ہاسپٹل لے کر جاؤ۔"

"میں اس بلڈوزر کو اپنے نازک کندھوں پر اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا سوری۔ اسٹریچر منگواؤ۔" مومن نے ناک سے مکھی اڑائی۔ تبھی دو میل نرس ایک اسٹریچر بھگاتے ہوئے وہاں آن پہنچے تھے غالباً لوگوں نے یہ خدمت خلق انجام دی تھی۔ بسمہ شارق تند نگاہوں سے مومن کو زخمی شخص کو اسٹریچر پر ڈالتے دیکھ رہی تھی۔

"تم جانتے ہو مرد ہو کر بھی تمہارے اندر عورتوں والی روح سرائیت کرتی ہے۔" زخمی کو ہسپتال کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔

"اور تم جانتی ہو تمہاری یہ زبان قینچی سے بھی زیادہ تیز چلتی ہے۔ کسی ٹیلر سے کانٹیکٹ کرو کپڑا کاٹنے کے کام آئے گی۔ یا پھر میرے پاس ایک نیا مشورہ بھی ہے۔" مومن نے جوشیلے انداز میں اپنا خیال بتایا۔ بے تاثر چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

"اپنے مشورے تم اپنے پاس رکھو۔ مجھے کسی کے مشوروں کی ضرورت ہے نہ مدد کی۔ شکریہ!"

"اچھا میں نے تو تمہارے ہی فائدے کی بات کی تھی۔ بٹ ایز یو وش۔ (لیکن جیسا تم چاہو)" وہ کندھے اچکاتا اس کے آگے چلنے لگا۔ بسمہ نے سالم نگاہوں سے اس کی پشت کو گھورا۔

"کیا مشورہ ہے۔؟" وہ سرسری انداز میں کہہ رہی تھی۔ مومن نے نچلا لب دبایا۔ تو وہ یہ بات قبول کر رہی تھی کہ اس کی زبان بہت تیز چلتی ہے۔

"میرا مشورہ ایک محدود مدت تک ہوتا ہے مدت ختم، مشورہ ختم۔" وہ پٹی ہوئی کو مزید تپا رہا تھا۔

"میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے مجھے بتا دو ورنہ کچا چبا جاؤں گی۔"

"کیوں آدم خور ہو تم جو کچا چبا جاؤ گی۔؟" مومن آگ لگا رہا تھا۔ اس کی باتیں جلتی پر تیل کا کام انجام دے رہی تھیں۔

"مومن ابراہیم۔" وہ دانت پیس کر تنبیہہ کرتی نظروں سے اسے وارن کر گئی۔

"اچھا سنو۔ جتنی تمہاری آواز خوبصورت ہے۔ (بسمہ نے فرضی کالر جھاڑے) اور جتنی تمہاری زبان تیز چلتی ہے (اس نے آنکھیں گھمائیں) وہ سامنے سگنل دیکھ رہی ہو۔ وہاں بیٹھ کر مانگنا شروع کر دو۔ قسم سے جھولی بھر جائے گی تمہاری۔" مومن نے اندر کی جانب بڑھتے مڑ کر دور نظر آتے سگنل کی جانب اشارہ کیا۔ بسمہ کا چہرہ اہانت سے سرخ ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے خونخوار تاثرات سے محفوظ ہوتا وہ ایک جانب کھسکا۔

"مومن ابراہیم میں تمہاری جان لے لوں گی۔" وہ چیل کی طرح پنجے جھاڑ کر اس پر جھپٹنے لگی تھی۔ مومن نے اس کے حملے کو ناکام بناتے بہسپتال کے اندر کی جانب دوڑ لگائی تھی۔

مومن سے بات کرتا ملک تیز روی سے گاڑی چلا رہا تھا۔وہ دورویہ سڑک سنسان تھی۔ صبح کا وقت تھا اور آج دن بھی اتوار کا تھا۔ اتوار مطلب سارے کاروباری لوگوں کی چھٹی کا دن۔ سڑک کے درمیان میں بنی فٹ پاتھ پر ہرے بھرے درخت لگے نظر آرہے تھے۔ تبھی کافی دور سے اسے گاڑی کی ونڈ سکرین سے اس فٹ پاتھ پر ایک لڑکی بیٹھی دکھائی دی۔ناجانے ایسا کیا تھا جو وہ لڑکی صبح کے اس وقت وہاں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ فون کے سپیکر سے مومن ابراہیم کی آواز آرہی تھی۔ گاڑی اس لڑکی کے قریب سے گزری۔

ملک نے اس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔ ایسے ہی کوئی شک سا گزرا تھا۔ دل واہموں میں گھرا تھا لیکن گاڑی اگے بڑھتی گئی۔ اگلے ہی لمحے ٹائروں کی چڑچڑاہٹ کے ساتھ ملک نے گاڑی ریورس کی سانس سینے میں اٹک گیا اگر جو اس کا وہم سچ نکلا؟ ملک نے گاڑی اس لڑکی کے قریب روکی۔

گاڑی کے دروازے کی ٹھک کی آواز پر لڑکی نے چہرہ اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑے اس مرد کو دیکھا۔

"جیا سکندر۔" ملک کے لبوں نے حرکت کی۔ جیا اپنی ہی جگہ ساکت ہوئی تھی۔ کیوں؟ وہ ہمیشہ اسے مفلسی کی حالت میں ہی کیوں ملتی تھی؟

"اینجل۔" ملک نے دیکھا اس کی آنکھیں رو رو کر حشر کا سامان کر رہی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں تیرتا پانی سمندر کی سیاہی لیے ہوئے تھا بالکل ایسے ہی جیسے ہیزل گرین آنکھیں کسی گمنام جنگل کا گمان دینے لگتی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔؟" ملک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"وو۔وہ۔ میں۔ میں یہاں۔" جیا سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کیا وہ اسے یہ بتاتی کہ اس کے شوہر نے اسے گھر سے دربدر کر دیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ ملک نے کرب کی انتہا کو چھوتی جیا سکندر کا کندھا تھپکنا چاہا۔ اس کے چھونے سے جیسے جیا سکندر کو کرنٹ سا لگا تھا۔ وہ اچھل کر اس سے دور ہٹی۔ ملک نے ضبط سے لب بھینچے۔

"کوئی ایسی بات ضرور ہے جیا سکندر جو تمہیں اس فٹ پاتھ تک کھینچ لائی ہے۔" ملک اس کے ساتھ آ بیٹھا۔

"انہوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ مجھ پر کیا بیتے گی۔ میں کہاں جاؤں گی انہیں زرہ برابر احساس نہیں ہوا۔" وہ ٹرانس کی کیفیت میں بولی تھی۔ ساتھ بیٹھا وہ شخص اس کی اذیت کا ازالہ کرتا تھا۔ وہ کیسے خاموش رہتی۔؟ ملک کے دماغ نے دو جمع دو چار کرتے معاملے کی تہہ تک رسائی حاصل کی تھی۔

"فی الحال تمہارا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ دنیا چیلوں اور کوؤں سے بھری پڑی ہے۔ جو تمہیں نوچ کھائیں گے۔ مشکل وقت اللہ کی طرف سے آزمائش ہے جیا۔ بہادر بنو اور ڈٹ کر ان حالات سے نمٹنے کی کوشش کرو۔ بنت حوا کمزور نہیں طاقتوروں پر بھاری ہے۔" جیا نے اس کی بات پر گالوں پر گرتے آنسو پونچھے۔

"ایسے ہی نوچ کھائیں گے کوئی شکار نہیں ہوں میں۔ لاوارث ہی سہی لیکن اپنا گھر ہے میرے پاس۔ گل زرین سکندر کی آدھی سے زیادہ پراپرٹی کی حقدار ہوں میں۔" وہ لمبی سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اکلوتی ہو۔؟" ملک نے داد دیتی نگاہوں سے استفسار کیا۔

"اکلوتی تھی نہیں اکلوتی ہو گئی ہوں۔" اس کے لہجے کا اداس پن ملک کا دل چھلنی کر گیا۔

"اب کہاں جاؤ گی۔؟"

"اپنی حویلی۔ سکندر حویلی۔" اب کہ لہجے میں مغرور پن در آیا تھا۔

"میں ڈراپ کر دوں۔" ملک نے سنجیدہ انداز میں پیشکش کی۔ جیا کشمکش میں گھری اس کی گاڑی کو دیکھنے لگی۔ ایسے کیسے کسی اجنبی پر یقین کر جاتی۔ لیکن کیا وہ اجنبی تھا؟

"ڈرو مت۔ تم میری بہن ہو۔ اور یہ محافظ اپنی چلتی سانسوں تک تمہاری حفاظت کر سکتا ہے۔ تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔" جیا اپنی جگہ چور سی ہوئی تھی۔

"بہن!" اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"ہاں تم مجھے اپنا بھائی سمجھ کر بھروسہ کر سکتی ہو۔ کیا نہیں کر سکتی.؟" ملک نے استفہام کیا

"ای۔ ایسی بات نہیں ہے اینجل۔ میں تو بس آپ کو زحمت۔"

"اوہ کم آن جیا چلو بھی اب۔" ملک کی بات پر وہ گہری سانس ہوا کے سپرد کرتی گاڑی میں جا بیٹھی۔ سکندر حویلی وہی جگہ تھی جو جیا سکندر کو اسکیپ فراہم کرتی تھی۔ خیالوں میں گم جیا سکندر ملک کو ایڈریس بتانا بھول چکی تھی۔ ہوش تو تب آیا جب گاڑی ایک دم سے بریک لگنے پر رکی۔ جیا نے آس پاس دیکھا وہ سکندر حویلی کے سامنے تھی۔ وہ تمام خیالات جھٹکتی گاڑی سے اتر کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

"حد ہے بندہ جھوٹے منہ اتنی گرمی میں پانی ہی پوچھ لیتا ہے۔" اپنی گاڑی ریورس کرتا ملک منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا۔

ماضی:

"ہائے جہانداد ملک واٹ آ پلیزینٹ سرپرائز۔" ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکی اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت ایک کلب میں بیٹھا ہوا تھا۔ جہانداد ملک نے بیزاری سے اس لڑکی کو خود سے دور کرتے موبائل پر نظریں جھکائیں۔ وہاں چلتی ریکارڈنگ ان کے چودہ طبق روشن کر رہی تھی۔ اگلے چند لمحات میں وہ اس لڑکی کی جانب پشت کیے کھڑا جھنجھلاہٹ سے کسی سے بات کر رہا تھا۔

"مام آئی سوئیر۔ میں صدف کے ساتھ بہت برا پیش آؤں گا اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی تو۔ وہ اس دو ٹکے کے لڑکے کے ساتھ اپنے عشق کی داستانیں رقم کر رہی ہے اور آپ دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے ہیں۔" دوسری جانب سے اپنی بیٹی کے کردار کی گواہیاں دی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"فائن اب جو کرنا ہو گا مجھے خود ہی کرنا ہو گا۔ اور ایک آخری بات آپ صوفیہ قریشی کے سلسلے میں ان کے ماں باپ سے بات کریں میں جلد از جلد نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" کہہ کر وہ کال بند کر گیا۔ کلب میں موجود نوجوان نسل سب کچھ بھلائے رنگ رلیوں میں مصروف تھی۔ اسی ماحول کی مصروفیت میں کھو جانے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

جہانداد ملک کی دھمکی کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے صدف کو بلا کر استفسار کیا۔ وہ بلا جھجک اپنی اور واجد کی محبت کو ان کے سامنے رکھ گئی تھی۔ دردانہ بیگم صدمے کی حالت میں اس کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس کی خواہش کو نظر انداز کر کے وہ اس کا دل نہیں مار سکتی تھیں۔ لیکن جہانداد ملک کی صوفیہ قریشی کے لیے محبت سے بھی وہ واقف تھیں۔

صدف کی واجد سے شادی مطلب صوفیہ اور جہانداد ملک کے رشتے کا خاتمہ تھی۔ آنے والے دنوں اور ہفتوں میں صدف ملک کی شادی صوفیہ قریشی کے بھائی حدید قریشی سے طے پا گئی تھی۔ واجد سکندر کا رابطہ اپنے گھر والوں سے نہیں ہو پا رہا تھا اور ادھر صدف کی شادی کی تیاریاں دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔

وہ ایک دن یونیورسٹی سے واپسی پر صدف کے گھر والوں سے بات کرنے کی غرض سے ان کے گھر آیا تھا لیکن گارڈ نے اسے دروازے سے ہی رخصت کر دیا۔ وہ ایک بات جان گیا کہ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ لیکن اسے وقت درکار تھا۔

حال:

اس نے دھیرے سے اپنی آنکھوں کے بھاری پپوٹے وا کیے تو سامنے کا منظر واضح ہوا۔ اس نے گردن دائیں جانب موڑنی چاہی لیکن اس نے حرکت نہیں کی۔ سر بھاری تھا منوں بوجھ سے بھی زیادہ بھاری۔

"فریال" اس کے بائیں جانب سے کسی لڑکی کی آواز ابھری۔ اب کی بار اس نے تکلیف سے گردن اس جانب موڑ ہی لی۔ درد تو ہوا تھا لیکن خیر وہ ایک مضبوط لڑکی تھی۔ بس پتہ نہیں اس روز اسے کیا ہوا تھا۔ اچانک سے اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیلتی گئیں۔

"آپ۔ آپ کو کیا ہوا۔؟ یہ چوٹ کیسے لگی۔؟" اس نے حیرت سے اپنے بائیں جانب بیٹھے عبید باجوہ سے استفسار کیا۔ اس کے ماتھے پر پٹی لگی ہوئی تھی اور ایسی ہی ایک پٹی کی مدد سے اس کے بازو کو جکڑ کر کندھے سے باندھا گیا تھا۔

"دیکھ لو تمہاری خاطر میں نے جان کی بازی بھی لگا دی۔" وہ ہنس دیا۔ بسمہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"لیکن یہ چوٹ کیسے آئی آپ کو۔؟" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"جب آپ میڈم بے ہوش تھیں۔"

"وہ بے ہوش نہیں تھی نیند میں تھی۔" بسمہ نے عبید باجوہ کو ٹوکا۔ آہ یہ بیسٹیز اور ان کی محبت۔

"اوہ اچھا مجھے تو لگا اس دنیا سے کوچ کر گئی ہو گی۔" بسمہ اور فریال دونوں نے عبید باجوہ کو گھورا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"اچھا اچھا۔ میں تو کچھ بول ہی نہیں رہا۔" وہ ان دونوں لڑکیوں سے لڑائی یا ناراضگی مول نہیں لے سکتا تھا۔ ایک بسمہ شارق تھی جو اس کی بہن جیسی تھی اور دوسری فریال ساجد تھی جو کم از کم اس کی بہن جیسی تو نہ تھی۔

"ویسے بسمہ تمہیں نہیں لگتا ہمیں فریال کو اصل حقیقت بتانی چاہیے۔" کچھ دیر بعد عبید باجوہ کی آواز ابھری۔

"نہیں۔" بسمہ کا بے رنگ چہرہ سپاٹ ہوا تھا۔ فریال نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں کیا۔؟" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"نہیں۔" بسمہ دوبارہ بولی۔ فریال کا دل چاہا قریب لگا آئی۔ سی۔ یو۔ مونیٹر اٹھا کر اسے دے مارا۔ لیکن دل کی چاہ بھی کبھی پوری ہوئی ہے۔

"کیا صبح ناشتے میں 'نہیں' کھا کر آئی ہو۔" مومن ابراہیم ان کی باتیں سنتا اندر داخل ہوا تھا۔ ہاتھ میں نیلے رنگ کی فائل تھی۔

"نہیں۔ یہ کوئی نئی ڈش ہے کیا۔؟" بسمہ نے آنکھیں ٹپٹپائیں۔ انداز وہی تھا کہ کہہ لو جو کہنا ہے بسمہ شارق کو کون سا کوئی فرق پڑتا ہے۔

"ہاں مومن ابراہیم کی ایجاد کردہ نئی ڈش ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کچھ کہا تم نے۔؟" فریال اور عبید باجوہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

"فکر نہیں کریں حضور آپ کی شان میں عرض کرنے کے لیے قصیدہ نہیں کہا۔" اس نے فائل فریال کے بیڈ کی پائنتی پر لگے ٹیبل پر دھری۔ جواباً بسمہ شارق بھی کچھ بڑبڑائی تھی لیکن وہ اگنور کر گیا۔

"آپ کے ڈسچارج پیپرز ریڈی ہو چکے ہیں فریال۔ اب آپ واپس جا سکتی ہے لیکن۔" وہ یونہی لیکن کہہ کر بات ادھوری چھوڑا کرتا تھا۔

"بسمہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ عبید باجوہ آپ کو ہاسٹل چھوڑ آئے گا اور آپ کی دیکھ بھال کے لیے مکمل ایک نرس کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم آپ کی ہیلتھ کے متعلق کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ گاٹ اٹ۔؟" مومن نے نرمی سے اس کے سر کے عین اوپر مقام پر زوردار دھماکہ کیا تھا۔

فریال جو "مومن ابراہیم" کے خود سے مخاطب ہونے پر کھوئی ہوئی تھی وہیں بسمہ والی بات پر افسردگی چھا گئی۔

"یہ میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتی۔؟" اس نے بسمہ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ فریال کے معصومانہ انداز پر فدا ہوتی اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔

"یہ آپ کی ماں ہیں۔؟" پہلا استفسار ہوا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کیا پھر رشتہ دار ہیں۔؟" دوسرا استفسار ہوا۔

"نہیں کوئی خونی رشتہ تو نہیں ہے۔" وہ منمنائی۔

"پھر یہ آپ کی کیا لگتی ہیں۔؟" تیسرا اور آخری استفسار۔ فریال نے تھوک نگلا۔

"یہ میری بہن ہے۔ (مومن نے آئبرو اچکائے) مم۔ میرا مطلب بہن جیسی دوست ہے۔" وہ بولی۔ مومن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"دیکھیں فریال ساجد۔ 'دی کینڈیڈیٹ آف ایم ایس ٹریننگ سینٹر' یہ دوستی ایک جعلی رشتہ ہوتی ہے۔ ایک روز قیام پذیر ہوتی ہے تو بہت جلد اختتام پذیر بھی ہو جاتی ہے۔ اس جذبے کو انسان جب کوئی نام نہیں دے پاتا تو وہ اسے دوستی کے نام سے جاننے لگتا ہے۔ 'دو' یعنی دو لوگ اور 'ستی' کا مطلب ساتھ یا وفاداری ہے۔ دو لوگوں کے درمیان ایسا جذبہ جو خود پر وفاداری کا ملمع چڑھائے رکھتا ہے۔ لیکن آج کے دور میں کوئی شخص مخلص نہیں، کوئی دوست وفادار نہیں۔ آج کل کی دنیا میں دوستی کے نام پر فریب ملتا

ہے۔ فریب یعنی دھوکہ اور دغا۔ ہمارے سینٹر کی ایک قابل شاگرد ہونے کے باعث آپ کو وقتی جذبات سے متاثر ہو کر دوستیاں گانٹھنے کی اجازت ہر گز نہیں ہے۔" آخر کار وہ خاموش ہو ہی گیا۔ فریال کے وجود میں پھریری دوڑی تھی۔ کیا دوستی اتنی بے مول ہوتی ہے۔؟

"واؤ۔ تمہیں تو موٹیویشنل سپیکر ہونا چاہیے تھا۔" بسمہ سے فریال کی حالت دیکھی نہیں گئی۔

"تم سے کسی نے مشورہ نہیں مانگا۔ اپنے کام سے کام رکھو اور تم ان دونوں کے ساتھ نہیں جانے والی میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔ جلدی آؤ۔" وہ سنجیدگی سے کہتا باہر نکل گیا۔

بسمہ نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو واپس دھکیلا۔ سفاک۔ سنگ دل۔ کھڑوس اور سڑو۔ وہ اس کی شان میں گستاخیاں کر رہی تھی۔

صوفیہ ابراہیم کے حویلی سے چلے جانے کی خبر ابھی تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ جہانداد ملک اضطراب کی کیفیت میں ہاتھ ملتے فون پر دوسری جانب جاتی گھنٹی سن رہے تھے۔ کچھ پل بعد فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو کہاں مر گئے ہو تم ابھی تک تو کام ہو جانا چاہیے تھا۔" جہانداد ملک نے چھوٹتے ہی سوال داغا۔ دوسری جانب کھڑے ندیم دارا نے ایک نظر اپنے عقب میں ڈالی وہاں اداس سی صوفیہ ابراھیم بیٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ فکر نہیں کریں مالک بس کچھ دیر مزید لگے گی پھر آپ کا کام مکمل ہو جائے"

"اچھا ٹھیک ہے جلدی کرو۔ اور مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ۔" وہ کال کاٹ گئے ندیم نے کھا جانے والی نظروں سے فون کو گھورا۔

"کون سے کام کی بات کر رہے ہو تم لوگ۔؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

"ظاہر ہے پارٹ ٹائم قتل و غارتگری کا کام کرتا ہوں۔ ملک کے نام کی سپاری دی ہے مجھے جہانداد نے۔ اب بس ملک کو اس کے انجام تک پہنچانا ہے۔" وہ کڑوے کسیلے لہجے میں بولتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"جیسے میرے خاندان کو تباہ کیا تھا تم لوگوں نے۔" وہ آہستہ سے بولی تھیں۔

واپسی کا راستہ ہمیشہ کٹھن ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنا قیمتی اثاثہ سکندر حویلی کے حوالے کر کے آ رہا تھا۔ جیا سکندر اس کی بہن تھی اور وہ اس کا محافظ۔ کیا وہ حقیقت پتہ چلنے پر اسے معاف کر پائے گی؟ سوالات اس کے ذہن کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ تبھی اسے کوئی احساس ہوا۔ کچھ غیر شناسا سا احساس جو آج سے پہلے کبھی معلوم نہیں ہوا تھا۔

بیک ویو مرر میں تین گاڑیاں اس کے تعاقب میں نظر آنے لگیں۔اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ گاڑیاں مزید تیزی سے اس کے قریب آنے کی تگ ودو کر رہی تھیں۔ملک کو اپنے آس پاس خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ گاڑی کی رفتار ایک دم سے بڑھائی۔ تیز بہت تیز لیکن دو گاڑیاں ایک دم سے اس کے آگے آکر رک گئیں۔اس نے گاڑی کو بریک لگائے۔ٹائروں کی چڑچڑاہٹ سے وہ چاروں گاڑیاں ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔یہ سڑک بہت کشادہ تھی۔

ملک نے دیکھا سامنے گاڑی سے دو بندے باہر نکل کر کھڑے ہو چکے تھے۔انہوں نے مکمل سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پھولے مسلز اور تنومند جسم کے مالک۔ملک نے دایاں آئبرو اٹھایا۔اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس کی گاڑی کے قریب آتے۔ملک نے پھرتی سے ڈیش بورڈ کے باکس کو کھنگالا۔سامنے خالی ڈبہ اس کو منہ چڑا رہا تھا۔ملک کو یاد آیا وہ اپنی گاڑی لے کر گھر سے نہیں نکلا تھا۔اس کی مطلوبہ شے اس کی اپنی گاڑی میں تھی۔

"ساری مصیبتیں آج ہی کے دن آنی تھیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا۔اس نے دیکھا ایک گاڑی اس کے عقب میں بھی کھڑی تھی۔

"بھائی صاحب گاڑی ہٹائیں۔" اس کی بات پر سامنے کھڑے لوگوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ہاں ویسا ہی جیسا تم موویز میں غنڈوں کو لگاتے دیکھتے ہو۔

"کیوں بے تیری بس نکلی جا رہی ہے۔" ان میں سے ایک اس کے قریب آیا۔شانے پر ہاتھ رکھے وہ گویا ہوا۔

"بس تو نہیں لیکن تم لوگوں کی ہوا ضرور نکلنے والی ہے۔" ملک نے اس کا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹا کر مڑوڑا۔ کڑک کی آواز سے اس کا بازو شاید شانے سے جدا ہوا تھا۔ایک زوردار پنچ۔۔اور خون اس کے منہ سے فوارے کی صورت بہہ نکلا۔

"کیوں نکل گئی ہوا۔؟" ملک نے اس کے سینے پر اپنا بھاری بوٹوں والا پیر رکھا۔

"اے ے۔" دوسرا شخص چیختا ہوا آگے بڑھا۔

"سوری میں یہاں تمہیں اے۔بی۔سی نہیں سکھا سکتا۔" ملک نیچے جھکا۔اس شخص کا نشانہ چوکا۔

"تیری تو۔" ملک کے جسم میں بجلی دوڑی تھی۔وہ آگے بڑھا اور پے در پے مکوں اور گھونسوں سے مقابل شخص کا منہ توڑ دیا۔ایک اس کو چھونے کی غلطی کر بیٹھا تھا تو دوسرا اس کے بارے میں الفاظ کا چناؤ غلط کر رہا تھا۔

"کوئی اور بھی ہے کیا۔؟" ملک نے باقی رہ جانے والوں کو للکارا۔ان تینوں سیاہ شیشوں والی گاڑیوں سے یکے بعد دیگرے کئی ویسے ہی بندے باہر نکلے تھے۔

"او تیری۔" ملک دل میں بولا۔خطرے کو خود دعوت دے کر وہ پچھتا رہا تھا۔

تبھی گولیوں کی آواز ہوا میں ابھری۔ان گنت گولیاں۔ملک نے نگاہ اپنے ارد گرد دوڑائی وہاں تین سے چار گارڈ ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ملک نے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھا۔یہ کیسے ہوا؟

"بھائی۔"کسی کی چیخ یک دم کراہ میں بدل گئی۔ملک کا دل ایک لمحے کے لیے سکڑ کر پھیلا۔'بھائی' یہ لفظ اسے صرف ایک شخص بول سکتا تھا۔

"یہ امتحان نہ لئیں میرے اللہ۔"اس کے دل نے صدا بلند کی۔اس کے سامنے کوئی شخص گھٹنوں کے بل گرا تھا۔

ملک کی نگاہ اس کی پھٹی ہوئی قمیض پر گئی۔اس نے گولی لگنے والے فرد کو نیچے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا تھا۔

"نن۔ندیم۔"ملک نے اپنی بانہوں میں زندگی کی آخری سانسیں بھرتے ندیم کو دیکھا۔وہ یہاں کیوں آیا تھا۔اور کیا ان تمام کو مارنے والا بھی ندیم تھا۔؟لیکن ایک بات ملک کو پریشان کر گئی کہ وہ اسے لگنے والی گولی کے سامنے کیوں آیا تھا۔؟وہ شخص کیا تھا۔ جہانداد کا رائٹ ہینڈ یا اس کو بچانے آنے والا فرشتہ۔؟

وہاں سے باقی کے تمام لوگ رفو چکر ہوئے تھے۔جانتے جو تھے اب ان کی خیر نہیں۔ملک نے سالم نگاہوں سے سامنے دور جاتی گاڑیوں کو دیکھا۔وہ اپنا وقت ضائع کیے بغیر ندیم کو گاڑی میں ڈالتا ہاسپٹل کی جانب روانہ ہوا تھا۔

ماضی:

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو قاسم ایسے کیسے تم اپنی بیٹی کو بھگا کر میری بیٹی کا نکاح چاہتے ہو۔ہوش میں تو ہو تم۔تمہاری وہ غدار بیٹی تمہارے منہ پر کالک مل کر چلی گئی اور تم یوں بیٹھے ہو۔کیا عزت غیرت سب مر گئی ہے تمہارے اندر۔"اس وقت جہانداد ملک اور قاسم ملک صوفیہ قریشی کے ماں باپ کے سامنے بیٹھے تھے۔ان کی باتیں قاسم اور جہانداد ملک کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"دیکھیں جو ہوا اسے بھول جائیں حدید کو صدف (بدبخت) سے بہتر کوئی بھی مل سکتی ہے۔آپ جہانداد اور صوفیہ کا رشتہ تو خراب مت کریں۔"وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔لیکن سامنے ان کے چہرے سے انکار واضح تھا۔

"صوفیہ اور حدید کا نکاح اسی تاریخ پر ہو گا۔لیکن تمہارے بیٹے کے ساتھ نہیں۔"وہ دوٹوک بول رہے تھے۔جہانداد ملک کی آنکھیں آگ اگلنے لگیں۔

"آپ ایسا نہیں کر سکتے انکل۔صوفیہ میری منگ ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔میں مر جاؤں گا لیکن اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔"وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو ملک۔ بہن ہے وہ میری۔" حدید قریشی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سارا منظر دیکھتی صوفیہ قریشی کی ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔

وہ حدید کے ساتھ ہوئی جھڑپ پر تن فن کرتا ڈرائنگ روم سے باہر نکلا تھا۔ وہاں چھپ کر کھڑی صوفیہ قریشی کو دیکھتے اس کے قدم تھم گئے۔ آس پاس کی دنیا کو ساکت کر کے وہ صوفیہ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔ وہ یہی تو کرتی آئی تھی۔

"پندرہ سال۔ پندرہ سال دیے تھے میں نے تمہیں خود سے محبت کرنے کے لیے۔" وہ اس کے سامنے سراپائے سوال بنا کھڑا تھا۔

"میری محبت میں، میری دعاؤں میں کون سی کمی رہ گئی صوفیہ کہ تم نے میری محبت کو بھاڑ میں جھونک کر میری ہی بہن کو بھگانے کا پلین ترتیب دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں کی شادی کی شرط ہی ان دونوں کا بندھن تھی۔؟" وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ کانفیڈینٹ اور بولڈ صوفیہ قریشی کہیں دور جا سوئی تھی۔

"بولو جواب دو مجھے۔" جہانداد ملک نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"میں نہیں کرنا چاہتی تم سے شادی۔ بار بار کی کہی ایک ہی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی جہانداد ملک۔ میں نفرت کرتی ہوں تم سے شدید نفرت آج سے نہیں اس گھڑی سے جب تمہارا نام مجھ سے جوڑا گیا۔ ہر اس لمحے سے جس میں مجھے تمہارے ساتھ منسوب کیا گیا۔" وہ اپنا جواب سناتی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

"ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں کوئی نہیں بچے گا میرے عتاب سے۔" وہ دھاڑتا ہوا انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر رہا تھا۔

"کیا ہوا حدید ابھی تک پہنچا نہیں۔" ان کی بات پر قریشی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ہر کوئی پریشان تھا۔ نکاح میں وقت کم رہ گیا تھا۔ صوفیہ قریشی سٹیج پر براجمان راہ تک رہی تھی۔ اس کے ساتھ براجمان ابراہیم داؤد سامنے پریشان حال کھڑے گھر والوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن آنے والا آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

حدید قریشی کی غیر موجودگی میں ہی صوفیہ قریشی کو ابراہیم داؤد کے عقد میں دے دیا گیا۔ وہ صوفیہ قریشی سے صوفیہ ابراہیم بن گئی تھی۔ اتنے قیمتی لمحات میں اپنے بھائی کی کمی کو محسوس کرتی صوفیہ ابراہیم آنسوؤں میں رخصت ہوئی تو وہیں حدید قریشی کی گمشدگی کا سراغ لگانے کے لیے قریشی صاحب نے اپنے بندے اس کی تلاش میں لگائے تھے۔

حدید قریشی کی تلاش اگلے ہی دن ختم ہوئی تھی لیکن ملنے والا حدید قریشی نہیں بلکہ اس کی لاش تھی۔

حال:

گاڑی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔دوں وں نفوس چپ سادھے بیٹھے تھے۔بسمہ شارق کھڑکی سے باہر دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔کیا اس کا باپ واقعی اسے مارنے کی کوشش کر سکتا تھا۔؟وہ سوچ کر رہ گئی۔ مومن نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا وہ ایک ہاتھ تھوڑی تلے رکھے نظریں دوسری جانب ٹکائے ہوئے تھی۔آہ وہ بات کیوں نہیں کر رہی تھی۔؟مومن سوچ کر رہ گیا۔

"تم نے غلط کہا تھا مومن ابراہیم۔"مومن نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ابھی ہی تو وہ اس کے بولنے کی خواہش کر رہا تھا لیکن کیوں؟

"کیا غلط کہا تھا میں نے۔؟"مومن نے پوچھا۔

"یہی کہ دوستی فریب کا دوسرا نام ہے۔غلط کہا بالکل غلط کہا۔"بسمہ نے اپنا رخ اس کی جانب موڑا۔باہر سیاہ سڑک کے اوپر بچھے نیلے آسمان پر ہلکی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔

"کیسے؟"

"تم نے کہا دوستی کا خول وفاداری ہے۔جبکہ ایسا نہیں ہے آج کی دنیا میں دوستی وہ واحد جذبہ اور احساس ہے جو دو انسانوں کو آپس میں باندھے رکھتا ہے۔یہ محبت یا نفرت نہیں دوستی ہی ہے جو آج کی دنیا میں بھی انسان دوسروں پر بھروسہ کر جاتا ہے۔"وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔مومن غور سے اسے سنتا گیا۔

"تم کہتے ہو دوستی ایک جعلی رشتہ ہے۔اگر یہ رشتہ جعلی ہوتا تو تم ملک سر سے اتنے وفادار کیسے ہوتے۔؟"سوالیہ آنکھیں بھوری آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"وہ میرے دوست نہیں ہیں۔میرے بھائی ہیں۔ایک باپ ہیں اور ایک فرشتہ ہیں۔اینجل۔"مومن جب بھی اس کا ذکر کرتا تھا یونہی لہجے میں مٹھاس در آتی تھی۔

"لیکن خونی رشتہ تو کوئی نہیں ہے ناں۔؟اور جب تم اس جذبے کو نام نہیں دے پا رہے تو تم اسے بھائی چارہ کہہ رہے ہو۔اور جانتے ہو بھائی چارہ کی بنیاد کیا ہے۔برابری اور مساوات۔ایک دوجے کو کمتر نہ جاننا۔خود پر ترجیح دینا۔اور سب سے بڑھ کر اس کا خیال رکھنا۔یہ بھائی چارہ ہے۔برابری ہے۔اور اسی کا دوسرا نام دوستی ہے۔دوستی معنی وفاداری اور ساتھ۔"وہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"میں نہیں جانتا تھا تم اتنی گہری بات بھی کر سکتی ہو۔بائے داوے ہر انسان کا پوائنٹ آف ویو مختلف ہوتا ہے۔جیسے میرا تم سے مختلف ہے۔"وہ کندھے اچکا گیا۔بسمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہر انسان کا پرسپیکٹو مختلف ہو سکتا ہے لیکن دل سب کا ایک ہی ہوتا ہے مومن ابراہیم۔کسی بھی چیز کے دل کو اچھا لگنے کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔اور تمہاری لوجک اور تھیوری میں جھول ہے۔"

"اوکے آئی سرینڈرڈ۔" مومن نے سر ہلایا۔ وہ اس کی بات سے متفق نظر آتا تھا۔ بات وہی تھی دل سب کا ایک ہی ہوتا ہے ایک ہی جیسے جذبات پاتا ہے۔ ایک ہی طرح کی محبت کرتا ہے بس کچھ لوگ اس میں فرق کرنے لگتے ہیں۔

باہر آسمان مکمل سیاہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں یقین نہیں ہے ناں تو تم مجھ سے دوستی کر کے دیکھ لو۔" بسمہ نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ مومن نے حیرت سے دیکھا سفید مخروطی انگلیاں اس کی جانب تھیں۔ وہ اسے دوسری مرتبہ دوستی کی آفر کر رہی تھی۔ بسمہ کچھ بولنے لگی جب ڈیش بورڈ پر رکھے مومن ابراہیم کے موبائل نے بیپ کی تھی۔ میسج ٹون۔

مومن نے گاڑی سڑک کے ایک جانب روکی۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ بسمہ اب تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ دوستی کی جانب بڑھایا جانے والا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

مومن نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ نمبر شناسا تھا ایسا کہ بس کانٹیکٹ لسٹ میں محفوظ پڑا ہوا خیر۔ اس نے میسج کھولا۔

"ملک کو بچاؤ مومن۔ جہانداد ملک نے اس پر قاتلانہ حملہ کروایا ہے۔" فقط دو سطریں۔ مومن کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ گاڑی میں حبس بڑھنے لگی۔ بسمہ نے اس کی پیشانی پر نمودار ہوتے پسینے کے قطرے دیکھے۔ پھر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"از ایوری تھنگ آل رائیٹ۔؟" مومن نے نم ہوتی آنکھوں سے بسمہ کو دیکھا اور پھر وہ نظریں موبائل پر ٹکا گیا۔ ایک موہوم سی امید دل میں جاگی تھی۔ دل میں ہاں دل میں جہاں محبت جنم لیتی ہے۔ بسمہ ٹھیک تھی اس نے اعتراف کیا۔

ہر موبائل میں ایک فائنڈ مائی ڈیوائس ایپلیکیشن موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی اسے ڈائونلوڈ کر رکھا تھا۔ اس پر مومن ابراہیم اور ملک کے موبائل کا آئی۔ ایم۔ ای۔ آئی۔ نمبر لنکڈ تھا۔ مومن کی انگلیوں نے ان تمام میں سے ایک کو دبایا۔

نقشہ کھلا اور فون کا آئیکن ابھرتا ایک جگہ سرخ بتی جلانے لگا۔ مومن نے دیکھا وہ اسلام آباد کا ایک معروف ہاسپٹل تھا۔

"مومن۔؟"

"بب۔ بھائی پر۔ مرڈر۔ اٹیمپٹ ہوا ہے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اوہ میرے خدایا۔۔ وہ ٹھیک ہیں ناں؟" مومن نے لب کاٹے اور کال ملائی۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔ تیسری بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"کیوں فون کیا ہے۔؟" انمول کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ مومن نے خیالات جھٹکے۔

"ہیلو۔ انمول بھائی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہیں۔" اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتا بسمہ نے تپ کر اس سے موبائل چھینا اور کال کاٹی۔

"یوڈفر۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔؟ انمول کو بتانے کی کیا ضرورت تھی وہ گھر پر اکیلی ہیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔؟" بسمہ نے اسے لتارا ۔ مومن نے گہری سانس خارج کی۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک عرصہ پہلے ملک کو گولی لگنے کی اطلاع دی تھی۔ لیکن وہ تب پہلے سے جانتی تھیں۔ چند پُر سکون سانسیں لینے کے بعد اس نے گاڑی دوبارہ سٹارٹ کر کے اپنی منزل پر ڈالی۔

"سر کو کچھ نہیں ہو گا مومن وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" بسمہ نے اسے تسلی دی۔ وہ سر ہلا گیا۔

"میں بھائی کو کبھی کچھ ہونے ہی نہیں دوں گا" وہ اپنے دل میں دعا گو تھا۔

کمرہ سہہ پہر کی چھٹتی روشنی کے باعث نیم اندھیر تھا۔ کسی کے ہچکیوں میں رونے کی آوازیں کمرے کی در و دیوار سے سر پٹک کر واپس آتی تھیں۔ وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھی۔ بیڈ پر بیٹھے اس نے سامنے نظر آتی دیوار کو تکا۔ کھڑکی سے آتی روشنی اس دیوار کو منور کیے ہوئے تھی۔ سامنے دیکھتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں سے تصاویر غائب تھیں۔ محض چند ایک تصاویر بچی تھیں۔ اسے یاد آیا چند ماہ پہلے وہ وہاں بہت سی تصاویر چھوڑ کر گئی تھی۔ لیکن اب؟

وہ آنسو پونچھتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ نیچے دالان میں ایک پینتس چھتیس سال کی ملازمہ صفائی کر رہی تھی۔

"باجی جی آپ آنے سے پہلے بتا دیتی میں پوری حویلی کی اچھے سے صفائی کر دیتی۔" وہ اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

"میرے کمرے میں کون گیا تھا۔؟" وہ ہاتھ باندھے ملازمہ کے سامنے کھڑی تھی۔ چہرہ بے تاثر تھا۔

"جج۔جی آپ کے کمرے میں۔ قسم لے لیں باجی جی ہم نے کسی کے لیے بھی حویلی کے دروازے نہیں کھولے۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔" وہ ہاتھ جوڑ گئی۔

"میں شک نہیں کر رہی میری کچھ چیزیں مسنگ تھیں اس لیے پوچھا۔" وہ صفائی دیتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

"آپ کو بھوک لگی ہے؟ میں کچھ بنا دوں۔" جیا نے نفی میں سر ہلایا۔

"ویسے باجی جی آپ اپنا گھر کیوں چھوڑ آئی ہیں۔؟" وہ ٹوہ لے رہی تھی۔ ہر ملازم ایسے ہی کرتا ہے۔ اپنے مالک کی باتیں سن کر پھیلانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔

"کیوں آپ کو اچھی نہیں لگ رہی؟ اور میرا گھر وہ نہیں یہ ہے۔" جیا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"توبہ باجی جی۔ میں تو بس ایسے ہی بول رہی تھی۔" وہ واپس اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ جیا نے چائے کی کیتلی چڑھائی۔ اس ملازمہ کا نام نجمہ تھا۔ وہ اور اس کا شوہر پچھلے دس بارہ سالوں سے حویلی میں موجود انیکسی میں مقیم تھے۔ حویلی کی اور اس میں موجود اس کی

چیزوں کی حفاظت ان کے ذمے تھی۔وہ دونوں قابل اعتبار ملازم تھے۔جیا کا ذہن پھر سے تصویروں کی جانب چلا گیا۔ آخر اس کے کمرے میں کون آیا تھا۔؟

مومن ابراہیم کی بات سن کر انمول کو اپنے ارد گرد دھماکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔کیوں آخر کیوں وہ خود کو اتنی تکلیف پہنچاتا تھا؟اسے انمول کا یا خود سے جڑے رشتوں کا رتی برابر بھی احساس نہیں تھا۔اپنی اور ملک کی باتیں اس کا وجود جھنجھوڑ رہی تھیں اگر جو اسے کچھ ہو گیا۔وہ صرف سوچ سکی۔

اسے وہاں بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی جب باہر دروازے پر بیل بجی۔وہ کھڑی ہوئی۔پانی سے دھوئے ہاتھ خشک ہو رہے تھے۔ برتن سنک میں ویسے ہی دھرے ہوئے تھے۔اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔سامنے مومن ابراہیم کھڑا تھا اور اس کے ساتھ وہی سرمئی آنکھوں والی لڑکی۔

"مم۔مومن۔ملک کہاں ہے وہ ٹھیک ہے ناں۔؟"اس کی آواز میں بے چینی تھی۔خوف تھا۔ڈر تھا۔مومن کے دل کو کچھ ہوا۔

"وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔میں انہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"مومن نے اسے تسلی دی۔لیکن وہ مزید بھڑک گئی تھی۔

"جج۔جھوٹ۔جھوٹ بولتے ہو تم۔جھوٹے ہو۔تمہارے ہوتے ہوئے ملک وہاں ہسپتال میں ہے۔مجھے اس کے پاس جانا ہے خدارا مجھے وہاں لے جاؤ۔"وہ چیختی ہوئی مومن پر چڑھ دوڑی۔بسمہ خاموش تماشائی بنی کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔انمول ملک مومن کے قریب کھڑی تھی۔بسمہ کے وجود میں بھانبڑ جلنے لگے۔

"میں پہلے بھی آپ کو ایک دفعہ ہسپتال لے جانے کی غلطی کر چکا ہوں انمول۔مزید میں کوئی غلطی دوہرا کر بھائی کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔معذرت میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔"وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔

"اگر ملک کو کچھ ہوا تو میں تمہاری جان لے لوں گی مومن ابراہیم۔"انمول نے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔وہ لڑکھڑایا تھا۔لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا وہ اسے یہ نہیں کہہ پایا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کی جان ہی تو لے رہی تھی۔اس کی سانسیں اس پر خود ہی تنگ پڑ رہی تھیں۔

"انمول آپ میرے ساتھ آئیں۔سر کو کچھ نہیں ہو گا۔"بسمہ نے انمول کو تھاما۔لیکن وہ اسے دور جھٹک گئی۔مومن نفی میں سر ہلاتا واپسی ہو لیا۔وہ یہاں بسمہ شارق کو چھوڑنے آیا تھا۔اب اسے ہسپتال جانا تھا۔

"مومن مارک مائی ورڈز۔"وہ اب بھی چیخ رہی تھی۔بسمہ نے دروازہ بند کر دیا۔اور اسے لے کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ناجانے کیوں چند لمحات قبل حسد کا عنصر نمایاں ہوا تھا۔خیر یہ تو تب تب ہوتا تھا جب مومن ابراہیم کے دل کی بات آتی تھی۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہسپتال پہنچا تھا۔ مومن ابراہیم کا حال کسی دیوانے کے سا معلوم ہو رہا تھا۔ ریسیپشن ڈیسک پر اپنے مطلوبہ شخص کا پوچھ کر وہ فوراً ایک راہداری میں گم ہو گیا۔ سامنے ہی بینچوں کے قریب ملک اضطراب کی کیفیت میں ہاتھ ملتا ادھر سے ادھر گھن چکر بنا گھوم رہا تھا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" اس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ ملک کے قدم کسی شخص کے احساس سے تھمے تھے۔ اس نے رک کر اپنے بائیں جانب طویل راہداری میں دیکھا وہاں مومن ابراہیم کھڑا تھا ہاتھ پہلوؤں میں گرائے۔ پھر وہ آگے بڑھا اتنا کہ ملک کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ملک کا دل ایک بار پھر پسیج گیا۔

"مومن۔ میرے بھائی۔" اس نے مومن کو شدت سے گلے لگایا۔ بس پسلیاں ٹوٹ جانے کی کسر باقی تھی۔

"ب۔ بھائی آپ ٹھیک ہیں۔؟" اس کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ ملک نے اسے زور سے پکڑا ہوا تھا۔

"ہاں اب میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کسی بچے کی طرح مومن ابراہیم کا ماتھا چوما۔ مومن کا چہرہ خون چھلکانے لگا تھا۔

"کیا ہوا تھا بھائی آپ خیال کیوں نہیں رکھتے۔؟" وہ مستفسر ہوا۔

"آج اس لمحے جب تمہارا تصور بھی قیامت تھا تو مجھے احساس ہوا کہ مومن ابراہیم ملک کے لیے کتنا ضروری ہے۔ کس حد تک یہ بندہ چاہتا ہے تمہیں۔ تمہارا بچھڑنا میری جان لے لے گا مومن۔" مومن نے حیرانی سے ملک کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"آپ نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا بھائی۔" وہ اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

"اس ہمیں میں کون کون شامل ہے تمہارے۔؟" ملک نے سخت لہجہ اپنایا۔

"وو۔ وہ۔" مومن گڑبڑا گیا تھا ایک بار پہلے بھی وہ ایسے ہی لاجواب ہوا تھا۔

"جواب دو مومن۔"

"انمول اور بسمہ۔" آنکھیں میچ کر کھولیں۔

"آہ مومن میں تمہیں کیا بولوں۔؟" وہ شدید ڈسٹرب ہوا تھا۔ وہ کتنا پریشان ہو رہی ہوں گی۔

"دیکھیں بھائی وہ بیوی ہیں آپ کی ان کو خبر ہونی چاہیے۔ اور میں کون سا انہیں ہسپتال لے آیا ہوں۔" مومن کو یاد آیا کیسے وہ پچھلی بار اس سے ناراض ہوا تھا۔

"میرا ڈر نہ ہوتا تو وہ بھی کر جاتے۔" ملک نے تنک کر کہا۔ مومن کچھ کہنے لگا۔

تبھی ایک ڈاکٹر ان کی جانب آیا اس کے ساتھ تین میل نرس بھی تھیں۔ وہ شکل سے ہی کوئی بڑا ڈاکٹر معلوم ہو رہا تھا۔ مومن کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔ اگر ملک ٹھیک تھا تو ہسپتال میں کون تھا۔؟

"پیشنٹ کی حالت بہت نازک ہے۔ بلیڈنگ بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ آپ دعا کریں۔" وہ اپنی سناتے وہاں سے چلے گئے۔

"پیشنٹ کون؟"

"ندیم دارا۔" اور مومن ابراہیم کو لگا ہسپتال کی پوری چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ اس نے منہ کھولے حیرت سے ملک کو دیکھا آیا جاننا چاہ رہا ہو کیا سچ میں؟ مومن کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ملک نے ساری کتھا اس کے گوش گزار دی۔

ماضی:

"ہوش میں تو ہو تم۔ ایک کا قتل کر آئے ہو دوسرے کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہو۔ چاہتے کیا ہو تم۔؟" قاسم ملک سامنے کھڑے اپنے پچیس سالہ بیٹے کو ڈانٹ رہے تھے۔ جہانداد ملک سر جھکائے کھڑا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا قتل تھا۔ یہیں سے شروعات ہوئی تھی۔

"مجھے صوفیہ کی خاطر جن لوگوں کا قتل کرنا پڑا میں انہیں اپنے رستے سے ہٹانے میں دریغ نہیں کروں گا۔" وہ جنونی ہو رہا تھا۔

"صوفیہ نہیں صوفیہ ابراہیم۔ اور تم کرو گے قتل باپ کے نام کے سوا تمہارے پاس ہے ہی کیا۔؟ آخر کون سی طاقت پر اتنا اترا رہے ہو۔" دردانہ بیگم اس کے روبرو آئی تھیں۔ جہانداد ملک کی رگوں میں لفظ "طاقت" خون بن کر اترا تھا۔

اس کی انا پر کاری وار کیا گیا تھا۔ وہ خاموش رہنے والوں میں سے نہیں تھا۔ انہوں نے جہانداد ملک کو ہلکا لے لیا تھا وہ جانتے نہیں تھے کہ جہانداد ملک کی دشمنی کی قیمت ہر ایک فرد کو چکانی پڑے گی۔ کیونکہ دشمنی میں ملک ہر حد سے گزر جایا کرتا تھا۔

پاکستان پہنچ کر واجد سکندر نے سب سے پہلے صدف ملک سے نکاح کیا تھا۔ اس کے نکاح میں گواہان کے طور پر معید سکندر اور اس کے کچھ دوست شامل تھے۔ معید سکندر کی موجودگی میں نکاح ہوا تو وہ ان دونوں کو گھر لے کر آئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم واجد۔ ہم نے تمہیں بیرون ملک پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اور تم وہاں سے نکاح کر کے آ گئے۔؟" گل زرین سکندر ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔ ان کی اپنی اولاد انہیں دغا دے جائے گی۔ یہ قطعی نہیں سوچا تھا۔

"وہاں سے نہیں بابا جان میں نے پاکستان آ کر نکاح کیا ہے اور بھائی جان ہمارے نکاح کے گواہ ہیں۔" واجد سکندر کی بات پر صوفے پر آرام سے بیٹھا معید سکندر الرٹ ہوا تھا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اپنے چھوٹے بھائی کی شکل دیکھ کر رہ گیا جو اپنے مقدمے میں اسے بھی گھسیٹ لایا تھا۔

"اللہ نے دو بیٹے دیے وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک۔" وہ وہاں سے یہ جا وہ جا ہوئے تو نائلہ جعفری کا قہقہہ چھوٹا۔ باقی سب بھی دھیرے سے ہنس دیے۔ ظاہر ہے واجد، گل زرین صاحب کی زوجہ کا لاڈلا بیٹا تھا تو ایسے کیسے اس کی بات نہیں مانی جانی تھی۔ خوشیاں ان کی منتظر تھیں۔

حدید قریشی کی موت کی خبر صوفیہ ابراہیم پر قہر بن کر ٹوٹی تھی۔ اس کے پاس ماں باپ کے بعد ایک وہ رشتہ تھا جو اس کا اپنا تھا۔ اب وہ کیا کرے کدھر جائے؟ جہانداد ملک کے ارادے اس کے ماں باپ کو ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی جان کے لیے دوسرے ملک فرار ہو گئے۔ ابراہیم داؤد کی ہمدردیاں صوفیہ ابراہیم کے گھاؤ پر مرحم خیزی کر رہی تھیں۔ ابراہیم کی محبت اور توجہ نے صوفیہ ابراہیم کو سنبھال لیا تھا۔

جہانداد ملک کو اس کے والد نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے اس قتل کے کیس سے بچنے کے لیے روپوش کروا دیا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ ایک بات کہہ گئے تھے کہ ان کی واپسی سب پر بھاری پڑے گی۔ اور بات جب انا پر آ جائے تو وہ نسلیں تباہ کر دیتی ہے۔

حال:

دن ڈھل آیا تھا۔ سورج اپنی کرنوں سے ہر شے کو چمکا کر اب شبِ نیند سونے جا رہا تھا۔ ہر چرند پرند اپنے نشیمن کو پرواز کر رہے تھے۔ ایسے میں اس بھورے رنگ سے بنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا وہ شخص دروازے پر لگی گھنٹی بجا رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے وہاں کھڑا تھا جس کا احساس اس کی پیشانی پر ہلکے پسینے کے قطروں سے ہو رہا تھا۔ جولائی کا نصف چل رہا تھا ظاہر ہے پتنگوں کو بھی پر لگ جاتے ہیں اس گرمی میں۔

دروازے کے باہر کے منظر کو چھوڑ کر اگر اندر آؤ تو وہ اپنی کمرے سے نکل کر باہر کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ صوفیہ ابراہیم۔ ندیم دارا کل انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ رات میں بھی گھر نہیں تھا اس بات کا پتا انہیں رات کے کھانے میں چلا۔ شاید اب وہ آ گیا تھا۔ وہ ساری رات بے چین رہی تھیں۔ ملک کی خاطر۔ ندیم نے اس کے ساتھ کیا کیا وہ نہیں جانتی تھیں۔

"تم۔!" دروازے پر ملک تھا۔ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اسے بہت عرصے بعد دیکھ رہی تھیں۔ ایک سال بعد نہیں دو سال بعد یا شاید تین سال بعد۔

"آپ کا بیٹا آپ کو لینے آیا ہے چلیں گی نہیں۔؟" وہ مدھم مسکراہٹ سے بولا۔ ہاں صوفیہ ابراہیم اس کی سگی ماں سے بڑھ کر تھیں۔

"مم۔ ماہیر میں آتی ہوں۔" وہ دوبارہ اندر غائب ہو گئیں۔ واپسی پر ان کے شانوں پر ایک چادر تھی۔ جھریوں زدہ چہرہ پر سکون تھا۔ ایسا سکوت بہت دنوں بعد ان کے چہرے پر آیا تھا۔

وہ دونوں اس گھر سے دور ہوتے گئے۔ بھورے رنگ والا گھر اداس کھڑا رہ گیا۔

'صوفیہ ابراہیم نے بولا تھا ان کا بیٹا ان کو لینے ضرور آئے گا۔ اور وہ آیا تھا۔'

ندیم دار اجو انہیں جہانداد ملک کی قید سے نکال کر لایا تھا۔ ان کا بیٹا بن کر۔

ماہیر سکندر جو انہیں اس گھر سے لے کر جا رہا تھا۔ ہاں وہ دونوں بھی ان کے بیٹے جیسے تھے۔

اور ان کا سگا بیٹا۔ مومن ابراہیم۔؟

وہ خوش تھیں۔ وہ شکر گزار تھیں۔ دل پر سکون تھا اور چہرے پر طمانیت اور اطمینان چھلک رہا تھا۔

شاک کی کیفیت سے نکل کر اگلا مرحلہ دکھ کا تھا۔ جان لیوا دکھ۔ انسان کے دکھ کو زائل ہونے کا پروسیس ایک طویل عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ وہ آج آفس نہیں گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر شے اس کے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہو۔ اس کی سوچیں اس کا دماغ مفلوج کر رہی تھیں۔ کیا واقعی وہ تصاویر سچ تھیں۔؟ دل نے صدا لگائی۔ ہاں اگرچہ اس شخص کا چہرہ واضح نہ تھا لیکن وہ تصاویر جیا ہی کی تھیں۔ دماغ نے تصحیح بھی کر دی۔

کمرہ بے شک کشادہ تھا لیکن گھٹن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ صوفے پر سر پیچھے پھینکے بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا جب ملازمہ نے آکر معید سکندر اور ثانیہ بیگم کی واپسی کی اطلاع دی۔ وہ دونوں واپس آ چکے تھے بالاج سگریٹ جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا۔ مائو تھ فریشنز سپرے کر کے وہ نیچے کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم" بالاج نے ان کے قریب کھڑے ہوتے سلام کیا۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تھے۔

"واعلیکم السلام۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"سفر کیسا رہا آپ دونوں کا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"ہمارا سفر تو ٹھیک تھا بر خود دار تم بتاؤ۔ یہ آنکھوں میں سرخی اور ان کے نیچے حلقے کیوں آ گئے ہیں؟"معید سکندر اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"میں ٹھیک ہوں" وہ سرد مہری سے بولا۔

"جیا کہاں ہے بالاج اسے بلاؤ۔ نائلہ نے اس کے لیے تحائف بھیجوائے ہیں۔" اب کی بار ثانیہ بیگم بولی تھیں۔ بالاج کا دل بے قابو ہوا اگر جو ان دونوں کو معلوم ہوا کہ جیا گھر پر نہیں ہے تو وہ کیا توجیہہ پیش کرے گا؟

"کچھ پوچھ رہی ہے تمہاری ماں جواب دو اسے۔ "معید سکندر اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ ان کا بیٹا ان سے قد میں تین انچ لمبا تھا ۔ان سے بالاج کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی ایسی ہی حالت اس کی پانچ سال پہلے بھی ہوئی تھی۔ مگر تب حالات اور معاملات مختلف تھے۔

"گھر پر نہیں ہے وہ۔" وہ سر جھکا گیا تھا۔ ہمت نہیں تھی ان کو دیکھنے کی۔ ہمت لاتا بھی کہاں سے جیا کے بارے میں سوچنا بھی محال ہو رہا تھا۔ وہ اتنے سال اس کے پاس رہی تھی۔ بالاج نے اسے ہر سرد گرم سے بچایا تھا تو وہ کب اور کیسے بہک گئی؟

"کہاں ہے وہ۔؟ بالاج سکندر میں نے پوچھا تمہاری بیوی کہاں ہے؟"معید سکندر جیسے ضبط کیے کھڑے تھے۔

"وہ اپنے گھر جا چکی ہے وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اب وجہ بھی اسی سے جا کر۔"

"چٹاخ۔ "معید سکندر کا ہاتھ اٹھا اور بالاج کے سرخ و سپید چہرے پر اپنی چھاپ چھوڑتا چلا گیا۔ ثانیہ بیگم دہل کر اٹھی تھیں۔ آخر کو بالاج ان کا لختِ جگر تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ہمیں معلوم نہیں وہ اس گھر سے خود گئی ہے یا نکالا گیا ہے اسے۔ اب تم اپنے ماں باپ سے جھوٹ بولو گے۔"معید سکندر نے اپنے نحیف ہاتھوں سے اسے گریبان سے پکڑا۔

"جواب دو ہمیں بالاج ایسی کون سی قیامت آ گئی تھی جو تم نے میری بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔" ثانیہ بیگم با قاعدہ رونے لگے تھی۔ وہ اس سب سے لاعلم نہیں تھے پتہ تو انہی تب ہی چل گیا تھا جب جیا سکندر نے اپنا قدم گھر سے باہر نکالا تھا۔ دروازے پر معمور گارڈ نے انہیں فوری اطلاع دی تھی لیکن اندر کی وجہ سے وہ لاعلم تھے۔

"تم اپنے سٹینڈرڈ سے کتنا گر گئے ہو بالاج سکندر۔ تم سے بڑا بے غیرت انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں پوچھتا ہوں آخر کیا وجہ تھی جو تم نے اتنا گھٹیا کارنامہ سر انجام دیا۔ اپنی ہی عزت کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟"لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔

"بالاج تم جیا کو واپس لاؤ گے ورنہ مجھے اپنی ماں مت کہنا۔" ثانیہ بیگم اسے وارن کر رہی تھیں۔

"وہ خود اس گھر سے گئی ہے واپس بھی خود ہی آئے گی" اس کی آواز نم تھی۔ وہ دونوں تڑپ اٹھے لیکن یہ وقت سختی دکھانے کا تھا۔ بالاج سکندر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں اس کی پشت تکتے رہ گئے۔ آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ ان کا بیٹا اس قدر ٹوٹ رہا تھا۔

میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ تو بالاج کیونکر انہیں بتاتا کہ جیا سکندر اس گھر سے کیوں گئی تھی۔ وہ خود کو تنہا تصور کر رہا تھا۔ بیوی سے بڑھ کر کوئی دوست وفادار نہیں ہو سکتا لیکن اسے تو اس نے بھی دھوکہ دے دیا تھا۔ وہ یہ کیوں بھول رہا تھا کہ وہ عاشق تھا۔ بے وفائی کا دکھ تو ہر عاشق جھیلتا ہے۔ ہر محبت کرنے والا گلے شکوے کرتا ہے مگر وہ ایک شوہر بھی تھا۔ وہ ایک روایتی مرد تھا ایسا مرد جو ہر معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ ایسے مرد کی بیوی ہونا عورت کے لیے اعزاز ہے کیونکہ وہ مرد اگر محبت کرنے پر آئے تو اس سے بڑھ کر عورت کا مضبوط سائبان کوئی نہیں ہوتا۔ بالاج سکندر نے بے شک جیا سکندر کو چاہا تھا لیکن وہ وعدہ خلافی کر گیا تھا۔ کوئی شک نہیں تھا کہ پچھتاوا اس کا مقدر بن جاتا۔

"پچھتاوا مائی فٹ۔ میں بالاج سکندر ہوں ایک دھوکے باز لڑکی کی خاطر خود کو تباہ نہیں کروں گا۔" وہ سنک پر جھکا چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔

وہ ایک ملازم کے ہمراہ اس عالیشان بنگلے میں داخل ہوا تھا۔ بنگلہ اس کے مالک کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہر جانب چمکتے دھمکتے فرنیچر کی جگہ پُر تھی۔ وہاں ایک سوئی تک کی قیمت بھی ڈالرز میں ہونا تھی۔ اس نے گمان کیا۔

"آپ یہاں تشریف رکھیں۔ سر کچھ ہی دیر میں آتے ہوں گے۔" ملازم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر یہ جا وہ جا ہوا۔ وہ اس وقت سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ سیاہ شرٹ کے اوپر سیاہ ہی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ کچھ دیر ارد گرد نگاہ دوڑاتا رہا۔ جب اسے یقین ہو چلا کہ اب کوئی ملازم اس طرف نہیں آئے گا تو وہ باہر نکلا۔ سامنے ہی بڑا سا دالان تھا۔ آہ یہ حرام کا پیسہ۔ وہ دبے قدموں اوپر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر اوپر تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ بلآخر وہ سیڑھیاں چڑھتا دائیں جانب موجود راہداری میں سے ایک کمرے میں گم ہو گیا۔

اس کا شکار اس کے سامنے تھا اور وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹنے کو تیار۔ اس نے مڑ کر دروازہ دھیرے سے لاک کیا۔

"میرا کوٹ لاؤ ادھر۔" کرخت آواز میں سامنے موجود ہستی نے حکم جاری کیا۔ اس نے آئی برو اچکا کر اسے دیکھا۔ یقیناً وہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی ملازم ان کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ وہ ٹائی کی گرہ کستا آئینے میں نمودار ہوتا اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ کوئی کوٹ لے کر ان کے قریب آیا۔ انہوں نے اپنے دونوں بازو پیچھے کی جانب بڑھائے جب کسی نے انہیں اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔

"آہ۔ کون ہو۔۔" ان کی چیخ مقابل نے اپنی ہتھیلی کی مدد سے منہ میں ہی دبائی تھی۔

"موت کا پروانہ۔" فقط تین حروف اور شارق کبیر کا سانس جیسے سینے میں اٹکنے لگا۔

"اووں۔ اووں۔" وہ ہاتھ چھڑوانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ مقابل نے جھٹکا دے کر ان کا رخ موڑا۔ وہ ایک بار پھر سے کراہے۔

"بد بختو کہاں مر گئے ہو سب۔؟" وہ دوبارہ چیخنے لگے تھے اونچی آواز نے ان کے سامنے کھڑے لڑکے نے تکان سے انہیں دیکھا۔ وہ اپنے ملازمین کو بلا رہے تھے جنہیں انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا لیکن اس وقت ان کے پاس کوئی نہ تھا۔

"چیختے بہت ہو تم۔ منہ بند کرو اپنا ورنہ سارا حرام کا پیسہ ٹھونس کر بند کروا دوں گا۔" وہ بے زاری سے گویا ہوا۔ شارق کبیر خاموش ہو گئے۔ وہ اس وقت اپنی ایک پائی بھی گنوانے کے حق میں نہیں تھے۔

"کون ہو تم اور تمہیں یہاں گھسنے کس نے دیا۔؟" وہ آہستہ آواز میں بولے تھے۔

"میرا نام مومن ابراہیم ہے۔ یہ نام میرے باپ نے رکھا تھا۔ مومن۔ وہ جو ظالموں پر بھاری ہے۔ اور مجھے یہاں یہ لے کر آیا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک کارڈ ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا۔ وہ دراصل وزیٹنگ کارڈ تھا جس کا استعمال اپائنٹمنٹ کے طور پر کیا جاتا تھا۔

"اور تمہیں کس نے خبر دی کہ میں آج صبح گھر پر ہوں۔؟" وہ نیوز کاسٹنگ کر رہے تھے جیسے۔ مومن ابراہیم کا پارا ہائی ہوتا جا رہا تھا۔ بیٹی کم تھی جو اب باپ بھی۔ ہنہ۔

"رات تم کلب میں نہیں پائے گئے۔ چچ چچ تمہاری بیٹی تمہیں کنگال کر گئی مسٹر کبیر۔ عیاشیوں کے لیے پیسے کی قال پڑ گئی ہو گی ناں اس لیے فضول میں بہانے کی بجائے ٹک کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہو۔" مومن نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کمرے میں موجود بڑے سے صوفے پر بٹھایا۔

"اب بتاؤ یہاں کیوں آئے ہو۔؟" ان کے انداز میں شان تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہی اکڑ گئے تھے۔ مومن اور شارق کبیر کے درمیان فقط ایک میز تھی شیشے کی چمکتی ہوئی میز۔

"بتاتا ہوں۔ نمبر ایک کہ تم نے ملک کے ساتھ غداری کی۔ اور غداری کی سزا موت ہے۔" مومن نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک گن نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ شارق کبیر کی سٹی گم ہوئی۔

"دوسرا۔ تم نے بسمہ پر حملہ کروا کر اس کی جان لینے کی کوشش کی نتیجتاً ایک عزیز زخمی ہوا۔" اس نے ایک چاقو نکال کر سامنے پڑی میز پر دھرا۔ شارق کبیر کے اب صحیح معنوں میں ہوش اڑے تھے۔

"تیسرا اور سب سے بڑا کارنامہ تم نے ملک پر حملہ کروا کر کیا ہے۔ نتیجتاً ہمارے دوست کو گولی لگی۔" مومن نے ایک چابک نکال کر ان دونوں چیزوں کے ساتھ رکھا۔ شارق صاحب کا گلا خشک ہو گیا۔

"پپ۔پانی۔پانی۔"اُنہوں نے سائیڈ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔مومن نے ایک آنکھ سے پانی کو دیکھا اور دوسری انہیں پر گاڑھے رکھی۔

"اوہ۔تو تمہیں لگتا ہے میں اتنا بیوقوف ہوں۔ادھر میں پانی پکڑوں اور ادھر تم مجھ پر حملہ کر دو چچ۔چچ۔"مومن نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم سب کر سکتے تھے لیکن بسمہ اور ملک کی جان لینے کی کوشش کا حق تمہیں حاصل نہیں تھا۔"مومن نے اب کی بار اپنے ہاتھ کا مکا بنا کر اس پر پھونک ماری۔کھڑکی سے آتی صبح کی روشنی میں کوئی سلور رنگ کی شے چمکی تھی۔فسٹ رنگز۔دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں وہ فسٹ رنگز پہنے ہوئے تھا۔

"اب بتاؤ تمہارا ٹیسٹ کیسا ہے۔؟"وہ اس پر جھکا۔شارق کبیر بے ساختہ صوفے میں دھنس گئے۔انہیں اپنے سے چھوٹے لڑکے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔وہ ان سے سامنے پڑی چیزوں کے متعلق ان کا ٹیسٹ پوچھ رہا تھا۔

"تم (گالی) بچو گے نہیں میرے ہاتھوں سے۔آہ!"مومن نے ایک زوردار پنچ ان کے چہرے پر دیا۔ناک سے نکسیر پھوٹی اور وہ ایک جانب لڑھک گئے۔مومن نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔اسے مارنے کا حکم تو تھا لیکن جان سے مارنے کا نہیں۔

"ہئے۔اٹھو۔"اس نے پانی کا بھرا جگہ ان پر انڈیلا۔وہ بوکھلا کر ادھر ادھر تکنے لگے۔

"دد۔دیکھ لوں گا میں تمہیں اور تمہارے اس ملک کو بھی۔"مومن نے استہزایہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پہلے آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ لو۔ہاہا"

"تم۔۔"وہ کچھ بولنے لگا جب مومن نے شش کہتے اسے خاموش کروایا۔

"آئندہ اگر تم نے ایسی واہیات حرکت کی تو تم میرا شیطانی روپ دیکھو گے۔آج کے بعد بسمہ یا ملک اور ہمارے کسی بھی فرد کے قریب بھی بھٹکے تو مومن ابراہیم تمہاری روح تک چھلنی کر دے گا۔"اس نے شارق کبیر کے جبڑے اپنی مٹھی میں لیے۔اوپر ناک سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔

"بسمہ بسمہ بسمہ۔آخر رشتہ کیا ہے تمہارا اس کے ساتھ۔میری بیٹی کا نام لیتے ہوئے تمہارے اندر کا مومن نہیں جاگ رہا۔"مومن ابراہیم کی آنکھیں ابل باہر آئیں۔وہ ان دونوں کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔لاحولاولاقوۃ۔

"اے۔مسٹر کبیر ہر دوسرے بندے کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے کیا۔؟"

"سمجھا نہیں ہے لیکن ہر مرد ایک جیسا ہوتا ہے۔ہو سکتا ہے کہ تم بھی میری بیٹی میں۔۔۔"مومن نے ان کے منہ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔

"بسمہ شارق مجھے عزیز ہے اس لیے نہیں کہ میں اس میں انٹرسٹڈ ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک لڑکی ہے۔اور کسی کی بہن بیٹی ماں کی عزت مومن ابراہیم کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔اس میں عزتِ نفس باقی ہے۔بسمہ شارق عظیم ہے اس لیے کہ وہ تم جیسے شخص سے نفرت کرتی ہے۔وہ تمہاری شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"مومن کہہ کر خاموش ہوا۔شارق کبیر کا چہرہ اہانت کے مارے سرخ پڑ گیا لیکن وہ ڈھیٹ تھے۔ایک ڈھیٹ بیٹی کے باپ تھے۔

"چلو ایک ڈیل کر لیتے ہیں۔؟"

"کیا۔؟"مومن نے پوچھا۔اب وہ کیا نیا شوشہ چھوڑنے والے تھے۔

"تم بسمہ شارق رکھ لو اور مجھے میری دولت لٹا دو۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ مومن ابراہیم کہ میری بیٹی مجھے کنگال کر کے میری دولت ہتھیا کر لے گئی تھی۔تم وہ پراپرٹی مجھے واپس لا دو تو میں بسمہ کی جان چھوڑ دوں گا۔ورنہ ہو سکتا ہے کسی دن وہ تمہیں اس زمین پر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔"ان کا انداز کاروباری تھا۔جیسے کوئی سودا گر بولی لگاتا ہے۔

"یو باسٹرڈ۔"مومن نے ایک مزید مکا ان کے بائیں گال پر جڑا۔اب کی بار منہ سے خون نکلا تھا۔

"تم جیسا گھٹیا باپ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا جو دولت کی خاطر اپنی سگی اولاد کا سودا کرنے لگے۔اس دولت اس زمین کے دو ٹکڑوں کے پیچھے ہو تم۔لالچی کمینے۔تمہیں جتنی دولت چاہیے ناں وہ تمہارے منہ پر مار دوں میں کیونکہ دولت جان نہیں خرید سکتی۔"وہ پھنکارتا ہوا باہر نکلنے لگا جب پیچھے سے شارق کبیر کی آواز ابھری۔

"وہ میری بیٹی ہے۔شارق کبیر کی بیٹی۔ایک گناہگار زانی کی بیٹی۔کرپٹ انسان کا خون ہے وہ۔اسے مجھ سے لاکھ نفرت سہی۔وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی خواہش ہی کیوں ناں رکھتی ہو۔لیکن وہ ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹی کیا کر سکتی تم سوچ بھی نہیں سکتے مومن ابراہیم۔"وہ تن بدن میں آگ لیے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔پھر وہ رکا نہیں دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتا وہ دالان عبور کرتا باہر نکل گیا۔پیچھے شارق کبیر اسے بکتے جھکتے اپنی دردوں پر مرہم رکھ رہے تھے۔

ماضی:

بیٹے کی لاوبالی طبیعت میں سدھار آتے دیکھ کر گل زرین سکندر نے صدف اور اس کے رشتے کو دل سے قبول کر لیا تھا۔وہ باپ تھے اپنی اولاد سے کب تک ناراض رہتے۔؟

ان دونوں بھائیوں کی شادی اکٹھی ہوئی تھی۔ معید سکندر اور ثانیہ کی رخصتی کے ساتھ ساتھ واجد اور صدف واجد سکندر کا ولیمہ۔ وہ خوش تھے بلآخر انہیں اپنے صبر کا پھل مل چکا تھا۔ محبت وقت مانگتی ہے اور گزرتے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ ان کی زندگی ایک خوبصورت ڈگر پر چل نکلی تھی۔ جہاں ہر طرف بہار اور ہر سو خوشیوں کا بسیرا تھا۔

جہانداد ملک کی واپسی دو سالوں بعد ہو چکی تھی۔ ماں کی دہائیوں اور باپ کی دھمکیوں کے آگے وہ سر جھکا گیا اور یوں اس کی شادی اپنی دور پرے کی رشتہ دار ساحرہ سے ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر ستائیس برس تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ وہ ابھی تک لندن میں ہی رہائش پذیر تھا۔ بدلہ لینے کا جنون آج بھی اس کے دل و دماغ میں زندہ تھا۔ اس کے دشمن اس سے دور تھے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ کسی بھی کام کو کرنے میں طاقت درکار ہوتی ہے اور۔ پیسہ وقت کی ضرورت ہوتا ہے۔ اس سے بڑی طاقت اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اس کی اولین ترجیح اپنی طاقت کو بڑھانا تھا جس کے لیے اس کا شمار بڑی سے بڑی غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ہونے لگا۔ وہ اس دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ ساحرہ ملک سے اس کو کبھی دلی محبت نہیں ہو سکی تھی۔ والدین کی زندگی میں وہ اپنا بدلہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک بات طہ تھی اس کو برباد کرنے والوں نے کتے کی موت مرنا تھا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے داد اس معصوم کو اتنی بڑی سزا مت دو۔" ساحرہ ملک چیخ رہی تھیں۔

"تمہیں میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو ایک بار ٹھان لوں وہ کر کے دکھاتا ہوں۔" اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔

"داداوہ کسی کی بیوی ہے، کسی کے بچے کی ماں ہے اس کو برباد مت کرو خدا کا قہر نازل ہو گا تم پر۔" آنسو ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے لیکن وہ اس وقت اس جلاد صفت انسان سے کسی کی بخشش مانگ رہی تھی۔

"چٹاخ۔" متوقع تھپڑ سے وہ لڑکھڑائی تھیں جہانداد ملک نے انہیں بالوں سے جھپٹا۔

"گھٹیا عورت خود کیا ہو تم۔ میرے معاملات میں بولنے کی اوقات نہیں ہے تمہاری۔۔" وہ دھاڑے اور تن فن کرتے کمرے سے نکل گئے۔

"مم۔ بب۔۔" دروازے کے پیچھے چھپی دو اڑھائی سالہ انمول نے آواز لگائی۔ غزالی آنکھوں میں خوف کے ڈورے ہلکورے لے رہے تھے۔

"انمول میری جان۔" ساحرہ ملک نے اسے اپنے سامنے کیا وہ ڈر کے مارے کانپ رہی تھی کیونکہ وہ آج کی انمول سے مختلف تھی۔

"مم۔ با۔ بابلے اے۔ بابا۔" (ماما بابا برے ہیں بابا) وہ اپنی توتلی زبان میں اپنی سمجھ کے مطابق بول رہی تھی۔

جو شخص اس کی ماں کو اذیت پہنچانے کا سبب بن رہا تھا وہ انمول ملک کی نظر میں برا تھا۔ ساحرہ ملک انمول کی پیٹھ تھپکتی کچھ دیر پہلے جہانداد ملک کی باتوں کو سوچ رہی تھیں۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے ان کی باتوں میں صوفیہ ابراہیم کا نام واضح تھا۔ وہ اس بات سے انجان نہیں رہ پائی تھیں کہ صوفیہ ابراہیم کے لیے طلوع ہونے والا سورج بری نوید لے کر آنے والا تھا۔

واجد سکندر کی پہلی اولاد ماہیر سکندر کی صورت اس دنیا میں آئی تھی۔ وہ ہیزل گرین آنکھوں والا شہزادہ سب کا لاڈلا تھا۔ وہ نفرت سے دور پیار کیے جانے کے قابل تھا۔ اس کی پیدائش کے ایک سال بعد معید سکندر کے ہاں اللہ کی نعمت آئی تھی۔ بالاج سکندر سنہری آنکھوں والا مغرور شہزادہ۔ سکندر حویلی کے مکینوں کو تمام خوشیاں نصیب تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماہیر اور بالاج کی دوستی مثالی بنتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بنا لقمہ تک نہیں نگلتے تھے۔ وہ دوست نہیں تھے بلکہ ایک جان ایک روح تھے۔

ایک شام جب سورج مغرب کی جانب روانہ ہوا تو اس پوش ایریا میں کھڑی سکندر حویلی کے قریب واقع پارک میں کسی کی چیخ بلند ہوئی۔

"آآآ۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ تبھی ایک جانب کھڑے اس آٹھ سال کے بچے نے اپنا بلا زمین پر پھینکا۔ وہ ہوا میں بلند ہو کر دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔ وہ تیر کی تیزی سے روتے بلکتے بچے کے قریب آیا تھا۔ جس کے گرد چودہ پندرہ سالہ لڑکے جمگھٹا بنائے کھڑے تھے۔

"اے ے۔ میرے بھائی سے دور ہو جاؤ۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ پیش کی۔

"نہیں تو کیا کر لے گا تو چھوٹو۔" وہ لڑکے قہقہہ لگا کر ہنسے۔ لڑکے نے جھک کر مٹھی میں مٹی بھری۔ اس مٹی میں کنکر بھرے ہوئے تھے۔ اور پھر اس نے وہ مٹی ان سب کی آنکھوں میں پھینکی۔ اب کی بار اس پارک میں مختلف چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ سبز آنکھوں والا بہادر بچہ دوسرے بچے کو لے کر بھاگا۔ اور پھر اس نے پارک کے گیٹ پر آ کر دم لیا۔ سنہری آنکھوں میں آنسو لیے بالاج سکندر ماہیر سکندر سے لپٹ گیا۔

"اگر تم نہ آتے تو وہ گندے بچے مجھے مار دیتے۔"

"میرے ہوتے ہوئے کوئی میرے بھائی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" اس نے بالاج کی پیٹھ تھپک کر خود سے دور کیا۔ وہ اب بھی سرخ ہوتی آنکھوں میں آنسو جمع کیے کھڑا تھا۔

"ارے روؤمت۔ تم مرد ہو اور مرد کبھی روتے نہیں ہیں۔ تم ہر مشکل وقت میں مجھے آواز دوگے۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔" ماہیر سکندر اور وہ دونوں اب اپنے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ پارک ان کا پسندیدہ تھا۔ جب بھی کوئی ایک دوسرے سے ناراض ہوتا تو وہ یہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا دوسرا وہاں ضرور آئے گا۔

حال:

جولائی کی گرمی اور اوپر سے چولہے کے باعث کچن میں بن جانے والی حبس-اس نے کبھی اپنی حویلی میں رہ کر کاموں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب یہاں چولہے پر چائے کی کیتلی چڑھائے بیٹھی تھی۔ ملک کی اطلاع اسے صبح مومن کے ہاتھ ملی تھی کہ وہ ٹھیک ہے۔ انمول کا دل ابھی تک ڈر سے لرز رہا تھا لیکن وہ بے حس بنی چائے میں الائچی ڈال رہی تھی۔

اس کے عقب میں بنے لیونگ روم میں جھانکو تو وہاں تمہیں دو نفوس بیٹھے نظر آئیں گے۔ نارنجی اور سفید رنگ کے امتزاج میں ملبوس بسمہ شارق اور ایک سفید پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس صوفیہ ابراہیم۔ بسمہ شارق کا حلیہ عام دنوں سے مختلف تھا۔ آج اس نے انمول کی طرح پیروں کو چھوتی شرٹ پر ٹراؤزر زیب تن کیا تھا۔ وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے ہوئے تھی جبکہ ٹریننگ سینٹر میں رہتے ہوئے اسے سرگرمیوں کے لحاظ سے آرام دہ کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ بہر حال وہ شکر مند تھی کہ اس کی ٹریننگ درمیان میں روک دی گئی۔ لیکن آخر کب تک۔

اس کے برعکس صوفیہ ابراہیم اس کے دائیں طرف بیٹھی میٹھی میٹھی نظروں سے اس سرمئی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں انہیں تو جیسے بسمہ شارق کی شکل میں بیٹی مل گئی تھی۔

"تمہاری امی کہاں ہوتی ہیں؟" وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔ وہ تینوں کافی دیر سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جب انمول چائے بنانے کا کہتی وہاں سے اٹھ گئی۔ اب وہ دونوں وہاں موجود تھیں۔

"وہ اس دنیا میں نہیں ہیں آپ نے کیوں پوچھا۔؟"

"تمہاری ماں بہت عظیم عورت ہو گی جس نے تمہاری ایسی تربیت کی۔" بسمہ کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہ۔۔" صوفیہ معافی مانگنے لگی تھیں۔

"اپنی تربیت میں نے خود کی ہے آنٹی۔ میری ماں مجھے پیدا کرتے ہی اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔" وہ ہاتھوں کی انگلیاں مسل رہی تھی۔ اس کی آواز کچن میں کھڑی انمول تک بھی پہنچی تھی۔ کپوں میں چائے ڈالتے اس کے ہاتھ کانپ اٹھے۔

"انمول یہ دیکھو تمہاری ماما کو کیا ہو گیا۔" اس کے ذہن میں جہانداد ملک کا کہا جملہ گونجا۔

"میری ماں کے خون کا بدلہ آپ کو چکانا ہو گا بابا" وہ دل میں پھنکاری۔ آنکھوں میں نفرت واضح تھی۔ہاں وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کا قاتل اس کا اپنا ہی سگا باپ ہے۔وہ خاموش تھی کیونکہ وہ انمول ملک تھی۔اپنے رب اور باپ کے سوا کسی تیسرے سے نہ ڈرنے والی۔ خشیت الہی اس کے دل میں تھا۔اور باپ کا ڈر فطری نہیں تھا۔وہ اپنے باپ سے ڈرتی تھی۔وہ قتل کیے جانے سے ڈرتی تھی۔وہ ڈرتی تھی کہ جہانداد ملک کسی دن اسے بھی اس کی ماں کی طرح زینوں سے دھکا دے کر مار دیں گے اور یقیناً یہ ان کے لیے مشکل نہ ہو گا۔

"ایسا نہیں کہتے اس سب میں میرے رب کی مرضی تھی۔تمہاری ماں اس دنیا میں نہیں تو کیا ہوا آج سے تم میری بیٹی ہو۔"

"اور وہ۔ آپ کا ہلا کو خان۔کیا وہ بانٹ لے گا آپ کے پیار کو مجھ سے۔" وہ ہنسی۔اس کی مسکراہٹ پیاری تھی۔

"میرا ہلاکو خان۔" وہ ماں تھیں۔آنکھیں گرم سیال سے نم ہوئیں ان آنکھوں کی ٹھنڈک اب مومن ابراہیم کا دیدار تھا۔

دروازے پر بیل بجی بسمہ شارق اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی۔انمول چائے ٹرے میں رکھے لا رہی تھی۔اس نے دروازہ کھولا سامنے ہی بلیک سوٹ میں ملبوس مومن ابراہیم کھڑا تھا۔اس نے بسمہ کو دیکھا۔وہ نارنجی سوٹ میں سورج کی پھوٹتی کرن لگ رہی تھی۔اس پر مشرقی لباس جچ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" مومن غش کھاتے کھاتے گرا۔سلام کی امید اسے اس لڑکی سے نہ تھی۔

"واعلیکم السلام۔" وہ آہستہ آواز میں بولا۔ذہن میں ابھی تک شارق کبیر کی باتیں گونج رہی تھیں۔بسمہ نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے رکھیں۔وہ منہ میں کچھ گنگناتے ہوئے راہ داری میں آگے بڑھا۔وہاں سے لیونگ روم میں بیٹھے افراد نظر نہیں آتے تھے۔راہداری عبور کی اور وہ ایک دم ٹھہر گیا۔ساری دنیا ساکت ہوئی تھی۔ہر نفس نے دم سادھ لیا۔

یہ ملن تھا۔مومن ابراھیم اور اس کی بدقسمت ماں کی پہلی ملاقات۔وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل پایا۔صوفیہ ابراہیم۔اس کے باپ ابراہیم داؤد کی بیوہ۔مومن نے انہیں تصویروں میں دیکھا تھا۔لیکن وہ شبابی سے اسلافی تک کا سفر تہہ کر چکی تھیں۔چہرہ آج بھی ویسا تھا بس جھریاں اپنا جال بچھائے بیٹھی تھیں۔بال دوپٹے کے ہالے سے جڑوں کی سفیدی دکھلا رہے تھے۔وہ انہیں کبھی پہچان نہیں پاتا لیکن ان کی گہری بھوری آنکھیں۔آہ۔اس کا دل سیپارہ ہوا۔ٹکڑوں میں بٹا ہوا دل۔اور ریزہ ریزہ ہوتا وہ شخص مومن تھا۔

"مومن میرے بیٹے۔" صوفیہ کی آواز حلق میں اترتے آنسوؤں نے بند کی۔مومن کا دل ان کی آواز سننے کو تڑپنے لگا۔

"ما۔ما۔ں" اس کے لب وا ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر ہلکی ہلکی بیئرڈ میں جذب ہوا تھا۔ صوفیہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھیں۔ بسمہ اور انمول کی نظریں ان ماں بیٹا پر تھیں۔ مومن ابراہیم کا دل دھڑکنا بھول چکا تھا۔ کتنا بد قسمت تھا وہ جس نے بچپن سے ماں کا لمس محسوس نہیں کیا تھا وہ انہیں دو قدم کی دوری پر دیکھتے ہوئے بھی دیری کر رہا تھا۔ لعنت ہو مومن تم پر!

"ماں!" وہ آگے بڑھا اور ماں کی پیشانی چوم لی۔ جس لمس کو وہ آج تک اپنی پیشانی پر محسوس نہیں کر پایا تھا وہ لمس جو ماں اپنے بچے کو بخشتی ہے وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اپنی ماں کی پیشانی چومے انہیں اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

"آپ کہاں تھی ماں؟ آپ اپنے بیٹے کے ساتھ نہیں تھیں۔ آپ کو مجھ سے جدا کرنے کا حق کسی کو نہیں تھا۔ ایک ماں سے اس کی اولاد چھیننے کا حق کسی کو نہیں ہوتا۔ مومن ابراہیم سے بڑا بد قسمت اس دنیا میں کوئی نہیں۔" وہ رو رہا تھا۔ اور بسمہ شارق پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کا رندھا ہوا لہجہ سب کی آنکھیں نم کر گیا۔ اس کے جملے بے ربط تھے۔ صوفیہ ابراہیم کی ہچکی بندھ گئی۔

"میرے بیٹے۔ میری جان میرا مومن۔ ماں صدقے۔" صوفیہ ابراہیم نے اسے اپنے سامنے کھڑا کرتے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھاما۔

"میں نے آپ کو بہت مس کیا ہے ماما۔ میں نے آج تک آپ کے لمس کو محسوس نہیں کیا۔" وہ کسی بچے کی طرح شکوے کر رہا تھا۔ صوفیہ ابراہیم نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور مومن ابراہیم کو لگا جیسے پوری دنیا کے گلے شکوے مٹ گئے ہوں۔ ہر شے بارش کے بعد کے موسم کی طرح دھل گئی ہو۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ جس ہستی کا انتظار اس نے تئیس سال کیا تھا وہ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

"آئیں اندر چلتے ہیں مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" وہ انہیں اپنے مضبوط بازوؤں کے حلقے میں لیے اپنے سابقہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

بسمہ اور انمول کا بھی سکتہ ٹوٹا تھا۔

"ہر شخص کی کہانی ایک سی کیوں ہوتی ہے۔" بسمہ صوفے پر بیٹھی۔ اگلے ہی پل چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ وہ رونے لگی تھی لیکن کیوں؟ انمول بھی یک دم پریشان ہوئی۔

"بسمہ کیا ہوا ہے تمہیں؟ ایسے روؤ تو مت کچھ بتاؤ تو سہی۔" اس نے بسمہ کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"مومن بہت لکی ہے جسے اس کی ماں آج تئیس سال بعد زندہ سلامت مل گئی ہے انمول لیکن میں اپنی ماں کہاں سے لاؤں۔؟ میری اور اس کی کہانی مختلف نہیں ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی ماں کو اس سے جدا کرنے والا جہاندادملک تھا تو میری ماں کو مجھ

سے میرے رب نے چھین لیا۔" انمول نے ترحم سے اسے دیکھا۔اس بچی نے بھی کبھی اپنی ماں کا لمس نہیں پایا تھا۔انمول ملک خود کو خوش قسمت تصور کرنے لگی تھی کہ وہ تین سال تک اپنی ماں کے سائے تلے رہی تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا تمام کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔میری اور تمہاری کہانی بھی مختلف نہیں ہے بسمہ شارق۔" انمول سرد لہجے میں بولی۔کچھ ایسا تھا جو بسمہ شارق کے بہتے آنسو تھم گئے۔اس نے ناسمجھی سے انمول کو دیکھا۔اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔؟"

"اس دنیا میں روز لاکھوں مرتے اور لاکھوں بچے ہی جنم لیتے ہیں۔ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ماں کو کھو دیتے ہیں۔اور ان میں سے دلیر وہ ہوتے ہیں جو یہ جان جاتے ہیں کہ ایک ماں کو ہم سے دور کرنے والا ستر ماؤں سے بھی زیادہ ہم سے پیار کرتا ہے۔وہ زمانے میں رہنا سیکھ جاتے ہیں۔تم دلیر بچوں کی فہرست میں آتی ہو۔تم نے کبھی اپنے باپ کے ماحول کا اثر خود پر نہیں پڑنے دیا۔تم نے ٹھیک کہا تمہاری تربیت بسمہ شارق نے کی ہے۔لیکن لاعلمی سب سے بڑا عذاب ہے بسمہ۔تمہاری ماں کبھی مری نہیں تھی نہ ہی وہ تمہیں پیدا کر کے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔اس پہیلی کا جواب تمہیں تمہارا اپنا آپ دے گا۔" اس اپارٹمنٹ کی پوری چھت بسمہ شارق پر گری تھی۔اس نے بے یقینی سے سر اٹھایا۔آنسو بہت دیر کے خشک ہو چکے تھے۔انمول افسردگی سے میز پر دھرا چائے کا کپ اٹھا رہی تھی۔چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور انمول ملک کو ٹھنڈی چائے ہی پسند تھی۔پسند کہو یا عشق۔

دورات قبل:

وہ دونوں ہاسپٹل کے ٹھنڈے کاریڈور میں بیٹھے تھے۔اندر ندیم دراز زیر علاج تھا۔اس کا بچنا ناممکنات میں سے تھا۔لیکن امید اور کوشش پر ہی یہ دنیا قائم ہے۔

"وہ وہاں کیوں آیا اور اگر آپ کو مارنے آیا تھا تو آپ کی جگہ اس نے گولی کیوں کھائی اس سب کا جواب مجھے آپ سے چاہیے بھائی۔" مومن کا لہجہ بہت کچھ جتاتا ہوا تھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" ملک نے لاعلمی دکھائی۔

کچھ دیر بعد دو ڈاکٹر ان کی جانب آتے دکھائے دیے۔

"پیشنٹ کی کنڈیشن کیسی ہے ڈاکٹر۔؟" ملک نے پوچھا۔مومن انگلیوں پر سیکنڈ گننے لگا۔ایک دو۔اور ابھی اِنَّ لِلّٰہِ وَ۔۔۔

"ہی از فائن ناؤ۔گولی نکال دی تھی جس کی وجہ سے وہ خطرے میں تھے لیکن اب آپکی دعائیں رنگ لائی ہیں جو وہ خطرے سے باہر ہیں۔آپ دونوں میں سے ملک کون ہے۔؟"

"میں ہوں ملک" ملک آگے بڑھا۔

"آپ کو پیشنٹ بلا رہے ہیں لیکن کوشش کی جائے کہ آپ کی کسی بات سے انہیں دکھ یا صدمہ نہ پہنچے۔" مومن شدید بدمزہ ہوا۔ جتنا ندیم دارا کر چکا تھا اس کا بس چلتا تو وہ اسے دکھ اور صدمے کی بجائے اوپر پہنچا دیتا۔

اگلے منظر میں ملک ندیم دارا کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

"مم۔ مجھے معاف کر دیں بھائی میں نے بہت سے غلط کام کیے ہیں لیکن کبھی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کا ایک احسان ہی میرے کندھے جھکا دیتا ہے بھائی۔" وہ بمشکل اپنے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملک نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ آگے بولنے لگا۔

"بہت سی ایسی باتیں ہیں جن پر سے راز کا پردہ اٹھنا بہت ضروری ہے بھائی۔" آئی سی یو مانیٹر پر اس کی دل کی دھڑکن چل رہی تھی۔ نہ نارمل نہ شدید۔

"بولو۔ میں سن رہا ہوں " اس نے ندیم کی ہمت بندھائی۔

"صوفیہ ابراہیم میرے گھر پر موجود ہیں۔ میں نے کبھی خود سے وعدہ کیا تھا کہ صوفیہ ابراہیم کی قید کی زنجیر میں کاٹوں گا اور خود سے کیے ہوئے وعدوں کا پورا ہونا دل سے منوں بوجھ اٹھ جانے کے برابر ہے۔" ملک اپنے آس پاس کا ہوش بھول بیٹھا۔ وہ صرف اسے سن رہا تھا۔ کیا واقعی صوفیہ ابراہیم کی قید ختم ہو گئی تھی؟ کیا مومن کی بدقسمت ماں آزاد تھیں۔؟ یہ بات جلد از جلد مومن کو بتانی چاہیے۔ اسے اپنی ماں عزیز تھی ماں کسے عزیز نہیں ہوتی؟

"میں جانتا ہوں کہ یہ بات پتہ لگوانا آپ کے لیے قطعاً مشکل کام نہیں ہے لیکن میں ایک اور آسانی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ پر حملہ جہانداد ملک نے نہیں شارق کبیر نے کروایا تھا۔ آپ کے نام کی سپاری تو مجھے ملی تھی۔ لیکن میں اپنے وفادار لوگوں سے غداری نہیں کرتا۔" اس کا اشارہ ملک کی جانب تھا۔ وہ دماغ میں ریاضی کے سوالوں کی طرح دو جمع دو کر رہا تھا۔

"تم بھی میری طرح کے ایک بھیڑیے ہو ندیم۔ مجھے وفادار بھیڑیے پسند ہیں لیکن اپنے ماں باپ کے وفادار۔" ہیزل گرین آنکھوں میں سرخی اتری۔

"جانتا ہوں اور بہت سی جگہوں پر آپ کا گناہ گار بھی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اب مجھے اپنے ایک سوال کا جواب آپ سے چاہیے۔" ندیم دارا نے اسے دیکھا۔

"پوچھو میں تمہیں جواب دوں گا۔"

"میرا باپ سلیم اور جہانداد ملک اچھے دوست تھے۔ وہ دونوں لندن میں اکھٹے پڑھا کرتے تھے۔ ہر گناہ میں برابر کے شریک۔ وہ دونوں بے مثال تھے۔ لیکن پھر جہانداد ملک کی غداری اور برین واشنگ کی بنا پر میرا باپ اس کے ہاں کام کرنے لگا۔ وہ چوبیس گھنٹے جہانداد ملک کے ساتھ ہوتا تھا۔ میری ماں اس کو لاکھ سمجھاتی لیکن وہ ایک عیاش مرد تھا۔ وہ کتوں کی طرح دن رات جہانداد ملک کے تلوے چاٹتا تھا۔ تم بھی اچھے سے جانتے ہو میرے باپ کو، آخر اس رات اس ٹرک میں کوئی اور نہیں بلکہ سلیم تھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کا بڑا گناہ تھا لیکن پھر اس نے اپنے گناہوں کی سزا پائی۔ ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ وہ یہاں پاکستان میں غائب ہوا تھا۔ ان دنوں میں امریکہ ہوا کرتا تھا۔ مجھے لگا کہ جیسا نداد ملک نے اسے بھی مروا دیا۔ لیکن نہیں بھائی۔ جہانداد ملک کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچپن کے دوست کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اس نے سلیم کو غائب ضرور کروایا تھا لیکن اس نے میرے باپ کی جان نہیں لی۔ اب میرا سوال یہ ہے بھائی کہ۔ میرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے میرے باپ کو کہاں کیا ہے۔؟ کون سے بل یا کون سے ملک میں اسے چھپا رکھا ہے آپ نے" وہ جو ریلیکس انداز میں اپنے بوٹ کی نوک سے فرش کھرچ رہا تھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹتی گئیں۔ سوال غیر متوقع تھا اور مرحلہ حیرانی کا۔ ندیم دارا اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا تو ملک کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔

ماضی:

یہ منظر لندن کے ایک ہسپتال کا تھا۔ وہ دونوں پریشان حال کاریڈور میں کھڑے دعا گو تھے۔ اندر آپریشن تھیٹر میں ان کی بیٹی صوفیہ ابراھیم داخل تھیں۔

"ابراہیم سے بات ہوئی آپ کی۔؟" ان کی ماں نے استفسار کیا۔

"اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ لیکن وہ جلد ہی پہنچ جائے گا" ابراھیم داؤد کسی میٹنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان سب کو وہیں چھوڑ کر اگر تم ہاسپٹل کے عقب میں بنے اس کمرے تک آؤ تو سورج کی روشنی چوکھٹ سے گزرتی اس شخص کے چہرے پر گر رہی تھی۔

"تمہیں جیسا کہا گیا ہے تم وہی اس کے ماں باپ سے کہو گی ورنہ انجام کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔" جہانداد ملک اپنے ہاتھ میں ایک نو مولود بچے کو اٹھائے سامنے کھڑی نرس سے مخاطب تھے۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

جہانداد ملک نے زہر خند نگاہوں سے اس بچے کو دیکھا۔ آج اللہ نے صوفیہ ابراھیم کو اولاد نرینہ سے نوازا تھا۔ لیکن جہاندار ملک انہیں ان کی اولاد کی شکل دیکھنے کو بھی ترسانے والے تھے۔ اولاد کو چھین لینے سے ماں کی حالت ایک مردہ جیسی ہو جاتی ہے تو وہ بھلا کیونکر ناں یہ کام انجام دیتے۔

دوسری جانب ایک نرس ان کے والدین کے سامنے کھڑی تھی۔

"آئی ایم سوری آپ کی بیٹی نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا ہے۔" ان دونوں کے کندھے ڈھلک گئے۔ وہ شاک کی کیفیت میں اس نرس کو دیکھ رہے تھے۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ ان کا نواسا اس دنیا میں آنے سے قبل مر چکا تھا۔ کیا واقعی؟

"اور میری بیٹی۔؟" ان کا دل دھڑکا۔

"ان کی حالت بہت کریٹیکل تھی اس لیے انہیں بیسٹ ٹریٹمنٹ کے لیے دوسرے ہسپتال شفٹ کیا گیا ہے۔"

"واٹ! آپ ایسے کیسے ہماری بنا اجازت اسے کہیں بھی بھیج سکتے ہیں۔؟" انہوں نے پورا ہسپتال سر پر اٹھا لیا تھا۔ اگلے چند لمحات میں یہ خبر ان پر پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی کہ ان کی بیٹی لاپتہ ہو چکی ہے۔

یہ وقت شام کا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں ایک نومولود کا بچہ اٹھائے وہ جھنجھلا کر فون پر آتی کال کاٹ رہے تھے۔

"ارے بس بس بابا کی جان۔" بچہ حلق پھاڑ کر رونے لگا۔ ابراھیم داؤد اسے خاموش کروانے کی تگ ودو کر رہے تھے۔ تبھی وہ خاموش ہو گیا۔

"بابا کی جان کا کوئی پیارا سا نام بھی تو ہونا چاہیے ناں؟" وہ اسے پچکار رہے تھے۔

"مومن۔ ہاں مومن ابراہیم نام ہو گا آج سے میرے بیٹے کا۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر لب رکھے۔ بچہ سکون سے آنکھیں موند گیا۔

"مومن کیونکہ مومن کبھی جھکتا نہیں۔ مومن کیونکہ مومن ظالموں پر بھاری ہو گا۔ مومن کیونکہ میرا مومن سچا ہو گا۔ وہ ہمیشہ حق کے ساتھ کھڑا ہو گا۔" وہ اسے پکارتے ہوئے سلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ بچہ نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

ہاں وہ مومن ابراھیم تھا ابراھیم داؤد اور صوفیہ ابراہیم کی سگی اولاد۔

جہانداد ملک نے محض ایک نرس کو خریدا تھا لیکن ابراھیم داؤد نے پورے ہسپتال کو خریدا ہوا تھا۔

جو بچہ جہانداد ملک کے پاس گیا وہ لاوارث تھا۔ لے پالک تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی جہانداد ملک۔ایک ماں سے اس کی اولاد چھینتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا۔؟"ساحرہ بیگم نے ترحم سے بیڈ پر پڑے اس بچے کو دیکھا۔

"آہستہ بولو ساحرہ۔وہاج اٹھ جائے گا۔"وہ اس بچے کا نام بھی رکھ چکے تھے۔

"میں چیخ چیخ کر سب کو بتاؤ گی کہ تم نے صوفیہ ابراہیم سے اس کی اولاد چھینی ہے۔"وہ چیختی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تھیں۔جہانداد ملک بھی ان کے پیچھے دوڑے۔

"رک جاؤ ساحرہ ورنہ میں بہت برا پیش آؤں گا۔"انہوں نے ساحرہ کو سیڑھیوں پر جالیا۔

"کیا کرو گے تم۔مارو گے مجھے مار دو لیکن۔"

"میں ایک سیکنڈ سے پہلے تمہیں ان زینوں سے دھکا دے کر مار سکتا ہوں اور رہی بات اس بچے کی تو جواباً میں سب کو بتاؤں گا کہ ساحرہ ملک وہاج ملک کو جنم دیتے ہوئے چل بسی۔چچ۔چچ۔"ساحرہ نے بھڑک کر ان کا گریبان جکڑا اور اس سے پہلے کہ وہ ایک تھپڑ جہانداد ملک کو دے مارتیں۔

جہانداد ملک نے اپنی کہی بات پر عمل کرتے ہوئے انہیں پیچھے کی جانب دھکا دیا۔وہ لڑکھڑائیں اور نا جانے کتنی ہی سیڑھیاں گرتی اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئیں۔

انہوں نے داخلی دروازے پر کسی کی پرچھائی ابھرتی محسوس کی۔

"انمول۔"وہاں اڑھائی تین سال کی انمول کھڑی تھی۔وہ اپنی جگہ پر جامد ہو گئے۔وہ تو آیا کے ساتھ پارک گئی تھی پھر یہاں کیسے؟

"ساحرہ۔"چہرے پر افسوس اور کرب کے ملے جلے تاثرات لاتے وہ ساحرہ کی جانب بڑھے۔

"ساحرہ اٹھو ساحرہ۔انمول یہ دیکھو تمہاری ماما کو کیا ہو گیا۔"انہوں نے ساحرہ کا گال تھپتھپایا۔لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں تھیں۔

"بابا۔"انمول رونے لگی تھی۔بابا نام کی پکار میں کتنی شدت تھی۔جہانداد ملک کو اپنی غلطی کا احساس جی بھر کر ہوا۔

صوفیہ ابراہیم کو ہسپتال سے نکلوانے کے پیچھے ابراہیم داؤد کا ہاتھ تھا لیکن کب اور کیسے صوفیہ ابراھیم لاپتہ ہوئی یہ ان کے گمان میں نہیں تھا۔انہوں نے ہر جگہ،ہر ممکن شخص سے استفسار کر لیا تھا لیکن بے سود۔اب تو انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اس سب کے پیچھے بھی جہانداد ملک کا ہاتھ ہو گا۔ابراھیم داؤد لندن سے امریکہ شفٹ ہو گئے تھے۔بیوی کی جدائی کا غم انہیں نگل رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔

"دروازہ کھولو۔ کوئی ہے پلیز میری مدد کرو۔" وہ دروازے کو پیٹتی اپنی مدد کے لیے کسی کو پکار رہی تھیں۔ ان سے ان کی اپنی اولاد چھین لی گئی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے یہاں قید تھی۔ قید ہاں جہانداد ملک کے بنائے پنجرے میں قید۔

ایک دم دھاڑ سے دروازہ کھلا اور جہانداد ملک اپنی پوری وجاہت کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ وہ ان پر چیخی تھیں۔ چلائی تھیں۔ لیکن وہ بس خاموشی سے انہیں تکتے رہے۔

"میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا تھا صوفیہ۔ ہمیشہ تمہارے نام کے ساتھ اپنا نام رکھا اور تم نے کیا کیا مجھے توڑ دیا۔ میرا وجود چھلنی کر کے تم اس ابراہیم سے شادی کر گئی۔" وہ خاموشی سے انہیں سننے لگیں۔

"مجھ سے بچپن میں ایک غلطی ہوئی تھی صوفیہ کہ میں نے تم سے منگنی کی۔ جس کی سزا اب تم بھگتو گی۔" وہ خاموش ہوئے۔ صوفیہ ابراہیم کے لب کچھ بولنے کو پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"میری اولاد کہاں ہے جہانداد ملک۔؟ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ۔؟" انہوں نے جہانداد کو گریبان سے جکڑا۔ وہ قہر آلودہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ یہ وہ چہرہ تھا جس کی تمنا کبھی انہیں تھی۔ لیکن وہ دھوکے باز نکلی تھیں۔ اور ان کی سزا موت ہونا تھی۔

"تمہاری اولاد مطلب تمہارا بیٹا اس وقت میرے پاس ہے وہاج ملک نام رکھا ہے میں نے اس کا۔ سوچو جس شخص کی تم شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی اس کا نام اپنی اولاد کے ساتھ کیسا لگ رہا ہے۔؟" صوفیہ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ کیا ابراہیم انہیں بھول گیا تھا۔

"بولو جواب دو مجھے۔ کیسا لگ رہا ہے اس قید میں رہ کر۔ میری محبت کی قید میں رہتی تو بہاریں تمہارا نصیب بنتی لیکن یہ سزا تم نے خود چنی ہے۔ میں جہانداد ملک آج اسی لمحے صوفیہ 'ابراہیم' کی محبت سے دستبردار ہوتا ہوں۔" اور اسی لمحے صوفیہ ابراہیم کا وجود پتھر ہو گیا۔ انہیں غم نہیں تھا انہیں صدمہ تھا۔

"تم ہوتے کون ہو ایک ماں سے اس کی اولاد چھیننے والے۔ کس حق سے تم نے میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کیا جہانداد ملک۔"

"تم نے کس حق سے میری محبت کی تزلیل کی تھی صوفیہ 'ابراہیم'۔ میری محبت روندے جانے کے قابل تو نہ تھی۔" ان کی آواز میں لرزش تھا۔ لہجہ ہارا ہوا۔

جہانداد ملک وہاں سے نکل گئے۔ صوفیہ ابراہیم تنہا رہ گئیں۔ اس سیاہ کال کوٹھری میں اکیلی۔ اور یہ وہ دن تھا جب صوفیہ ابراہیم کی زبان پر تالا لگ گیا۔ جس کی کنجی ان کی اولاد تھی۔

"میرا بیٹا ایک دن مجھے یہاں سے نکالے گا۔" الفاظ ان کی زبان پر رقم کر دیے گئے۔ دن گزرے، مہینے نکلے اور سال بیتے لیکن صوفیہ ابراہیم کی قید کبھی ختم نہیں ہوئی۔

حال:

وہ صوفیہ ابراہیم کی گود میں سر رکھے لیٹی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے صوفیہ ابراہیم کی صورت ایک ماں مل گئی تھی۔ بسمہ شارق کا دل خوش تھا۔ صوفیہ ابراہیم اس کے بال سہلا رہی تھیں۔

"عمر کیا ہے تمہاری۔؟" وہ مستفسر ہوئیں۔

"اکیس سال۔ خیریت؟" بسمہ نے جواب دیا۔ وہ مسکرائی تھیں۔ وہ جب مسکراتی تھیں تو ان کی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔

"ابھی تک شادی نہیں کی تم نے۔" بسمہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اکیس سال۔ کیا یہ کوئی عمر تھی شادی کی۔

"اکیس سال کوئی عمر نہیں ہوتی شادی کی۔" اس نے بتانا ضروری سمجھا۔

"ہاں لیکن خوبصورت اور پیاری لڑکیوں کا زیادہ دیر تنہا رہنا بھی اچھا نہیں ہے۔" انہوں نے اس کے بال ماتھے سے ہٹائے۔ وہ کھکھلا دی۔ خوبصورت اور پیاری۔ ہاں وہ تھی اتنی پیاری۔

"بالکل۔ آپ اس کی شادی کیوں نہیں کروا دیتیں۔" مومن ہاتھ میں جوس کا گلاس تھامے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہینڈسم اور خوبصورت لڑکوں کا کنوارا رہنا بھی اچھی بات نہیں ہے ماما اس کے لیے بھی کوئی لڑکی ڈھونڈیں۔" وہ مومن کو دیکھ صوفیہ ابراہیم سے مخاطب ہوئی۔

"تم دونوں لڑنا تو بند کرو میں نے تو ایک بات کی تھی۔ ویسے ایک لڑکی ہے میری نظر میں تمہارے لیے۔" مومن کے سائیڈ ٹیبل پر گلاس رکھتے ہاتھ رکے۔ کانوں کی لوئیں تک سرخ ہوئی تھیں۔

"آپ اپنی نظروں کو قابو میں رکھیں۔ بہت سی لڑکیوں پر ٹک رہی ہیں میرے خیال میں۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی نہ آج نہ زندگی میں پھر کبھی۔" اس کا انداز ایک دم سے سنجیدہ ہوا تھا۔ بسمہ نے بغور جائزہ لیا وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تھا۔

'اس سب کی وجہ آپ ہیں انمول۔ کاش آپ اس کا محبت سے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیتیں۔' بسمہ شارق دل میں انمول سے مخاطب تھی۔ صوفیہ ابراہیم ماں تھیں اپنے بیٹے کی خوشیاں دیکھنا ان کا حق تھا لیکن یہاں بیٹا ہی کترا رہا تھا تو وہ بیچاری کیا کرتیں۔

"تم مومن کو سمجھاؤ بسمہ وہ شاید تمہاری بات مان جائے۔" انہوں نے بسمہ سے کہا۔ آنکھوں کی جوت ایک دم بجھ گئی تھی۔ بیٹے ماں کا احساس کیوں نہیں کرتے۔

"آپ ٹینشن مت لیں ماما۔ وقت لگے گا لیکن وہ سنبھل جائے گا۔"

"اسے سنبھالنے کی خاطر کسی دوسرے وجود کا ہونا ضروری ہے بیٹا۔ جو اس کا ہیلر ہو۔ جو اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو ہیل کر سکے۔" بسمہ کا دماغ مومن کی جانب جا چکا تھا۔ وہ آج بھی انمول سے محبت کرتا تھا۔ لیکن کہتا نہیں تھا۔ پہلی محبت کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ وہ کم ہو سکتی ہے وقت کے ساتھ لیکن بھولنے کے لیے نئی زندگی کا ملنا ضروری ہے۔

مومن ہزار دعوے کر لے لیکن حقیقت وہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تک تھی۔

کمرہ نیم تاریک تھا ایسے کہ وہاں موجود واحد کھڑکی میں سے روشنی آتی اسے منور کر رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں تمہیں کوئی شخص کرسی پر بیٹھا نظر آئے گا۔

"دد۔ دیکھو مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کیوں تم لوگوں نے مجھے یہاں باں دھ رکھا ہے۔؟" وہ کرسی کے ہتھوں پر بندھے اپنے ہاتھ کھولنے کی کوشش کرتا چیخ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر تازہ زخموں کے نشان تھے۔

کھڑکی کے قریب کوئی کھڑا اپنا سانس باہر کی کھلی ہوا کے سپرد کر رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھو تو تمہیں وہاں چند ٹوٹے پھوٹے گھروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب وہ گنجان علاقہ تھا۔ دفعتاً وہ شخص مڑا۔ دور سے دیکھنے پر ہی ہیزل گرین آنکھیں سرخ معلوم پڑ رہی تھیں۔ وہ آگے آیا اور پاس رکھی پانی کی بالٹی اس شخص پر انڈیل دی۔

"کون ہو تم۔" وہ شخص دھاڑا۔

"پہچان جاؤ گے۔" اور وہ تو آواز سے ہی پہچان گیا تھا کہ مقابل شخص ہے کون۔

"م۔ ملک۔ تت۔ تم۔" ملک نے اس کی آنکھوں پر سے پٹی اتاری۔

"ملک نہیں ماہیر سکندر۔ جیا سکندر کا بھائی۔" اس شخص کا سانس سوکھنے لگا۔ حلق تر کرتے اس نے دوبارہ ملک کی جانب دیکھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔؟" ملک نے اس کو دونوں جبڑوں سے پکڑا۔ اس شخص کی حیرت مزید بڑھتی گئی۔

"وہ تصاویر بالاج سکندر تک کیسے پہنچیں؟ جب میں نے تمہیں وارن کیا تھا کہ سکندر ہاؤس کے مکینوں سے دور رہنا تو تم کیوں باز نہ آئے۔؟" اس نے دریافت کیا۔ آواز میں غصہ تھا۔

"میں نہیں جانتا۔ جس مرضی کی قسم لے لو۔ میں نے کوئی تصویریں بالاج کو نہیں دیں۔ ناں ہی میں نے سکندر ہاؤس کے لوگوں پر نظر رکھی ہے۔ ہوا کیا ہے کچھ تو بولو۔؟" وہ ایک بار پھر سے چیخنے لگا۔

"تم نے نہیں دی تو کس نے دی ہیں۔؟ تمہارے علاوہ کون ہے اس کھیل میں شامل؟ آخر وہ شخص ہے کون جس نے میری بہن کو اس کے گھر سے دربدر کیا۔ میں تمہاری جان لے لوں گا وہاج ملک بتاؤ مجھے۔" ملک کی آواز دیوار سے سر پٹک کر واپس آنے لگی۔ وہاج کو اپنی موت قریب کھڑی قہقہہ لگاتی محسوس ہوئی۔

"میں نہیں جانتا میں تو جیا تک سے نہیں ملا۔ مجھ سے بے شک میرے باپ جہانداد ملک کی قسم لے لو۔" وہ ہاتھ بھی جوڑ سکتا تھا لیکن فی الوقت وہ بندھے ہوئے تھے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور ملک کے ہاتھوں ہرگز نہیں۔ ہر زی روح کی طرح اسے بھی اپنی جان پیاری تھی۔

"کم از کم قسم تو اپنے سگے باپ کی کھا لیتے تم۔" ملک کے لہجے میں ناگواری تھی۔ وہاج ملک چونک گیا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟"

"بکواس نہیں حقیقت کہو وہاج ملک۔ اور وہ یہ کہ جہانداد ملک تمہارا باپ نہیں تمہارا باپ کوئی اور ہے۔ اس نے صرف تمہیں ایک پالتو کتے کی طرح پالا ہے جبکہ سچ کچھ اور ہے۔" وہ جیب سے کچھ نکال رہا تھا۔

" کبھی تم نے کہا تھا کہ مجھے اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیئے۔ واقعی ہر انسان کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ اپنا اصل لے کر اس دنیا میں آئے ہو تو جاؤ گے بھی اپنے اصل کے ساتھ۔ تمہیں تمہارا اصل یہ بتائے گا۔" اس نے ایک خاکی رنگ کا لفافہ اس کے سامنے لہرایا۔ دوسرے ہاتھ میں کچھ اور بھی تھا۔ کوئی شیشی۔ اور یہاں وہاج ملک کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ دعاؤں کا ورد۔

"پلیز پلیز ملک۔ میں نے کچھ نہیں کیا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر تم کہو گے تو میں جیا سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ بس ایک آخری دفعہ مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔" وہ بھیک مانگ رہا تھا۔ ملک کو یقین ہو چلا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر تصویریں بالاج تک پہنچانے والا وہاج ملک نہیں تھا تو اسے اس دوسرے شخص کا سراغ لگانا تھا۔ اس نے تیزاب کی بھری شیشی دیوار میں دے ماری۔ کانچ ٹوٹا اور نتھنوں کو جلا کر راکھ کر دینے والی خوشبو پورے کمرے میں پھیلنے لگی۔

"آخری بار وہاج۔۔ یہ آخری دفعہ تھا اس کے بعد تمہارا کھیل ختم۔" اس نے وہ لفافہ وہاج ملک کے منہ پر مارا۔

"میرے ہاتھ تو کھولتے جاؤ۔" اسے باہر کی جانب بڑھتے دیکھ وہ پیچھے سے چلایا تھا۔

"نوکر نہیں ہوں میں تمہارا۔" وہ جھلا کر کہتا باہر نکل گیا۔ اندر پورے کمرے میں تیزاب کی اٹھتی تعفن زدہ خوشبو پھیلنے لگی۔ وہاج سے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔

ماضی:

معید سکندر کو اللہ تعالیٰ نے اایک پیاری سی گڑیا عطا کی تھی جس کا نام انہوں نے منہا سکندر رکھا۔ ماہیر سکندر کے گیارہ سال بعد واجد سکندر کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا۔ چند ماہ کی جیا سکندر اپنی معصومیت سے سب کا دل موہ لیتی۔ بالاج سکندر اسے گھنٹوں بیٹھ کر تکا کرتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری۔ ماہیر سکندر اور بالاج کی دوستی وقت کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔

"بالاج تم مجھ سے ایک وعدہ کرو گے۔؟" ایک دن وہ ایسے ہی اس سے بول اٹھا۔

"ہاں کیوں نہیں میں وعدہ کروں گا۔" اس کی عمر دس سال تھی جبکہ ماہیر اس سے ایک سال بڑا تھا۔

"تو پھر وعدہ کرو تم کبھی بھی جیا کو رونے نہیں دو گے۔ بلکہ ہمیشہ اس کا خیال رکھو گے۔ بتاؤ تم بنو گے ناں اس کے محافظ۔" اس کے باپ نے بتایا تھا کہ وہ جیا کا بھائی ہے اور اس کا محافظ۔ وہ یہی سب بالاج سے بھی ایکسپیکٹ کر رہا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میں کہ تمہاری بہن کا خیال رکھوں گا۔" دس سالہ بالاج نے گیارہ سالہ ماہیر سکندر کے ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔

یہ واقعہ چند روز بعد کا تھا جب ایک آفیشل ڈنر سے واپسی پر واجد سکندر اور صدف ملک جان کی بازی ہار گئے۔ اگر تم اس رات کو اس سنسان سڑک پر لے کر آؤ تو تمہیں وہاں روتا بلکتا بچہ نظر آئے گا۔ وہ اپنے ماں باپ سے اٹھنے کی فریاد کر رہا تھا۔ لیکن وہ جان سے جا چکے تھے۔ ایک ٹرک نے بری طرح ان کی گاڑی کچل ڈالی تھی۔ ماہیر سکندر اس رات بچ گیا تھا۔ کیسے؟

کچھ لمحے قبل ان کی گاڑی خراب ہوئی۔ تو وہ دونوں باپ بیٹا باہر نکل آئے۔ ماہیر سکندر سڑک کے درمیان میں کھڑا شرارتیں کر رہا تھا جبکہ واجد سکندر گاڑی پر جھکے اسے چیک کر رہے تھے۔ تب بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ اس بچے کی زندگی جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس دن اس رات سے اس کی آنکھوں میں جنون سوار ہوا۔ بدلہ لینے کا جنون۔ انتقام کی آگ جو کبھی بجھتی نہیں ہے۔ اس جہاں میں تو کبھی نہیں۔

'انتقام اس کی خواہش نہیں جنون تھا۔'

جہانداد ملک وہاں پہنچ چکے تھے۔انہوں نے زبردستی ماہیر سکندر کو اپنے ساتھ گھسیٹنا شروع کی۔وہ سڑک پر اوندھے منہ گرا ان کے ساتھ کھنچا چلا جارہا تھا۔لیکن وہ ظالم تھے۔بے حد جابر۔

"تمہارے ماں باپ نے اپنی غداری کی سزا پالی بچے۔اب تمہاری باری۔جانتے ہو میرے نزدیک غداری کی سزا کیا ہے۔موت صرف موت۔لیکن تمہارا وقت بہت دور ہے۔"وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اپنے بھائی اور بھاونج کی موت کی خبر معید سکندر پر قہر بن کر ٹوٹی تھی۔وہ ڈھے گئے تھے۔اس دن ان کی کمر توڑ دی گئی۔اوپر سے ماہیر سکندر کی گمشدگی کی خبر زخم گہرا کر رہی تھی۔پولیس کا کہنا تھا کہ وہ بچہ انہیں کی مانند ٹرک تلے کچلا جا چکا ہے لیکن کسی نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا۔وہ لوگ سکندر ہاؤس شفٹ ہو گئے۔سات ماہ کی جیا کو کچھ خبر نہ تھی۔بس وہ ماں کا لمس محسوس نہ کر کے روتی تھی اور اس کا رونہ بالاج کو چڑ دلاتا تھا۔وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔کیونکہ وہ ماہیر سکندر سے مشابہت رکھتی تھی۔اور آنے والے اٹھارہ سال بالاج سکندر نے ماہیر سکندر کی نذر کیے تھے۔

جہانداد ملک اسے لے کر لندن آئے تھے وہ پاکستان رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔انہوں نے اس کے ڈاکیومنٹ میں اسے ایک نئی شناخت دکھائی تھی۔

"ملک"

اس کا نام ماہیر سکندر سے بدل کر ملک رکھ دیا گیا اور پھر وہ نام تاحیات ماہیر سکندر کے ساتھ نتھی رہا تھا۔لندن پہنچنے تک ماہیر سکندر صدمے سے خاموش رہا تھا۔جب ہوش آیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سفاک انسان اس کا سگا ماموں ہے۔وہ اس کے سامنے گڑگڑایا۔رویا لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ سنی۔

"کیا تم واپس جانا چاہتے ہو۔؟"انہوں نے ایک روز اسے پیار سے پچکارتے سوال کیا۔

"ہہ۔ہاں آپ آپ مجھے میرے گھر واپس بھیج دیں پلیز ماموں پلیز۔مجھے یہاں نہیں رہنا۔"اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔وہ کچھ ہی دنوں میں بیزار ہو گیا تھا۔سارا دن اور رات وہ ایک ہی کمرے میں بند رہتا۔

"اگر تو تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں واپس جانے دوں تو تمہیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔"انہوں نے اسے امید تھمائی۔

"کب تک۔؟"وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کتنے دن کتنے ہفتے۔؟لیکن۔۔

"دس سال تو کہیں نہیں گئے ملک۔"وہ مسکرائے۔اور ماہیر سکندر پتھر کا ہو گیا۔

"تم واپس جا کر کیا کرو گے ؟ماں باپ تمہارے مر چکے ہیں پیچھے کیا بچا ایک بہن تو وہ بھی دیکھنا اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلے گی۔" وہ صحیح کہہ رہے تھے کہ اس کا پیچھے کوئی نہ تھا ماسوائے ایک بہن کے۔ اسے کافی دن گزر چکے تھے یہاں پر۔ اب تک تو اس کے گھر والے اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکے ہونگے۔ وہ ریلیکس ہو گیا۔ اسے اپنی بہن کی فکر ختم ہوئی۔ کیونکہ وہ اسے مضبوط انسان کے حوالے کر کے آیا تھا۔ اس کے حوالے جسے چٹان جتنا مضبوط خود ماہیر سکندر نے بنایا تھا۔

اس کا پر سکون انداز جہاندادملک کو کھٹکا ضرور لیکن وہ اسے وقت کے بدلتے حالات کی نظر کر گئے۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی بات سمجھ گیا ہو۔ انہوں نے ماہیر سکندر کا داخلہ لندن کے ہائی سکول میں کروایا تھا۔ وہ اس کی تعلیم و تربیت کرنے والے تھے بالکل ویسے ہی جیسے انہوں نے وہاج ملک کی کبھی کرنا تھی۔

انہوں نے ملک کے کہنے پر اسے گھر کے اندر نہیں رکھا تھا بلکہ وہ اپنی مرضی سے سرونٹ کوارٹرز میں رہتا تھا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ کم از کم انہیں اس کی شکل نہیں دیکھنا پڑے گی۔ رات کو ملک دیر تک باہر رہتا تھا لیکن انہوں نے کبھی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی ویسے بھی وہ اسے لندن کے ماحول میں رنگنا چاہتے تھے۔

موسم بہت خوبصورت تھا۔ کافی دنوں بعد آج دھوپ نکلی تھی یا یوں کہا جائے کہ وہ آج ملک کا دیدار کرنے نکلی تھی۔ وہ جب سے آیا تھا آج باہر نکلا تھا۔ وہ لان میں پڑی چیئرز پر بیٹھا آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ سامنے ٹیبل پر چائے کا کپ پڑا تھا۔ پاس ہی اس کا جرنل رکھا ہوا تھا۔ جب کوئی شے اس کے کان سے چھوئی۔ اس نے کان کی لو جھٹکی شاید کوئی کیڑا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی موج میں ڈوب گیا۔ اب کی بار کوئی شے اس کی گردن کو چھوئی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کے بالوں کی جانب بڑھنے لگی۔

"یا اللہ۔" وہ کرنٹ کھا کر اٹھا۔ کپڑے جھاڑے لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔

"ہی ہی ہی۔" کسی بچے کی کھکھلاہٹ کی آواز اسے اپنے عقب سے سنائی دی۔ وہ مڑا۔ ہیزل گرین آنکھیں سامنے موجود ہستی کو دیکھ کر سکڑی تھیں۔ اس نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے تم تنگ کر رہی تھی۔؟" اس نے پوچھا۔ مقابل ہستی اپنی غزالی آنکھوں میں دنیا جہاں کی معصومیت سموئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں وہ تم تھی۔ مجھے کیوں تنگ کیا۔؟" ملک نے اسے گھورا۔ وہ آرام سے ٹیبل پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پھسلا اور اگلے ہی لمحے چائے کا سارا کپ ملک کے جرنل پر سلامی عرض کر رہا تھا۔

"یو سلی گرل یہ کیا کیا تم نے۔" ملک نے اسے بازو سے پکڑ کر دور جھٹکا۔ وہ گھاس پر گری تھی۔ لیکن زارو قطار رونے کا شغل شروع کر چکی تھی۔ ملک نے تکان سے اسے دیکھا۔ یہ جرنل اس کے لیے بہت قیمتی تھا جو یہ نامعلوم لڑکی خراب کر چکی تھی۔

"ہیئے۔ اب رو کیوں رہی ہو۔؟" ملک نے اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ممکن تھا کہ وہ رو رو کر ندیاں بہا دیتی۔

"تم گندے ہو تم نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں بابا کو بتاؤں گی۔" وہ رو رہی تھی۔ ساتھ میں اپنی کہنی سہلا رہی تھی۔ اس نے ہاف سلیوز شرٹ پہن رکھی تھی۔

"تو تم چغل خور ہو میری چغلی کھاؤ گی۔" ملک نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اب اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

"نہیں وہ کیا ہوتا ہے میں نے تو آج تک نہیں کھائی۔۔۔ آ تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ بابا۔ بابا۔" بات کرتے کرتے اسے یاد آیا کہ ملک نے اسے تھپڑ بھی مارا ہے۔ لیکن اس نے تو کوئی تھپڑ نہیں مارا تھا اسے۔

"آآآ۔ بچ۔" ملک کے ہاتھ کی دو انگلیاں اگلے ہی لمحے اس کے ننھے منھے دانتوں میں تھیں۔ نوکیلے دانت اسے اپنی جلد میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک سیر تھا تو دوسری سوا سیر انمول ملک تھی۔

اگلے منظر میں وہ چھوٹا پٹاخا جہانداد ملک کے بازوؤں میں دبکی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اور ملک ان کے سامنے کھڑا تھا۔ سر جھکائے نہیں گردن اکڑا کر۔

"آئندہ میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا ناں ملک تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ اسے ڈانٹ رہے تھے۔ لہجے میں مصنوعی پن تھا کیونکہ وہ جانتے تھے غلطی انمول کی ہی ہو گی۔

"اپنی بیٹی سے کہیں اپنے دانتوں کو قابو میں رکھے اچھے بھلے انسان کو چودہ ٹیکے لگوانے کا سبب بن سکتی ہے یہ۔" انمول ملک نے غصے سے اسے دیکھا۔ اس کی بات پر جہانداد ملک نے اپنی ہنسی دبائی۔ جبکہ ملک کے نقوش تن گئے تھے۔ وہ شخص ہنس رہا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر جاتا۔

وہ جہانداد ملک کی ضد پر ایک کراٹے کلب جوائن کر چکا تھا۔ وہاں کا کوچ بہت اچھا تھا۔ ملک کو وہاں کا ماحول جہانداد ملک کے گھر سے قدرے بہتر تھا۔ وہ دن کو سکول سے آنے کے بعد یہیں آ جاتا تھا۔ ایک تو گھر پر جہانداد ملک اور دوسرا ان کی پٹاخا بیٹی۔

اس کا بس چلتا تو وہ اس آفت کی پڑیا کو اٹھا کر کسی دوسرے جہاں پٹک دیتا۔ لیکن کاش۔

آج وہ جہانداد ملک کے کہنے پر ان کے ساتھ ایک سائٹ پر آیا تھا۔ نیوی بلو پولو شرٹ پر بلیک جینز پہنے وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اس وقت چودہ سال کا تھا۔

"سلیم۔ میری گن لاؤ ادھر۔" سلیم فوراً سے حاضر ہوا۔ انہوں نے وہ بندوق ملک کی جانب بڑھائی۔ وہ چند لمحے اس بندوق کو دیکھتا رہا۔

"گولی آپ کو مارنی ہے؟" اور جب بولا تو آواز کھردری تھی۔ لہجہ بے لچک۔

"تمہارا نشانہ بہت کچا ہو گا اسے درست کروانا ہے ورنہ کیسے لڑ پاؤ گے اپنے دشمنوں سے۔" ملک نے گن تھامی۔ اور جہانداد ملک کی ہدایت کے مطابق نشانہ باندھا۔ وہ چودہ سالہ ماہیر سکندر بندوق چلانا سیکھ رہا تھا۔

"شوٹ۔!" انہوں نے بلند آواز لگائی۔ ملک کا ہاتھ ٹریگر پر گیا۔ اس نے ٹریگر دبایا گولی ٹھاہ کی آواز سے نکلی تھی لیکن سامنے موجود اپنے ٹارگٹ پر نہیں لگی۔ جہانداد ملک نے دیکھا وہاں تعینات گارڈز مین بوس ہو رہا تھا۔ ملک کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کا نشانہ کچا نہیں تھا وہ اپنا ٹارگٹ جانتا تھا۔ جہانداد ملک کا ملازم ملک کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھائی کر رہا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ کلب نہیں گیا تھا۔ وہ کب سے اپنا دھیان کتابوں پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ جب اسے احساس ہوا۔ کسی کی موجودگی کا احساس اور ایک مخصوص خوشبو۔ اس نے ادھر سے ادھر جھانکا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ شاید اس کا وہم تھا۔

لیکن اگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا تو جان پاتا کہ وہ تین فٹ تین انچ کی لڑکی کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ملک کو متوجہ نہ پا کر وہ مایوس سی واپس لوٹ گئی۔ وہ ایسا ہی تھا جب بھی گھر ہوتا انمول ملک کو منہ بھی نہ لگاتا اور ایک وہ تھی جو اس کے پیچھے پیچھے ہوتی تھی۔

پھر سارا دن ملک کو وہی احساس رہا۔ جیسے کسی کی نظریں اس پر کھب چکی ہوں۔ جہانداد ملک نے آج اسے گھر کے اندر کھانے کی دعوت دی تھی۔ وہ ٹھکرا نہیں سکا۔ احترام اس پر فرض تھا۔

اس وقت وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا جہانداد ملک کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب کسی بلی کے میاؤں میاؤں کی آواز اسے اپنے قریب سے سنائی دی۔ لیکن اس گھر میں تو کوئی بلی نہ تھی۔

اس نے دیکھا دروازے کی اوٹ میں چھپی وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے رازدارانہ انداز میں ایسے آوازیں نکال رہی تھی۔ ملک کو اس کی چالاکی سمجھ آئی۔ وہ ڈبل گیم کھیلتا کچن میں بڑھ گیا۔ وہاں موجود پینٹری کے باہر کی جانب کھلتے دروازے سے ہو کر وہ اندرونی دروازے سے دوبارہ اندر آیا۔ انمول پریشان سی ڈائننگ ہال میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ کہاں گیا؟

"اوئی ماں۔" اس کا کان بہت برے طریقے سے مڑوڑا گیا۔ وہ چلا اٹھی۔

"تو یہ تم تھی جنگلی بلی۔" اس نے اور زور سے اس کا کان مڑوڑا۔ غزالی آنکھوں میں آنسو جمع ہوتے گالوں پر بہہ نکلے۔ سرخ آنکھیں گالوں پر آنسو۔ ملک کا دل اس کے رونے پر دھڑکا۔ وہ الٹے پاؤں واپس مڑا۔ وہ وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ وہ لڑکی اسے سٹک کر رہی تھی۔ اور وہ اس کے جال میں بچھ کر اپنا ہدف کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں بلاشبہ ماہیر سکندر کو زیر کرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ وہ پلٹتا گیا۔ کھانا۔ جہانداد ملک اور اپنا آپ وہ سب بھول رہا تھا۔ یاد تھا تو بس وہ سرخ متورم غزالی آنکھیں۔

"اسکی آنکھیں مجھے مدہوش کر رہی ہیں۔ کیوں؟۔" وہ سٹڈی ٹیبل پر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھا تھا۔ چہرے پر پریشانی اور عاجزی تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں سے وہ ہوش گنوائے جا رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے خود سے سوال کیا۔

اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

یا وہ خود کو وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں مختلف لڑکے کھڑے پسینے سے تر تھے۔ سامنے ہی کوچ انہیں ٹریننگ دے رہا تھا۔

"آج وہ صاحب نہیں آئے۔" ٹریننگ میں بریک کے دوران ملک نے کوچ سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کوئی پریشانی ہو سکتی ہے۔" وہ کندھے اچکا گئے۔ وہ صاحب روزانہ کچھ دیر کے لیے وہاں آتے تھے۔ اکیلے آتے تھے تنہا ہی جاتے تھے۔ آج وہ نہیں آئے تھے لیکن کیوں۔؟

وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا جب کوئی شخص ایمرجنسی میں کلب کے اندر داخل ہوا۔ اس کے بازوؤں میں ایک بچہ تھا جو بری طرح سے رو رہا تھا۔ اتنا بڑا بچہ وہ کیسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھے؟

وہ سیدھا ملک کی جانب آئے۔ کوچ انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ملک میرے پیارے بیٹے کیا تم میری مدد کرو گے۔ مجھ پر ایک احسان کر دو۔" انہوں نے منت کی۔ ملک پریشان ہوا۔

"کیسی مدد۔؟" بچہ ان کی بانہوں میں روٹھا ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنے باپ کی کسی بات سے متفق نہ ہو۔

ملک کی نظریں اس خوبصورت ترین بچے سے اس کے باپ کی جانب گئیں۔ کوچ اور ملک ان کی آمد کی وجہ سمجھ چکے تھے۔

حال:

وہ آج تین دن بعد اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔ آنکھیں رت جگے کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ وہ سیدھا چلتا ہوا راہداری میں آگے آیا۔ وہاں صوفے پر صوفیہ ابراہیم بیٹھی تھیں۔ اور ان کی گود میں سر رکھے مومن ابراہیم لیٹا ہوا تھا۔ صوفیہ ابراہیم کی انگلیاں اس کے سر میں حرکت کر رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھا اور سلام کیا۔ دونوں نے ہی محبت سے جواب دیا تھا۔ اس کی متلاشی نظروں کو ادھر ادھر گھومتے دیکھ مومن نے اپنی ہنسی دبائی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں بھائی۔" وہ سرسری انداز میں گویا ہوا۔ ملک مسکرا کر سر جھٹکتے اس کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مومن نے نظریں اٹھا کر اپنی ماں کا نورانی چہرہ دیکھا۔ وہ آنکھوں میں فکر لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" آنکھوں میں سوال تھا اور لہجہ خوشگوار۔

"جینا سیکھ چکے ہو تم۔" وہ سانس خارج کرتی بولی تھیں۔ شاید یہ سوال تھا۔

"میں زندگی گزارنا سیکھ چکا ہوں ماں۔ زندگی جینے اور گزارنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ شخص جو ابھی مجھ سے اور آپ سے مل کر گیا ہے ناں وہ مجھے اس دنیا میں سب سے محبوب ہے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اگر مومن ابراہیم کی حفاظت کرتا ہے تو مومن ابراہیم بھی اس کی حفاظت کے لیے جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے۔ ملک میرے بھائی ہی نہیں ہیں بلکہ آپ کے شوہر کے بعد انہوں نے مجھے بچے کی طرح پالا ہے۔ وہ مجھ سے سات سال بڑے ہیں اور مومن ابراہیم کا بس چلے تو وہ یہ سات سال ان پر سے وار دے۔ مجھے ان سے محبت ہے لیکن وہ اس محبت سے کہیں زیادہ محبت انمول سے کرتے ہیں اور مومن ان کے لیے ایک چھوٹی سی قربانی نہ دے پاتا یہ کس کتاب کی تحریر ہے ماں؟ میں ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتا۔ میں اگر آج ان سے کہوں کہ مجھے فلاں شے چاہیے تو وہ اپنا آپ نچھاور کر کے مجھے لا کر دیں گے۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا اس دنیا میں رہنے کے لیے انسان کو اپنا دل مارنا پڑتا ہے اور میں اپنا دل ایک عرصہ ہوا مار چکا ہوں۔ سو چِل ماں۔ آپ کا بیٹا تنہا ہی اچھا ہے۔" صوفیہ ابراہیم نے شدت جذبات سے اس کی پیشانی چومی۔ وہ مسکرا دیا۔

"اٹھیں اب آپ چل کر آرام کر لیں۔" مومن نے ہاتھ بڑھا کر انہیں بھی اپنے ساتھ کھڑا کیا۔

"لیکن مجھے بھوک لگی ہے۔" مومن ابراہیم کی ماں اسی کی طرح معصوم تھیں۔

"آپ آرام کریں میں خود آپ کے لیے مزے دار سا کھانا بناتا ہوں۔" وہ انہیں لے کر کمرے کی جانب جا رہا تھا۔

"ماشاءاللہ میرا بیٹا تو کک بھی ہے۔"

"الحمدللہ۔" اس نے سر کو خم دیتے ہاتھ سینے پر باندھا۔

ڈائننگ ہال میں معید سکندر اور ثانیہ بیگم بیٹھی کھانا کھا رہے تھے جب بالاج سکندر سیڑھیاں اترتا ان کی جانب آیا۔ وہ ایش گرے سوٹ میں ملبوس تھا۔ بال سلیقے سے سیٹ کر رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ آج آفس کو اپنا دیدار کروانے والا ہے۔

"السلام علیکم۔" اس نے سلام کیا لیکن سامنے دونوں نفوس کھانے میں مگن تھے جیسے اسے دیکھا تک نہ ہو۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"بابا آج ہماری فارن پارٹی کے ساتھ میٹنگ ہے کیا آپ ہمیں جوائن کریں گے۔؟" لہجہ عام سا تھا۔ معید سکندر نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا بلکہ فون نکال کر چند بٹن دبائے اور دوسری جانب جاتی گھنٹی سنتے رہے۔

"ہیلو عباد میں نے تمہیں کہا تھا کہ آج کی تمام میٹنگز کینسل کروادو۔ کیا تم پھر سے بھول گئے۔؟"

"اچھا آج ہماری کوئی میٹینگ نہیں ہے۔؟ دیٹس گڈ۔ اور ہاں لائر سے بات ہوئی تمہاری کب تک واپس پاکستان آجائے گا وہ۔" معید سکندر اپنے سیکرٹری سے مخاطب تھے۔ ان کا آفیشل لائر اس وقت بیرونِ ملک تھا۔

"ہمم ٹھیک ہے آئندہ کوئی بھی ایرہ غیرہ میٹنگ رکھنے کا بولے تو اسے اس کے حقائق پڑھ کر سنا دینا۔ خدا حافظ۔" انہوں نے کال بند کی۔ اور دوبارہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

"یہ سب کیا تھا بابا۔ اب آپ اپنے بیٹے کو غیروں میں شمار کرنے لگے ہیں۔" وہ بے یقین تھا۔

"ہمارا بیٹا چند دن پہلے کہیں کھو گیا ہے۔ یہ جو ہمارے سامنے کھڑا ہے نا یہ بالاج سکندر ہے ایک انا پرست مرد۔ بالاج تم نے تو ان مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا جو روز اپنی بیویوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں۔ ارے تم سے وہ لاکھ گنا بہتر ہیں جو بیویوں سے ہزار نالاں سہی پر انہیں باہر کی ہوا نہیں لگنے دیتے۔ نا جانے ہماری تربیت کہاں دفن ہو گئی ہے۔ یہ میرے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ لو بالاج سکندر ہمیں ہمارا بیٹا اور بہو لٹا دو۔" ثانیہ بیگم بالاج سے مخاطب ہوئیں۔ وہ چپ چاپ ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے اس کا دل کیا یہ گاڑی کہیں ٹھوک دے لیکن وہ حرام موت گلے نہیں لگانا چاہتا تھا۔ جیا سکندر کے جانے کا دکھ اسے اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا۔

"کوئی سمجھتا کیوں نہیں ہے آخر میں کسے اپنا حال دل بیان کروں۔؟" اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہر کوئی اسے غلط سمجھ رہا تھا۔ وہ کیسے کسی کو بتاتا کہ وہ اندر سے کس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس نے جیا پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا تھا اس کی حقیقت جو

بے شک اس کا ماضی تھی اس نے بالاج سکندر کو بری طرح سے متاثر کیا تھا۔ وہ انسان تھا دوسرے انسانوں کی طرح اسے بھی ہیلنگ کی ضرورت تھی۔ کچھ وقت لگا تھا اسے ہیل ہونے میں۔

اس کا دھیان فون کی بجتی گھنٹی کی جانب متوجہ ہوا۔ سکرین پر گڑیا کالنگ لکھا جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال پیس کرتے فون کان سے لگایا۔

"السلام علیکم منہا کیسی ہو۔؟" اس نے اپنا لہجہ حتی الامکان درست کرنے کی کوشش کی۔

"واعلیکم السلام بھائی۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ آپ نے جیا کو۔۔" اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ کال کاٹ چکا تھا۔ اس کی بہن بھی اسے غلط کہہ رہی تھی۔

"آآآ۔!" اسٹیرنگ وہیل پر جمے اس کے ہاتھوں کی نسیں ابھر رہی تھی۔ وہ اس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ وہ کسی سے اپنا دکھ شئیر نہیں کر سکتا تھا وہ کسی کو اپنا درد بیان نہیں کر سکتا تھا۔ بھائیوں جیسا دوست وہ آج سے اٹھارہ سال پہلے کھو چکا تھا۔ اس کے بعد نہ کوئی اس کا دوست بنا نہ ہی بھائی۔ وہ تنہا تھا اس دنیا میں تنہا آیا تھا تو اسے رہنا بھی تنہا ہی تھا۔

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ سامنے سے کوئی شے اڑتی ہوئی آ کر اس کے چہرے پر لگی تھی جسے وہ بروقت کیچ کر گیا۔ سامنے ہی وہ بیڈ پر بپھری بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر حملہ آور شے پلو تھا۔

"میں کسی افریقہ کے جنگل میں تو نہیں گھس آیا۔؟" اس نے کان کی لو کھجائی۔ نا جانے کیوں لیکن آج اس کی شامت پکی تھی۔

"نہیں میرے مجازی خدا آپ افریقہ کے جنگل میں نہیں بلکہ انمول ملک کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔"

"ہاہاہا۔" اس سے پہلے انمول مزید کوئی وار اس پر کرتی وہ اپنے دایاں کان پکڑ گیا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ کان پکڑے کھڑے اس سے معافی مانگتے ہوئے بہت کیوٹ لگ رہا تھا۔ لیکن یہ وقت انمول کے لیے نرمی دیکھانے کا نہیں تھا۔

"ہنہہ۔ کہاں تھے تم پچھلے تین دنوں سے۔؟ میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ۔؟" انمول لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ملک کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر کے وہ جواب کی منتظر کھڑی تھی۔

"وہ کون۔؟" ملک نے پوچھا۔

"وہی جس کے پاس جا کر تمہاری مصروفیات طویل ہو جاتی ہیں۔" وہ طنزیہ گویا ہوئی۔ ہاتھ سینے پر باں دھ لیے۔

"میری ہر مصروفیت کی وجہ تو آپ ہیں۔ سب آپ سے شروع اور آپ پر ختم۔ نہ کوئی دوسرا نہ تیسرا۔" اس نے انمول کو کندھوں سے تھامے خود کے قریب کیا۔ انمول کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"جھوٹے ہو تم۔"

"ادھر دیکھیں میری طرف مجھے آج تک کسی دوسرے کا خیال نہیں آیا اور نہ ہی آئے گا اس قدر چاہا ہے میں نے آپ کو۔" ملک کی آواز شیریں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"مم۔ میں بہت ڈر گئی تھی ملک۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں شاید زندہ نہ رہ پاتی۔ میرے جینے کی وجہ تو تم ہو۔" وہ ایک دم سے سسکتے ہوئے اس کے سینے سے جا لگی۔ وہ ایک بار پہلے بھی اس کے گلے لگی تھی لیکن تب اور آج میں فرق تھا۔ ملک نے اس کے بال سہلائے۔ دور اندر اس کا دل کانپ گیا تھا۔ اگر اس کی وجہ سے انمول کو کچھ ہو جاتا تو؟

"آپ کہیں تو اپنی ہر آتی جاتی سانس بھی آپ کے پاس گروی رکھوا دوں۔ جس پر ہر اختیار اور طاقت صرف آپ کی ہو زوجہ۔ اب سے یہ جان بہت انمول ہو گئی ہے کیونکہ یہ آپ کے جینے کی وجہ ہے۔" وہ اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکائے ہوئے تھا۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اسے منا چکا تھا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح مان چکی تھی۔ انمول کا روٹھنا حق تھا تو ملک کا منانا فرض تھا۔

"آئندہ تم کچھ ایسا نہیں کرو گے جس سے تمہیں تکلیف ہو۔" وہ آرڈر دے رہی تھی۔ ملک نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نہ ہی کوئی بات چھپاؤ گے مجھ سے۔" وہ پیچھے ہٹی اور انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"کھلی ہوئے کتاب کی طرح آپ پر آشکارا ہو جاؤں گا۔" وہ اس کی ہر بات پر سر ہلا رہا تھا۔ انمول مسکرا دی۔ وہ شخص اسے سکون بخشتا تھا۔

"ملک۔" وہ فکر مندی سے گویا ہوئی۔

"جی زوجۂ ملک۔" استحقانہ انداز۔

"کوئی پریشانی ہے کیا؟ تمہاری آنکھیں اداس ہیں۔ یہ تمہاری مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہیں۔" ملک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ عورت اس کی بیوی تھی اس سے وہ کوئی بات نہیں چھپا سکتا تھا۔ پچھلے تین دنوں کی ساری کتھا وہ اس کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ اور وہ غور سے اسے سن رہی تھی۔ جہاں محبت ہو وہاں یقین اسے انمول نے تھمایا تھا۔

وہ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اوپن کچن میں مومن ابراہیم کھڑا کٹنگ بورڈ پر کچھ کاٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر بسمہ کو دیکھا اور دوبارا اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ بسمہ فریج کے قریب آئی۔ پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی پیا اور پھر مومن کو دیکھنے لگی۔ وہ سبزیاں کاٹنے کے ساتھ چولہے پر رکھی ہنڈیا کا بھی خیال کر رہا تھا۔ چہرے پر نولفٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"میں کوئی مدد کروادوں؟" وہ زیادہ دیر چپ نہ رہ سکی۔ مومن ابراہیم کی خاموشی اسے بہت کھٹکتی تھی۔ ہمیشہ۔

"واہ آج سورج کہاں سے طلوع ہوا ہے جو بسمہ شارق اپنی مدد کی آفر ہمیں کر رہی ہیں۔؟" وہ طنزیہ گویا ہوا۔

"جب لڑکا اتنا ہینڈسم ہو گا تو کون کمبخت اپنی مدد کی آفر نہیں کرے گا۔" وہ ہنس کر کہہ گئی۔ مومن نے اسے سخت نگاہوں سے گھورا

۔

"مائنڈ یور لینگویج مس بسمہ۔" وہ چھری کٹنگ بورڈ پر پٹختا چولہے کی جانب متوجہ ہوا۔ بسمہ آگے بڑھ کر پیاز کاٹنے لگی جو ابھی مومن آدھے ادھورے چھوڑ کر گیا تھا۔

"انسان میں اتنی نازک مزاجی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔" مومن نے اس کے سوں سوں کرنے پر چوٹ کی۔ لیکن بسمہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پیاز کاٹنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں دھندھلا رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے چھاتا پانی اس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔

"آؤچ۔" ان دیکھی میں وہ تیز چھری سے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کاٹ چکی تھی۔ مومن فوراً سے پلٹا۔

"یہ کیا کیا بیوقوف لڑکی!" اس نے بسمہ کا ہاتھ پکڑا جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اسے سنک تک لے جاتے دھونے لگا۔ اس کے ہر انداز میں فکر تھی۔

بسمہ کو درد ہو رہی تھی لیکن وہ خاموشی سے مومن کو دیکھتی رہی۔

"زخم کافی گہرا ہے" مومن نے اسکی انگلی اپنے ہاتھ میں دبائی۔ خون رک گیا لیکن چھوڑے جانے پر وہ پھر سے بہنے لگتا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ رک چکا تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی مارشل آرٹس سے تعلق رکھتی ہے۔ اتنا نازک پن۔

"دھیان کہاں تھا تمہارا آخر؟" وہ اس کے زخم پر پھونک رہا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔ مومن خود کو اس کی نظروں کے حصار میں محسوس کر سکتا تھا۔

"اوہ ہیلو۔ یوں ندیدوں کی طرح کیوں مجھے تاک رہی ہو۔ کیا کبھی کوئی اتنا پیارا لڑکا نہیں دیکھا۔؟" مومن کی تیز آواز پر اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ شرمسار ہوئی لیکن وہ بسمہ شارق تھی۔

"ہینڈسم تو بہت دیکھے ہیں لیکن اتنا پیارا لڑکا ایک واحد ہی ہے" اس نے اپنا ہاتھ مومن کی گرفت سے آزاد کروایا۔ زخم پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ نا جانے اس کے ہاتھ میں ایسا کیا جادو تھا جو درد کچھ پل کے لیے ہی سہی لیکن رک چکا تھا اور اب پھر سے زخم میں درد کی ٹیس اٹھنے لگی تھی۔

"لو یہ لگالو۔" مومن نے ایک ٹیوب اس کی جانب بڑھائی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے یہ زخم تو خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے بھلا جسمانی زخم بھی روح پر لگے گھاؤ سے زیادہ تکلیف دہ ہو سکتے ہیں۔" بسمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن یہ تمہیں اذیت دیں گے۔ زخموں کو زیادہ دیر تک کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے ورنہ یہ ناسور بن جاتے ہیں جتنی جلدی ہو سکے ان پر مرہم لگا لینی چاہئیے۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ بسمہ نے اس کے ہاتھ سے ٹیوب نہیں پکڑی۔

"اور اگر کوئی مرہم رکھنے والا موجود نہ ہو تو۔؟" وہ سوال کر گئی۔ لیکن اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے ہمیشہ اپنے زخموں کو کریدتے خود کو تکلیف سے دوچار کیا تھا۔ اس کے پاس کوئی شخص نہ تھا جو اس کی حالت پوچھ سکتا۔ تو وہ کیوں اتنا نرم بن رہا تھا اور کیوں وہ اس کے سحر میں جا رہی تھی۔؟

"تو خود اپنے زخموں پر مرہم لگانا سیکھ جاؤ۔" مومن نے اس کے دائیں ہاتھ میں وہ ٹیوب تھمائی۔ بسمہ کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ اس نے سرد سانس اندر کھینچی۔

"یہ زخم بہت جلد ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بس کچھ پل، کچھ دن کی اذیت اور پھر وہ مندمل ہوتے ہوئے ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ظاہری طور پر بہت کچے ہوتے ہیں۔" اس نے ٹیوب سے تھوڑی سی مقدار میں سفید رنگ کی مرہم نکالی اور زخم پر لگائی۔ جلن بڑھنے لگی۔

"انسان کو خود سے محبت ہونی چاہیے۔ اگر تمہیں خود سے محبت ہوتی تو کبھی خود کو اذیت نہ دیتی بلکہ اپنی تکلیف کو دور کرتی۔ یہ جسم یہ روح اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اسے سوئی سے چھونے کا بھی حق نہیں ہمارے پاس۔" وہ واپس اپنے کام کی جانب متوجہ ہوا۔ بسمہ سر جھٹکتی اپنے کمرے میں جانے لگی۔ اسے تنہائی چاہیے تھی۔ رونے کے لیے۔ دل کا غبار نکال کر اسے ہلکا کرنے کے لیے۔ اسے تنہا رہنا پسند تھا۔

"بسمہ۔" مومن کا انداز سنجیدہ تھا۔ وہ پلٹی نہیں بس ہمم کہہ کر اسے بولنے کا اشارہ کیا۔ ایک ہاتھ انگلی کے زخم پر گردش کر رہا تھا۔

"اپنی سیاہی کو اتنا مت پھیلاؤ۔ انسان غلط ہوتے ہیں اور جو غلط نہیں ہوتے وہ انسان نہیں ہوتے۔ دنیا کا سائیکل ایسے ہی چلتا ہے۔ کبھی خود کو اپنی سیاہی میں مت گھلنے دینا ورنہ یہ تمہیں سر تا پیر سیاہ بنا دے گی۔ ایسے انسان کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ یاد

رکھنا۔"مومن نے جلتے پیازوں میں پانی کا چھڑکاؤ کیا۔شرر کی آواز کچن میں ہر سو پھیل گئی۔بسمہ وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی۔فون اٹھایااور واٹس ایپ کھولا۔وہاں چیٹ لسٹ میں سب سے اوپر ایک میسج جگمگا رہا تھا۔

"اگر تو تم چاہتی ہو وہ اپنی زندگی جیے۔۔۔۔"اس سے آگے کا پیغام چیٹ کے اندر موجود تھا اس نے وہ پیغام کھول کر نہیں دیکھا تھا۔دور اندر وہ اس پیغام کا مفہوم اور مطلب سمجھتی تھی۔اب وقت تھا کہ جواب دیا جاتا۔ وہ خود غرض ہو رہی تھی۔خیر آج کی دنیا میں تو ہر بندہ خود غرض ہے۔اس کی سیاہی اس کے ناخنوں سے جڑ پکڑ رہی تھی۔

بوجھل قدم کبھی انسان کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔بوجھ زنجیر کی طرح انہیں زندگی کی ہر دوڑ میں جکڑ کر منہ کے بل گرا دیتا ہے۔اور اگر یہ بوجھ دل پر پڑ جائے تو دل کو بنجر کر دیتا ہے۔ایسے بوجھ کو دل پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔وہ بھی اس وقت بوجھل قدموں سے جہانداد ملک کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔اسے آج یہ حویلی پرائی معلوم ہوئی۔وہ آگے بڑھتا ہوا ایک کھلے سے دالان میں آرکا۔وہیں پر جہانداد ملک ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔اس نے آنکھوں میں سرخی لیے انہیں دیکھا۔

"یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔؟فون کہاں پر ہے تمہارا کتنی کالز کی ہیں میں نے تمہیں کوئی احساس ہے۔"احساس کی بات کون کر رہا تھا جو دوسروں کے دل گدھ کی طرح نوچ کھاتا تھا۔

"مر نہیں گیا تھا میں زندہ سلامت آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔بتائیں اب کون سا کام پر گیا آپ کو مجھ سے۔"وہ سرد مہری سے بولا۔جہانداد ملک نے اس کی آواز صاف محسوس کی تھی۔لیکن وہ انجان بنے رہے۔

"ہاں ایک ضروری کام ہے مجھے تم سے۔ندیم دار اکا پتا لگوانا ہے وہ کہاں ہے اور کیوں ہے یہ سب تم بتاؤ گے مجھے۔جتنا جلدی ہو سکے یہ کام کرو۔"وہ حکم دے رہے تھے۔وہاج کی آنکھوں میں شرارے پھوٹنے لگے۔

"میں آپ کا ملازم نہیں ہوں۔یہ کام آپ کے چیلوں کے کرنے والے ہیں۔"اس کی بدتمیزی پر جہانداد ملک بل کھاتے رہ گئے۔

"ملازم نہیں لیکن بیٹے ہو تم میرے۔"

"بدقسمتی سے۔"اس نے آنکھیں گھمائیں۔

"کیا کہا؟دوبارہ کہنا ذرا۔"ان کی بات پر وہاج کا دل کیا جیب سے وہ لفافہ نکال کر ان کے منہ پر مارے لیکن وہ ابھی جہانداد ملک کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"وہ تنبیہہ کرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔جہانداد ملک کی حیرانی بجا تھی۔ان کی اولاد نے آج تک ان سے بدتمیزی نہیں کی تھی تو آج کیا وجہ بنی تھی؟وہ سوچنے لگے۔

انہوں نے ایک مرتبہ پھر سے ندیم کا نمبر ٹرائی کیا لیکن آگے سے جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔" انہوں نے زور سے موبائل صوفے پر دے مارا۔ ندیم ان کا فون نہیں اٹھا رہا تھا اوپر سے سونے پر سہاگا کہ وہ حویلی بھی نہیں آیا تھا نہ ہی اس کی لوکیشن کا کوئی سراغ مل رہا تھا۔ اب انہیں اپنے نئے بندے کام میں لانے تھے۔ ان کے پاس غلاموں کی کمی نہیں تھی۔

"ہیلو۔ تمہیں ایک آدمی کا نام اور ضروری معلومات شئیر کی ہیں۔ کل تک مجھے اس کے پیدا ہونے سے لے کر اب تک کی تمام ہسٹری چاہیے۔" وہ اپنے بندے کو فون کال پر نئے کام سے نواز رہے تھے۔ وہ ہر شے سے لاعلم تھے۔ اور لاعلمی سب سے بڑا عذاب ہے۔

وہ مومن کو کال پر گھر آنے کا بول چکی تھی۔ اسے فریال اور باجوہ سے ملنے سینٹر جانا تھا۔ وہ آج بہت دنوں بعد ان دونوں سے ملنے جانے والی تھی۔ اکیلی جا نہیں سکتی تھی لہذا اس نے مومن کو فون کیا۔ اور وہ ایک ہی بار کہنے پر مان چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑی ہینڈ بیگ میں تڑوڑ مڑوڑ کر کوئی فائل ٹھونس رہی تھی۔ سرخ جلد والی فائل اس بیگ کے سائز سے تھوڑی بڑی تھی لیکن وہ اسے یوں سر عام نہیں لے کر جا سکتی تھی۔ وہ آج مکمل سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ شیشے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ بے داغ اور صاف شفاف سفید رنگت۔ لیکن وہاں کچھ تھا۔ ڈر اور خوف۔

اس نے تین پُر سکون سانس لے کر خود کو ریلیکس کیا اور باہر نکل آئی۔ انمول کچن میں کھڑی اپنا ناشتہ تیار کر رہی تھی یا شاید کر چکی تھی۔

"ناشتہ چاہیے۔ بنا دوں؟" وہ بولی۔ بسمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ گھر پر ان دونوں اور صوفیہ ابراہیم کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ صوفیہ اپنے کمرے میں تھیں۔

"اتنی جلدی میں کہاں جا رہی ہو۔؟" اس نے بسمہ سے استفسار کیا۔

"فریال کی طبیعت نہیں ٹھیک تھی ناں تو اس لیے سینٹر جا رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

انمول چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بار بار موبائل دیکھ رہی تھی۔ مومن نے کہا تھا کہ وہ پہنچ کر میسج کرے گا۔ پھر وہ پانی کا گلاس پکڑے اس کی جانب آئی۔ بسمہ نے غٹا غٹ پانی کا گلاس پیا۔ انمول اب صحیح معنوں میں پریشان ہوئی تھی۔

"اپنا سانس درست کر کے گھر سے نکلا کرو بسمہ۔" وہ نصیحت کر رہی تھی۔ بسمہ نے ناسمجھی سے اسے تکا۔

"ہمارا سانس ہمیں پُر سکون رکھنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اگر یہ درست نہ ہو تو انسان بوکھلایا رہتا ہے۔ دنیا میں ستر فیصد ایکسیڈنٹ پریشانی اور ہڑبڑی میں ہوتے ہیں۔ سانس اوپر اور نیچے ہونے کی صورت آپ کی جان لے سکتی ہے۔" وہ کہہ کر خاموش ہوئی۔ بسمہ اس کا خوبصورت چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"آپ بہت اچھی ہیں ملک سر بہت لکی ہیں۔" اس کی بات پر انمول مسکرا دی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس سے زیادہ خوش قسمت تو وہ خود تھی۔

"ملک میرے نصیب میں تھا بسمہ اور مجھے اپنی محبت پر فخر ہے۔"

"آپ خود کو خوش قسمت کہہ رہی ہیں لیکن اس بد قسمت کا کیا جو آپ کو جوے کی مانند ہار گیا۔ اصل خسارہ گر تو وہ ہے۔" وہ دل میں بولی۔

"کیا محبت انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔" اس کے دل نے صدا لگائی اور جواب ہاں میں آیا تھا۔

"آپ ملک سر سے بہت محبت کرتی ہیں ناں۔؟" وہ مسکرا کر بولی۔ انمول نے نفی میں سر ہلایا۔

"محبت نہیں عادت ہے اور یقین مانو عادت سے بڑا نشہ اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اور یہ عادت میری رگوں میں سرائیت کرتی ہے۔" انمول جذب کے عالم میں بولی۔ بسمہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ انمول کو پریشانی لاحق ہوئی۔

"میں نہیں جانتی تمہاری پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے لیکن میں تمہاری خوشیوں کی تمنا کروں گی۔" بسمہ استہزایہ ہنسی۔

"انمول آپ نے کہا تھا میری اور آپ کی کہانی ایک سی ہے۔ لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔"

"کیسے۔؟ دیکھو پانچوں انگلیاں بے شک برابر نہیں ہوتیں لیکن ان کی بیس (Base) یعنی ہتھیلی ایک ہی ہوتی ہے۔" وہ صحیح کہہ رہی تھی جیسے مسلمان ہوتے ہوئے ہم انسانوں میں فرقہ واریت آجاتی ہے۔ ہاتھ کی مثال بھی ایک ایسی ہی ہے۔

"آپ کی اور میری زندگی بہت مختلف ہے آپ نے جسے چاہا اسے پالیا لیکن جسے میں چاہتی ہوں وہ تو کسی اور کو چاہتا ہے۔ کتنی خوش قسمت ہو گی ناں وہ لڑکی جسے وہ چاہتا ہے۔ اور ایک میں ہوں سدا کی بد قسمت جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرا نہیں ہے پھر بھی اس پر مرتی ہوں۔ میری عقل میرے ساتھ نہیں ہے شاید۔" بسمہ کی بات انمول کے دل پر لگی تھی۔ وہ تھوڑی کھسیانی ہوئی۔

"اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔" بات ختم ہو چکی تھی۔ کہنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ نہ بسمہ مزید سوال کر سکتی تھی نہ انمول میں جواب دینے کی سکت باقی تھی۔ وہ اسے اس بات کا جواب نہیں دے پائی تھی۔

بسمہ کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ مومن نیچے پارکنگ ایریا میں موجود تھا۔ وہ انمول کو خدا حافظ کرتی باہر نکل گئی۔ لیکن انمول اپنی جگہ جم چکی تھی۔ اس کا ناشتہ بھی سارا دھرا کا دھرا رہ گیا۔ دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔

اضطراب، دکھ اور صدمہ اس پر ایک ساتھ حملہ آور تھے۔ وہ تذبذب کا شکار ہو تا فون کان سے لگائے ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔

"پلیز کال اٹھاؤ عالیہ۔ پلیز" وہ جھنجھلا کر بولا لیکن کال دوسری جانب سے کاٹ دی گئی۔

"عالیہ!!!" وہ دبا دبا سا غرایا۔ دوبارہ کال ملائی تیسری بیل پر وہ اٹھالی گئی۔

"کہاں مر گئی تھی تم۔ کال کیوں نہیں پک کر رہی۔؟" وہ چھوٹتے ہی گویا ہوا۔

"دیکھو وہاج ملک۔ میری اپنی بھی کوئی پرسنل لائف ہے میں کوئی تمہاری زر خرید غلام نہیں ہوں جو پہلی کال پر ہی فون کان سے لگائے بیٹھی ہوں۔" وہاج کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا۔

"عالیہ جعفری کون سی مصروفیت ہاں۔ بالاج اور جیا کی سیپریشن کروا کر تو تمہیں ہر فکر سے آزاد ہونا چاہیے۔ بلکہ تم ہو گی اور یہاں ایک میں ہوں جس کا انگ انگ دکھ رہا ہے" وہ صدمے سے بولا۔ اپنی تکلیف وہ بھولا نہیں تھا۔

"واٹ! سیپریشن۔؟ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟" وہ چلائی۔ وہاج نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسی۔

"آہستہ نہیں بول سکتی کان کا پردہ پھاڑ دیا تھا تم نے۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں اتنا بچہ ہوں جو تمہاری چالاکی نہیں سمجھوں گا۔" عالیہ نے ناسمجھی سے فون کو گھورا۔ وہ کیا بول رہا تھا۔

"میں کیا کیا ہے وہاج مجھے پتہ تو چلے۔؟"

"کیا تم نے بالاج کو جیا اور میری پکس نہیں بھیجیں۔؟" وہاج نے تحمل سے پوچھا۔

"نہیں وہاج میری ماں یہاں بیمار پڑی ہے بہن کے سسرال والوں نے انہیں ٹانگ کر رکھا ہے اور اوپر سے۔۔" وہ بولتی بولتی خاموش ہوئی۔

"اوپر سے کیا۔؟" وہاج کو تجسس نے آن گھیرا۔

"میرے رشتے والے آئے تھے وہ جلد از جلد نکاح چاہتے ہیں۔ لیکن میں یہ نکاح نہیں کرنا چاہتی۔" وہ رونے کے قریب تھی۔

"تو مت کرو۔ انکار کر دو۔ کوئی بھی تم پر زور زبردستی نہیں کر سکتا۔ عاقل اور بالغ کے لیے اپنا آپ کافی ہوں ا چاہیے۔" وہ بول رہا تھا۔ عالیہ نے صدمے سے موبائل دیکھا کیا تھا وہ شخص؟ اتنی آسانی سے وہ انکار کا بول رہا تھا۔ کیا وہ مشرقی لڑکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہاج ایک پل کو اپنا مسلہ بھول چکا تھا۔

"ہاں اور جیسے میرے ماں باپ تو فوراً مان جائیں گے ناں۔ میرے بابا میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔" اس کا مسلہ زیادہ بھاری تھا۔

"ہاہاہا۔ کتے انہیں ابر اٹیسٹ نہیں کھاتے۔" عالیہ نے لمبا سانس لیا۔

"وہاج ملک میں نے کوئی تصاویر بالاج کو نہیں بھیجیں اور ویسے بھی میں گواپ کرنا چاہتی ہوں معافی مانگ کر معاملہ رفع دفعہ کرنا ہے بس۔" اب کی بار وہاج کو جھٹکا لگا۔ کیا کسی شخص پر گواپ کرنا انہیں آسان ہوتا ہے؟

"تو تم ہار مان رہی ہو۔؟" عالیہ نے لب کاٹے۔

"میں نے سب کچھ کر کے بھی دیکھا ہے لیکن وہ شخص میرا نہیں ہو پایا۔ اب ہمیں اپنے فیصلے تقدیر کے سپرد کر دینے چاہییں۔" وہاج نے توصیفی آبرو اٹھائے۔ وہ لڑکی آج سمجھداری کی باتیں کر رہی تھی۔

"صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس لوٹ آئے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔" عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ واقعی میں گواپ کر کے خوش تھی۔ ہمیں زندگی میں بہت سے مواقع پر لاحاصل شے کے لیے گواپ کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہماری زندگی ختم ہو گئی ہو۔ امید لگا کر زندگی کو ہرا بھرا بنایا جا سکتا ہے۔

"سنو۔"

"ہمم۔" وہ بالکنی کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ سامنے حویلی کا عقب تھا وہاں ملک رہتا تھا لیکن وہ پچھلے کچھ عرصے سے وہاں نہیں تھا۔ حویلی کا ہر پودا ہر تنکا جیسے مرجھا گیا تھا اس کے بغیر۔

"کیا تم مجھ سے نکاح کرو گے۔؟" سپیکر سے عالیہ جعفری کی آواز ابھری۔ وہاج ملک اپنی جگہ ہل کر رہ گیا۔

"شادی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا۔؟"

"شٹ اپ! وہاج میں سیریس ہوں میری ماں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہے لیکن میرے رشتہ جس شخص سے طے کیا جا رہا ہے وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑا ہے اوپر سے اس کا اتنا بڑا خاندان۔" عالیہ نے تفصیل بیان کی۔

"تو کیا میرے ساتھ خوش رہ لو گی۔؟"

"اگر اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ۔" وہاج کی گرفت موبائل پر مضبوط ہوئی۔

"میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گا خر دماغ نہیں ہوں جو جانتے بوجھتے آگ کے دریا میں کود جاؤں۔" عالیہ کے ہنہہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مسکرایا۔

"اگر وہ تصاویر تم نے سینڈ نہیں کی میں نے نہیں کی تو کس نے پہنچائی وہ تصاویر بالاج کے پاس۔" اندازہ اور سراغ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

"حریم ناز تم اسے کیسے بھول گئے وہاج ملک۔" وہاج کو لگا جیسے اسے تپتی دوپہر میں چھایا مل گئی ہو۔ اس نے ایک پل کی دیری کیے بنا کال بند کی۔

"کھڑوس۔" عالیہ نے اسے نئے لقب سے نوازا۔

دوسری جانب وہاج ملک کا ہاتھ کانٹیکٹ لسٹ کھنگال رہا تھا۔ حریم ناز کے نام پر انگوٹھا رکھا۔ بیل جانے لگی۔ کچھ دیر بعد کال اٹھائی گئی۔

"بولو۔" نہ سلام نہ دعا پھاڑ کھانے والا لہجہ۔

"کہاں ہو تم۔؟" وہاج نے بھی سارا لحاظ بالائے طاق رکھ دیا۔

"کیوں فون کیا ہے۔؟"

"بالاج سکندر کو تم نے تصویریں کس سے پوچھ کر سینڈ کی تھیں۔" وہ مطلب کی بات پر اتر آیا۔ بات کو طول دینا اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے؟ آر یو ان یور سینسز مسٹر وہاج۔ میں یہاں مر رہی ہوں اور تمہیں لگتا ہے کہ میں دوسروں کے جھمیلوں میں پڑوں گی۔" وہاج نے کنپٹی سہلائی۔

"اب تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔؟" تھکا ہوا لہجہ۔

"میرے ایکس ہز بینڈ نے میرے بیٹے کی کسٹڈی کے کیے مجھ پر کیس کر دیا ہے۔"

"واٹ! بیٹا؟" وہاج پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ہا۔ ہاں وہ میرے ایکس ہز بینڈ۔۔" وہاج نے اس کی بات کاٹ دی۔

"واہ حریم ناز واہ۔ تم تو ایک بچے کی ماں ہوتے ہوئے بھی بالاج سکندر کے خواب دیکھ رہی ہو اور ایک وہ ہے جو ایک ہی وار پر گواپ کر گئی۔" وہاج کے ذہن میں عالیہ کا عکس لہرایا۔ وہ دونوں بٹلرز کیفے میں بیٹھے تھے۔ اور وہ بول رہی تھی۔

"وہ کون؟"

"تم سے مطلب۔ باجی آپ اپنے گھر والوں پر دھیان دیں تو بہتر ہو گا۔" وہاج نے اسے تپا کر کال کاٹی۔ حریم پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

"اگر تصویریں میں نے نہیں سینڈ کیں۔ عالیہ اس معاملے سے دور ہے اور حریم کو کچھ معلوم نہیں تو آخر یہ تیسرا شخص ہے کون۔؟" وہ تانے بانے بن رہا تھا۔ وہ معلوم کرواں ا چاہتا تھا۔ اسے چین نہیں آنا تھا۔ تبھی اس کے دماغ میں روشنی کا کوندا لپکا۔ ذہن روشن ہوا تھا۔

"مجھے ندیم دارا سے ملنا ہے۔" واٹس ایپ پر ملک کے ہاں پیغام چھوڑا۔

"اوکے۔" کارپلائی بہت جلدی آیا تھا۔ وہاج کا دل ہر بوجھ سے آزاد تھا۔ وہ اپنا اصل جان چکا تھا۔ ضمیر سے بوجھ ہٹ چکا تھا۔ اب بس اسے ایک کام کرنا تھا معافی۔ ہاں معافی۔ جس گناہ کا وہ مرتکب ہونے جارہا تھا اس گناہ کی معافی۔

اور عالیہ جعفری؟ کیا وہ اسے اتنی اہمیت دیتا تھا کہ اس سے نکاح کر لیتا۔ لیکن کیا معلوم نکاح کرنے سے سب ٹھیک ہو جائے۔؟

وہ عالیہ کو سوچ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے نیم رضامندی دکھا چکا تھا۔ اسے اس سب کے لیے لاہور جانا تھا لیکن اس سب سے بھی پہلے اسے ندیم دارا سے ملنا تھا۔

سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے کہ آخر ان تینوں کے علاوہ وہ چوتھا نفوس کون تھا۔؟

دن کے بارہ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ آسمان آگ اگل رہا تھا ایسی ہی گرمی گاڑی کے اندر بھی چھائی ہوئی تھی۔ جس سے بچنے کو گاڑی میں اے سی چل رہا تھا۔ مومن ابراہیم کے ہاتھ سٹیرینگ وہیل پر تھے۔ اور بسمہ شارق کی نظریں اپنے ہاتھوں پر۔ اس کے ہاتھوں تلے اس کا ہینڈ بیگ تھا۔ وہ اسے خود سے دور نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اب تک ریلیکس ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا سانس درست کر لیا تھا۔

"تمہارے باپ کی کیا کہانی ہے؟" مومن کی آواز گاڑی کی ساکن فضا میں گونجی۔ بسمہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس کے باپ کی بات کیوں کر رہا تھا۔؟

"سب جانتے ہوئے بھی تمہیں پوچھنے کی بیماری ہے۔" وہ دوبدو جواباً بولی۔

"دو سال ہی سہی لیکن تم سے بڑا ہوں تمیز سے بات کیا کرو۔" مومن کو اس کا انداز غالباً بھایا نہیں تھا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ اپنا رخ کھڑکی کی جانب موڑ گئی۔

گاڑی ایم ایس مارشل آرٹس سینٹر کے باہر رکی تھی۔ جب مومن ابراہیم کی آواز پر وہ متوجہ ہوئی۔

"واپسی پر میرا انتظار کرنا۔ اکیلے باہر مت نکلنا۔" بسمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چل دی۔ مومن کی نظروں نے اس کا سینٹر کے اندر داخل ہونے تک پیچھا کیا تھا۔ اچانک اس کا موبائل بزر ہوا۔

"ہیلو کون۔؟" نمبر انجان تھا کوئی۔

"اتنی جلدی مجھے بھول بھی گئے۔؟" مصنوعی حیرانی۔

"اوہ تو مسٹر شارق کبیر کیسے فون کیا آپ نے؟" مومن نے سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائی۔

"میری ڈیل کے بارے میں کیا سوچا تم نے۔ بسمہ شارق یا دولت میں سے کس کا سودا عزیز ہے تمہیں۔" وہ اپنی ڈیل کی بابت استفسار کر رہے تھے۔ اس کا مطلب وہ بھولے نہیں تھے انہیں ان دونوں میں سے کوئی ایک چاہیئے تھا۔

"دولت بسمہ شارق سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔" وہ بولا۔ دوسری جانب شارق کبیر نے اونچا سا قہقہہ لگایا۔

"دیکھو لڑکے مجھے ابھی اور اسی وقت جواب چاہیئے۔"

"میں تمہیں بتادوں گا فی الحال مجھے ضروری کام ہے۔" مومن نے گاڑی سٹارٹ کی۔

"لگتا ہے تمہیں بسمہ شارق کی جان پیاری نہیں ہے جو اتنی دیر کر رہے ہو۔ مجھے۔۔۔" مومن کال کاٹ گیا۔ وہ دانت نکوستے رہ گئے۔ یہ شخص ان کے دن برباد کر رہا تھا۔ انہوں نے آج تک اس سے زیادہ ضدی اور گھمنڈی لڑکا نہیں دیکھا تھا۔

"یا اللہ مجھے کوئی سیدھی راہ دکھادے۔" مومن سست روی سے گاڑی چلا رہا تھا اس کی سوچوں کا مرکز بسمہ شارق تھی۔ کیا وہ لڑکی اسے اتنی عزیز ہو چکی تھی کہ اس کے دماغ پر صرف وہ حکومت کرنے لگی تھی؟

وہ تینوں سینٹر کے عقب میں بنے گارڈن میں موجود تھے۔ ہمیشہ کی طرح بسمہ اور فریال بینچ پر بیٹھی تھیں اور عبید باجوہ ان کے سامنے گھاس پر ٹانگیں لمبی کیے بیٹھا ہوا تھا۔

"بارش ہونے والی ہے۔" عبید نے سر آسمان کی جانب اٹھا کر کہا۔

"کوئی امکانات نظر تو نہیں آرہے اور ویسے بھی جولائی میں کون سی بارش۔" بسمہ نے قیاس لگائی۔

"دیکھنا بارش ضرور ہو گی کیونکہ بادل ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ایک مزے کی بات بتاؤں تمہیں پتہ ہے میں ایک دفعہ اپنے گاؤں گیا اور وہاں جون کے مہینے میں ایسے ہی بول دیا کہ بارش ہونے والی ہے سب نے انکار کیا لیکن چند ہی پل گزرنے کے بعد آسمان

پر کالی گھٹائیں چھائیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش برسنے لگی۔"فریال نے دیکھا آسمان پر ایک بادل آرہا تھا تو دوسرا جارہا تھا۔کیا عبید باجوہ کا وجدان دوست تھا۔؟وہ یونہی ہمیشہ ایک بات بتاؤں کہہ کر اپنے گاؤں کی کہانی سنایا کرتا تھا۔

"اللہ کرے کہ بارش نہ ہو۔"بسمہ نے کہا۔

"کیوں؟"فریال اور باجوہ کی گردنیں تیزی سے اس کی جانب گھومیں۔وہ اپنی جگہ چور بن کر رہ گئی۔اتنی گرمی میں کون کافر بارش سے انکار کرے گا۔

"بارش کے بعد کا موسم ہمیشہ مجھے اداس کر دیتا ہے۔پانی کی چند بوندیں گر کر ہماری ضرورت تو پوری کر جاتی ہیں لیکن اس کے بعد کا ابر آلود موسم مجھے اچھا نہیں لگتا۔اس لیے دعا کرو کہ بارش نہ ہو۔"اس کی بات پر فریال اور باجوہ ہوں کر کے رہ گئے۔ایک دم سے ہر سو خاموشی چھا گئی۔پودے بھی خاموش تھے تو ہر گل نے جیسے زبان سی لی ہو۔

"شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟"وہ پوچھ عبید سے رہی تھی لیکن اس کی نظریں فریال کا طواف کر رہی تھیں۔

"لڑکی مانے تو شادی بھی کر لیں گے۔"

"لڑکیاں مانتی نہیں ہیں بلکہ لڑکیوں کو منایا جاتا ہے اور ویسے بھی ہمارے ہاں مشرقی لڑکیاں جواب نہیں دیتیں۔آپ کو چاہیئے کہ رشتہ بھجوائیں۔"عبید نے سر کو خم دیا۔

"ویسے کیا آپ ابھی تک اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔؟"فریال نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"نہیں اب تو ہم یہاں اسلام آباد موو ہو گئے ہیں۔"وہ لوگ مزید چند باتیں کرتے رہے۔جب آسمان گرج دار آواز کے ساتھ گڑگڑایا۔

"لو ہی گئی بارش شروع۔"اور پھر واقعی دیکھتے ہی دیکھتے وہاں زوروں کی بارش برسنے لگی تھی۔وہ تینوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔ان کی کلکاریاں ہوا میں گونج رہی تھیں۔

وہ سینڑ کے باہر کھڑی تھی۔بارش ابھی بھی برس رہی تھی۔مومن نے کہا تھا کہ وہ اسے پک کرے گا لیکن وہ اسے بتائے بغیر کیب منگوا چکی تھی کیونکہ اسے اپارٹمنٹ جانے سے پہلے کہیں اور پہنچنا تھا۔وہ مومن اور ملک کو خبر نہیں لگنے دینا چاہتی تھی۔اس نے اپنے ہینڈ بیگ پر گرفت مضبوط کی۔کچھ ہی دیر میں وہ چھتری پکڑے سبز بیلوں سے ڈھکے بارش میں بھیگتے اس بنگلے کے دروازے پر تھی۔ایک ملازم اسے اپنے ساتھ اس کمرے تک لایا۔اس کی منزل مقصود سامنے تھی۔

آہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے ناں اپنے گھر میں اجنبیوں کی طرح سے آنا۔ وہ دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوئی۔ سامنے صوفے پر شارق کبیر بیٹھے تھے۔ کمرہ مکمل روشن نہ تھا۔ بسمہ کا دل کانپ گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے بس یہ معلوم تھا کہ اسے وہ شخص عزیز تھا تو اس کی خاطر کچھ بھی۔

"فائل۔؟" انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ بسمہ نے بیگ سے دوہری ہوئی فائل نکالی اور شارق کبیر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی ۔انہوں نے تیر کی تیزی سے اسے کھول کر پڑھا۔ انہیں فائل سے غرض نہ تھی انہیں بس ملک کی بربادی سے غرض تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ بکھرتی گئی۔ آنکھوں کی جلن کچھ حد تک کم ہوئی لیکن بسمہ شارق کا دل ڈوب رہا تھا۔

"ویل ڈن بسمہ۔" بسمہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹکنے لگا۔ کیا وہ یہ سب کرنے کے بعد معافی کی حق دار ہو گی؟ دل نے جواب دیا 'نہیں'۔

"اب پتہ چلے گا ملک کو کہ شارق کبیر سے پنگا لینے کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ تمہاری بربادی آج سے شروع ملک۔" وہ فائل ہاتھ میں اٹھائے والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور بسمی شارق کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔

ضمیر کی ملامت انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ کیا وہ بھی آج سے ملامت کاروں میں شامل ہو گئی تھی؟ اگر ہاں تو اس کے ضمیر کی ملامت اس کے جسم سے خون کا کوئی آخری لوتھڑا بھی نہیں مٹا سکتا تھا۔

وہ جب گھر پہنچی تو مومن ابراہیم گھر پر نہیں تھا۔ وہ طبیعت خرابی کا بہانہ کرتی اپنے کمرے میں گھس آئی۔ وہ اب متذبذب سی ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ مومن کو معلوم ہو جانا تھا اگر وہ اسے لینے سینٹر پہنچ جاتا تو۔ وہ ڈر رہی تھی۔ اس کا دل واہموں میں گھر رہا تھا۔ لیکن وہ بسمہ شارق تھی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کیا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ بزدل بن رہی تھی۔

کیا محبت انسان کو اتنا کمزور کر دیتی ہے۔ ہاں محبت انسان کے جذبات کو اجاگر کرتی ہے۔ اور جذباتی انسان ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ محبت انسان کو کمزور نہیں کرتی، جذبات کرتے ہیں۔

وہ لاشعوری طور پر مومن کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آئے گا تو وہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے گی۔ آگے وہ جانے اور بسمہ کا باپ۔

تبھی اس کے کمرے کا دروازہ بنا دستک کے کھلا۔ اندر داخل ہونے والا شخص مومن ابراہیم تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ گہری بھوری آنکھوں کا تصادم سرمئی آنکھوں سے ہوا۔ کچھ تھا ان آنکھوں میں جو سرمئی آنکھوں نے جھرجھری لی۔ وہ آگے بڑھا۔ بسمہ کا جسم کپکپانے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے لب کھولے لیکن۔

"چٹاخ!" پہلا تھپڑ، پہلی اذیت اور دل میں اٹھتا درد۔ آہ۔

مومن نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔وہ بسمہ کی ایک بھی سنے بغیر اسے تھپڑ سے نواز چکا تھا۔وہ اپنے بائیں گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے سرخ و سپید گالوں کی زینت بننے لگے۔

"جو تم کر چکی ہو ناں بسمہ شارق میر ا بس چلے تو تمہیں زمین میں گاڑھ دوں۔کیونکہ تم جیسے بزدل کیڑوں کی سرزمین مٹی ہی ہوتی ہے ۔خاک ہو تم۔"وہ دھاڑا۔اس کی آواز سے پورا اپارٹمنٹ گونج اٹھا۔انمول اور صوفیہ بھی بسمہ کے کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔

"تم نے آج تک کوئی محرومی نہیں دیکھی بسمہ شارق کبیر "اسکی آواز میں نمی اترنے لگی۔کیا تھی وہ لڑکی۔کتنی سفاک تھی ناوہ۔کتنی ظالم۔

"م۔مم۔مومن۔"اس نے کچھ بولنا چاہا۔

"خاموش۔!"وہ پھر سے چیخا۔بسمہ کا دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔انمول اور صوفیہ دروازے میں ایستادہ ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔وہ دونوں ہی اس کی غلطی سے لاعلم تھیں۔کیا بسمہ شارق کا جرم قابل معافی تھا؟

اس نے صبح صبح ہی وہاج کو میسج چھوڑا تھا کہ وہ اسے حویلی سے پک کر لے گا۔اس وقت وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔وہاج خاموشی سے بیٹھا تھا۔وہ اس دن کس مشکل سے وہاں سے نکل کر آیا یہ صرف وہی جانتا تھا۔وہ دن،وہ پل بہت برے گزرے تھے اس کے۔لیکن جو راز وہ وہاں سے لے کر آیا تھا اس نے وہاج ملک کی زندگی بدل دی تھی۔ہاں وہ بدل گیا تھا اس نے خود کو بدلنے کا عزم کر لیا تھا۔

اگر کوئی پیادہ شطرنج میں ہار جائے تو وہ دوسری چال نہیں چل پاتا وہ بھی اس وقت ایک ہارا ہوا پیادہ تھا جو نئی بازی شروع ہونے کا منتظر تھا۔زندگی کی نئی بازی اسے سب سکھا دینے والی تھی کیونکہ وہ پر عزم تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے۔؟"ملک نے اسے دیکھا وہ خاموشی سے اب اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔جیسے جواب دینے کے لیے ناپ تول کر رہا ہو۔

"ایسا کہ زندگی تھما کر سانسیں چھین لی گئی ہوں۔"ملک کو افسوس ہوا۔وہ اس سے چھوٹا تھا۔بھلے اس نے بہت برا کیا تھا لیکن وہ اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا۔

"اللہ پر توکل کرو وہ سب ٹھیک کر دے گا۔"وہاج نے سر ہلایا۔

"وہ غفور الرحیم ہے۔"وہاج کی آواز ابھری۔

"بالکل۔"ملک نے تائید کی۔

"تو وہ مجھے بھی معاف کر دے گا۔ہاں؟" وہ آنکھوں میں امید کے دیے جلائے پوچھ رہا تھا۔ملک نے گہری سانس بھری ان کی منزل مقصود آچکی تھی۔ملک نے گاڑی روک دی۔

"اللہ تعالیٰ حقوق اللہ تو معاف کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد کی کوئی معافی نہیں۔اپنے رب سے معافی مانگنے سے پہلے اس کے بندوں سے معافی مانگو۔اگر وہ تمہیں معاف کر دیں تو تم نوازے جاؤ گے اللہ کی رحمت سے اور بخشش سے۔" ملک سیٹ بیلٹ کھولتا باہر نکل گیا۔وہاج بھی دوسری طرف سے باہر نکلا گاڑی کا دروازہ واپس بند کرتے اس نے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

" آرام گاہ۔" وہ سکون سے بولا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے آگے چل دیا۔وہاج نے بھی اس کی تقلید کی۔

وہ دونوں آگے بڑھ رہے تھے اور تمام آرام گاہیں جیسے ان کا دیدار کر رہی تھیں۔ملک کا انداز پر سکون تھا تو وہیں وہاج کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"ملک۔"

"ہاں بولو۔" پُر سکون لہجہ۔آرام گاہ کی طرح آرام دہ انداز۔

"مم۔مجھے گھ۔گھٹن ہو رہی ہے۔" وہ اٹک گیا۔الفاظ منہ سے نکلنے سے انکاری ہو گئے۔ملک نے آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھا۔

"ابھی سے ڈر گئے۔" انداز رازدارانہ تھا۔خفیہ لہجے سے وہاج کو وحشت ہونے لگی۔یہ وہ اسے کہاں لے آیا تھا۔کیسی آرام گاہ تھی وہ۔ملک استہزایہ ہنسا۔آنکھوں میں بھی استہزایہ پن اتر آیا تھا۔انداز ایسا تھا کہ ابھی سے ڈر گئے۔کیا کوئی اور امتحان ابھی باقی تھا۔؟

آج موسم کافی خوشگوار تھا زیادہ گرمی تھی نہ ہی زیادہ حبس بس متناسب سا ماحول۔وہ ہاتھ سے چائے کی ٹرالی گھسیٹتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔سامنے آمنے سامنے رکھے صوفوں میں سے ایک پر اس وقت جیا سکندر براجمان تھی تو اس کے بالکل سامنے وجیہہ سا ملک براجمان تھا۔وہ کافی دیر سے وہاں موجود تھا تقریباً ایک آدھ گھنٹے سے۔جیا اس پر اعتبار کر رہی تھی کیونکہ وہ اس کا محافظ تھا۔وہ بالاج کے مقابلے میں بھی اس پر زیادہ بھروسہ کر سکتی تھی۔یہ شخص اس کی ہر جگہ حفاظت کرتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کا نام کیا ہے لیکن میں آپ کو اینجل بلاؤں گی۔" معصوم سی جیا کی معصوم سی خواہش۔

"جو تمہارا دل چاہے۔" وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا۔اس قدر رں رم لہجہ اس نے آج تک کسی سے اختیار نہیں کیا تھا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے اب چلنا چاہیے مجھے۔" وہ کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔نجمہ (ملازمہ) چائے پیش کر رہی تھی۔

"ارے آپ چائے تو پیتے جائیں۔" جیا نے بھرے ہوئے کپ کی جانب اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی مختلف لوازمات رکھے گئے تھے۔

"نہیں گڑیا پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے چلنا ہو گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ جیا کی آنکھیں نم ہوئی تھیں کاش آج اس کا بھائی بھی زندہ ہوتا تو وہ اس سے کتنا پیار کرتا۔ ہاں وہ ملک سے لاعلم تھی۔

وہ مین گیٹ سے باہر نکلتے وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا چکا تھا۔ باہر دھوپ تھی اور اس کی ہیزل گرین آنکھیں ایسی دھوپ سہن نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا اور دور گلی کی نکر پر کوئی شخص گاڑی میں بیٹھا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں اور کس کے لیے آیا تھا۔ بس دل کیا اور وہ آ گیا۔ ہاں دل انسان کو مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سارے کھیل دل کے ہی تو ہوتے ہیں۔ دل کیا تو یہ کر لیا دل نہ کیا تو چاہنے کے باوجود وہ کام ترک کر دیا۔

"تو تم نے یہ تماشہ اب اپنے گھر میں شروع کر دیا جیا سکندر۔ آئی ول ناٹ سپیئر یو۔ (میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔)" وہ غرایا۔ ہاتھ اور دماغ کی نسیں پھولنے لگی تھیں۔ غصے کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ سامنے وہ شخص آنکھوں پر چشمہ لگائے دھیمی مسکراہٹ سے اپنی گاڑی کے قریب پہنچ رہا تھا۔ وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ اور بالاج سکندر کی بس ہوئی تھی۔ اس نے زن سے گاڑی آگے بڑھائی اور سکندر حویلی کے سامنے لا کر روک دی۔ دروازہ کھولتا وہ اندر داخل ہوا۔ گارڈ کے سلام کا جواب دینا بھی وہ بھول چکا تھا۔

"باجی جی وہ صاحب کون تھے۔؟" ڈرائنگ روم کے اندر سے اسے ملازمہ کی آواز سنائی دی۔ وہ سننا چاہتا تھا لیکن جیا کے روبرو جا کر۔

"آپ جائیں یہاں سے۔" اس نے ملازمہ کو مخاطب کیا وہ سلام کرتی وہاں سے چلی گئی۔ جیا اس سنگدل کی آواز پر ہی تھم چکی تھی۔ بالاج سکندر اس کے پیچھے آیا تھا کیا واقعی؟

"آ۔ آ۔ آپ۔ یہاں۔" اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ بالاج نے تنفر بیزاری سے اسے دیکھا۔ جیا کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"کیوں کیا میں نہیں آ سکتا یہاں؟ یا پھر تم اپنے کسی اور عاشق۔۔"

"شٹ اپ بالاج۔" اس کا ہاتھ اٹھا لیکن وہ اسے درمیان میں ہی روک چکی تھی۔ کیا وہ بالاج پر ہاتھ اٹھا سکتی تھی؟ نہیں کبھی بھی نہیں۔

"کیا ہوا رک کیوں گئیں جیا۔ مارو ناں مارو تھپڑ یہی کسر باقی رہ گئی ہے اب تو۔ جیا واجد سکندر۔" جیا کی شکل رونے والی ہوئی۔ اس کا ارادہ قطعاً یہ نہیں تھا۔ آہ وہ بے رحم سکندر۔ وہ کیوں اتنی بے اعتباری دکھا رہا تھا کیا وہ بعد میں زرہ برابر بھی برداشت کر سکتا تھا۔

"جیا واجد نہیں جیا بالاج سکندر ہوں میں۔ سمجھے آپ۔" وہ بھی جواباً چیخی۔

"کون تھا وہ مرد؟ اور تمہارے گھر پر کیا کر رہا تھا ہاں بولو جواب دو مجھے جیا سکندر۔" بالاج دھاڑا۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ وہ شخص اس کی جیا کے گھر آیا تھا۔ جو تصاویر اسے موصول ہوئی تھیں ان میں وہاج ملک کا چہرہ واضح نہ تھا اس لیے وہ اس شخص کو وہاج سمجھنے لگا تھا۔ یہ بد گمانیاں اور غلط فہمیاں انسان کو مار دیتی ہیں۔

"آپ کو جواب دہ نہیں ہوں میں اور آپ ہوتے کون ہیں میرے گھر میں کھڑے ہو کر میرے کردار پر سوال اٹھانے والے۔ خود کیا ہیں آپ؟ حریم ناز کو بھول گئے کیا؟" اس نے بالاج کو آئینہ دکھایا۔

"تم سے جتنا پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ بتاؤ مجھے یہ وہاج تھاناں؟ ہاں یاناں۔؟" اس نے جیا کو جھنجھور کر رکھ دیا۔ وہ اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے عقب میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ سالا آج بچے گا نہیں میرے ہاتھوں۔" وہ کہتے ہوئے اس بات سے انجان تھا کہ سامنے کھڑا شخص حقیقتاً اس کا سالا بھی ہو سکتا ہے۔

"اینجل۔" جیا کی آواز پر بالاج پلٹا اور اسے لگا وہ اگلا سانس نہیں لے پائے گا۔ مقابل شخص کی عینک گریبان میں اٹکی ہوئی تھی۔ خوبرو چہرہ روشن پیشانی اور اس پر تضاد اس کی ہیزل گرین آنکھیں۔ ان آنکھوں کو تو وہ سات پردوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ آنکھیں تو اسے حفظ تھیں۔

"میرا۔ موبائل رہ گیا تھا۔" اس نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا۔

"ماہیر سکندر۔" بالاج کے لبوں نے سرگوشی کی۔ لیکن جیا سکندر کو وہ اس کی آواز اپنے کانوں میں ڈھول پیٹتی محسوس ہوئی۔ اس کے سر پر آسمان ٹوٹ کر گرا۔ کیا وہ ماہیر سکندر تھا؟ کیا وہ جیا سکندر کا بھائی تھا۔؟ ہاں وہ اس کا سگا بھائی تھا۔

وہ بالاج سکندر کا بچپن کا بھائی تھا۔ وہ اس کا دوست تھا بلکہ وہ دوست نہیں تھا وہ تو رگِ جاں تھا جو اسے سمجھتا تھا، اسے پرکھ سکتا تھا۔ ہمیشہ اس کے ہمقدم اس کے آگے کھڑا ہوتا تھا۔ وہ ماہیر سکندر تھا بالاج سکندر کا جان سے عزیز دوست۔ وہ دوست جس کے لیے بالاج سکندر نے پورے اٹھارہ سال آنسو بہائے تھے۔ دوستی بہت عام ہوتی ہے لیکن دوستی میں وفا اسے خاص بنا دیتی ہے۔

وہ بھی دوستی میں ہر حد پار کر گیا تھا۔ اگر اسے رتی برابر معلوم ہوتا کہ اس کا جگر اس دنیا میں سانسیں بھر رہا تھا تو وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔

"یہ تم ہو ناں ماہیر۔؟ میرے بھائی۔" بالاج کا لہجہ رندھ گیا۔ ادھر سبز آنکھوں میں آگ جلنے لگی۔ وہ پیچھے کی جانب پلٹنے لگا۔ الٹے قدموں کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔

"ماہیر سٹاپ اٹ یار مزید کتنا تڑپاؤ گے۔؟" بالاج نے اپنے قدم اس کی جانب لیا۔ جیا سکندر ساکت نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"بب۔ با۔ لاج۔" وہ ماہیر کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن جیا کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس کی آنکھیں نم تھی تو لب وا تھے۔ ایک جیا تھی جس نے اس کی سے بے وفائی کی تھی اور دوسرا وہ تھا جس کا بالاج نے اٹھارہ سال انتظار کیا تھا۔ وہ کہاں جائے۔؟

باب نمبر:7

'وہ کہاں جائے؟'دوست کے پیچھے یا اپنی محبت کے لیے یہیں رک جائے۔ فیصلے کا وقت نہیں تھا۔جیا سکندر کا توازن بگڑا وہ لڑکھڑائی اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوتی بالاج سکندر نے اسے نرمی سے تھام لیا تھا۔وہ بالاج سکندر کی بانہوں میں جھول گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ آنسو تھم گئے۔بالاج سکندر کا دل رک گیا۔ہر شے کی طرح ساکت اور ساکن۔

وہ اپنی محبت کے لیے رک چکا تھا۔محبت ہی انسان کو روک لیتی ہے۔بالاج کے بھی پیروں میں بیڑیاں ڈل گئیں۔کیا واقعی؟

اگلے چند لمحات میں وہ جیا سکندر کے کمرے میں سینے پر بازو باندھے پریشان کن نظروں سے ڈاکٹر کو اس کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے مسٹر سکندر۔شدید ٹینس اور کمزوری کے باعث یہ بے ہوش ہوئی تھیں۔ آپ کو ان کا بہتر خیال رکھنا ہو گا۔ان شاءاللہ بہت جلد یہ صحت یاب ہو جائیں گی۔"ڈاکٹر نے اپنی سناتے ایک چٹ پر چند ادویات کے نام گھسیٹے۔پھر وہ چٹ بالاج کی جانب بڑھائی۔اس کی نظریں جیا پر ٹکی ہوئی تھیں۔وہ اب تک بے ہوش تھی۔بقول ڈاکٹر کے وہ کچھ گھنٹوں تک مکمل ہوش میں آجائے گی۔

"آئیں میں آپ کو باہر تک چھوڑ دیتا ہوں۔"بالاج نے ڈاکٹر کا بیگ تھامتے اپنے قدم کمرے سے باہر نکالے۔وہ بھی اس کی تقلید میں چلتی ہوئیں باہر نکل گئیں۔اب وہاں محض جیا سکندر رہ گئی تھی۔

بالاج کی واپسی اگلے چند منٹوں میں ہوئی۔وہ جیا کے قریب ایک جانب آبیٹھا۔بہت غور سے اسے دیکھتے ہوئے بالاج کو پہلی مرتبہ خود پر افسوس ہوا۔کیا وہ مرد معافی کے قابل تھا۔نہیں جیا اگر اسے ساری زندگی معاف نہ کرتی تو بھی وہ حق بجانب تھی۔

"میں ہر شے کا ازالہ کر دوں گا جیا۔ آئندہ کوئی دکھ یا درد تمہارے پاس آنے سے پناہ مانگے گا۔"اس نے جیا کی پیشانی سے بال ہٹائے۔اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔کچھ دیر مزید وہ وہاں بیٹھا آج ہوئے واقعے کو سوچتا رہا۔دماغ اور دل جنگ برپا کر رہے تھے۔اگر ماہیر سکندر زندہ تھا تو وہ لاش کس کی تھی جو آج سے اٹھارہ سال قبل انہیں ثبوت کے طور پر دکھائی گئی۔وہ تو اسے دیکھ ماہیر کے انتقال کی نشاندھی کر چکے تھے۔

لیکن اس کا انتقال کبھی ایک جہاں سے دوسرے جہاں ہوا ہی نہ تھا۔وہ تو آج بھی زندہ تھا۔

دوستی دیمک کی طرح ہوتی ہے۔یہ آہستہ آہستہ انسان کے جذبات اور احساسات کو چاٹ جاتی ہے اور آخر میں انسان اندر سے کھوکھلا ملتا ہے جسے دنیا خود غرض اور سنگدل کہہ کر رد کر دیتی ہے۔

وہ بھی دوستی میں ہر حد پار کر گیا تھا۔ اگر اسے رتی برابر معلوم ہوتا کہ اس کا جگر اس دنیا میں سانسیں بھر رہا تھا تو وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے خود کو ان سب سے کیوں چھپایا۔؟ کیوں اس نے اپنے عزیز از جان رشتوں کو اپنی دائمی جدائی کے غم میں تڑپایا؟ وہ کہاں تھا اتنے سال۔؟ ان تمام سوالات کے جوابات اسے صرف ماہیر سکندر ہی دے سکتا تھا۔ لیکن وہ اب اسے کہاں ڈھونڈے۔؟ وہ تو جا چکا تھا۔

"ایک بار ملو تم ماہیر سکندر تمہیں تو میں سارے رشتے یاد دلاؤں گا۔" اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جیا کے بالوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اس کے بال بہت ریشمی اور ملائم تھے۔ وہ انہیں چھونے سے بھی ڈرتا تھا۔ تبھی چند ایک بال اس کی انگلیوں کے ناخن میں پھنس گئے۔ وہ خیالات کی دنیا سے باہر نکلا۔ اگلے ہی پل اس کے دماغ میں جھماکہ ہوا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیا پر کمفرٹر درست کرتا وہ اسی تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اسے معلوم ہو چلا تھا۔ لاعلمی کے عذاب سے نجات مل چکی تھی۔

اٹھارہ سال بیتے نہیں تھے بلکہ بالاج سکندر نے انہیں گزارا تھا ہر اس یاد ہر اس بات کے ساتھ جو ماہیر سکندر سے جڑی تھی۔

وہ دونوں آگے بڑھتے جا رہے تھے اور تمام آرام گاہیں مجسم بنی انہیں تاک رہی تھیں۔ دفعتاً ملک ایک آرام گاہ کے قریب رک گیا۔ ڈر و خوف سے زرد ہوتے وہاج ملک کے قدم اس کے ساتھ ہی تھم گئے۔ اس نے ملک کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں ایک تختی لگی ہوئی تھی۔

'ندیم دارا

آخری آرام گاہ'

وہاج سانس لینا بھول گیا۔ اسے نہیں معلوم پڑتا تھا کہ اپنی زندگی کے تئیس سالوں میں کبھی وہ یوں تڑپا تھا۔ جو تڑپ اب اس کے دل میں اٹھی اس کا سامنا وہ زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اس کے سامنے موجود قبر میں پڑا وہ شخص بھی خالی ہاتھ تھا۔ انسان دنیا سے لے کر ہی کیا جاتا ہے؟

وہ ایک دم سے زمین پر گھٹنوں کے بل گرا۔ آنکھوں میں خوف کی جگہ دکھ اور کرب نے لے لی۔ وہاج کا ہاتھ دھیرے سے قبر کی مٹی پر گردش کرنے لگا۔ مٹی تازہ تھی۔ ٹھنڈی اور نم۔

ملک نے ارد گرد نگاہ دوڑائی وہاں ہر جانب ایسی ہی قبریں تھیں۔ سفید اور بھوری۔ انہیں سب سے پورا قبرستان بھرا ہوا تھا۔ ہر جانب ایک سی آرام گاہیں۔ ملک کا ذہن انہیں میں ڈوبتا چلا گیا۔

چند روز قبل:

وہ ہسپتال کا منظر تھا۔ ملک ندیم کے قریب بیٹھا تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے جواب کا منتظر نظر آتا تھا۔

"میرا باپ کہاں ہے بھائی۔؟" وہ دوبارہ بولا۔ ملک نے ہونٹ بھینچ لیے اور جب وہ بولا تو آواز میں سرسراہٹ تھی۔ ایسی ہی ایک سرسراہٹ ندیم کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرائیت کرتی محسوس ہوئی۔ وہ بول رہا تھا۔

"تم کیوں جاننا چاہتے ہو اس شخص کے متعلق؟ کیا اس لیے کہ وہ شخص تمہارا باپ تھا یا اس لیے کہ تم اس کا انجام جاننا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ تمہارا باپ وہ جو گناہوں کے دلدل میں پور پور دھنس چکا تھا آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس کی چلتی سانسیں سالوں پہلے ہی دم توڑ چکی ہیں۔" ندیم کے چہرے پر کرب ابھرا ابھرا سے اپنے سینے کے بائیں جانب درد اٹھتا محسوس ہوا۔

"کیا میرا باپ مر چکا ہے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"ہاں تمہارا باپ مر چکا ہے ندیم۔ آج سے بہت سال پہلے وہ اپنے اصل انجام کو پہنچ گیا تھا۔" ملک اٹھ کھڑا ہوا وہ ندیم کو تکلیف میں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آکر رک گیا۔

"اسے میں نے نہیں مارا تھا ندیم۔ وہ اپنی موت آپ مرا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ جہانداد ملک کے ہاتھوں کتے کی موت مرتا لیکن میرے ہاتھوں میں اسے ایک عزت دار جنازہ نصیب ہوا تھا۔ جس کی چاہ شاید ہی اس نے کبھی کی ہو۔" وہ سنجیدہ نظر آتا تھا۔

"میرے سوال کا مطلب ہر گز وہ نہیں تھا بھائی۔ میں جانتا تھا کہ میرا باپ آپ کے پاس تھا لیکن وہ مر چکا ہے یہ مجھے ابھی معلوم ہوا۔ خیر برائی کا دنیا سے اٹھ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ موت اس کا نصیب تھی وہ تو سب کا نصیب ہوتی ہے۔ کل آپ کی جان بچانے کا مقصد آپ کے احسانوں کا بوجھ تھا جو آپ نے مجھ پر اور میری ماں پر کیے۔ میں جانتا ہوں کہ بغیر کسی آمدن کے میری ماں کیسے اکیلے رہا کرتی تھی اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے اتنے مہنگے کالج کے اخراجات کیسے اور کس کے ذریعے پورے ہوتے تھے۔ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ میں جب اپنی ماں کے چل بسنے کے بعد پاکستان لوٹا تو معلوم ہوا کہ وہ عظیم شخص کون تھا۔ جہانداد ملک کی غلامی میرا مقصد تھی۔ اور میرا دوسرا مقصد...." وہ ایک دم خاموش ہوا۔ آنکھیں تکلیف سے بند ہونے کے در پر تھیں۔

"وہاج ملک کو حاصل کرنا تھا۔" ملک نے چونکتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ یہ بات اس کے لیے نئی تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔؟"

"وہاج ملک جہانداد ملک کی اولاد نہیں ہے بھائی وہ لڑکا میرے باپ کی ناجائز پیداوار ہے۔ وہ شخص میرا بھائی ہے۔ اس کی رگوں میں میرے باپ کا خون دوڑتا ہے۔ میں اپنا پورا خاندان گنوا چکا تھا اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔" ملک کی آنکھیں حیرت سے

پھیلیں۔لب اوہ کی صورت سکڑے۔وہاج جہانداد ملک کا بیٹا نہیں یہ تو وہ جانتا تھا لیکن وہ ندیم کا بھائی اور سلیم کا بیٹا ہو سکتا ہے یہ بات اس کے علم میں نہ تھی۔در حقیقت اس نے کبھی وہاج ملک کے بارے میں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

"اور تمہارا تیسرا مقصد صوفیہ ابراہیم کی قید سے رہائی تھا۔کیوں؟"ملک نے استفسار کیا۔

"میرا باپ ایک وفادار دوست اگرچہ نہیں تھا لیکن وہ غلامی بہت وفا کے ساتھ نبھاتا تھا۔اس کے ابراہیم داؤد کے ساتھ تعلقات بہت پرانے اور دوستانہ تھے۔وہ اپنی غلامی میں ہر حد سے گزر گیا یہاں تک کہ صوفیہ ابراہیم کو اذیت دینے کا باعث بھی بنا۔لیکن وہ ہمیشہ اپنی اس غلطی پر شرمسار رہا تھا۔اسے ہمیشہ سے ابراہیم داؤد سے ہمدردی رہی تھی۔مومن ابراہیم کی زمہ داری آپ کو سونپنے کا بھی اسے میرے باپ نے کہا تھا بے شک وہ آپ سے بے خبر نہ تھا۔"ندیم بول رہا تھا اور ملک کی پہیلیوں کی گتھیاں خود بخود سلجھتی جا رہی تھیں۔وہ سارا گیم سمجھ رہا تھا۔وہ ہمیشہ خود کو شطرنج کا پیادہ سمجھتا آیا تھا لیکن اس میں بادشاہ جہانداد ملک تھے۔جسے شہ مات صرف اس کی ملکہ دے سکتی تھی۔ملکہ یعنی اس کے وفادار۔اس کا دل چاہا وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"مجھے درد ہو رہا ہے بھائی۔"ندیم کراہا۔ملک تیر کی تیزی سے اس کے قریب آیا۔وہ اپنے سینے کو مسل رہا تھا۔

"ندیم ندیم... کہاں درد ہو رہا ہے؟فکر نہیں کرو تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"ملک کو اپنے الفاظ کھوکھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"میری ایک آخری خواہش پوری کریں گے بھائی۔؟"اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ امید تھی۔

آئی سی یو مانیٹر پر ہارٹ ریڈنگ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ایک دم بڑھ جاتی اور پھر سے مدھم۔

"ندیم حوصلہ کرو اور مجھے بتاؤ کیا چاہتے ہو تم۔؟"

"میرے بھائی کو معاف کر دیجیے گا بھائی۔وہ گناہگار ضرور ہے لیکن وہ اس گناہ کا مرتکب نہیں جسے لوگ گناہ کبیرہ کہتے ہیں۔"وہ بول رہا تھا۔ملک نے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں۔

"اس نے آپ کی بہن کے ساتھ برا کیا بہت برا کیا۔لیکن وہ اس کا گناہگار نہیں ہے۔وہ غلط تھا اور غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔اس کی غلطی کو معاف کر کے راہ راست پر لانا آپ..کا..کام.....ہے.....بھائی!"ندیم کی آنکھیں بند ہوتی گئیں۔اس نے سر کو جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ندیم نے خود کو آسمان اور زمین کے درمیان معلق پایا۔آخری الفاظ جو اس کی سماعت میں اترے وہ ملک کے تھے۔وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔اس سے کسی شے کا وعدہ کر رہا تھا لیکن اس کا جسم ٹھنڈا پڑتا گیا۔

"ندیم۔"ملک دھاڑا۔جس وقت مومن ابراہیم کمرے کے اندر داخل ہوا تب تک ہسپتال کے اس کمرے میں موجود وہ مریض دم توڑ چکا تھا۔ملک اس پر جھکا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

مومن کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔کاش وہ اس شخص کا شکریہ ادا کر پاتا جس نے اس کی ماں کو جہاندادملک جیسے ظالم دیو کی قید سے رہائی دلوائی تھی۔

"بھائی ہی ازڈیڈ۔"مومن نے ملک کو پیچھے کی جانب دھکیلا۔وہ بے یقینی سے ندیم دارا کے ساکت وجامد وجود کو دیکھ رہا تھا۔روح بھی جسم سے وفادار نہیں ہوتی،ادھر جسم ٹھنڈا پڑا اور اِدھر روح پرواز۔

"بھائی۔"مومن نے اس کا سکتہ توڑا۔وہ نفی میں سر ہلاتا پیچھے کی جانب بڑھتا گیا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ آج تاریخ دوہرائی جائے گی۔ چند سال پہلے اس کے باپ نے بھی ملک کے ہاتھوں میں اپنی جان دی تھی۔بہت سے راز اسے تھمائے تھے اور آج ان کا بیٹا بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گیا تھا۔

اس نے ڈاکٹرز کو اندر آتے دیکھا۔وہ مومن کو ہدایات دے رہے تھے۔پھر انہوں نے سفید چادر سے ندیم دارا کا وجود ڈھک دیا۔اس کی آنکھیں تاقیامت بند ہو کر رہ گئیں۔

موجودہ دن:

"بھائی۔"وہاج کی آنکھوں سے گرم سیال بہنے لگا۔رندھی ہوئی آواز نے ملک کو حال میں پٹکا تھا۔وہاج اس قبر کی پائنتی پر سر ٹکائے ہوئے تھا۔بلک بلک کر رونے کی آواز ملک کے اعصاب جھنجھوڑنے لگی تھی۔

"انجام دیکھ رہے ہو اس کا۔"ملک اس کے کندھے کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"کسی دن تمہارا اور میرا انجام بھی یہی ہو گا۔"اس کی آواز سرد تھی۔کوئی اتنے سفاک الفاظ بھی بول سکتا ہے۔

"میرے خاندان کا آخری فرد بھی آج نیست ونابود ہو گیا۔یا اللہ میں کیا کروں۔؟"اس کی آواز نم تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

ملک نے افسوس سے اسے دیکھا۔افسوس انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔

"تمہاری زندگی اس وقت جس دوراہے پر آ کھڑی ہوئی ہے وہاج ملک اسے تم نے چننا ہے۔مختلف راستوں میں سے کسی ایک راستے کو چننے والے تم خود ہو گے وہاج۔کیوں کہ زندگی ایک بار ہی ملتی روز روز تو مواقع ملتے ہیں۔"وہاج کے آنسو ایک پل کے لیے تھم گئے۔اس کی ساری حسیات ملک کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"تم چاہو تو زندگی کو ایک نئے موڑ پر لا سکتے ہو۔ایک نئے انداز میں جی سکتے ہو۔یہ تمہیں دوبارہ نہیں ملے گی سو اسے جینا سیکھو۔"ملک نے فیصلے کا اختیار وہاج پر چھوڑا۔وہ ندیم کی آخری خواہش پوری کر رہا تھا۔وہ وہاج کو ہدایت دے رہا تھا آگے وہ خود جانے۔

"اور بدلہ۔؟"وہ بولا۔

"یہ کبھی ختم نہیں ہو گا وہاج۔ بدلے جنم لیتے ہی کبھی نہ ختم ہونے کے لیے ہیں۔ ان کی چاہ آپ کا یا دشمن کا اختتام ہے اختتام یعنی موت۔ (پھر قبر کی جانب اشارہ کیا) کسی مرے ہوئے شخص کی آخری خواہش کا احترام کرنا چاہیے تمہیں۔" اس کے بعد وہ رکا نہیں بلکہ جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان آرام گاہوں سے نکلتا چلا گیا۔

وہاج نے دوبارہ اس قبر کو دیکھا۔ وہاں سویا وجود اس کے خاندان کا آخری حصہ تھا جو آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سویا پڑا تھا۔

"انتقام کا جنون مجھے ختم کر دے گا بھائی۔ لیکن میری دعا ہے کہ ہمیں برباد کرنے والے اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ میں وہاج ملک آج اس پل سے خود کو بدلتا ہوں۔ میں اپنی گزری تمام تر زندگی سے دستبرداری حاصل کرتا ہوں۔ میری خواہش اب سے جینے کی ہے۔ اور میں اپنی زندگی جیوں گا۔" وہ ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت جو اس کے دماغ میں پہلا خیال آیا وہ جیا سکندر کا تھا اور اس کے بعد عالیہ جعفری۔

"مومن!" صوفیہ ابراہیم کی تیز آواز پر وہ دونوں دروازے کی جانب متوجہ ہوئے۔ بسمہ آگے بڑھتی ان کے سینے سے جا لگی۔ انمول حیرت سے آنکھیں پھیلائے معمالات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے مومن۔ ساری غیرت بیچ کھائی ہے جو ایک لڑکی پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔؟" ان کی آواز تیز تھی۔ مومن کے دماغ کی شریانیں کھولنے لگیں۔ بسمہ کی وجہ سے اس کی ماں اس سے بدظن ہو رہی تھی۔

"جانتی نہیں ہیں آپ اسے ایک نمبر کی مکار لڑکی ہے یہ اور اصل تماشا تو تب لگے گا جب بھائی کے پچھلے آٹھ سال کی محنت بیچ چوراہے پر روندی جائے گی۔" مومن کی بات پر انمول کے کان کھڑے ہوئے لیکن وہ اصل بات سے انجان تھی۔

"اور خدا کی قسم اگر ایسا کچھ ہوا تو مومن ابراہیم کا وحشیانہ روپ دیکھو گی۔" وہ انگلی اٹھائے اسے وارن کر رہا تھا۔ بسمہ نے ڈر کے مارے اس کی طرف دیکھا۔ سفید رنگت میں سرخیاں گھل رہی تھیں۔ چیک شرٹ پسینے سے شرابور تھی۔ ماتھے پر بھی پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"مومن میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میری پوری بات۔۔۔" وہ بمشکل کچھ بولنے لگی لیکن اس کے الفاظ مومن کی تیز آواز تلے دب گئے۔

"ایسا نہیں چاہتی تھیں؟ کیا میں تم پر یقین کر لوں جس نے میرے بھائی کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی؟ تمہارا باپ ایک غدار تھا اور تم غدار کی بیٹی غدار۔"

"بس کر دو مومن۔ مزید کتنا ذلیل کرو گے اسے۔ اگر غلطی ہو گئی ہے اس سے تو لڑنے کی بجائے سوچ بچار سے اس کا حل تلاشو۔" صوفیہ ابراہیم آگے ہوئیں۔

"غلطی اس سے نہیں ہم سے ہوئی ہے۔ اس کو تحفظ دینے کی غلطی ہوئی ہے ہم سے۔ کوئی اپنے محسن کے احسانوں کو یوں ملیامیٹ کرتا ہے؟ ارے پوچھیں اس سے کس چیز کی کمی دی ہے اسے جو یہ ہمارے تمام احسانات کا بدلہ یوں چکا رہی ہے۔" اس بار آواز مدھم تھی۔ انمول نے کینہ توز نگاہوں سے مومن کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں شعلے بھڑکائے بسمہ کو گھور رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ جھلس کر ہلاک ہو جاتی۔

"اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ اس قابل ہی نہیں کہ اسے عزت دی جائے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" مومن نے نفی میں سر ہلاتے ایک ہاتھ سے سر کھجایا۔ وہ شدید ڈپریسڈ نظر آتا تھا۔

"اتنا اوور ریئیکٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ کہاں جائے وہ تمہاری نظروں سے دور ہو کر۔" انمول کی آواز نے مومن کا دھیان اپنی جانب مبذول کرایا۔

"کہیں بھی چلی جائے۔ لیکن اس گھر سے چلی جائے میں اس کا وجود مزید برداشت نہیں کر سکتا اس گھر میں۔" مومن نے گہری سانس کھینچی۔

"اور تم کون ہوتے ہو اس بات کا فیصلہ کرنے والے کہ اس گھر میں کون رہے گا کون نہیں۔؟ یہ اپارٹمنٹ میرے شوہر کا ہے۔" وہ دو فقروں میں بہت بڑی بات جتا گئی تھی۔ مومن کے سر کھجاتے ہاتھ رک گئے۔ صوفیہ ابراہیم اور بسمہ شارق نے انمول کو دیکھا۔ وہ اپنی نگاہیں مومن پر جمائے ہوئے تھی۔ مومن کچھ کہنے لگا پھر سر جھٹک گیا۔

اس نے اپنے قدم دروازے کی جانب بڑھائے۔ وہ اس کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے کندھے کے قریب رک گیا۔ نظریں گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ چہرہ البتہ بے تاثر اور سیدھا تھا۔

"آپ کے شوہر سے پہلے یہ اپارٹمنٹ میرے بھائی کا ہے لیکن میں آپ کی خواہش کا احترام کروں گا۔ ایک آخری بات کہ سولہ سال پہلے انمول ملک جس مومن سے ملی تھی 'وہ ایک غلام تھا' لیکن میں نہیں۔ اپنا حکم اپنے پاس رکھیں۔" کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ انمول نے لب کاٹے۔ یہ بات اگر ملک کو پتا چل گئی تو۔؟ لیکن وہ جانتی تھی مومن ابراہیم کبھی یہ بات ملک تک نہیں پہنچائے گا۔ کندھوں سے بوجھ ہٹ گیا تو وہ بھی دروازے سے ہٹ گئی۔

"ماما۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے سر کو نقصان پہنچے۔" بسمہ کا لہجہ اب بھی روندھا ہوا تھا۔ صوفیہ ابراہیم نے اس کی پیٹھ سہلاتے اسے پچکارا۔

"بس بیٹے چھوڑ دو اس بات کو اور بھول جاؤ کہ آج کچھ ہوا تھا۔" بسمہ نے ہچکی بھرتے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔" اس نے نیا مسلہ پیش کیا۔ صوفیہ ابراہیم مسکرا دی۔

"ایک لفظ ہے 'سوری' جسے کہنے والا چھوٹا یا بڑا نہیں ہو جاتا۔ معافی مانگ لینی چاہیے اور مجھے یقین ہے میرے بیٹے کا دل سمندر سے بھی بڑا ہے۔" انہوں نے پل میں مسلے کا حل تلاشا۔ بسمہ کچھ مطمئن ہوئی۔ لیکن اسے ملک کے غصے کی پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ کیا وہ بھی اس پر مومن کی طرح غصہ کریں گے۔

بھری شام میں اس پارک کے بیلوں سے سجے گیٹ پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نووارد آگے بڑھتا گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ جگہ بدل گئی تھی۔ بدل تو بہت کچھ گیا تھا۔

کبھی کبھی وقت کا بدلنا انسانوں کے بدلنے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن جذبات کا کیا؟ وقت بدل جاتا ہے انسان بدل جاتے ہیں لیکن جذبات نہیں بدلتے۔ وہ ازل تا ابد تک ایک سے رہتے ہیں۔

وہ شخص آگے بڑھتا آیا۔ پھر وہ ایک جگہ آکر تھم گیا۔ متلاشی نگاہوں سے ادھر سے ادھر دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں کسی شے پر آکر رک گئیں۔ اس نے تشکر بھری سانس خارج کی۔ مسافر کو منزل نظر آگئی تھی۔ اٹھارہ سال بعد بھی اسے یاد تھا کہ انہیں کہاں ملنا ہے
۔

وہ اس پارک میں بنے ایک سنگی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ خشک ہوا سرسراتی ہوئی اس سوگوار مرد کو چھو کر گزر رہی تھی۔ وہ گہری سوچوں میں گم حال سے بہت دور تھا۔ اور پھر ہوا میں اسے کسی عزیز از جان کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس کا پورا وجود برف بن گیا۔

وہ اس روز کو تصور کرتا آیا تھا لیکن آج اس تصور کا حقیقت کا روپ دھارنا اس کا وجود پتھر کر گیا۔ وہ ہاتھ گود میں رکھے نگاہیں جھکائے بیٹھا رہ گیا۔ کسی کی آمد کی آواز قریب آتی گئی۔ پھر اسے اپنے سامنے اس شخص کی پرچھائی دکھی۔ اس کا دل سینے میں اتل پتل ہونے لگا۔ اس نے اس پرچھائی کے تعاقب میں دیکھا۔ وہی گوری رنگت بھورے بال اور سنہری آنکھیں اس کے سامنے کھڑا سفید و سیاہ میں ملبوس وہ شخص بالاج سکندر تھا۔ ان دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا تھا۔ کھیل ختم ہوا۔

اسے معلوم تھا ایک دن اس سے اس چھپن چھپائی کے کھیل کی بابت استفسار ہو گا اور اسے جواب دینا ہونگے لیکن اسے اپنا وجود مجرم لگنے لگا۔

"محبت خوش قسمتی ہے ماہیر اسے آزمانا نہیں چاہیئے۔" تصوف تھا یا نصیحت ماہیر اندازہ نہیں کر سکا۔ بالاج کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مجرم نے صفائی کے لیے لفظ تلاشے لیکن اس کا ذہن خالی تھا۔ ساری دلیلیں، تمام توجیہات جو اس نے سوچ رکھی تھیں وہ بیکار گئیں۔ وہ اپنے دوست کے سامنے سر جھکائے ہوئے تھا۔

'وہ مجرم تھا اس کے پاس دلیل نہیں تردید تھی۔'

ماضی:

اس دن وہ صاحب ملک کے ہاتھوں میں اپنا سات سالہ بچہ دے کر گئے تھے۔ جس کا نام مومن ابراہیم تھا۔ ملک کو نہیں معلوم تھا اسے کیا کرنا چاہیے وہ پندرہ سالہ لڑکا خود اپنے دشمنوں کے درپر پل بڑھ رہا تھا۔ وہ کیسے اسے اپنے ساتھ رکھ لیتا۔ یہی سوچ کر اس نے مومن ابراہیم کو کوچ کے حوالے کر دیا۔ اور خود گھر واپس لوٹ گیا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا تھا۔

وہ جس وقت گھر لوٹا اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیلنے میں ابھی وقت تھا اور یہ خوبصورت وقت انمول ملک کا ہوتا تھا۔ وہ روز اس وقت لان میں ہوتی تھی۔ کبھی شائستہ بی کے ساتھ ٹینس کھیلتی ملتی تو کبھی تتلی بنی پھولوں کے درمیان ملتی۔ وہ کافی دیر وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ آج وہ کھیل نہیں رہی تھی بلکہ خاموش سی لان میں رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ ملک کو اس کا اتنے آرام سے بیٹھنا جیسے کھٹکنے لگا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کی کرسی کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اور پھر اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"بھاؤ۔" وہ ایک دم اس کے سامنے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈر جائے گی لیکن وہ نہیں ڈری۔

"ہئے چھوٹا پٹاخا۔" اس نے انمول کو متوجہ کرنے کے لیے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ انمول کا سکتہ ٹوٹا۔ پھر اس نے ملک کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرد سا تاثر تھا۔

"کیا ہوا۔؟" اس نے پوچھا۔

"آج میرا برتھ ڈے ہے۔" وہ دوبارہ اسی پوزیشن میں واپس بیٹھ گئی۔ ملک نے سر کو خم دیا۔ اسے کبھی بھی انمول کا برتھ ڈے یاد نہیں رہا تھا بلکہ جب اسے معلوم ہوتا وہ اس روز گھر دیر سے آتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جہانداد ملک کی نفرت کے عوض وہ انمول کا برتھ ڈے اسپائل کرے۔

"کیا ماموں تمہارا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں؟" ملک نے سوال داغا۔

"ماں ہوتیں تو ضرور کرتیں۔" انمول کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ یقیناً وہ رونے والی تھی۔ لیکن کیا وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا؟

وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ انمول کو محسوس ہوا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ اس کا دل دکھا۔ مزید کچھ نہیں تو وہ اسے "ہیپی برتھڈے" تو کہہ ہی سکتا تھا۔

"ہیپی برتھڈے۔" کچھ ہی دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ انمول نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھی جانے والی چیز کی جانب گیا۔

"کیسا لگا۔؟" ملک نے استفسار کیا۔

"بیوٹیفل۔" وہ سفید موتیے کے پھولوں سے بنا وہ تاج اپنے ہاتھوں میں اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اور اس کی خوشبو بہت دلفریب تھی۔

"کیا یہ میرے لیے ہے۔؟" اس نے تصدیق چاہی۔ ملک اسے اتنا پیارا تحفہ کیسے دے سکتا تھا۔

"ہاں میری طرف سے یہ تاج ایک خوبصورت شہزادی کے لیے ہے۔" انمول مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"اور تم کون ہو۔؟ میرے شہزادے۔؟" دس سالہ لڑکی نے اس سے ہنس کر پوچھا۔ ملک ساکت رہ گیا۔

"نہیں۔ میں کوئی شہزادہ نہیں ہوں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔ اور پھر وہ اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔

"اسے کیا ہوا۔؟" انمول نے تعجب سے اسے جاتے دیکھا۔ اور پھر اس تاج کو ناک کے قریب کیے اس کی مسحور کن خوشبو اپنے اندر اتاری۔

اگلے چند دن وہ اس مومن نامی وجود سے بھاگتا رہا تھا۔ اس کا باپ اسے یہاں چھوڑ کر کہاں گیا، کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ اور پھر وہ اسے مزید فراموش نہیں کر پایا۔

"تم اسکول جاتے ہو؟" وہ اس دن مومن ابراہیم سے پوچھ رہا تھا۔ سات سالہ مومن نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن اب نہیں جا رہا۔" وہ توتلی زبان میں بولا۔ سات سال کی عمر میں بھی اس کی زبان کی لکنت نہیں گئی تھی۔

"چلو اس پیر سے تم دوبارہ اسکول جاؤ گے۔" ملک نے اسے انفارم کیا۔

"سچ۔؟" چھوٹے مومن کی آنکھوں میں امید کی کرن تھی۔

"مُچ۔" ملک کو اس کی آواز خوبصورت لگی۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت تھا۔ اسے مومن ابراہیم میں اپنا آپ دکھنے لگا۔ بن ماں باپ کے وہ دونوں تنہا تھے۔ انہیں سہارا بننا تھا ایک دوسرے کا مضبوط سہارا۔

اور پھر ملک کے اکثر اوقات دن رات اسی کلب میں گزرنے لگے تھے۔

ادھر انمول ملک سارا دن اس کا انتظار کرتی گزار دیتی لیکن وہ تھا کہ آتا ہی نہیں تھا اور اگر کبھی بھولے سے وہ گھر میں قدم رکھ بھی لیتا تو انمول کو اگنور کر کے آگے بڑھ جاتا۔

"بابا ملک بہت برا ہے۔" ڈائننگ ہال میں رات کا ڈنر سرو کیا جا رہا تھا جب انمول ملک کی آواز ابھری۔

"وہ بد سے بھی بدترین ہے انمول۔" جہانداد ملک نے مسکرا کر جواب دیا۔ انمول کا چہرہ مزید اتر گیا۔

"وہ مجھ سے بات نہیں کرتا اب۔ مجھے اگنور کر دیتا ہے۔" وہ بارہ سال کی ہو چکی تھی لیکن انداز اب بھی وہی تھے۔

"تمہیں اس سے بات میں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔؟" جہانداد ملک نے کانٹا پلیٹ میں رکھتے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ چمچ کی مدد سے پلیٹ میں رکھے چاول بکھیر رہی تھی۔

"وہ بھی تو ہمارے گھر کا فرد ہے نا بابا سائیں اس لیے مجھے اس سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔" انمول کے جواب پر جہانداد ملک کے آئیبرو ناپسندیدہ انداز میں اکھٹے ہوئے۔

"گھر کے فرد گھر کے اندر رہتے ہیں۔ سرونٹ کوارٹرز میں محض نوکر رہا کرتے ہیں اور ملک بھی ہمارا ملازم ہے۔ آئندہ یاد رکھنا۔" جہانداد ملک نے چبا چبا کر لفظ ادا کیے۔

"لیکن وہ تو۔۔"

"میں نے کہہ دیا ناں۔" ان کی آواز تھوڑی سخت تھی۔ انمول سہم گئی۔ وہ ان کے اگلے وار کی متلاشی تھی۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی جس کی وجہ سے وہ ماری گئی تو کیا وہ اسے بھی یونہی۔۔۔ انمول جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"آج کے بعد تم اس سے بات نہیں کرو گی اور نہ ہی میں تمہیں سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتا دیکھوں مائنڈ اٹ۔؟" کھانا کھایا جا چکا تھا۔ وہاں سے جانے سے پہلے جہانداد ملک انمول کو نصیحت کرنا نہیں بھولے تھے جس پر انمول نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

وہ بھی عام دنوں کی ایک شام تھی۔ انمول اپنی اسکیچ بک لیے لان کی ٹھنڈی گھاس پر بیٹھی تھی۔ پینسل کی نوک مہارت کے ساتھ سفید ورق پر اپنا رنگ بھر رہی تھی۔ جب داخلی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ملک اندر داخل ہوتے چوکیدار کو سلام کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پیچھے کسی کو اشارہ کیا۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ انمول نے سوچا۔ سر مزید اونچا کر کے دیکھا۔

نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ایک دس گیارہ سالہ لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ کافی شرمیلا سا لگتا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ملک اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا آگے بڑھ گیا۔ اور یہیں انمول ملک کو موقع ملا تھا۔

نیلا رنگ اس کا پسندیدہ تھا لیکن اسے یہ رنگ صرف خود پر ہی اچھا لگتا تھا۔ نیلا یعنی آسمان کا رنگ۔ وہ اس رنگ کو آزاد سمجھتی تھی۔ آسمان کی طرح آزاد اور لامحدود۔ یہ رنگ اسے اڑنا سکھاتا تھا۔

"کون ہو تم۔؟" وہ ایک دم اس کے سامنے آئی تھی۔ مومن نے رک کر اس لڑکی کو دیکھا۔ عمر کے حساب سے وہ کوئی چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ جینز اور ڈھیلی سی شرٹ میں ملبوس۔ سیاہ بال جو کندھوں سے نیچے تک اسٹیپس میں کٹے ہوئے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" مومن نے جواباً پوچھا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ تم کون ہو۔؟" انمول نے اسے سر تا پیر دیکھا۔

"میں؟ میں انسان ہوں۔" اترا کر جواب دیا۔

"ظاہر ہے دو ٹانگوں پر جانور تو چلنے سے رہا۔ اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے طنز کیا۔

"میرا نام مومن ابراہیم ہے۔" خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"ملک کو کیسے جانتے ہو تم؟" نیا سوال پوچھا گیا۔

"میرے بھائی ہیں وہ۔"

"اوہ یعنی تم ہمارے ملازم ہو۔" مومن نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ تمہارا بھائی ہمارا ملازم ہے تو تم بھی ایک طرح سے ملازم ہوئے۔" انمول کا لہجہ عجیب تھا۔ مومن سر ہلاتا کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔ انمول کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ ملک اتنا بے رحم کیوں تھا۔ وہ اس سے سلام تو کر ہی سکتا تھا لیکن۔۔

وہ غصے سے کھولتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

"یہ مومن ابراہیم ہے میرا دوست۔ ماں باپ نہیں ہے اس کے۔" وہ جہاندادِ ملک کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے کندھے کے قریب مومن ابراہیم کھڑا تھا۔

"تو۔؟" جہانداد ملک نے مومن ابراہیم کو دیکھتے استفسار کیا۔اس کی آنکھیں اسے کسی کی یاد دلا رہی تھیں۔اس کی جسے ملے انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔وہ جنہیں انہوں نے قید میں رکھا ہوا تھا۔

"میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔" ملک سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟" ان کے سوال پر ملک نے انہیں جن نگاہوں سے دیکھا وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ اس کا عمل دخل میرے ذاتی معمالات میں نہیں ہونا چاہیے۔" وہ رضامند تھے۔انہیں وفادار لوگ پسند تھے اور دوست سے بڑھ کر کون وفادار ہو سکتا ہے۔؟

"وہ لڑکی کون تھی۔؟" ملک کے کمرے میں کھڑے مومن نے استفسار کیا۔

"کون؟۔انمول۔؟ وہ میری کزن ہے۔"

"اچھا وہ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ ملازم ہیں ان کے۔" مومن نے کندھے اچکائے۔ملک کے اندر کچھ چھن سے ٹوٹا تھا۔ملازم؟

"بھائی۔؟"

"تم چھوڑو یہ سب۔اپنے اصل مقصد پر غور کرو جس کے لیے تم یہاں موجود ہو۔" ملک نے کمرے میں لگی واحد کھڑکی کھول دی۔ہوا کا جھونکا سرسراتا ہوا کمرے کی ساکن فضا میں شامل ہوا۔

"آپ ان سے ملیں ہیں کبھی؟" مومن کی آواز میں بے تابی تھی۔ان کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کی کہانی جانتے ہیں۔

"نہیں میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔" ملک نے کہتے مومن کو گلے سے لگایا۔وہ اس سے آٹھ سال چھوٹا تھا بالکل اس کے بھائی جیسا بالکل ایک چھوٹے بچے جیسا۔

حال:

"میرا ماضی بہت طویل اور بھیانک ہے۔" پارک میں بنے اس بینچ پر دونوں نفوس دم سادھے بیٹھے تھے۔ماہیر سکندر بول رہا تھا اور بالاج کو اس کا کہا ایک ایک لفظ ازبر ہوتا جا رہا تھا۔

"ماضی تکلیف دہ ہوتا ہے۔میں جب جب اسے یاد کرتا ہوں میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔یہ اتنا خوفناک کبھی نہیں ہوتا اگر میرے رشتے میرے ساتھ ہوتے۔اگر مجھے تمہارا ساتھ میسر ہوتا۔" آواز میں اداسی گھل گئی۔بالاج ترسی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے بہت سے سوال ہوں گے مجھے لے کر لیکن میرے پاس میرے ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"مجھے کوئی جواب نہیں چاہیے۔مجھے تم مل گئے یہی کافی ہے۔"ماہیر سکندر کا تمام تر ماضی تو وہ جان چکا تھا اب مزید کچھ نہیں بچتا تھا۔

"میں نے بہت انتظار کیا ہے تم سب کا۔تم سب سے ملنے کا۔"وہ بولا۔بالاج مسکرا دیا۔اس کی اذیت وہ سمجھ سکتا تھا۔

"تمہارا فیصلہ کسی طور سے غلط نہیں تھا۔اپنوں سے دوری عذاب تھی لیکن تمہارا جنون سر چڑھ کر بول رہا تھا۔میں جانتا ہوں عزم و عزائم جب جنون بن جائیں تو تباہی لاتے ہیں۔تمہارا مقصد جہانداد ملک سے انتقام لینا ہے۔جو پورا بھی ہو گا اور تم اپنی منزل پاؤ گے۔لیکن۔۔"وہ خاموش ہوا۔ماہیر نے الجھ کر اسے دیکھا۔وہ اسے مزید سننا چاہتا تھا۔

"لیکن؟"

"تمہیں اس سب کا خسارہ بھگتنا ہو گا۔"وہ نرم تاثرات لیے بول رہا تھا۔

"کیسا خسارہ۔"مزید استفسار۔

"انتقام کی آگ میں جل کر تم راکھ کی مانند ٹھنڈے تو ہو جاؤ گے لیکن جانتے ہو کیا؟ آگ اپنے ساتھ بہت کچھ لپیٹ کر لے جاتی ہے۔بالکل اسی طرح بلکہ ہر انسان کی طرح تمہیں جیت کا خسارہ جھیلنا پڑے گا۔"بالاج نے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ماہیر سکندر گہرہ سانس بھر کر رہ گیا۔

"میری دعا ہے کہ تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیابی ملے۔"ماہیر نے سر کے خم سے دعا قبول کی۔

"خیر تم نے تو بھئی شادی بھی کر لی۔اپنے دوست کی تو یاد نہیں آئی ہو گی۔"بالاج ہنسا۔ماحول کا بوجھل پن ختم کرنا چاہا۔

"ایسا مت کہو بالاج سکندر کا نام ماہیر سکندر کی ہر سانس کے ساتھ دھڑکتا تھا۔"ماہیر نے ناک پھلائی۔بالاج ایک بار پھر سے ہنس دیا۔

"شادی نہیں کی صرف نکاح ہوا ہے انمول کے ساتھ۔"اس نے صاف گوئی کی۔

"محبت ہیں تمہاری۔؟"مسکرا کر پوچھا۔

"زندگی ہیں وہ میری۔"عزت،احترام اور محبت کیا نہیں تھا اس کے جواب میں۔

"واہ بھئی کیا بات ہے۔ہمیں کب ملوا رہے ہو بھابھی سے۔؟"

"بہت جلد۔"

"انتظار رہے گا۔" بالاج نے پیچھے سے اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکنجے میں قید کی۔

"چھوڑ۔" وہ پھر پھرایا لیکن اس کے سامنے دس سالہ بالاج سکندر نہیں تھا۔

"اتنے عرصے کا غبار بھی تو نکالنا ہے نا بھائی جان۔" بالاج نے دانت نکوستے ایک گھونسا اس کے پیٹ میں جڑا تھا۔

"آآ۔" ماہیر سکندر نے جوابی کاروائی نہیں کی۔ وہ مارشل آرٹس چیمپئن اپنے عام سے دوست کے ہاتھوں مکے اور گھونسے کھاتا رہا تھا۔ لیکن اف تک نہ کی۔ وہ دونوں بہت عرصے بعد ملے تھے۔ میلوں کا نہیں سالوں کا فاصلہ تھا ان کے درمیان جسے کسی نا کسی طرح مٹانا ہی تھا۔ شروعات ہو چکی تھی اختتام باقی تھا۔

ماضی:

دن کا وقت تھا اور موسم مینا برسا رہا تھا۔ بارش رم جھم برس رہی تھی۔ کبھی رک جاتی اور کبھی پھر سے برسنے لگتی۔ ایسے میں انمول رین کوٹ پہنے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں چھتری تھامے جو کہ اب بند تھی۔ اس نے رک کر سامنے کوارٹرز کی جانب دیکھا۔ سفید کمروں کے سامنے بنے دو اسٹیپس پر وہ بیٹھا تھا۔ انمول کے قدم خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگے۔

کھٹکے کی آواز پر ملک نے سر اٹھا کر اپنے دائیں جانب براجمان ہوتی انمول ملک کو دیکھا۔ وہ چھتری اپنے ساتھ رکھے وہاں بیٹھ چکی تھی۔ ملک نے اپنا چہرہ واپس پھیر لیا۔

"ایک ملازم کے ساتھ مت بیٹھیے انمول بی بی کہیں آپ کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے۔" وہ بولا تو آواز میں طنز کی آنچ تھی۔

"بابا گھر میں نہیں ہیں میں اسی لیے آئی ہوں ورنہ وہ مجھے آنے نہیں دیتے۔" انمول نے رین کوٹ اتار کر ایک طرف چھتری کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر ملک جانب دیکھا۔

"تم جانتے ہو بچوں کی زندگی میں ماں کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔؟" ملک کی سماعت میں انمول کی آواز اتری۔ اس کا پور پور انمول کو سننے لگا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا وہ جب بھی بولتی ملک کے جسم کا ہر عضو اسے سنتا اور حفظ کرتا جاتا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ انسان کھانے اور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا لیکن میرا ماننا ہے کہ انسان ماں کے بغیر مر جاتا ہے۔" انمول نے دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑتے اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو حرارت بخشی۔

"لیکن میں غلط تھی میں ہمیشہ غلط ہوتی ہوں۔ میں تین سال کی تھی جب میری ماں کا قتل ہوا۔" ملک نے ایک جھٹکے سے گردن موڑی۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کیا واقعی انمول کی ماں کا قتل ہوا تھا۔؟

"آپ کو کیسے معلوم کہ آپ کی ماں کا قتل ہوا تھا۔؟" اس نے استفسار کیا۔پندرہ سالہ انمول نے گہری سانس بھری۔

"کیونکہ میری ماں کا قاتل میرا اپنا سگا باپ ہے۔" چار سو چالیس واٹ کا جھٹکا لگا تھا ملک کو۔جہانداد ملک نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشا تھا۔اس کا دل دکھا۔انمول پر کیا بیتی ہو گی۔

"میں اس دن جب گھر لوٹی تو مجھے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔میں ڈر گئی تھی۔ماما بابا سے لڑائی کر رہی تھی۔کس بات پر مجھے نہیں معلوم تھا۔ان کی آواز بہت اونچی تھی لیکن پھر ایک دم آواز آنا بند ہو گئی۔میں بھاگ کر اندر گئی اور پھر میں نے دیکھا میری ماں سیڑھیوں کے اختتام پر خون میں لت پت تھی اور میرا باپ سیڑھیوں کے آغاز پر جم کر کھڑا تھا۔وہ واقعہ بہت برا تھا۔بہت برے طریقے سے میرے دماغ پر اثر انداز ہوا۔مجھے لگتا ہے کہ کسی دن وہ مجھے بھی مار دینگے۔" انمول نے اس کی جانب دیکھا۔ملک پہلے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔غزالی آنکھوں میں گھائل کر دینے والے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔وہ ملک کا دل گھائل کر گئے۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" تسلی کے چار حروف تھے یا خود کو باور کرایا گیا۔

"ایسا ہی ہو گا۔میں نے کبھی ان سے بد تمیزی نہیں کی۔مجھے لگتا ہے کہ اگر میں ان سے بد تمیزی کروں گی یا اونچی آواز میں بات کروں گی تو وہ مجھے بھی یونہی سیڑھیوں سے گرا کر مار دینگے۔موت بہت ظالم ہے ملک میں مرنا نہیں چاہتی۔" وہ بولی۔آواز میں لرزش تھی۔گلا رندھ گیا تھا۔اسے موت ہراساں کرتی تھی۔

ملک نے ترحم سے اس لڑکی کو دیکھا۔وہ ایک بار پھر سے رونے کو پر تول رہی تھی۔ملک کا دل دھڑکنے لگا۔

"آپ روئیں مت۔جہانداد ملک آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ ساکت ہوئی۔ملک کو لگتا تھا اس کا باپ اسے بخشے گا؟ وہ جس نے اپنی بہن، اپنی بیوی تک کو نہ بخشا وہ شخص اسے کیسے بخش سکتا تھا۔وہ رونا بھول گئی۔اسے ملک پر غصہ آنے لگا۔

"گارنٹی دے سکتے ہو؟" انمول نے طنز کیا۔

"گارنٹی نہیں میرا وعدہ ہے آپ سے، میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک آپ کی حفاظت کروں گا۔اور ملک اپنا یہ وعدہ ساری زندگی نبھائے گا۔" اس کی آواز سخت تھی۔پر عزم آواز انمول ملک کی سماعت میں رس گھول گئی۔وہ اس پر سو بار یقین کر سکتی تھی۔کیونکہ اسے یقین تھمایا گیا تھا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری خوش قسمتی ہو گی کہ مجھے تمہاری تحویل میں رکھا جائے۔" انمول نے جھک کر رین کوٹ اٹھایا۔چھتری بھی پکڑ لی۔بارش رکی ہوئی تھی۔وہ حویلی کے اندرونی حصے میں جانے لگی۔آدھ راستے میں جا کر وہ پلٹی۔

"آئی لو یو۔" بادل زور سے گرجا۔ ایک دم جیسے بادلوں میں جمع ہوئے غبار کو بہہ نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔ بارش کے قطرے اس کے بالوں سے ہوتے چہرے پر گرنے لگے۔ اس کی آواز بہت ہلکی تھی ملک نے ہاتھ کان کے پاس لے جا کر نفی میں ہلایا گویا اسے ایک لفظ تک سنائی نہیں دیا۔

اس برستی بارش نے ایک اور محبت کی داستان آسمان پر رقم کی تھی۔ انمول آنکھیں میچتی مسکراہٹ دباتی پلٹی اور بھاگ کر اندر غائب ہو گئی۔

مومن ابراہیم کا ہر وقت ملک کے ساتھ رہنا انمول کو چبھنے لگا تھا۔ جہاں ملک ہوتا، مومن بھی وہیں پایا جاتا۔ اس بات پر اس کی مومن ابراہیم سے ہمیشہ لڑائی ہوتی تھی۔ لیکن پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

"تم ایک ملازم ہو بہتر ہو گا کہ میرے معاملات میں نہ بولا کرو۔" وہ ہمیشہ اسے باور کراتی لیکن وہ پھر نازل ہو جاتا۔ کبھی وہ ملک کو بلانے کی غرض سے جاتی تو اس کی بجائے مومن ابراہیم نامی شے ملتی۔ وہ بار بار بے عزت ہو کر دوبارہ اس کے سامنے آجایا کرتا تھا۔

"انمول بہت مغرور ہیں اور نک چڑھی بھی۔" وہ ایک دن ملک سے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت مارشل آرٹس کلب میں بیٹھے تھے۔ ملک اس کی بات پر مسکرا دیا۔ ذہن کے پس منظر میں انمول کا وہی روپ ابھرنے لگا تھا۔

"کوئی بات نہیں ان پر جچتا بھی ہے۔" مومن نے منہ پھلا لیا۔ غصے سے ملک کو دیکھا۔

"آآآ!" ملک نے اس کا دایاں گال پکڑ کر زور سے کھینچا۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"تم ان سے زیادہ بات ہی مت کیا کرو۔ کیوں بار بار ان سے بات کرنے پہنچ جاتے ہو۔؟" ملک نے مسئلے کا حل نکالا۔ مومن کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ اور جب بولا تو لہجہ سوگوار اور اداس سا تھا۔

"اچھا لگتا ہے ان سے باتیں کرنا۔ وہ بولتی رہیں تو میں گھنٹوں انہیں سن سکتا ہوں۔" ملک چونک اٹھا۔ چہرہ متغیر ہو گیا۔

"مومن۔۔" کوچ نے آواز لگائی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ ملک تنہا ان زینوں پر بیٹھا رہ گیا۔

'اچھا لگتا ہے ان سے باتیں کرنا۔ وہ بولتی رہیں تو میں گھنٹوں انہیں سن سکتا ہوں۔' ملک کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ اسے ابھی مزید وہاں کام کرنا تھا لیکن وہ وہاں نہیں رکا۔ اور پھر ساری رات اس نے لندن کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے گزاری تھی۔

حال:

اس نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو سفید بلب کی روشنی سے پل بھر کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دوبارہ آنکھیں کھولنے پر اس نے خود کو اپنے کمرے میں موجود پایا۔ اس کا کمرہ ہلکے گلابی رنگ اور سفید فرنیچر میں مزین تھا۔ چند لمحات اسے سمجھنے میں گے اور پھر ہر یاد اس کے ذہن میں تازہ ہوتی گئی۔

"اینجل۔" اس کے لبوں سے ہلکی سرگوشی کی مانند نکلا۔ اور پھر اسے کمرے میں کسی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی احساس تھا جو اس رات ہاٹل کی لابی میں اسے ہوا تھا۔ غیر آرام دہ لیکن تحفظ کا سا احساس۔ اس نے کروٹ بدلی۔ اس کی سیدھ میں ڈریسنگ ٹیبل تھا اور اس کے قریب ہی بالاج اسٹول ڈالے بیٹھا تھا۔ لیکن وہ جیا کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ اس کا دھیان اپنے دائیں جانب تھا۔ جیا اٹھ بیٹھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے اس نے سامنے تکا۔ وہاں رکھے سفید کاؤچ پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ جسے اس کا بھائی ہونے کا رتبہ حاصل تھا۔ ماہیر کی توجہ جیا کی جانب بھٹکی تھی۔ اس کی تقلید میں بالاج نے بھی اپنی نگاہوں کا رخ جیا کی جانب پھیرا۔

"جیا۔" بالاج اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر جیا اپنا منہ موڑ گئی۔ بالاج کے دل کو کچھ ہوا۔ لیکن شاید وہ اسی قابل تھا۔

"کیا مجھ سے بھی بات نہیں کرنی جیا۔" اب کی بار ماہیر اٹھ کر اس کی جانب بڑھا۔ وہ اس کی بہن تھی اور اسے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے وہ نا جانے کتنی راتیں نہیں سویا تھا صرف اس لیے کہ اس کی بہن کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

"میں تمہارا مجرم ہوں جیا۔ لیکن کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتی۔؟" بالاج کی آواز دوبارہ ابھری۔ ماہیر نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں نے کبھی معاف کرنا سیکھا ہی نہیں۔" وہ دوبدو اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ اسے رونا آنے لگا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے شخص کا جرم قابلِ معافی تو ہرگز نہیں تھا۔ اس نے دو گھڑی بالاج کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر وہ نظریں جھکا گئی۔ وہ خود بھی تو کہیں نا کہیں قصوروار تھی۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے بھی ناراض ہو گی۔ لیکن یہ سب ضروری تھا۔ میرے لیے تمہاری حفاظت ضروری تھی۔" ماہیر نے اسے سمجھانا چاہا۔

"آپ لوگ پلیز جائیں یہاں سے، مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔" جیا بے بس ہوئی۔ اس کا رخ بالاج کی جانب تھا۔ ماہیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"دیکھا میری بہن تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی جاؤ یہاں سے۔" بالاج کے لب حیرت سے وا ہوئے۔ وہ اپنی پوزیشن کلئیر کرنے کی خاطر اپنے دوست کو وہاں سے بھیج رہا تھا۔ اس نے دانت پیستے اسے تیز گھوری سے نوازا۔

"آپ بھی جائیں پلیز۔" جیا نے ان دونوں کو باہر کا راستہ دکھایا۔

"چل سالے دونوں مل کر چلتے ہیں۔" بالاج ماہیر کے گلے میں بازو ڈالتا اسے لیے باہر نکل گیا۔ پیچھے جیا اکیلی رہ گئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ دونوں غائب ہوئے تھے۔ ایک شخص اس کا شوہر تھا جس نے اسے اعتبار کی ڈور تھما کر اتنے زور سے کھینچی کہ وہ جیا کے ہاتھوں کے ساتھ اس کا دل تک زخمی کر گئی۔ اور دوسرا شخص اس کا بڑا بھائی تھا جس نے پچھلے اٹھارہ سال اس سے اپنی شناخت چھپائی۔ وہ بچپن سے جس بھائی کو مردہ سمجھتی آئی تھی وہ کبھی مرا ہی نہیں تھا۔

"یا اللہ۔" اس کے منہ سے سسکی بر آمد ہوئی۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے چہرے پر پھسلنے لگے تھے۔ اسے معلوم نہیں ہوا وہ کتنی دیر روتی رہی۔ وہ اپنی زندگی میں موجود دونوں مردوں سے ہاری تھی۔ ان دونوں نے اسے ہرایا تھا۔ اس کی محبت اتنی مضبوط کبھی ہوئی ہی نہ تھی کہ وہ جیت پاتی۔

جیت بھی طاقتوروں کا مقدر ہوتی ہے۔

وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو خلافِ معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اسے حیرت ہوئی گھر میں چار افراد کے ہوتے ہوئے بھی خاموشی۔

"اللہ خیر کرے۔" وہ آگے بڑھا۔ لاؤنج سے ملحقہ کچن میں ہلکی کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ ملک نے شکر کا سانس لیا۔

"السلام علیکم۔" کان کی لو کھجاتا وہ کچن کاؤنٹر کے قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"واعلیکم السلام۔" ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے کھڑی انمول نے جواب دیا۔ انداز تھوڑا نہیں بہت سنجیدہ تھا۔ ملک نے حلق تر کیا۔ بیوی کے سامنے تو بڑے سے بڑے ہٹلر بھی کانپ جایا کرتے تھے۔

"گھر میں کچھ ہوا ہے کیا۔؟" ملک نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ سامنے کوئی نہ تھا۔ یقیناً سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

"تمہیں فکر ہے گھر کی؟" چبھتا ہوا لہجہ۔ ملک کے لب اوہ میں سکڑے۔ مطلب معاملہ گرم تھا۔

"کتنی خاموشی ہے نا گھر میں آئی وش ایسی خاموشی ہمیشہ رہے لیکن یہاں کچھ پل گزرتے ہیں تو دنگل مچ جاتا ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ انمول نے سالم نگاہوں سے اسے گھورا۔

"اب یہی خاموشی ملے گی تمہیں سننے کو۔"

"مطلب۔؟" ملک کا ماتھا ٹھنکا۔

"مومن گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ آنٹی کو بھی اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔" ملک کو اچھو کا سا لگا۔ اس نے بے یقینی سے انمول کو تکا۔ وہ متحیر ہوتے پوچھنے لگا۔

"کدھر چلا گیا؟" اس کا بھائی گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔

"وہ مجھے بتا کر تو نہیں گیا۔" انمول نے لاپرواہی سے کہا۔ یوں کہ اسے مومن کے جانے سے کوئی خاصا فرق نہیں پڑا تھا۔ ملک کے اعصاب تن گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انمول اب اس کے بالکل سامنے تھی۔ درمیان میں کچن کاؤنٹر کی میز حائل تھی۔

"آپ کو نہیں معلوم تو پھر کسے معلوم ہونا چاہیے انمول۔؟ کہیں آپ نے تو اسے یہاں سے جانے کے لیے نہیں کہا تھا۔؟" الفاظ طنز میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انمول نے لب بھینچ لیے۔

"تم مجھ پر الزام عائد کر رہے ہو؟" انمول نے زور سے کپ ٹیبل پر پٹخا۔ ملک کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال بچھ گیا۔

"الزام نہیں لگا رہا حقیقت سے آشنا کر رہا ہوں آپ کو۔" اس نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اگر وہ بھی انمول کی طرح آواز اونچی کرتا تو بات بگڑ جانی تھی۔ رشتوں میں دڑاڑ کی بنیاد ہی اونچی آواز میں بات کرنا ہے۔ جب آپ اونچا بولنا شروع ہو جائیں تو لوگ آپ سے بات کرنا چھوڑ جاتے ہیں۔ رشتوں میں دوریاں آجاتی ہیں اور فاصلے کبھی نہ مٹنے والے بن جاتے ہیں۔

"اوہ، تو یہ آگ مومن کی لگائی ہوئی ہے۔ اسی نے کان بھرے ہیں ناں تمہارے۔" غلط فہمی جنم لینے لگی تھی۔

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا انمول۔ میں اسے جانتا ہوں وہ کبھی بھی یوں گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس نے اسے مجبور کیا ہو۔" ملک جھنجھلایا ہوا لگتا تھا۔

"تو جا کر اس سے پوچھو میرے ساتھ کیوں لڑائی کر رہے ہو۔" انمول کی ناک سرخ ہونے لگی۔ وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

"میں نے آپ سے کب لڑائی کی ہے؟" ملک نے انگھوٹے سے کنپٹی سہلائی۔

"یہ لڑائی نہیں تو کیا ہے۔ کبھی الزام دے رہے ہو۔ اونچی آواز میں بات کر رہے ہو۔ اور پھر اپنی ہی بات سے مکر رہے ہو۔" انمول بھڑک اٹھی۔ ملک کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اوہ گاڈ انمول۔ میں۔۔" وہ کچھ کہنے لگا۔

"السلام علیکم سر!" بسمہ کی آواز نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ دونوں اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

لیونڈر کلر کے سادہ سوٹ میں ملبوس بسمہ شارق پونی ٹیل بنائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ سفید رنگ کا اسٹالر گلے میں مفلر کی طرح لے رکھا تھا۔ ملک کی نظریں اس پر سے سفر کرتیں اس کے ہاتھ کی جانب بڑھنے لگیں۔ وہ ہاتھ میں سوٹ کیس تھامے ہوئے تھی۔

"تم کہیں جا رہی ہو۔؟" سوال انمول کی جانب سے تھا۔ بسمہ نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ سوٹ کیس زمین پر رکھا۔

"میں واپس ہاسٹل جا رہی ہوں۔" چہرے پر سنجیدگی تھی۔ لیکن سنجیدگی کے ساتھ وہاں کچھ اور بھی تھا۔ ڈر اور خوف۔

"لیکن کیوں۔؟" ملک نے سول کیا۔ وہ ایک دن گھر پر نہیں تھا اور اس کا آشیانہ بکھر رہا تھا۔ اگر جو وہ چند مزید دن گھر نہ آتا تو شاید اسے وہاں کوئی نہ ملتا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے سر۔ یا شاید اعترافِ جرم کہنا بہتر ہو گا۔" بسمہ سر جھکا گئی۔ ملک کے انمول کو تکا۔ وہ 'ہنہ' کہتی اپنے کمرے میں گم ہو گئی۔ ملک نے فرصت سے بسمہ کی جانب دیکھا۔

"سر جھکانا مجرم کا شیوہ ہے بسمہ۔ مجھ سے بات کرنے کی خاطر آپ کر سر اٹھانا ہو گا۔ گردن اکڑا کر مجھ سے بات کریں کہ مجھے لگے میں اپنی کسی اسٹوڈینٹ نہیں بلکہ مارشل آرٹس سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی سے بات کر رہا ہوں۔" ملک کچن کاؤنٹر کی دوسری جانب گیا۔ انمول کی کافی کا کپ یونہی پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ملک کو ٹھنڈی کافی نہیں پسند تھی۔ وہ تازہ کافی بنانے لگا۔

"میرا جرم ناقابلِ معافی تو ہرگز نہیں۔" اس نے سر اٹھالیا۔ لیکن کندھوں کا بوجھ گردن اکڑنے نہیں دے رہا تھا۔

"آپ انسانوں سے معافی کی امید رکھے ہوئے ہیں۔" ملک نے کافی بینز کپ میں ڈالے۔ بسمہ لب کترتے اسے دیکھے گئی۔

"لیکن جو میں نے کیا وہ جرم سے بھی بڑا گناہ تھا۔ کسی کی سالوں کی محنت کو بہتے دریا میں بہا دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔" آواز دھیمی تھی۔ اعتراف کرنا بہت کٹھن تھا۔

"اس گناہ میں عقلمندی ہو گی اگر اس سے کسی ایک کا بھی فائدہ ہوا ہو۔" جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے ناسمجھی سے ملک کو دیکھا۔ وہ اب کافی پھینٹ رہا تھا۔

"آپ کے اس عمل سے کس کا فائدہ ہوا ہے۔؟" اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔

"مومن۔ میں نے یہ سب اس کے لیے کیا تھا سر۔ بابا نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ مومن کو نقصان پہنچائیں گے۔ ان شارٹ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کے تمام احسانات میرے خوف تلے دب گئے تھے۔" اسے تھوڑی ڈھارس ملی۔ کم از کم اس کے فعل سے کوئی ایک تو فیض یاب ہوا تھا۔

"کیا آپ کو لگتا ہے آپ نے کچھ غلط کیا۔؟" بسمہ نے اس کے سوال پر نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر ڈر کیسا؟ ٹینشن فری ہو جائیں اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں میں سب سنبھال لوں گا۔" اس کی آنکھیں تشکر کے احساس سے بھیگنے لگیں۔ کیا تھا وہ مرد جو ہر چیز کو اتنا نارملی ہینڈل کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری سر۔" ایک باغی آنسو عارضوں پر بہہ نکلا۔

"میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر معافی کیونکر؟" ملک کی کافی بن گئی تھی۔ اس نے پہلا گھونٹ بھرا۔ اور پھر برا سا منہ بناتے کپ کو پرے کیا۔

"میں ہاسٹل جانا چاہتی ہوں۔" بسمہ نے اجازت چاہی تھی یا مطلع کیا تھا اسے نہیں معلوم تھا لیکن وہ جانتا تھا اسے واپس جانا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی ٹریننگ واپس بحال ہو جانی تھی۔ اچھا تھا اگر وہ اگلے چند دن ہر فکر سے آزاد گزارتی۔

"آپ آزاد ہیں اور پریشان نہیں ہوں آپ کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے۔" ہمیشہ کی طرح اس نے بسمہ کو بھی یقین تھمایا۔

"شکریہ۔!" اس نے سوٹ کیس اٹھالیا۔ ایک الوداعی نظر انمول کے کمرے کے دروازے پر ڈالی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"رکیں آپ کا اکیلا جانا ٹھیک نہیں ہے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" ملک کی آواز ابھری۔ اس نے دیکھا وہ کافی کا کپ سنک میں رکھتا اس کی جانب آ رہا تھا۔

"آپ کی کافی۔" ملک نے اداس نظروں سے کچن میں دیکھا۔

"میرے ہاتھ کی کافی کبھی اچھی نہیں بنی اب بھی محض اس نے حلق کڑوا کیا ہے۔ میں واپس آ کر انمول سے کہہ دوں گا وہ بنا دیں گی۔" ملک باہر نکل گیا۔ بسمہ نے ایک بار پھر پلٹ کر انمول کے کمرے کو تکا۔

اسے انمول ظالم لگ رہی تھی۔ لیکن ظالم انسان نہیں الفاظ ہوتے ہیں۔

صبح کی روشنی ہر سو پھیل چکی تھی۔ معمول کی طرح تمام لوگ اپنی اپنی روزی کمانے کے لیے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ایسے میں وہ کچن میں کھڑی ایک گھریلو لڑکی کی طرح ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے چائے کی کیتلی چولہے سے اتار کر کپ میں چائے انڈیلی۔

کوئی سایہ سا تھا جو اسے کچن کی کھڑکی سے باہر نظر آیا۔ چائے انڈیلتے اس کے ہاتھ لرز گئے۔ اس نے جلدی سے اپنا ناشتہ تیار کیا اور کچن سے باہر نکل آئی۔

"نجمہ۔" وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ ناشتہ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور ملازمہ کو آواز لگائی۔ وہ اوپر والے پورشن سے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

"جی بی بی۔"

"کچن والے گارڈن کی طرف کون ہے۔؟" اس نے سیدھا سوال کیا۔ نجمہ سوچ میں پڑ گئی۔

"میں نے پوچھا باہر کون ہے۔؟" ٹوسٹ منہ میں رکھے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"باجی اس سائیڈ تو کوئی نہیں جاتا۔ میں نے مالی سے کہا تھا اس جگہ پر پودوں کی کانٹ چھانٹ کرنے کو وہی ہو گا۔ آپ فکر نہیں کریں۔" جیا مطمئن ہو گئی۔ بلاوجہ وہ پریشان ہو رہی تھی جیسے گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو۔

"السلام علیکم۔" اس کا ارتکاز بالاج کی آواز نے توڑا۔

"واعلیکم السلام۔" بد دل نخواستہ اس نے جواب دیا۔ بالاج نے اس کا انداز بغور دیکھا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟" وہ اس کے سامنے ون سیٹڈ صوفہ پر آکر بیٹھ گیا۔ جیا کا ناشتہ کرنا محال ہوا تھا۔

"میں مروں یا جیوں، آپ سے مطلب؟"

"تمہارے تمام مطلب مجھ سے ہی جڑے ہیں جیا بالاج سکندر۔ کیوں بھولنے لگی ہو؟" اسے جیا کا جواب ناگوار گزرا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا اور ویسے بھی میں کوئی لاوارث تو نہیں اور اب تو ماشاءاللہ سے میرا بھائی بھی زندہ ہو گیا ہے۔" جیا نے طنز کیا۔ چائے کا کپ دور کر دیا۔ ناشتہ کرنے کی چاہ نہیں رہی تھی لیکن بھوک کا کیا؟ خیر وہ بالاج کے جانے کے بعد آرام سے ناشتہ کر لے گی۔

"کیا نئے رشتوں کے مل جانے سے پرانے رشتے ختم کر دو گی۔؟" جیا نے کپ ٹیبل پر رکھتے نظریں اٹھائے اسے دیکھا۔

"کم از کم آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔" جیا جھنجھلا گئی۔ وہ شخص اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہمیشہ کی طرح ہارنے لگی تھی۔

"یہ بات نہیں کرو کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ ہمارا رشتہ سب سے انمول ہے۔"

"اور نازک بھی۔ رشتوں کو نازک عدم اعتماد بناتا ہے بالاج۔ تعلق میں اعتبار نہ ہو تو یہ کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔" وہ بولی۔ بالاج نے طویل سانس خارج کی۔ اس کا گلہ بجا تھا۔

"تم شکوہ کر سکتی ہو کیونکہ تمہیں حق حاصل ہے۔" لہجہ نرم تھا۔ حالات مختلف ہوتے تو جیا کو خوشی ہوتی لیکن اس وقت ہرگز نہیں۔

"اچھا تو کیوں اعتبار نہیں کیا مجھ پر۔؟ کیوں اپنے آپ سے دور کر دیا مجھے؟" گلے میں آنسوؤں کا پلندہ اٹک گیا۔ سنہری آنکھوں نے نم ہوتی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ بہت ضروری تھا۔ تمہیں خود سے دور کرنا نہایت اہم تھا۔" بالاج تھوڑا آگے ہوا میز پر دھرا جیا کا چائے کا کپ اٹھایا۔ لبوں سے کپ لگاتے اس نے جیا کی پھولتی ناک محسوس کی تھی۔

"یہ چائے میری تھی۔" دبہ دبہ غصہ۔

"میں بھی تو تمہارا ہوں۔" جیا کے چہرے پر گلال بکھر گیا۔

"میرے ہوتے تو خود سے دور کبھی نہیں کرتے۔" وہ چیختی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجبوری تھی۔" آواز دھیمی تھی۔ جیا نے شاک کی کیفیت میں بالاج کو دیکھا۔ وہ بڑے مزے سے اس کی چائے کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔

"کیسی مجبوری۔؟" آنکھیں میچ کر کھولیں۔ وہ ہائپر ہو رہی تھی۔ اسے اپنی صحت کی فکر کرنی چاہیے۔

"میں چاہتا تو وہ سب جاننے کے بعد بھی تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا تصویریں بھیجنے والے کو میری کمزوری معلوم ہو جاتی اور وہ ہر ممکن طریقے سے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔" بالاج نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

"بیٹھ جاؤ جیا سکندر۔" جیا کشمکش میں مبتلا واپس اپنی جگہ بیٹھ چکی تھی۔

"ماں بابا گھر پر نہیں تھے۔ ملازموں پر مجھے اعتبار نہیں۔ جو واحد اعتبار مجھے ہے وہ اس گھر پر تھا اور اپنے گارڈز پر جو چوبیس گھنٹے اس سکندر حویلی کے گرد پہرہ دیتے ہیں۔" بالاج نے انگلی گھمائے آس پاس کی جانب اشارہ کیا۔

"واٹ؟ گارڈز؟" جیا کی حیرت کی انتہا تھی۔ کیا وہ چوبیس گھنٹے پہروں کی ضد میں تھی۔ کیا وہ تعاقب اور حبس کا احساس وہم نہیں تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر جو کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تو؟ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"ہاں کیونکہ میرے لیے تم دونوں کی حفاظت اہم تھی۔" بالاج نے ہونٹ دبائے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ جیا نے پہلے ناسمجھی سے اور پھر حیران نظروں سے بالاج کو تکا۔ چہرہ لال گلابی ہوا تھا۔

"ڈو یو نو۔؟" کبھی نہ ختم ہونے والی بے یقینی تھی۔ بالاج کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"آئی نو ویری ویل۔" بالاج نے سر کو خم دیا۔ پھر کچھ خفگی سے اسے دیکھا۔

"تم نے مجھ سے کیوں چھپایا۔؟ اگر میں وہ رپورٹس نہیں دیکھتا تو شاید کبھی جان ہی نہیں پاتا۔" جیا کا سر جھک گیا۔

"میں بتا دیتی۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس خبر سے آگہی بالاج کا حق تھی۔

"لیکن تم نے نہیں بتایا۔ ویل، میں نے بہت غلط کیا۔ وہ سب جاننے کے بعد کوئی بھی روایتی مرد ایسا ہی کرتا۔ تمہیں گھر سے میں نے نکالا تھا کیونکہ دشمن ہماری تاک میں تھا۔ وہ کبھی بھی تمہیں یا ہمارے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔"

"اور ہمارا دشمن کون ہو سکتا ہے۔؟" جیا نے سوال اٹھایا۔

"حریم نازیا شاید وہاج ملک۔ لیکن ماہیر کا کہنا ہے کہ یہ کام ان دونوں کا ہی نہیں۔ بلکہ کوئی ہے تیسرا شخص جو تمہیں مجھ سے دور کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی راہ آسان کی تھی۔ تاکہ وہ ڈھیلا پڑ جائے اور اس کی یہی لاپرواہی ہماری جیت بن جائے۔" بالاج نے رک کر اپنا سیل نکالا۔ پھر کچھ کھنگالتے موبائل جیا کی جانب بڑھایا۔ جیا نے اسے تھام لیا۔

"اس روز ان تصویروں کے ساتھ مجھے دو ٹیکسٹ میسج بھیجے گئے تھے۔" جیا نے سکرین پر دیکھا۔ وہاں ایک میسج بالاج کی انا پر چوٹ لگانے کا تھا تو دوسرا جیا سکندر کے متعلق۔

'اگر تو تم چاہتے ہو کہ میں جیا سکندر کو بخش دوں تو اسے خود سے دور کر دو۔'

وہاں لکھا جگمگا رہا تھا۔ جیا کی سیل پر گرفت سخت ہوئی اس نے زور سے موبائل ٹیبل پر پٹکا۔ پھر غصے سے بالاج کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ چہرے پر پہلے کی بنسبت اب سنجیدگی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے میں اس سب پر یقین کر کے آپ کو معاف کر دوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے مسٹر بالاج سکندر۔ میں مجبور ہوں ورنہ ایک پل بھی آپ کی زندگی میں نہ رہتی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں اپنے راستے جدا کر لیں۔" اس نے دوٹوک بات کی۔ بالاج کے چہرے کے نقوش تن گئے۔

"تمہیں یہ سب اتنا آسان لگتا ہے؟ میں تمہیں چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور تم ہو کہ مجھے سمجھنے کی بجائے ٹانٹ کیے جا رہی ہو۔" بالاج کو اس بے وقوف لڑکی پر غصہ آنے لگا تھا۔

"جیا پاگل نہیں ہے، جیا کچھ کہتی نہیں ہے تو جیا کچھ جانتی نہیں ہے۔؟ آپ مجھے تنگ کر رہے ہیں کبھی میرا تعاقب کر کے تو کبھی میرے سامنے آ کر ماضی دوہرا کر۔ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی کتنی دفعہ سمجھاؤں آپ کو؟" جیا کی بس ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ بالاج اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ایک بار پھر سے معافی مانگنا چاہوں گا۔ جانتا ہوں تمہیں اعتماد میں لینا چاہیے تھا لیکن عورت جذباتی ہوتی ہے اسی لیے رک گیا۔ میں نے جو کیا مجھے اس پر افسوس ہے لیکن۔!" وہ جیا کے صوفے کی ہتھ کے قریب کھڑا تھا۔ نظریں جھکائے جیا کو دیکھتا ہوا۔

"میں تمہیں خود سے جدا نہیں کر سکتا۔ میری سانسیں تم سے بندھی ہیں بھلا کوئی اپنی سانس چھین سکتا ہے کیا؟" جیا نے سر جھٹکا۔ یہ باتیں اس پر اب اثر نہیں کرتی تھیں۔

"میں نے ماں بابا کو نہیں بتایا کہ وہ دادا دادی بننے والے ہیں۔ بتاتا تو شاید وہ میرا قتل کر دیتے۔" وہ ہنس دیا۔ پھر آس سے جیا کی جانب دیکھا۔

"اپنا اور اس کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔" جیا کی بھری آنکھوں سے ایک آنسو گال پر لڑھکتا گیا۔ بالاج سکندر آگے بڑھا۔ جیا کے عقب سے گزرتے وہ رک گیا۔

"آئی لو یو بوتھ۔(I love you both)۔" جھک کر جیا کے سر پر بوسہ دیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک آنسو جیا کے ریشمی سیاہ بالوں میں گر کر فنا ہوا اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکلتا گیا۔

جیا سن بیٹھی رہ گئی۔ آس پاس ہر شے ساکت تھی۔ بھیگی آنکھوں سے زارو قطار گرم سیال بہنا شروع ہو گیا تھا۔ دکھ، درد اور ازیت۔ کیا نہیں تھا بالاج کی آواز میں۔ اس کا کہنا تھا کہ جیا کو اس نے خود سے مجبوری کے تحت دور کیا۔ اگر وہ اس کے ساتھ رہتی تو یقیناً دشمنوں کے ہتھے لگ جاتی۔ لیکن بالاج نے اس کی حفاظت ترک نہیں کی۔ کیا تھا وہ شخص ایک جانب ولن کا روپ دھارے وہ اس پر رتی برابر یقین نہیں کر سکتا تھا تو دوسری ہی جانب وہ اسے اپنا مان بخش کر گیا تھا۔ اگر بالاج اس کی حفاظت نہ کرتا تو وہ شاید۔ جیا کا ہاتھ بے ساختہ سینے سے نیچے رینگتا گیا۔

"یا اللہ۔" بائیں ہاتھ سے اپنی سسکیاں گھونٹتی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا قسمت یہی تھی؟

وہ ایک لڑکی تھی، ایک بیٹی ایک بہن تھی، کسی کی بیوی تھی تو سب سے بڑھ کر ماں بننے جا رہی تھی۔ اس کا بچہ اس کی کل کائنات تھا ۔اسے سمجھوتہ کرنا تھا۔ ہاں ہر لڑکی یہی کرتی ہے۔ اس کی ماں ہوتیں تو بتاتی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن وہ جانتی تھی ہر معاشرے میں لڑکی پر فیصلہ لاگو ہوتا ہے۔ اسے ہی سمجھوتے کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ شاید اس کی قسمت میں بھی یہی تھا۔

ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ ایم۔ ایس۔ مارشل آرٹس سینٹر کے سامنے اس وقت گہما گہمی کا ماحول تھا۔ تمام اسٹوڈینٹس چہ مگوئیاں کرتے سینٹر کی جانب اشارہ کرتے کچھ کہہ رہے تھے۔ کوئی اونچی آواز میں چیخ رہا تھا تو کوئی بت بنا اس عالیشان عمارت کو تکے جا رہا تھا۔ کیا ان کا سفر اتنا ہی تھا؟ کیا وہ عمارت اب اپنی تعمیر کے زیر آجانی تھی؟ کیا اس کا مالک اسے اپنے ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسلنے دے گا؟

تمام سوالات ان کے دماغ میں گردش کرتے انہیں دکھ دے رہے تھے۔ وہ سب پریشانی اور اضطراب سے کبھی عمارت کی جانب دیکھتے تو کبھی اپنے پیچھے موجود چوڑی سڑک کو۔

"کیا وہ آئے گا؟" کسی تیس بتیس سال کے لڑکے نے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ سوال تھا امید نہیں۔

ان سب کو وہیں چھوڑ کر بڑے سیاہ گیٹ کی جانب آؤ تو جالی دار گیٹ کھلا تھا۔ دونوں پٹ ایک دوسرے سے جدا تھے۔ وہاں سے دو باوردی گارڈ ہاتھوں میں بندوقیں تھامے ایک نوجوان کو اپنے توانا بازوؤں میں بھینچے باہر لا رہے تھے۔ وہ دروازے کے قریب سے گزرے اور آگے بڑھ گئے۔ کسی کی آنکھوں نے یہ منظر سکون سے دیکھا تھا۔

"اب آئے گا اصل مزہ۔" وہاں کھڑا شخص مسکرا دیا۔ دور اسٹوڈینٹس کا شور بلند ہوا کوئی ہنڈا سوک آکر چرر کی کے ساتھ رکی تھی۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ مستند اور چاک و چوبند۔

اب کوئی اسٹوڈینٹس کو بلند آواز میں تسلی آمیز الفاظ کہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے ناک کھجائی۔ چچ دی اینڈ۔

اور پھر انہوں نے اپنے سامنے سرخ ڈورے لیے سبز آنکھوں کو دیکھا۔ پھر دراز قد مرد کو۔ وہ ملک تھا۔ ان کا دشمن۔

ملک کے چہرے کے نقوش تنے ہوئے تھے۔ گردن کی نسیں واضح ہو رہی تھیں۔

"کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔؟" وہ دھیمی آواز میں غرایا۔ تمام اسٹوڈینٹس نے دم سادھ لیا۔ سیاہ لوہے کے گیٹ بھی خاموشی سے یہ منظر تکنے لگے۔ فریال اور عبید باجوہ ہجوم میں سب سے آگے کھڑے تھے۔ وہ دونوں انہیں باخوبی سن سکتے تھے۔

"مالک تماشا نہیں لگایا کرتے بلکہ لگانے والوں کو چیونٹی کی مانند مسل دیتے ہیں۔ لائک دز۔" شہادت کی انگلی دائیں جانب کی۔ وہاں سے پھر کسی نوجوان کو دھکیل کر باہر نکالا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دہلیز عبور کرتے ملک کا ہاتھ نوجوان کی گردن تک رینگتا گیا۔ نوجوان اور گارڈز جھٹکے سے رک گئے۔

شارق کبیر کا سانس ایک پل کو تھما لیکن پھر وہی سپاٹ چہرہ فکس ہو گیا۔

"یہاں کا اصل مالک کون ہے یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔" ملک نے مضبوطی سے اس نوجوان کو گدی سے پکڑ رکھا تھا یوں کہ اس کے ساتھ موجود گارڈز بھی وہیں رک کے کھڑے تھے۔ شارق کبیر نے ایک نظر اپنے پیچھے کھڑے سیکرٹری کو دیکھا۔ اس نے اشارہ سمجھتے نیلے رنگ کی فائل آگے بڑھائی۔

"یہ رہے واضح ثبوت۔ ممکن ہے کہ تم چیخو چلاؤ گے نہیں۔" انہوں نے ہنس کر سر جھٹکا۔ ملک نے تیز نگاہوں سے اس فائل کو دیکھا۔ پھر شارق کبیر کو دوبارہ پھر سے فائل کو۔ نوجوان کی گردن چھوڑ دی۔ گارڈز دور ہو گئے۔ نوجوان ملک کے پیچھے چھپ گیا۔ تمام طلبہ نے خوفزدہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"یہ کاغذ کے دو ٹکڑے کسی کی ملکیت نہیں بتلا سکتے۔" ملک نے آبرو سے فائل کی جانب اشارہ کیا۔

"مان لو ملک کہ تم سے اپنی شکست قبول نہیں۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں اس سینٹر اور پراپرٹی کے کاغذات ہیں۔ جن پر میرا حق ہے۔ میں اس سب کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کے لیگل پرنٹس آؤٹ میرے پاس ہیں اور وہ۔۔" اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتے ملک نے جھٹ سے پینٹ کی جیبوں سے کوئی شے برآمد کی۔

"You mean this?" سبز آنکھوں سے تائید چاہی۔ ہاتھ میں چند کاغذات تھے۔ دو تہوں میں بند پرچہ جات۔ اسٹوڈینٹس کا شور بلند ہوا۔ ملک سر۔ کی آوازیں ماحول میں ارتعاش پیدا کر گئیں۔

"کیا ہے یہ۔؟" شارق کبیر کے گرد خطرے کا الارم بجا۔ ہر جانب سرخ رنگ اور ٹوں ٹوں سائرن کی آواز بجنے لگی تھی۔

ملک نے سر کو خم دیتے کاغذات کی ایک تہہ کھولی پھر دوسری۔ تمام کاغذات کو الٹایا۔ شارق کبیر دیکھ سکتے تھے۔ وہ مہر شدہ کاغذ تھے۔ اصل مالک کا نام ان کاغذات پر درج تھا۔

"شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اسے زیر کرنے کے گُر سیکھ کر آنے تھے۔ چچ" سر نفی میں ہلایا۔ شارق کبیر کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ انہوں نے بھینچی مٹھیاں کھولیں اور کاغذ ملک کے ہاتھ سے جھپٹنے چاہے۔ ملک بدک کر دور ہوا۔

"نہ۔نہ۔نہ۔ کوشش بھی مت کرنا ورنہ میرے اسٹوڈینٹس تمہارے ان حرام زادوں سے کئی زیادہ ہیں بس جذباتیب نہیں دکھاتے۔" انگلی سے چاروں اطراف اشارہ کیا۔ پھر چہرہ شارق کبیر کے قریب لایا۔ ان کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا۔ سیکرٹری کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ کاغذات اسے دیے گئے تھے۔ اسے چیک کرنا چاہیے تھا لیکن یہ کیا ہو گیا۔ لیگل پیپرز تو اصل مالک کے پاس تھے۔ اور وہ صرف دعوے دار نہیں بلکہ حقدار تھا۔

"اپنی عزت چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ذلالت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" ملک نے کاغذ واپس جیب میں اڑسے۔ تمام اسٹوڈینٹس کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں حیرانی اور خوشی کے تاثرات لیے اسے ہی دیکھ رہے تھے وہ دھیما سا مسکرا دیا۔

"عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"بالکل۔" ملک نے زور و شور سے سر ہلایا۔ جیب میں رکھا موبائل ایک دم تھرتھرایا تھا۔ ملک کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

"اللہ جسے باہے عزت دے اور۔۔۔۔ جسے چاہے ذلت۔" آدھا جملہ شارق کبیر کو دیکھتے کہا تھا۔ انہوں نے لب بھینچ لیے۔ تماشا تو لگ گیا تھا۔ ذلت تو مل گئی تھی۔ وہ پلٹے۔ غصے سے سیکرٹری حماد کو تکا۔ لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہ چونک گئے۔

"سس۔ سرر۔ سر۔" اس کے ہاتھوں میں ٹیبلٹ تھا۔ وہ عینک لگائے خوف و ہراس سے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ شارق کبیر نے ٹیبلیٹ کھینچا۔ غصے سے بھرپور نظر حماد پر ڈالتے دوسری اسکرین پر ڈالی۔ انہیں لگا آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین پھٹ گئی ہو۔ وہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے تھے۔

دور مجمعے میں کھڑی بسمہ شارق کا چہرہ بھی اس وقت بے تاثر اور سپاٹ تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور بائیں ہاتھ میں تھامے موبائل سے آوازیں چیخ چیخ کر سنائی دے رہی تھیں۔

"ایک عرصہ پہلے میں نے تمہیں ایک بات کہی تھی کہ زن اور زر کی لالچ سے نکل آؤ یہ تمہیں اور تمہاری شان و شوکت کو مٹی میں ملا دیں گی اور دیکھو۔" ہاتھ کی ہتھیلی معصومانہ انداز میں ٹیبلیٹ کی جانب اٹھائی۔

شارق کبیر کی نظریں ٹیبلیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ نیوز کاسٹنگ دوبارہ شروع ہوئی تھی شاید بارہ بجے کی ہیڈ لائنز چلنے لگی تھی۔

"ساتھ ہی ساتھ آپ کو بتاتے چلیں کہ شہر کے مشہور بیوروکریٹ شارق کبیر اور ماڈل انزلہ کا اسکینڈل سر عام آگیا۔ شارق کبیر جیسے نام کے شرفاء ایک مشہور ماڈل انزلہ کے ساتھ کلب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں نا جانے کتنی لڑکیاں۔۔۔" وہ مزید کہہ رہی تھی لیکن شادق کبیر کا سانس رک چکا تھا۔ اسکرین پر ان کی اور انزلہ کی لائیو فوٹیج چل رہی تھی۔ ساتھ ہی ان کے دوسرے سیاہ

اعمال نامے دکھائے جارہے تھے۔شارق کبیر نے ٹائی کی گڑھا درست کی۔گریبان میں اٹکی عینک ہاتھ میں تھامی۔سیکرٹری کو اشارہ کرتے وہ ملک کی جانب پلٹے۔

"دیکھ لوں گا میں تمہیں۔"عینک والا ہاتھ اٹھائے وہ چبا چبا کر بولے۔

"چشمہ لگا کر دیکھنا صاف نظر آؤں گا۔"عینک چھین کر ان کی آنکھوں پر چڑھائی پھر گال تھپتھپاتے وہ ایک طرف ہو گیا۔گویا ان کے جانے کی راہ ہموار کی۔وہ تیزی سے ایک سائڈ سے ہو کر نکلے۔آگے طلبہ کا جمگھٹا تھا جو خود بخود ادھر ادھر بکھر تا گیا اور وہ درمیان سے سر جھکا کر گزرتے گئے۔ان کے پیچھے ہی گارڈز اور سیکرٹری تھے۔تمسخرانہ نگاہیں، مدھم ہنسی، اور چابک کی طرح لگتے جملے۔وہ کلس کر رہ گئے۔ہجوم کے دہانے پر وہ کھڑی تھی۔ان کی نظر اس کی جانب اٹھی۔آنکھوں میں سرخی لیے وہ ان کے قریب آئی۔بازو سینے پر بندھے تھے۔

"افسوس کہ میں آپ کی بیٹی ہوں اور آپ باپ لیکن۔آپ تو باپ کہلانے کے بھی لائق نہیں۔"بازو پہلوؤں میں جھول گئے۔ چہرے پر کرب ابھرا۔وہ ان کی بیٹی تھی آہ!

"Do it on your own belief"

"وہ کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔اور بیٹی کا دل کبھی نفرت نہیں کر سکتا۔"وہ آگے بڑھنے لگے۔

"آپ جیسا شخص باپ کے نام پر بھی دھب۔۔"وہ کچھ کہنے لگے تھی۔غصے سے پھنکارتے ہوئے۔

"بسمہ!"وہی تنبیہہ لہجہ۔گہری سانس بھرنے کی آواز۔وہ اپنی جگہ جم گئی۔شارق کبیر کب کے آگے بڑھ چکے تھے۔اس نے پلٹ کر دیکھا۔مومن نفی میں سر ہلاتا اسے سرزنش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مم۔مومن۔"وہ ملک کی طرف چل دیا۔بسمہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ہاتھ خالی تھے۔کیا دل بھی؟

"بھائی یہ سب کیا تھا۔؟"چہرے پر خوشگوار حیرت تھی۔ملک نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔پھر سامنے۔وہاں بسمہ نہیں تھی۔

"کم از کم وہ نہیں تھا جو تم نے کیا۔"اسٹوڈینٹس اندر آنا شروع ہو گئے تھے۔سب کے چہرے خوشی اور جیت کی سرشاری سے مسکرا رہے تھے۔

"بھائی! چھوڑ دیں اسے۔یہ بتائیں آپ نے یہ سب کیسے کیا؟"وہ جھنجھلایا۔

ملک نے جواب نہیں دیا یونہی چلتا ہوا وہ بیسمنٹ میں موجود کنٹرول روم میں آ گیا تھا۔مومن نے بھی اس کی تقلید کی۔

"بھائی۔۔"بے چارگی سے پکارا۔ملک سامنے موجود سکرین کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے وہی کیا جو ایک شخص اپنی بقا کے لیے کرتا ہے۔ میں نے اپنی عقل استعمال کی۔ جو شاید تمہارے پاس نہیں ہے۔" مومن کا منہ کھل گیا۔

"آپ مجھے بے وقوف کہہ رہے ہیں۔؟" یقین نہیں آیا تھا۔ ملک ہلکا سا مسکرایا۔

"نہیں۔ لیکن تم نے وہ نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا اور یہی تمہاری کمزوری ہے تم اپنے معمالات میں دوسروں کو بھول جاتے ہو۔ اب یہ بتاؤ تمہیں کیسے معلوم ہوا بسمہ شارق کبیر سے ملنے گئی تھی۔" مومن نے منہ بگاڑا۔ ہاتھ پاکٹ میں ڈال لیے۔ ایک بار پھر اس کا زکر۔

"ظاہر ہے جیسے آپ کو ڈھونڈا تھا۔ اور ان تمام اسٹوڈینٹس کے موبائل میں جی پی ایس ٹریک۔۔" اس کے لفظوں کو بریک لگی۔ آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔

"مم۔ مطلب آپ۔۔نے ان کی کال ریکارڈ سنے ہیں۔ اسمارٹ۔" گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ ساتھ ہی ادھر ادھر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ شکر۔

"بالکل کیونکہ شارق کبیر والا معاملہ تمہارا نہیں تھا اس لیے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ مومن گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ انہوں نے تمام اسٹوڈینٹس کے موبائل ہیک کیے ہوئے تھے۔ کوئی ای میل، کال یا میسج تھا وہ اسٹوڈینٹس تک پہنچنے سے پہلے ان تک آتا تھا۔

مومن نے ملک کو دیکھا وہ آنکھوں میں سوال لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

"تھپڑ کیوں مارا اسے۔؟" دوٹوک استفسار۔ مومن کی سٹی گم ہوئی۔

"ریفلیکس ایکشن تھا میرا۔ میں آپ کے معاملے میں کسی کی نہیں سن سکتا۔" کندھے ڈھلک گئے۔

"معافی مانگو گے اس سے۔" اب کی بار نصیحت اور تنبیہہ ساتھ تھی۔

"اوکے مانگ لوں گا۔" نرمی سے کندھے اچکا کر وہ باہر نکل گیا۔ ملک کے ذہن میں پہلا خیال جیا سکندر کا آیا تھا۔ اور پھر بالاج سکندر۔ جیا اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔ وہ جانتا تھا کیونکہ وہ خود تو معاف کرنے والوں میں سے تھا لیکن اس کی بہن نہیں۔ ابھی اسے معید سکندر لوگوں سے بھی ملنا تھا۔ آہ، تمام غم دوبارہ زندہ ہونے تھے۔

جہانداد ملک کی حویلی پر اگست کی صبح سوگوار اتر رہی تھی۔ ملازمین جلدی جلدی اپنا کام نمٹا رہے تھے۔ حویلی کے اندر داخل ہو تو تمہیں جہانداد ملک ناشتے کی میز پر کروفر سے بیٹھے نظر آئیں گے۔ وہ اکیلے تھے۔ وہاں اس میز پر وہ تھے یا پھر ان کی تنہائی۔ انہوں نے ایک بار پھر سے سر جھٹکا۔ تنہائی کا کیا ہے۔ ہک ہا۔

ناشتے کی طویل میز بالکل خالی تھی۔ میز پر انواع و اقسام کے لوازمات چنے گئے تھے۔ ان کی نظر فروٹس کے ساتھ رکھی چھڑی پر اٹک گئی۔ وہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھتے گئے۔ ذہن کے پس منظر میں صوفیہ ابراہیم کا خاکہ ابھر رہا تھا۔ وہ یہاں سے جا چکی تھی۔ اس بات نے جہانداد ملک کو آگ بگولہ تو بہت کیا لیکن وہ پیچ و تاب کھاتے رہ گئے۔ ندیم دارا کی موت کی خبر بھی انہیں مل چکی تھی۔ اور وہاج، کیا وہاج ٹھیک ہو گا؟

ہاں وہ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ جہانداد ملک کی آنکھوں کے سامنے کل رات کا ہوا واقعہ ابھرنے لگا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر نئی تازہ ترین اور چٹ پٹی خبر سن رہے تھے۔ جب ٹرالی بیگ گھسیٹنے کی آواز نے ان کی محویت میں خلل ڈالا۔ انہوں نے دیکھا ان کے دائیں جانب وہاج ملک آ کھڑا ہوا تھا۔

ایک ہاتھ سے بیگ تھامے وہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھینچے آنکھوں میں سرد پن لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو۔؟" جہانداد ملک کو تعجب نے آن گھیرا۔

"جی۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"مطلب۔ اور کہاں جا رہے ہو اس وقت۔؟" وہ ٹیک چھوڑے صوفہ پر آگے کو ہو بیٹھے۔ وہاج کی آنکھوں میں بے زاری اور زخمی پن تھا۔

"میں جہاں مرضی جاؤں آپ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" تیز لہجہ۔

"کیوں میں باپ۔۔" وہ بولنے لگے۔

"بس کر دیں یہ ڈراما۔ باپ نہیں ہیں آپ۔ بس کر دیں۔" ان کی بات بیچ میں ٹوکتے وہ چیخ اٹھا۔ آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔

"باپ ہوتے تو کسی کی اولاد نہ چھینتے۔ باپ ہوتے تو خود سے اول اپنی اولاد کو رکھتے۔ لیکن افسوس آپ تو باپ ہی نہیں۔ ایک گناہ کو اپنے آستین میں کیوں پروان چڑھایا۔؟" آخر میں آواز بلند اور نمی سے بھر گئی تھی۔ جہانداد ملک بری طرح چونک گئے۔

"مم۔ مطلب؟" بمشکل لب کھولے۔

"ہنہہ۔ مطلب یہی کہ کسی کی ناجائز اولاد کو اپنے گھر میں پناہ کیوں دی۔ اسے اپنے جیسا گھٹیا انسان کیوں بنایا کہ وہ دنیا کو اچھائی کی نظر سے دیکھ ہی نہیں پایا۔" جہانداد ملک کے اعصاب چٹخنے لگے۔ ان کے آگے حیرت کا سمندر تھا۔

"نا۔ ناجائز۔ لل۔ لیکن تم تو ابراہیم۔۔؟" ان سے بولا ہی نہ گیا۔

"غلط تھا۔ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا۔ جس بچے کو آپ ابراہیم داؤد کی اولاد سمجھ رہے ہیں وہ میں نہیں ہوں۔ میں تو آپ کے اس دوست کا بیٹا ہوں جسے آپ نے اور آپ کی لالچ نے مار ڈالا۔" وہ کوئی اور تھا۔ وہ وہاج ملک نہیں تھا جسے جہانداد ملک جانتے تھے۔

"جج۔ جھوٹ ہے یہ۔" وہ غیض و غضب سے غرائے۔ وہاج طنزیہ ہنس دیا۔

"جھوٹ کیا تھا اور سچ کیا ہے آپ کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ میں جا رہا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس گناہوں کی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے۔ خدا حافظ۔" وہ پلٹا لیکن جہانداد ملک کے الفاظوں نے قدم جکڑ لیے۔

"یہ زندگی گناہوں کی دلدل ہے۔ اس سے چھٹکارا پا بھی لو تو گناہوں کی بخشش نہیں۔ وہ کبھی تمہارے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔" ان کا اشارہ اس ذات کی طرف تھا جو ہر ایک کی توبہ قبول کرتا ہے۔ وہاج ملک چند ثانیے کو خاموش ہو گیا۔ اور جب بولا تو لہجے میں صدیوں کی تھکان تھی۔

"کسی نے کہا تھا اس ذات سے معافی مانگنے سے قبل اس کے بندوں سے مانگو۔ کیونکہ وہ حقوق اللہ سے پہلے حقوق العباد کو دیکھتا ہے۔" وہ رکا نہیں۔ تیز اور لمبے قدموں سے باہر نکل گیا۔

جہانداد ملک چونک کر حال میں لوٹے تھے۔ انہوں نے گہری سانس کھینچتے دائیں جانب باہر دیکھا۔ قد آور گلاس ونڈو کے اس پار مالی پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ مرجھائے ہوئے پودے دوبارہ کھل اٹھنے تھے۔ باسی ٹہنیاں اتر جانا تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کچھ لوگوں کے ہماری زندگی سے چلے جانے کے بعد ویرانی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ؛

'کچھ لوگوں کا ہماری زندگی سے چلے جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔'

جیا سکندر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نارنجی سورج کی کرنیں، صبح کی تازگی اور دل سے ہٹا بوجھ اسے خوشگوار احساس بخش رہا تھا۔ وہ ہلکا سبز رنگ زیب تن کیے ہوئے تھی۔ دوپٹہ شانوں پر سلیقے سے سیٹ تھا۔ سیاہ لمبے بال آبشار کی طرح پشت پر بکھرے تھے۔ ہاتھ سینے پر باندھے اس کی نظریں سامنے موجود گھروں کا طواف کر رہی تھیں۔ کسی احساس کے تحت وہ ایک دم پلٹی۔ لیکن شاید اس کا وہم تھا۔ اس نے دوبارہ سامنے دیکھا۔ نیچے موجود چوکیدار کسی کی آمد پر گیٹ کھول رہا تھا۔

"اینجل۔" اس کے لب مسکرا اٹھے۔ دروازے سے ماہیر سکندر اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکلی۔ سیڑھیاں اترتے لاؤنج میں آنے تک ماہیر سکندر اندر داخل ہو چکا تھا۔

"السلام علیکم۔" ایک دم اس کے چہرے کی خوشی کہیں کھو گئی۔ اسے یاد آیا وہ تو اس سے ناراض تھی۔

"وعلیکم السلام۔" آہستگی سے کہتے وہ وہاں رکھے صوفوں کی جانب بڑھی۔ ماہیر نے اس کا روکھا رویہ بغور نوٹس کیا تھا۔

"جیا۔" ماہیر نے اسے پکارا جو صوفے پر بیٹھے اپنے آنسوؤں پر پل باندھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ نرمی سے اسے کندھوں سے تھامے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

"روکیوں رہی ہو۔؟" وہ حیران ہوا۔اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"جیا ادھر دیکھو میری طرف۔" ٹھوڑی اونچی کی۔

"کیوں چھپایا خود کو۔؟ ہماری محبت کو کیوں آزمایا آپ نے۔؟" وہ اس کے ہاتھ جھٹکتی دور ہوئی۔ماہیر نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ بول رہی تھی۔

"آپ کو کبھی اپنی بہن کی یاد نہیں آئی۔؟ کبھی نہیں سوچا کہ جیا سکندر کس حال میں ہو گی۔؟ وہ زندہ ہے بھی یا نہیں۔؟ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہ رہی ہے وہ اس کا خیال بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ کہیں وہ کسی ظلم کا شکار تو نہیں۔؟" ہچکیاں بندھ گئیں۔اس کے رونے اور بولنے کی آواز ماہیر سکندر کو انگاروں پر لپیٹ رہی تھی۔وہ اسے خاموش کروانا چاہتا تھا لیکن ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

"میں تھک گئی ہوں بھائی۔ میں خود کو خود سے باندھتے باندھتے تھک گئی ہوں۔ مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ جیا نے آخری بار کب اپنا سوچا تھا۔ کیونکہ اس کی سوچوں کا مرکز تو وہی اپنے تھے جو اس کے نہیں رہے۔ آپ جانتے ہیں بھائی۔ منہا کی رخصتی پر اسے قرآن کے سائے تلے رخصت کرنے والا اس کا بھائی اس کے ساتھ تھا لیکن میرے ساتھ کون تھا؟ نہ ماں نہ باپ اور نہ ہی آپ۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ماہیر کی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔اس نے آگے بڑھ کر جیا کو گلے سے لگایا۔

"آپ نہیں تھے بھائی۔ میرے ساتھ کوئی اپنا نہیں تھا۔ سب کہتے تھے جیا خوش ہے، جیا ہنس مکھ ہے چلبلی ہے لیکن دل کا درد کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک آپ سب کی تصویروں کے سہارے زندگی گزاری ہے میں نے پھر ایک دم آپ آ گئے۔ماہیر سکندر واپس آ گیا۔ کیوں؟ واپس آنا تھا تو تب آتے نا جب جیا اکیلی تھی۔ جب اسے مینٹلی اور ایموشنلی کسی کی سپورٹ چاہیے تھی۔ جب بالاج سکندر نے اسے دھتکار دیا تھا۔" آواز بلند تھی۔ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچی ہوئی ماہیر سکندر کے سینے پر رکھی تھیں۔وہ ہولے سے اس کا سر تھپک رہا تھا۔ لیکن وہ مسلسل آنسو بہائے جا رہی تھی۔

"رونا بند کرو جیا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔" وہ ضبط کی انتہاؤں کو چھوتا ہوا بولا تھا۔جیا سکندر ساکت ہو گئی۔ یہ وہ مضبوط اینجل تو نہ تھا۔ماہیر نے اسے خود سے دور نہیں ہونے دیا۔وہ اس کی بہن تھی۔ماں باپ کے بعد وہی اس کا سب کچھ تھا۔وہ کیسے اسے خود سے جدا کر سکتا تھا۔اسے اپنے فیصلوں پر پچھتاوا ہونے لگا۔

پشیمانی ہر چیز پر غالب آ رہی تھی۔چند آنسو لڑیوں کی مانند اس کی آنکھوں سے نکلتے جیا سکندر کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

"آپ اب کہیں نہیں جائیں گے ناں؟" ایک آس تھی۔ملک نے اس کے سر پر بوسہ دیتے اسے پیچھے کیا۔روئی روئی سرخ متورم آنکھیں گالوں پر بہتے آنسو۔ماہیر کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"کبھی کہیں نہیں جاؤں گا۔اپنی بہن کے ساتھ رہوں گا اپنی جیا سکندر کے ساتھ۔"اس نے جیا کی پیشانی کو چھوتے وعدہ کیا تھا۔اور ایک عادت جو ان دونوں میں اٹل تھی وہ یہ کہ وہ دونوں اپنا وعدہ نبھانا اچھے سے جانتے تھے۔

"ہمیشہ؟"یقین دہانی چاہی۔

"ہمیشہ۔زندگی کی چلتی آخری سانس تک۔"ماہیر نے اس کے گالوں پر سے آنسو صاف کرتے جیا کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا۔

"اب نہیں رونا۔شاباش خاموش ہو جاؤ۔"جیا نے نم آنکھوں سے سر اثبات میں ہلایا۔پھر وہ گہری سانس بھر گئی۔اس کی زندگی آج مکمل ہوتی اگر بالاج۔۔۔

"جیا۔اب تو تم ناراض نہیں ہونا؟"اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ماہیر کے سوال پر وہ دل سے مسکرائی۔

"بالکل بھی نہیں ہوں۔"

"تمہارے بہت سے سوالات ہو سکتے ہیں مجھے لے کر تو تم۔۔"اس کی بات جیا نے نفی میں سر کو جنبش دیتے کاٹی تھی۔

"مجھے میرا بھائی میرا محافظ مل گیا ہے مجھے کسی سوال کا جواب نہیں چاہیے۔"وہ اس بائیں جانب بیٹھی تھی۔سر کو دائیں جانب خم دیتے اس کے کندھے پر سر ٹکا گئی۔وہ بھی مسکرا دیا۔پھر ایک دم اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔

"اہم۔مجھے تمہیں کسی سے ملوانا تھا۔"گلا کھنکار کر اس کی توجہ چاہی۔جیا کے کان کھڑے ہوئے۔

"کک۔کس سے؟کہیں آپ نے شادی تو نہیں کی ہوئی۔؟"ماہیر کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔وہ اس سے دور ہوئے آنکھوں میں سوال لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"نن۔نہیں۔"بے ساختہ وہ بول گیا۔بعد میں اپنے الفاظ کا احساس ہوا۔لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اپنے الفاظ کا غلام بن چکا تھا۔

"شکر۔مجھے لگا کہ آپ نے میرے بغیر شادی کر لی ہے۔"اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ہر بہن کی طرح وہ بھی اپنے بھائی کو سہرے میں دیکھنا چاہتی تھی۔ماہیر نے نظریں چرائیں۔دل میں سو دفعہ خود کو ملامت کیا۔

'میں نے ٹھیک کہا ویسے بھی میری کون سی شادی ہوئی ہے صرف نکاح ہی تو ہوا ہے۔'خود کو تسلی دی۔

"فی الوقت مجھے تمہیں کسی اور سے ملوانا ہے لیکن وعدہ کرو اوور ری ایکٹ نہیں کرو گی۔"جیا نے سر کو خم دیا۔ماہیر کی نظریں دروازے کی جانب اٹھیں۔

"اندر آجاؤ۔"بلند آواز میں کسی کو بلوایا تھا۔دروازے کی چوکھٹ پر کسی کا سایہ ابھرا۔پھر اس کا دراز قد واضح ہوا۔وہی چہرہ،وہی سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں۔مجرم کی طرح جھکی گردن۔جیا کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔بے یقینی سے ماہیر کو تکا۔وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تحمل کا اشارہ کر رہا تھا۔جیا کا پارہ چڑھ گیا۔

"وہاج۔"جیا کے لب ہلے۔آنکھوں کے سامنے وہ تمام دن کسی پھرکی کی طرح گھوم گئے۔وہ چکرا کر رہ گئی۔

"یہ گھٹیا انسان میرے گھر میں کیا کر رہا ہے۔"آواز اونچی تھی۔سرخ نظریں اسے اندر تک اسکین کر رہی تھیں۔

"جیا کالم ڈاؤن۔وہ مجرم ہے تمہارا۔"ماہیر بھی کھڑا ہو گیا۔

"یہ صرف میرا نہیں نا جانے اور کتنی لڑکیوں کا مجرم ہو گا۔اسے نکالیں باہر بھائی ورنہ میں کچھ غلط کر جاؤں گی۔"وہ غرائی تھی۔وہاج ملک نے زرا کی زرا نگاہ اٹھائے اسے دیکھ دوبارہ نگاہیں جھکا لیں۔

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں جیا۔"اس کی آواز دھیمی تھی لیکن جیا کو سنائی دے گئی۔وہ ایک دم ٹھہر گئی۔ناگواری سے اسے دیکھا۔

"معافی؟مجھے برباد کرنے کی مزید کسر اٹھا رکھی ہے تم نے جو یہاں چلے آئے۔پہلے وہ تصویریں اور اب خود۔کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔بخش دو مجھے۔"جیا نے ہاتھ باندھے۔ماہیر نے شش کہتے اسے قابو کیا۔غصہ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"بھائی چھوڑیں مجھے۔اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔"لہجے میں بے بسی تھی۔ابھی ماہیر اسے چھوڑے اور وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹے۔

"وہ تمہارا مجرم ضرور ہے لیکن وہ تصویریں اس نے سینڈ نہیں کی تھیں بالاج کو۔"جیا کی مزاحمت دم توڑ گئی۔اب کی بار آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔بالاج نے ٹھیک کہا تھا کیا؟واقعی ان کا دشمن کوئی تیسرا شخص تھا؟

"ایک۔ایک دفعہ دل سے معاف کر دو پلیز۔"وہاج نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔آنکھوں سے چند قطرے ہاتھوں پر گرے تھے۔اس نے ایک لڑکی کی ذات کو مسخ کر دیا تھا۔وہ کتنی اذیت میں ہو گی؟

"کس کس سے معافی مانگو گے وہاج ملک؟اگر میرے معاف کرنے سے تمہارے گناہ کم ہوتے ہیں تو سنو۔"وہ ماہیر کی ڈھیلی گرفت سے آزاد ہوئی۔سانس ہموار کرتے وہاج کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔وہ گند اس کے گھر میں کھڑا تھا اسے اس شیطان کو اپنے گھر سے نکالنا تھا۔جلد از جلد۔

"میں نے تمہیں اس دن ہی معاف کر دیا تھا جب تم میری زندگی سے گئے تھے۔ تمہاری دلی تسکین کے لیے میں ایک بار پھر سے تمہیں معاف کرتی ہوں۔ جاؤ آزاد ہو جاؤ اپنے گلٹ سے کہ جیا سکندر نے تمہیں دل سے معاف کر دیا۔ آئندہ کبھی اپنی شکل مت دکھانا مجھے۔ بہتر ہو گا پُر سکون اور مطمئن زندگی گزارو۔ اور چھوڑ دو یہ سب۔" وہ چہرہ موڑ گئی۔ وہاج نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"شکریہ۔" فقط ایک لفظ اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ وہاج ملک کا باب جیا سکندر کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ جیا پر سکون تھی۔ ماہیر جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیا نے اسے مسلسل خود کو گھورتے پا کر جھنجھلا کر پوچھا۔

"ایسے کیوں گھور رہے ہیں۔؟" وہ واپس جا بیٹھی۔ سر درد سے پھٹنے کو تھا۔ اسے پین کلر لینی چاہیے۔

"تم نے وہاج کو معاف کر دیا اور بالاج؟ اس کا کیا؟ اس کا جرم اتنا بڑا تو نہیں۔" ماہیر کے دل میں دوست کے لیے ہمدردی جاگی تھی۔ جیا نے آنکھیں گھمائیں۔

"جیا۔ میری بالاج سے بات ہوئی تھی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مجبور تھا۔" ماہیر نے ہاتھ اٹھائے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"مجبور۔؟" وہ استہزایہ ہنسی۔

"ہاں کیا تمہیں لگتا ہے بالاج اتنی بڑی خبر سننے کے بعد تمہارے ساتھ ایسا کرنے کا روادار تھا؟ نہیں۔ ایک دن پہلے اسے معلوم ہوا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ وہ یہ سب تمہارے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ لیکن اگلی ہی صبح وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وقتی غصہ تھا اسے۔ بالاج کی انا کی لکیر بہت اونچی ہے اسے ٹھیس پہنچی تھی۔ اس نے تمہیں گھر سے نکالا کیونکہ یہی ٹھیک تھا بس انداز اور رویہ غلط تھا۔ لیکن اس نے تمہاری حفاظت کی اور اب تک کر رہا ہے۔" وہ کہہ کر خاموش ہوا۔ پھر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیا ایک ایک لفظ غور سے سن رہی تھی۔

"فرض کرو اگر وہ تمہیں خود سے دور نہیں کرتا تو کیا ہوتا؟ وہ لوگ جن کا میسج اس روز آیا تھا وہ ایک گھر میں با آسانی تمہیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اور پتا ہے کیا انہیں سکندر حویلی کا نہیں معلوم۔ یہاں کے ایک ایک ملازم پر بالاج کو اعتبار تھا اسی لیے تمہیں خود سے دور کر دیا۔" جیا نے سر جھٹکا۔

"وہ مجھے بتا سکتے تھے۔ اعتماد میں لے سکتے تھے۔ اور پھر انہوں نے اعتبار تو دور گھر سے نکال دیا مجھے اور وہ بھی تنہا۔" وہ غصے سے بولی۔

"کس نے کہا تم تنہا تھیں؟" ماہیر سکندر اس سب میں پہلی بار مسکرایا۔ جیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں تمہارے ساتھ تھا۔ہمیشہ کی طرح کیونکہ مجھے تمہارا محافظ پیدا کیا گیا ہے۔"اس نے ٹیبل پر دھرا اپنا موبائل اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کے ساتھ تم خطرے میں تھیں۔تم بھی اور تمہارا بچہ بھی لیکن اب تم محفوظ ہو۔دل صاف رکھو جیا۔دل گدلا ہو گا تو تمہیں ہر شخص کی صفائی دل کی آنکھ سے دھندلی نظر آئے گی۔"وہ کہہ کر چلا گیا۔جیا سکندر وہیں رہ گئی۔اسے ایک فکر تھی کہ اگر بالاج کو معلوم ہوا کہ وہاج یہاں آیا تھا تو؟

سورج اپنے جوبن پر تھا۔دھوپ اس دروازے کے سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔

"ٹن ٹن ٹن۔"دروازے کی بیل پر اس نے ہاتھ رکھا تو شاید ہٹانا ہی بھول گئی۔وہ ایک ہلکے بادامی رنگ کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔گھر بہت بڑا نا تھا بس درمیانہ تھا۔اس کا دروازہ بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔دروازے کا رنگ سفید تھا۔

چند ثانیے بعد کوئی پورچ میں چوکیدار سے استفسار کر رہا تھا۔اس کے کہنے پر چوکیدار نے فوراً سے دروازہ کھول دیا۔وہ گھبرا کر اندر داخل ہوئی۔پھر تیز قدموں سے اینٹرنس کے قریب پہنچی۔وہاں اوپر بنے شیڈ کے باعث ٹھنڈی چھایا تھی۔اس نے اپنا پھولا تنفس درست کیا۔پھر سامنے کھڑے لڑکے کو دیکھا۔

"السلام علیکم۔"ہشاش بشاش انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"واعلیکم السلام۔"مومن نے ہاتھ نہیں ملایا۔

یونہی سلگتی نگاہوں سے سامنے کھڑی بسمہ شارق کو دیکھتا رہا۔وہ گلابی اور سفید رنگ کے امتزاج میں ہاتھ میں پرس پکڑے اس کے سامنے کھڑی تھی۔زبردستی کی مسکان چہرے پر سجائے۔آہ کتنی ڈھیٹ تھی وہ۔

"بچی نہیں ہو جو تمہیں کسی کے گھر میں داخل ہونے کے آداب سکھانے پڑیں۔"بسمہ نے ہاتھ واپس کھینچا۔چہرے کے دائی جانب لٹکتی بالوں کی ایک لِٹ انگلی پر لپیٹے تھوڑا مومن کی جانب جھکی۔

"Never Mind"

ادا سے الفاظ ادا کیے اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوئی۔مومن تلملا کر اس کے پیچھے گیا تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفوں پر صوفیہ ابراہیم کے بالکل ساتھ چپک کر بیٹھ گئی تھی۔اور ایک وہ تھیں جو اس کے صدقے واری جا رہی تھیں۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔؟"اس کے چہرے پر جھریوں زدہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولیں۔

"بالکل ٹھیک۔" وہ آج ضرورت سے زیادہ خوش لگ رہی تھی۔ شاید یہ اتنے دنوں بعد صوفیہ ابراہیم سے ملنے کا اثر تھا۔ اگلے چند منٹ وہ اس سے حال احوال دریافت کرتی رہیں۔

"مومن۔"

"جی۔؟" چند قدم کے فاصلے پر کھڑے مومن کو صدا لگائی۔ اس نے تابعداری سے پوچھا۔

"بچی اتنی گرمی میں آئی ہے ٹھنڈا پانی لاؤ بلکہ ایک کام کرو شیک بنالاؤ۔" انہوں نے مومن سے کہتے بسمہ کو محبت سے دیکھا۔ اس نے مسکراہٹ چھپائی جبکہ مومن ابراہیم کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی تھی۔

"میں۔؟" انگلی سے اپنی جانب اشارہ کرتے تصدیق چاہی۔

"جی آپ۔" صوفیہ ابراہیم کی بجائے بسمہ شارق کی جانب سے جواب آیا تھا۔

وہ اپنے اندر اٹھنے والے اشتعال پر قابو پاتا کچن میں چلا گیا۔ بسمہ ہنسی تھی۔

"کیوں تنگ کرتی ہو میرے بیٹے کو۔؟" صوفیہ ابراہیم نے اس کے چہرے پر ہلکی چپت رسید کی۔

"آپ کا بیٹا بھی تو کسی طرح ہاتھ نہیں آتا نا۔" اس نے یاسیت سے کچن میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہاں سے جوسر کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

"کیا؟" صوفیہ ابراہیم کے چہرے پر خوشی پھوٹی۔

"let me tell you something... کان پاس کریں۔" اس نے چہرہ صوفیہ ابراہیم کے کانوں کے قریب کیا۔ پھر چند الفاظ کہے۔ صوفیہ ابراہیم کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ جلدی سے ہڑبڑا کر کچن کی جانب دیکھا۔

"اہم۔ اہم۔" مومن ٹرے میں دو گلاس شیک رکھے لا رہا تھا۔ بسمہ سیدھی ہو بیٹھی۔ البتہ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مومن نے بسمہ کو دیکھتے ٹرے زور سے میز پر پٹخی۔ اس کی خونخوار نظروں سے لطف اندوز ہوتی بسمہ نے جلدی سے اپنا گلاس اٹھایا۔ اور کندھے اچکاتے اسے مزید تپایا۔ وہ پیچ و تاب کھاتا وہاں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"دیکھا کتنے غصے والا ہے۔" انہوں نے اسے احساس دلایا۔

"کوئی بات نہیں اس پر جچتا بھی ہے۔" وہ مسکرا کر گلاس سے گھونٹ بھر رہی تھی۔ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

ماضی:

اپنے وعدے کے پورے دس سال بعد جہانداد ملک کی پاکستان واپسی ہوئی تھی۔ پاکستان واپسی صرف ایک شخص کے لیے موزوں تھی اور وہ تھا ماہیر سکندر عرف ملک۔ اکیس سال کی عمر تک وہ ایک کامیاب مارشل آرٹس کا علم بردار بن چکا تھا۔ فائننشلی انڈیپینڈنٹ Financially Independent ہونا ایک پڑھے لکھے اور قابل مرد کے لیے مشکل نہیں ہوتا اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے ایک سینٹر میں بطور ٹیچر کام کرنا شروع کیا تھا۔ مارشل آرٹس میں پیسے کمانے کے ایک سو ایک طریقہ کار موجود ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا خواب اپنا مارشل آرٹس سینٹر بنانا تھا۔ ایک خواب تھا جس کی تعبیر کے لیے وہ راتوں کو سویا نہیں۔ اس کے پاس پراپرٹی کے نام پر ایک ڈھیلا تک نہیں تھا۔ لیکن اس کی وفاداری اس کے کام آئی۔

جہانداد ملک کے ساتھ کام کرنے کا اسے ایک واحد فائدہ یہی ہوا تھا۔ اس کے تعلقات ملک کے نامور اور معتبر لوگوں کے ساتھ بڑھنے لگے تھے۔ جہانداد ملک جیسے لوگوں کے راز ملک کی خفیہ آرگنائزیشنز تک پہنچانا اس کے لیے قطعاً مشکل نہ تھا۔ وہ جہانداد ملک کے سامنے ایک وفادار ملازم بن چکا تھا لیکن اصل میں اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

اپنے مارشل آرٹس سینٹر کا افتتاح اس نے اسلام آباد کے ایک قدرے غیر آباد علاقے میں کیا تھا۔ تئیس سال کی عمر میں اس کا مارشل آرٹس بن کر تیار تھا۔ اس کا خواب بہت کم عمری میں پورا ہوا تھا۔ لیکن اسے مزید بلندیوں تک لے کر جانا ابھی باقی تھا۔

M.S Martial Arts Training Center

اس کے لیے اپنے خواب اہم تھے۔ خوابوں کی خوبصورتی پر یقین ہی انسان کو کامیاب بناتا ہے۔ خواب خون پسینہ اور محنت لیتے ہیں۔ اس نے بھی اپنے دن اور رات خوابوں کو سینے میں سر و کیے تھے۔

مومن سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ ملک نے باپ سے بڑھ کر اس کا خیال رکھا تھا۔ مومن ابراہیم ملک کے لیے سانس سے زیادہ ضروری ہو چکا تھا۔ کوئی اس سے مومن کو چھیننے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی سانسیں چھین لینے کی سکت رکھتا تھا۔ ملک کوئی بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ قہر بن چکا تھا۔ اس کی ایک سفاک نگاہ مقابل کو جھلسا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔

ایک دن تھا جب ملک پر ایک حقیقت آشکارا ہوئی۔ ایسی حقیقت جسے وہ جھٹلاتا آ رہا تھا۔ مومن اسکول گیا ہوا تھا۔ ملک آج گھر میں موجود تھا۔ حویلی کے اندر اس کے لیے جگہ موجود تھی لیکن اس نے انیکسی میں رہنا مناسب سمجھا۔ وہ مومن ابراہیم کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ تنہائی کاٹنی تھی اس کی خوشبو میں ہی سہی۔

اس کا کمرہ کبھی بھی درست حالت میں نہیں رہا تھا۔ کبھی بیڈ شیٹ ٹھیک نہ ہوتی تو کبھی اسٹڈی ٹیبل پر گند پڑا رہتا۔ آج بھی وہی سب تھا۔ اس نے بیڈ شیٹ ٹھیک کی اور پھر اسٹڈی ٹیبل کی جانب آیا۔ وہاں ایک ڈائری رکھی تھی۔ موٹی جلد والی سیاہ ڈائری۔

My Life Span۔

اس پر سنہری رنگ میں کنندہ الفاظ ملک کو اس ڈائری کا مقصد سمجھا گیے تھے۔ مومن کو ڈائری لکھنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے یونہی اسے کھول لیا۔ چند الفاظ پر ہی اسے احساس ہوا کہ وہ غلط کر رہا ہے لیکن تجسس کے مارے وہ آگے پڑھتا گیا۔ چند مزید الفاظ، کچھ مزید صفحات اور پھر اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کی کہانی میں انمول داخل ہوتی گئی۔

وہاں ملک کے نام کے علاوہ واحد تیسرا نام انمول ملک کا تھا۔ ملک اپنی جگہ پتھر ہو گیا۔ نا جانے کتنی دیر وہ بے یقینی کے عالم میں وہاں بیٹھا رہا۔ اور پھر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے بھرم قائم رکھنا تھا۔ اپنی محبت کا اور مومن ابراہیم کی محبت کا۔

"جانتے ہو محبت کیا ہے۔؟" کالج سے واپسی پر لنچ کے دوران ملک نے اس سے استفسار کیا۔ مومن کی بھوری آنکھیں مسکرا دیں۔ ملک یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"فقط دیوانگی۔" ملک کی آنکھوں میں سنجیدگی چھا گئی۔ دیوانگی محبت کا اختتام تھی۔ تو کیا وہ محبت میں اتنا آگے نکل چکا تھا۔

"اور دوستی کیا ہے۔؟" یونہی پوچھ لیا۔

"قربانی۔" وہ ملک کو دیکھ کر بولا۔ ملک مسکرا دیا۔

"ایک بات کہوں۔"

"جی۔" کھانے کا لقمہ منہ میں رکھتے اسے بولنے کا اشارہ دیا۔

"محبت دیوانگی ہے لیکن اسے خود پر حاوی مت ہونے دینا۔ اپنا آپ اور اپنے مقاصد سب سے اوپر رکھنا۔ کیونکہ انسان کو خود سے محبت ہونی چاہیے۔" ں رمی سے سمجھایا۔ کھانا خاموش ماحول میں کھایا گیا۔

"میں جانتا ہوں انمول کی چاہ میری اوقات سے بڑی ہے لیکن ایک بات انہیں بھولنا میرے بس میں نہیں۔ کیونکہ اگر انہیں بھول گیا تو یہ دل مردہ ہو جائے گا۔ اور مردہ دل اور بنجر زمین میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" وہ کھانا کھاتا اٹھ گیا۔ ملک کی نظریں جھک گئیں۔

"آہ۔ یہ محبت۔" ٹھنڈی آہ خارج کیے مومن ابراہیم کے کمرے کو دیکھا۔ وہاں قفل لگ چکا تھا۔ ایسا ہی قفل اس کے دل پر بھی لگ گیا تھا۔

آنے والے سالوں میں اس نے کبھی مومن ابراہیم کو انمول کا نام لیتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اس نے کبھی وہ ڈائری کہیں دیکھی تھی۔ وہ چاہتا تو مومن کی دلجوئی جر سکتا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا۔ مومن ابراہیم کے دل میں پنپتا وہ محبت کا لوتھڑا عشق کی شکل اختیار کر جاتا۔ اور عشق میں بربادی تھی۔ مومن ابراہیم کا مقصد اگر بدل جاتا تو اس کے ہاتھ خالی رہ جانے تھے۔ ابھی اس کی عمر اس جھنجھٹ میں پڑنے کی نہیں تھی لیکن بعد کی تکلیف سے نجات بھی ممکن نہیں تھا۔

انمول ملک کا رویہ دن بدن اس سے بگڑ تا جا رہا تھا۔ وہ جہاں بھی ملتی اس پر طنز کرتی یا کسی بات کا طعنہ دے کر آگے بڑھ جاتی۔ یہ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ یہاں آ کر بھی نہیں بدلی تھیں۔ ویسی ہی چلبلی سی لڑکی۔ چوبیس گھنٹے ٹپ ٹاپ رہنے والی۔ اس کی واحد ترجیح اپنا آپ بن گیا تھا۔ وہ بہت حد تک خود غرض بن چکی تھی۔ اسے یونی لے جانے اور لانے کی ذمہ داری ملک کی تھی۔

"گاڑی روکو۔" اس دن یونی سے چند میل کی دوری پر اس نے گاڑی رکوا دی۔ ملک نے بیک ویو مرر سے اسے تکا۔

"ایسا کب تک چلے گا۔؟" اس نے سوال کیا۔ ملک کو مطب سمجھ نہیں آیا۔

"اب کیا کیا ہے میں نے۔؟" اپنا جرم پوچھا۔

"محبت کرتے ہو مجھ سے۔؟" ڈائریکٹ دوٹوک سوال۔ ملک کو شاک لگا۔ حیرت کا جھٹکا۔ وہ مکمل پیچھے کی جانب گھوما۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا۔؟" انداز انکاری تھا۔ انمول ملک نے آنکھیں سکیڑے اسے گھورا۔

"نہیں کرتے۔ لیکن میں تو تم سے محبت کرتی ہوں۔" حیرت کا دوسرا جھٹکا۔ ایک بیس سالہ لڑکی اس کے سامنے محبت کا اعتراف کر رہی تھی۔ اور وہ اپنی جگہ شل تھا۔

"اب بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔؟" ملک کے جبڑے تن گئے۔ چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہوا۔

"آپ سے محبت کر کے میں اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ میری منزل کچھ اور ہے۔" انمول کے سر پر لگی تلوؤں پر بجھی۔

"اچھا اور کیا ہے تمہاری منزل۔؟ جہانداد ملک کی موت؟ تم خود بھی جانتے ہو یہ تمہارے لیے کبھی مشکل نہیں رہا لیکن کوئی تو وجہ ہے جو تم تاخیر پر تاخیر کیے جا رہے ہو۔"

"وجہ بہت خوبصورت ہے۔ رہنے دیں آپ نہیں سمجھیں گی۔" ملک کی آنکھوں کے سامنے جیا سکندر کا عکس لہرایا۔ جو واحد اس کا خاندان تھی۔

"تو پھر محبت نہ کرنے کی وجہ۔؟" ملک کو اس لڑکی پر غصہ آنے لگا جو اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اور پھر ایک شیطانی خیال اس کے دماغ میں آیا۔

"میں آپ جیسی بولڈ لڑکی سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔"

"واٹ؟" انمول چیخی۔ وہ چہرہ واپس موڑ گیا۔ لبوں پر دھیمی سی مسکان آر کی تھی۔

"ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں شلوار قمیض پہنے، تنبو کی طرح دوپٹہ اوڑھنے والی اور نظریں جھکا کر چلنے والی ٹیپیکل لڑکیاں پسند ہیں۔" حیرت کی انتہا تھی۔ ویسے ہی جیسے کچھ دیر قبل ملک کو ہوئی تھی۔

"ٹیپیکل سہی لیکن یقین جانیں اصل خوبصورتی ہی ان میں ہے۔" آواز میں مان تھا۔

"ملک!!" صدمہ بھری آواز۔ ملک نے امڈ آتا قہقہہ ضبط کیا۔

اس دن کے بعد انمول ملک اور ملک کے درمیان کولڈ وار چل رہی تھی۔ جسے ملک کے تحفے نے توڑا تھا۔ وہ ایک مہرون رنگ کی چادر تھی۔ اس چادر نے انمول ملک کے ظاہر کو بدل دیا۔ ہاں وہ بدل گئی تھی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا اوڑھنا ہر شے بدل گئی تھی۔ اور یہی بات ملک کو حیران کر گئی۔

وہ ملک کی محبت میں بدل گئی تھی۔

پندرہ سال گزر چکے تھے۔ جہانداد ملک کے ساتھ اسے کام کرتے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ جہانداد ملک کا بھروسہ اور اعتماد ملک پر مضبوط ہو چکا تھا۔

ایک روز جہانداد ملک نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا۔

"آپ نے بلایا تھا۔" وہ جہانداد ملک کے سامنے کھڑا تھا۔ جہانداد ملک نے اپنی کرسی پر جھولتے سامنے میز کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں کوئی شے الٹی پڑی تھی۔

"اس تصویر میں نظر آتے چہرے کو مجھ تک پہنچانا ہے۔" ملک نے تصویر اٹھا کر دیکھی۔ کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی میں وہ تصویر چمک اٹھی تھی۔ ملک گنگ رہ گیا۔

"جتنی جلدی ہو سکے تمہیں یہ کام کرنا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے اور ملک کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہر احساس اس پر بھاری پڑنے لگا تھا۔ وہ اپنی بنائی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ سب سوچا تھا اس نے لیکن یہ نہیں۔ کیا منزل دور تھی ابھی؟ کیا ابھی اور امتحانات باقی تھے؟

ملک کی آنکھوں میں وحشت اور بے یقینی تھی تو سامنے تصویر میں نظر آنے والی سیاہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

حال:

وہ غصے سے اسٹڈی ٹیبل پر رکھی کتابیں ادھر سے ادھر پٹک رہا تھا۔ پھر اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب اٹھائی اور لا کر اسٹڈی ٹیبل پر پٹکی۔ اسے نا جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔

ٹیبل پر کاغذات، فائلز اور دیگر کتب کا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی ٹیبل سلجھی ہوئی نہیں تھی۔ ملک کے ساتھ ہوتا تو یہ کام وہ کر دیتا تھا لیکن اب اسے خود کرنا تھا۔ اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ دیوار میں بک شیلف نصب تھا۔ چار اوپر نیچے شیلف والا۔ اس نے وہاں کی تمام کتابیں بھی ٹیبل پر پٹک دیں جب دروازے پر کسی نے انگلی کی پشت سے ہلکی سی دستک دی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا بسمہ شارق دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"ناٹ اگین۔" مومن نے دو انگلیوں سے ناک مسلی۔ غصہ مزید عود آیا تھا۔

"تمہیں میرا اپنے گھر میں آنا اتنا ناگوار گزرا ہے۔؟" شکوہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔

"اصل ڈھیٹ پیدا ہوئی ہو۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔" دانت پیسے۔ وہ اندر چلی آئی۔ ٹیبل پر رکھی کتابوں کو دیکھا۔ ایک دم آنکھوں میں بے یقینی چھا گئی۔ پھر چمک ابھری۔

"تم ناولز پڑھتے ہو۔؟" چہک کر پوچھا۔ مومن ہکلا گیا۔

"صرف انگلش ناولز پڑھتا ہوں۔" کتابوں کے انبار میں سے دیکھ دیکھ کر کتابیں شیلف میں سیٹ کر کے رکھنا شروع کیں۔

"واٹ! انگلش؟ پڑھنے ہی ہیں تو اردو ناولز پڑھو نا۔" مفت کا مشورہ دیا۔ مومن نے ایک اور کتاب اٹھائی۔

"بہت شکریہ آگہی دینے کا۔" کتاب کو سب سے نچلے شیلف میں رکھا۔

"ہنہہ۔ کھڑوس۔" بسمہ نے ایک کتاب اٹھائی وہ مشہور انگلش رائٹر کا ایک قابل ذکر ناول تھا۔ اس نے صفحے پلٹائے۔

"انگلش ناولز میں کیا رکھا ہے۔ اردو والے پڑھنے چاہیے۔" وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"جیسے؟"

"جیسے مالا، پیرِ کامل، یارم، نمل، تصنع، امر بیل، عشق آتش، مرسل۔۔۔"

"بس بس بہن بریک لگاؤ۔" مومن نے ہاتھ اٹھا لیے۔

"استغفرُ للہ۔" بسمہ نے بہن لفظ پر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

وہ اس ٹاپک کو نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔ اگر چھیڑتا تو ناولز کی دیوانی لڑکیوں کی طرح وہ بھی پورا پینڈورا باکس لے کر بیٹھ جاتی۔ چند پل خاموشی کی نظر ہو گئے۔

"ناراض ہو۔؟" اب کی بار بسمہ کا انداز صلح جو تھا۔ مومن نے ایک آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں جت گیا۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"مومن۔ پلیز معاف کر دو۔ میں ڈر گئی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی دوسرا ہوتا تو یہی کرتا۔"

"بالکل تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو ایسا ہی کرتی کیونکہ لڑکیاں جذباتی ہوتی ہیں۔" مومن نے تائید کی۔

"اچھا نا۔ آئی ایم سوری۔"

"کان پکڑ کر معافی مانگو۔" مومن کا رخ بک شیلف کی طرف تھا۔ بسمہ اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"آئی ایم سوری اگین۔" مومن پلٹا تو دیکھا کہ بسمہ شارق دونوں کان پکڑے اس سے معافی کی طلب گار کھڑی تھی۔ اس کا دل دھڑکا۔ یہ لڑکی اسے حیران در حیران کرتی تھی۔

"اچھ چلو معاف کیا۔" مومن نے ہنس کر سر جھٹکا۔ بسمہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"سنو کل کیا کر رہے ہو تم۔؟" وہ اسٹڈی ٹیبل سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"مجھے سو کام ہوتے ہیں بی بی۔"

"اچھا۔" آواز میں اداسی گھل گئی۔ یہ بسمہ شارق کہیں سے بھی چند دن پہلے والی بسمہ نہیں لگ رہی تھی۔ مومن اسے دیکھے گیا۔ وہ جوتے کی نوک سے فرش کھرچ رہی تھی۔ یونہی کسی کی نظروں کی تپش پر چہرہ اٹھایا۔ مومن ابراہیم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ اور وہ پر سوچ انداز میں اس کے چہرے پر جیسے کچھ کھوج رہا تھا۔

"بیمار لگتی ہو۔ سمجھ نہیں آ رہا تمہیں مریض کہوں یا مریضِ عشق۔" بدوقت وہ بولا۔ نظریں چرائیں۔ بسمہ کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ کیا وہ چہرے پڑھنا جانتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سٹل ہو گئی۔ نہ آگے بڑھ سکی نہ ہی اپنی نشست سے ہل سکی۔

چند لمحات قبل وہ صوفیہ ابراہیم کے قریب بیٹھی انہیں کان پاس کرنے کا کہہ رہی تھی۔ انہوں نے اپنا کان اس کے قریب کیا۔

"I'm in love with your Son...May he be mine forever and ever?"

"بولیں۔ کیا وہ ابد تک میرا ہو سکتا ہے۔؟" ہلکی سرگوشی کرتے الفاظ۔ صوفیہ ابراہیم نے اسے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ لڑکی بولڈ تھی کوئی بھی بات کرنے سے کتراتی نہ تھی۔

بسمہ سرخ چہرہ لیے واپس سیدھی ہو بیٹھی تھی۔اس نے اپنا اعتراف لڑکے سے نہ سہی لڑکے کی ماں سے تو کر لیا تھا نا۔

"کہاں کھو گئی۔؟"مومن نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔بسمہ نے مومن کو دیکھا۔وہ آخری کتاب شیلف میں لگا رہا تھا۔اس نے لب کترے۔لفظوں کو طول دی۔

"کیا تمہیں مجھ سے کبھی محبت ہو سکتی ہے مومن ابراہیم۔؟"پھر وہ بولی۔آس،امید اور تمنا تھی اس کی اواز میں۔کتاب مومن کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہوئی۔گردن حیرت سے گھما کر اسے دیکھا۔وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھائے جواب کی منتظر تھی۔

"شاید کبھی نہیں۔"بسمہ شارق کے دل کو کسی نے تیز برچھی سے چیرا تھا۔خون رسنے لگا۔مومن ابراہیم کچھ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔وہ پلک تک نہ چھپک پائی۔

وہ ہاسپٹل کا ایک پر تعیش اور پرائیوٹ روم تھا۔کسی کی دھیمی چلتی سانسوں اور آئی سی یو مانیٹر کی ٹوں ٹوں کمرے کے ماحول میں شور پیدا کر رہی تھی۔ساتھ رکھے میز پر دواؤں کا انبار رکھا تھا۔کینسر کا مرض ان دواؤں سے جانے والا نہیں تھا لیکن یہ بھی ڈاکٹروں کی کوشش تھی۔ناکام کوشش!

دائیں جانب دیوار کے ساتھ صوفہ رکھا تھا۔نیلے رنگ کے صوفے پر ایک ادھیڑ عمر مرد ہاتھ پر سوچ انداز میں ٹھوڑی تلے رکھے بیٹھے تھے۔بال کلموں سے سفیدی جھلکا رہے تھے۔ان کے ساتھ ہی جمائیاں لیتی ایک نو عمر لڑکی بیٹھی تھی۔اضطراب سے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھتی ہوئی۔

دفعتاً دروازے پر کسی نے ناک کیا۔وہ صاحب اٹھے اور جا کر دروازہ کھولا۔سامنے سیاہ آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا۔وہ اسے نہیں جانتے تھے لیکن اس کے پیچھے کھڑا وجود ان کا خون تھا۔

"عالیہ۔!"سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔وہ وہاج ملک کے پیچھے کھڑی تھی۔سرخ رنگ کی چنری سر پر لیے اور دونوں پلو آگے کو ڈالے۔وہ سر جھکا گئی۔

"کون ہے یہ۔؟"سلمان جعفری نے عالیہ کو دبوچ کر کمرے کے اندر کھینچا۔وہ صبح سے ہاسپٹل میں نہیں تھی۔سست بیٹھی مسفرا ایک دم الرٹ ہوئی تھی۔بیڈ پر موجود ماں کو دیکھا۔وہ ویسی ہی بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھیں۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔؟"وہ غرائے۔عالیہ جعفری سہم گئی۔وہاج نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

"یہ وو۔وہاج ہے بابا۔ہم۔ہم نے نک۔نکاح کر لیا۔۔ہے۔کورٹ جا کر۔"وہ آنکھیں میچ کر بولی۔مسفر اتھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکا گئی۔

سلمان جعفری کا اگلا ردعمل غیر متوقع ہر گز نہیں تھا۔ان کا ہاتھ اٹھا۔اس سے پہلے کہ بھاری ہاتھ کا طمانچہ عالیہ کے چہرے کی زینت بنتا کوئی تیز رفتاری سے ان کے درمیان آیا تھا۔سلمان جعفری نے خونخوار تاثرات لیے وہاج کو دیکھا۔وہ ان کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت میں پکڑے پیچھے کر رہا تھا۔

"میری بیوی ہے یہ اور مجھے ہر گز برداشت نہیں کہ کوئی میری بیوی پر ہاتھ اٹھائے۔"اس نے ان کا ہاتھ نرمی سے واپس چھوڑ دیا۔سلمان جعفری کی پیشانی کی رگیں کھول رہی تھیں۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے بیٹی ہے یہ میری۔اور یہ وہی کرے گی جو میں کہوں گا۔"وہ دھاڑ رہے تھے۔

"یہ آپ کی پابند نہیں رہی۔"وہ تحمل سے بولا۔

"یہ ہے اور تم۔تم ابھی کے ابھی طلاق دو گے اسے۔"انہوں نے عالیہ کو اپنی جانب کھینچا۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔وہ جانتی تھی یہ تو ہونا ہی تھا۔

"بابا۔ماما کو دیکھیں۔"مسفر اایک دم نائلہ جعفری کی جانب بڑھی۔ان کا سانس اکھڑ رہا تھا۔شاید وہ جاگ چکی تھیں اور تمام باتیں سن رہی تھیں۔

سلمان جعفری ان کی جانب بڑھے۔جلدی سے آکسیجن ماسک لگانا چاہا لیکن انہوں نے زور سے سر ہلایا۔وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

"ماما۔"عالیہ بھاگ کر ان کے قریب گئی۔ان کا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے چھوا۔وہ ٹھنڈا تھا۔سردیوں کی شاموں کی طرح یخ۔

"عا۔عالیہ بیٹے۔"اٹک اٹک کر وہ بولنا شروع ہوئیں۔وہاج وہیں کھڑا تھا۔

"سلمان۔۔بچی کو معا۔ف کر۔دیں۔"انہوں نے اپنے شوہر کو دیکھا وہ لب بھینچ گئے۔

"غلطی ہوئی۔ہے اس۔۔سے لیکن اس رشتے کو قبول کر لینا ہی بہتر۔ہو۔ہو گا۔"انہوں نے عالیہ کے ہاتھ میں موجود اپنا ہاتھ ہلایا۔عالیہ نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔

سلمان جعفری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ان کی بیوی موت کے منہ میں تھی۔

"اس۔ے میری آخری خواہش۔۔سمجھ کر پوری کر دیں پلیز۔"

"ماما۔"مسفرااور عالیہ یکجاہو کر چیخیں۔ سلمان جعفری نے ضبط سے آنکھیں میچ کر کھولیں وہ مسفرااور عالیہ کے سسرال والوں کو کچھ دن بعد نکاح اور سادگی سے رخصتی کی تاریخ دے چکے تھے۔ لیکن کیاوہ اپنی زبان کے آگے بیٹی کو قربان کر سکتے تھے۔؟ہر گز نہیں۔

"بابا۔ پلیز معاف کر دیں ناں۔ وہاج بہت اچھالڑکا ہے۔"وہ روتے ہوئے وہاج کی جانب اشارہ کر کے بولی۔

انہوں نے وہاج کو دیکھا۔ تکیوں کے سہارے لیٹی نائلہ جعفری نے بھی آنکھیں اٹھائے اسے تکا۔ سیاہ کوٹ پینٹ میں وہ سوبر اور کافی سمجھدار لگ رہا تھا۔

"جیتی رہو۔ ہمیشہ خوش رہو۔"منٹوں کا فیصلہ سیکنڈ میں کرتے سلمان جعفری نے اپناہاتھ عالیہ جعفری کے سر پر رکھا۔ باپ ہونے کا مان تھایا کیاوہ ایک دم رو دی۔ پھر ان کا ہاتھ اٹھائے امید سے انہیں دیکھا پھر وہاج ملک کو۔ سلمان جعفری اس کا اشارہ سمجھتے آگے بڑھے۔ چند قدم وہاج نے بھی اٹھائے۔

"میری بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھنا وہاج۔ اسے سوئی تک نہیں چبھنی چاہیے۔"انہوں نے اسے گلے لگالیا۔ تینوں خواتین مسکرادی تھیں۔ وہاج نے سر ہلاتے تائید کی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں صوفوں پر بیٹھے تھے جبکہ عالیہ اور مسفراماں کی دونوں اطراف میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"انکل ہم دو ہفتے بعد امریکہ شفٹ ہونے کا سوچ رہے ہیں۔"وہاج نے اعلان کیا۔ سلمان جعفری نے آبرو اٹھائے۔ بھلااس کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتے عالیہ جعفری بول اٹھی۔

"اور یہ ہم دونوں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ ہم ایک نئے ملک جاکر نئی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔"سلمان جعفری نے اثبات میں سر ہلایا۔ نائلہ جعفری اور مسفرا بھی مسکرادی تھیں۔

وہ مطمئن ہو گئی۔ کچھ کھو کر جو اسے ملا تھاوہ اس کی توقعات سے بڑھ کر ہونے والا تھا۔

انسان بدل جائیں تو وہ بدلاؤ دوسروں کو بھی بدل دیتا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑا تھا۔ وارڈروب سے اپناڈریس نکالتے ہوئے اس نے ڈریسنگ روم سے کمرے میں جھانکا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھااس کا موبائل رنگ ہو رہا تھا۔ وہ ایک نیلے رنگ کی جینز اور شرٹ نکالتا کمرے میں آیا۔

"ہیلو۔"اسکرین پر جگمگانے والا نام پڑھ کر اس کے اندر تک سرشاری بھر گئی تھی۔ کپڑے ساتھ بیڈ پر دھرے اور آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو؟ کہاں ہو؟" ایک ساتھ پوچھا گیا۔

"ٹھیک ہوں اور اس وقت اپنے گھر میں بیٹھا ہوں۔" وہ آرام سے بولا۔

"سکندر حویلی۔؟" دوسری طرف بالاج نے پوچھا۔ ماہیر نے ماتھا چھوا۔

"نہیں اپنے اپارٹمنٹ۔" آواز ہلکی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کا اصل یہ نہیں تھا اس کا اصل سکندر حویلی تھی۔ اصل رشتے اس کے وہ اپنے تھے جن سے وہ اتنا عرصہ دور رہا تھا۔

"اوہ اچھا۔ میں نے ماما بابا کو بتا دیا تمہارا۔" وہ سکون سے بولا۔ ماہیر سکندر کی رکی سانس بحال ہوئی۔ وہ جانتا تھا ان کا ری ایکشن کیا ہو گا۔ معید سکندر بے یقین ہونگے تو ثانیہ بیگم نے رو رو کر برا حال کیا ہو گا۔

"ان کا رد عمل ویسا ہی تھا جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ظاہر ہے تم بیٹے ہو ان کے۔" ماہیر نے لب آپس میں پیوست کیے سر ہلایا۔

"ہیلو۔ کہاں کھو گئے؟" کچھ پل کی خاموشی پر بالاج نے اسے پکارا۔

"ہوں۔ ہاں ادھر ہی ہوں۔" وہ سامنے دیوار کو گھور رہا تھا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں کہاں ملیں؟" بالاج سکندر نے پوچھا۔ اسے ماہیر کا رویہ عجیب لگ رہا تھا۔

"سکندر حویلی۔ میرے گھر۔" بے ساختہ کہا۔ بالاج کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔ محبت سے لبریز۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر کل ملتے ہیں شام چھ بجے شارپ۔ لیکن۔" وہ رکا۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ ماہیر کا ماتھا ٹھنکا۔

"لیکن؟"

"وہ جیا۔ وہ مجھے دیکھ کر پھر سے ری ایکٹ کرے گی۔ اور ماں بابا پہلے ہی اس کی وجہ سے ناراض ہیں مجھ سے۔" اس نے سر کھجایا۔ بات کیسے کرے اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"تو۔؟ کس نے کہا تھا پھنے خان بننے کو۔ اب بھگتو ہٹلر کی اولاد۔" ماہیر نے لب دبائے۔ وہ جانتا تھا ابھی بالاج کیا کہنے والا ہے۔

"بھگت تو لوں گا لیکن کل کا کیا کروں تم کرونا جیا سے بات۔" سفارشی انداز۔ ماہیر سکندر کا قہقہہ گونجا۔ اس کا شک درست تھا۔ وہ واقعی اس سے بچپن کی طرح سفارش کر رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ میں اپنی بہن کو اذیت پہنچانے والی کی سفارش نہیں کروں گا۔" اس نے آواز کو بھاری اور سنجیدہ بنایا۔

"ماہیر۔" گھمبیر لہجے میں بڑے پیار سے اسے پکارا۔

"جی۔" ویسا ہی آگے سے جواب آیا۔ بالاج کو غصہ آنے لگا۔

"تم سفارش نہیں کروگے؟" دوٹوک آخری مرتبہ پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سر بھی نفی میں ہلا دیا۔

"اوکے۔ پھر میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ کل تمہارا بھائی تمہاری 'بھابھی' کے ساتھ تمہارے گھر تشریف لا رہا ہے۔" بے چارگی سے کہتے وہ فون بند کرنے لگا۔

"اوئے۔" ملک چیخ اٹھا۔ بالاج نے امڈ آنے والا قہقہہ دبایا۔

"کیا ہوا۔؟ جھٹکا لگا۔؟" مصنوعی افسوس۔ ماہیر کی گردن بالاج کی چھری تلے تھی۔

"مم۔ میرا مطلب تھا تم ایسا کچھ نہیں کروگے۔" تنبیہہ کی گئی۔

"اور میں ایسا کچھ کیوں نہیں کروں گا۔؟" توڑ توڑ کر پوچھا۔ ماہیر نے غصے سے اسکرین کو گھورا۔ اسے یاد آیا بچپن میں جب بھی اس نے کام نکلوانا ہوتا تھا وہ یونہی اسے بلیک میل کرتا تھا۔

"کیونکہ تم میرے بھائی ہو۔" گردن اکڑائی۔

"اور وہ تمہاری بہن۔ سوچو اسے پتہ چلے کہ اس کا بھائی اس کے بغیر شادی کر چکا ہے چچ۔ جیا کے ارمان تو آنسوؤں میں بہہ جائیں گے ناں؟" بالاج اس کی حالت سے محفوظ ہو رہا تھا۔

"شادی نہیں صرف نکاح۔" تردید کی۔ بالاج نے ہونٹوں کا کنارہ دباتے ہنسی پر کنٹرول کیا۔

"شادی میں سب سے اہم نکاح ہی ہوتا ہے۔ اور انمول تو رہ بھی تمہارے ساتھ رہی ہیں۔ اور ہاں کل انہیں لے کر آنا میں نے ماں بابا کو ان کے اس بیٹے کی بہو سے بھی ملوانا ہے۔" سہی تپانے والا لہجہ تھا اس کا۔ ماہیر نے چند گہرے ساں س خارج کیے۔

"کل آجانا تم بھی۔ جیا کو منانے کی زمہ داری میری۔" وہ آخر کار مان ہی گیا۔

"اوہ یس۔ تھینک یو بڈی۔" موبائل سے ہی ماہیر کو اس کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ہنہہ۔ بلیک میلر کی اولاد۔" ماہیر نے سر جھٹکا۔ وہ کال کاٹنے لگا جب بالاج کا ایک بار پھر سے پیار سے 'ماہیر' سنائی دیا۔

"ہاں جی۔" اب اس کی بس ہو رہی تھی۔ وہ مزید اسے تپانے والا تھا کیا؟

"تمہیں یاد ہے میں بچپن میں تمہیں کیا کہہ کر پکارتا تھا۔؟" بالاج کے پر سوچ انداز نے ماہیر کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بھول گیا تھا۔ وہ تو بس نام ہی اتنے تھے کہ اسے سمجھ نہیں آیا بالاج کس نام کی بات کر رہا ہے۔ اس نے ٹھوڑی مسلتے سوچا۔

"چیمپ۔؟" پہلا نام سامنے رکھا۔

"نہیں۔" نفی کی گئی۔

"بڑ کپ؟"

"اونہوں۔" نام دوبارہ رد کر دیا گیا۔

"برو۔؟"

"nopes" بالاج نے دوبارہ انکار کیا۔

"پھر؟" ماہیر نے تجسس سے پوچھا۔ بالاج نے ہونٹ موبائل کے اسپیکر کے قریب کیے۔

"Chimpanzee..." ہونٹ سکیڑے جلدی سے لفظ ادا کیا اور کھٹاک سے فون بند کر گیا۔

"واٹ دا۔۔۔" ماہیر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس سے ایک سال چھوٹا اسے چیمپینزی بول گیا تھا۔

وہ جلدی سے آئینے کے قریب گیا۔ چہرہ ٹٹولا۔ کیا وہ کہیں سے چیمپینزی لگتا تھا۔

"نہیں۔ اتنا خوبصورت اور پیارا تو ہوں میں۔" خود کو تسلی کروائی۔

"ہنہہ۔ جلتے ہیں یہ سب میری خوبصورتی سے۔" بیڈ سے کپڑے اٹھاتا وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نام کا صدمہ اسے اگلے چند دنوں تک رہنا تھا۔ بالاج بچپن میں اسے اس نام سے پکارتا تھا اور پھر دونوں خوب لڑائی کرتے تھے۔ اتنی کہ بڑے بھی ان کو لڑتا دیکھ پریشان ہو جاتے۔ لیکن اب۔۔ فراق تھا درمیان میں۔۔ اٹھارہ سالوں کا فاصلہ تھا۔ جذبات بے شک وہی تھے لیکن حالات بدل گئے تھے۔ وہ دونوں بچے نہیں رہے تھے بلکہ بڑے ہو گئے تھے۔

وہ دونوں ایم ایس۔ مارشل آرٹس سینٹر کے تھرڈ فلور پر بنے ملک کے آفس میں بیٹھے تھے۔ ملک نے سفید شرٹ کے کف کہنیوں تک موڑ رکھے تھے۔ مومن اس کے سامنے میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان تھا۔ ملک پرسوچ انداز میں انگلی ٹھوڑی تلے رکھے آہستہ آہستہ کرسی پر جھول رہا تھا۔

"اب کچھ بتاؤ گے بھی۔" اس نے کوفت سے مومن کی بتیسی دیکھی۔ اس کی بات پر مومن کے دانت مزید باہر آئے۔

"دانت اندر کرو اپنے۔" وہ کرسی پر جھولنا رک گیا۔ مومن بھی سیریس ہو گیا۔

"اس کا ایک ہی حل ہے۔" مومن نے بات ادھوری چھوڑی۔ ملک نے پانی سے ڈھکا گلاس اٹھایا۔ وہ کب سے بول رہا تھا اب حلق خشک ہونے کو آیا تھا۔ آئبرو سے مزید بولنے کا اشارہ کیا۔

"یہی کہ تم انمول کو ساتھ لے کر چلے جاؤ ایز آ فرینڈ۔" حل تلاش کر سامنے رکھا۔

"تم پاگل ہو اسے ساتھ لے کر چلا جاؤں تا کہ جیا کو شک ہو جائے۔" اس نے گلاس واپس رکھا۔ کرسی پر پیچھے کو ہو بیٹھا۔

"تو مسئلہ کیا ہے انہیں متعارف کرانے سے۔؟" مومن نے دوبارہ پوچھا۔

"میں اس کا مان نہیں توڑنا چاہتا۔ ضرورت کے وقت اس کو بتا دوں گا لیکن ابھی ہرگز نہیں یوں اگر اس نے کچھ کہہ دیا تو انمول کے سامنے کیا عزت رہ جائے گی میری۔" وہ بیوی اور بہن کا بھرم قائم رکھنا چاہتا تھا۔

"تو آپ انمول کو سمجھا دیں وہ نہیں بولے گی کچھ۔" نیا حل۔

"ان سے کولڈ وار چل رہی ہے۔ کیوں چاہتے ہو کہ اس چنگاری سے وہ جنگ عظیم کی شکل اختیار کر لے۔" مومن زور سے ہنسا۔ ملک کی شکل دیکھنے لائق تھی۔

"انسان کے کرتوت ہی اس کے اعمال بتلاتے ہیں۔" وہ آنکھ دبا گیا۔ ملک نے اسے غصے سے گھورا۔

"بالفرض میں اسے دوست بنا کر بھی لے جاؤں تو جیا کیا سمجھے گی اسے ایک گرل فرینڈ۔" اب کہ وہ پیپر ویٹ کو گھما رہا تھا۔ وہ الجھن کا شکار تھا۔ معاملہ بہت سیدھا تھا لیکن وہ خود کو خود ہی الجھا رہا تھا۔

"تمہارا مجھے کوئی فائدہ نہیں مومن۔ نہ اچھا مشورہ دے سکتے ہو نہ ہی ضرورت کے وقت کام۔۔" وہ بولتے بولتے رکا۔

"کیا؟" مومن نے استفسار کیا۔ ملک کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"تم اور بسمہ۔" وہ بولا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ ساری بے چینی عیاں ہونے لگی۔

"میں اور بسمہ کیا؟" خدشے کا اظہار کیا۔ ملک مسکرا رہا تھا۔ مومن کو چڑ چڑھنے لگی۔

"میرے ساتھی میرے دوست۔ تم انمول اور بسمہ۔ میرے پاس ماضی میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہ تھا اسی لیے میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔" دانت نکالے۔ آخر میں اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

"ناٹ ایٹ آل۔ میں بسمہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" وہ کوفت سے پیچھے ہوا۔ سر دائیں بائیں ہلایا۔

"پلیز میری خاطر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کی پشت سے کوٹ اٹھایا۔ مومن کو امید سے دیکھا۔

"آپ کی خاطر کوئی جان بھی مانگے تو خوشی خوشی دے دوں۔" مومن کے الفاظ محبت جیسی امرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"لیکن اسے آپ خود بتائیں گے۔" تنبیہہ کی۔

"اوکے۔ مائے بوائے۔" سر کو خم دیا۔

"امی کو بھی بلالوں۔"اس نے سلگتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یہ تو اور بھی اچھا ہو جائے گا نا۔"ملک نے خوشگوار حیرت سے کہا۔پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکلتا چلا گیا۔مومن ابراہیم نے گہری سانس خارج کی۔وہ اس کا دوست نہیں تھا دل کا ٹکڑا تھا۔

شام کا وقت تھا۔وہ لان کی ٹھنڈی گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھی۔خزاں کی ہوا کی طرح اداس لیکن بہار کی طرح مطمئن۔دفعتاً لان چیئرز کے سامنے رکھے میز پر دھرا اس کا موبائل بزر ہوا۔اس نے کال پک کی۔

"السلام علیکم۔"دوسری جانب ماہیر تھا۔

"واعلیکم السلام۔کیا حال ہے۔؟"وہ حال دریافت کر رہا تھا۔جیا نے ٹھیک ہوں کہتے جواب دیا۔

"کل شام چھ بجے ہم آرہے ہیں۔"اطلاع دی گئی۔

"ہم کون؟"وہ چلتی ہوئی ایک سائیڈ پر بنی کیاری کے قریب آگئی تھی۔وہاں گلاب اور مختلف پودے لگے تھے۔

"میں اور میرے تین دوست ہیں۔ساتھ میں صوفیہ ابراہیم بھی ہوں گی۔"اس نے مطلع کیا۔جیا نے سر ہلا دیا۔

"مامالوگ بھی کل ادھر ہی ہوں گے۔"

"اچھا۔"وہ بد دلی سے بولی۔دل اداس جو تھا۔

"جیا۔"ماہیر نے اسے پکارا وہ ہوں کر کے رہ گئی۔گلاب کی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی اسے تازگی بخش رہی تھی۔

"ان کے ساتھ بالاج بھی ہو گا۔"

"جانتی ہوں۔"وہ آرام سے بولی۔ماہیر نے طویل ساں س بھری۔اسے معلوم تھا وہ کچھ نہیں کہے گی لیکن اس کا اکھڑ رویہ معید سکندر اور ثانیہ بیگم کو پریشان کر جائے گا۔جو کہ وہ نہیں چاہتا تھا۔

"ایک بات کہوں مانو گی۔؟"امید سے پوچھا۔

"جی۔"تابعداری سے سر ہلاتے بولنے کا انتظار کیا۔بائیں ہاتھ سے فون تھام رکھا تھا جبکہ دایاں ہاتھ پھولوں کی سطح پر گردش کرنے لگا۔

"بالاج کو معاف کر دو۔"

"سسس۔"وہ کراہی۔شہادت کی انگلی میں کانٹا چبھا تھا۔ہلکی سی چبھن لیکن درد دل میں اٹھا تھا۔

"کیسے معاف کر دوں۔؟" انگلی دبائے وہ بولی۔ حلق میں کوئی شے اٹکنے لگی تھی۔

"دیکھو۔ جہاں پھول ہوں وہاں کانٹے دار جھاریاں بھی تو ہوا کرتی ہیں ناں۔ تم یوں اس کی اچھائیوں کو ایک برائی کے بدلے بھلا نہیں سکتیں۔" وہ سمجھا رہا تھا۔ جیا سکندر کے رکے آنسو جاری ہو گئے۔

"ہم انسان بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں ناں کسی کی لاکھ خوبیوں کو چند خامیوں کے بدلے طول دیتے ہیں۔" وہ بہتے آنسوؤں کے درمیان بولی تھی۔

"دل کا غبار رونے سے نہیں نکلے گا جیا۔ معاف کرنا سیکھو تا کہ تمہارا دل آزاد ہو جائے۔" جیا نے لب کاٹے۔ معاف کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن پچھلی تمام باتیں بھلا دینا مشکل ہوتا ہے۔

"آپ جانتے ہیں بھائی۔ میں نے کبھی معاف کرنا سیکھا ہی نہیں لیکن جو ایک شے میں نے سیکھی ہے وہ۔" وہ رکی۔ منہ پر ہاتھ رکھے ہچکیوں کا گلا گھونٹا۔ یہ فیصلہ وہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ بس اعلانیہ بتانا مشکل لگ رہا تھا۔

"وہ؟" ماہیر کی آواز گونجی۔

"وہ سمجھوتہ ہے بھائی۔" وہ رونے لگی تھی۔ ہچکیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں تو وہیں آنسو بھی مسلسل ہوتی بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔

"ہم مشرقی لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔ ہمیں اپنے لیے فیصلے کرنے کا اختیار تو ہوتا ہے لیکن وہیں دوسرا آپشن سمجھوتہ ہوتا ہے۔ اگر ہم سمجھوتہ نہیں کریں گی تو تنہا رہ جائیں گی۔ اگر کریں گی تو بقیہ زندگی اسی سب جھمیلوں میں گزار دیں گی۔ مجبوریاں انسان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہیں۔ اور مجھے محض اپنا نہیں سوچنا مجھے اس ننھی جان کا بھی سوچنا ہو گا بھائی جس کا اس سب میں کوئی قصور ہی نہیں۔ جس شخص کا قصور ہے اسے معافی بھی مل جائے گی۔ جلد یا بدیر میں نہیں جانتی۔ میں سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ ان سے کہہ دیں مجھے اپنا سر درد نہ بنائیں۔" اپنی سنا کر وہ فون بند کر گئی تھی۔ دوسری جانب ساکت ہوا کھڑا ماہیر ایک دم ہوش میں آیا تھا۔

"میری بہن تو بہت سمجھدار نکلی۔" وہ اب واٹس ایپ میں بالاج کی چیٹ کھولے اسے میسج چھوڑ رہا تھا۔

انسان کو وقت نہیں بدلتا حالات بدل دیتے ہیں۔

سکندر حویلی میں اس شام تمام بتیاں روشن تھیں۔ اندرونی حصے کی چمک دمک باہر کے ماحول سے مات کھا رہی تھی۔ باہر وسیع لان میں سفید صوفے رکھے گئے تھے ان کے سامنے ہی میزیں تھیں۔ جن پر رکھی پانی کی بوتلیں اور گلاس وہاں بیٹھے افراد کی نشاندھی کر رہی تھیں۔

پس منظر میں کراکری سیٹ کے کسی شے سے ٹکرانے کی آواز آئی تھی۔ اگر تم ان سب کے عقب میں دیکھو تو وہاں ایک مستطیل کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ جس کے ارد گرد چند ملازم کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ پورے لان میں زرد اور سفید بلب روشن تھے۔ واپس صوفوں کی طرف آؤ تو وہاں بیٹھے تین افراد یاسیت سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو مردہ قرار پا کر آج دوبارہ زندہ ہو آیا تھا۔

بڑے صوفے پر معید سکندر، ثانیہ بیگم، اور ماہیر سکندر براجمان تھے۔

"ماشاءاللہ دیکھیں تو ہمارا بیٹا کتنا بڑا ہو گیا ہے۔" ثانیہ بیگم نے پیار سے ماہیر سکندر کی پیشانی چومی۔ وہ ان کے دائیں جانب بیٹھا تھا۔ سیاہ رنگ کے کرتے میں ملبوس وہ وجاہت کا شاہکار لگ رہا تھا۔

"ماشاءاللہ۔ ہر نقش اپنے باپ سے چرایا ہے اس نے بس آنکھیں ماں پر چلی گئیں۔" معید سکندر بولے تھے۔ ماہیر دھیرے سے ہنس دیا۔ اس کے دائیں جانب دوسرے صوفے پر انمول ملک براجمان تھی۔ سیاہ رنگ کی پیروں کے ٹخنوں کو چھوتی فراک میں ملبوس، بالوں کا خوبصورت اور اونچا جوڑا بنائے وہ دوپٹہ ایک جانب شانے پر ٹکائے بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بالاج سکندر، معید سکندر اور ثانیہ بیگم کو وہ بہت پسند آئی تھی۔ البتہ جیا نے اسے سر تا پیر ترچھی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

انمول کے ساتھ براجمان بسمہ شارق کی نظریں سامنے صوفے پر بیٹھے مومن ابراہیم پر ٹکی تھیں۔ وہ نیوی بلو کلر کا نفیس سا سوٹ پہنے سرمئی آنکھوں میں کاجل لگائے دیدہ زیب لگ رہی تھی یوں کہ صوفیہ ابراہیم کی نگاہیں اس پر سے ہٹ ہی نہ سکیں۔ آہ وہ اسے اپنی بہو کے روپ میں تصور کیے بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھا مومن ابراہیم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ تمام لوگ ایک دوسرے سے مل چکے تھے۔ کچھ گڑھے مردے اکھڑ رہے تھے تو وہیں منہا کی شرارت اور باتوں پر قہقہے ہوا میں گونج رہے تھے۔

"بھائی نظریں ہٹالیں وہ آپ ہی کی ہے۔" مومن اور صوفیہ ابراہیم کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی منہا نے بالاج کے کان میں گھس کر کہا تھا جو مسلسل اپنے سامنے بیٹھی جیا سکندر کو تاک رہا تھا۔ منہا کی مداخلت اسے زرا پسند نہیں آئی۔

"لیکن آج وہ دل کے قریب لگ رہی ہے۔" دوبارہ اسی پوزیشن میں جاتے بالاج نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"یہی بات جا کر اس سے کہیں ناں۔" منہا نے منہ کے زاویے بگاڑے کیونکہ وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے سامنے بیٹھی دشمنِ جان کو دیکھ رہا تھا۔ جو چہرے پر بالاج کے لیے نو لفٹ کا بورڈ لگائے مکمل طور پر معید سکندر لوگوں کی طرف متوجہ تھی۔ بایاں ہاتھ الٹا کر ٹھوڑی تلے جمار کھا تھا۔ وہ تیز سرخ رنگ کی سلک کی میکسی زیب تن کیے ہوئے تھی۔ کانوں میں گولڈن جھمکے اور پیروں میں گولڈن ہی ہائی ہیلز۔ یہ ہیلز اس کے لیے خطرناک ہو سکتی تھیں۔ بالاج نے سوچا۔ تبھی ایک دم سے جیا نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

اس ایک پل میں ہی سنہری آنکھیں کاجل لگی سیاہ آنکھوں میں ڈوب کر رہ گئیں۔ جیا نے چہرہ واپس موڑ لیا۔ اب کہ معید سکندر اور ثانیہ بیگم صوفیہ ابراہیم کے ساتھ بات چیت میں لگے تھے۔

"ویسے سب کچھ کتنا مکمل لگ رہا ہے نا؟" منہا نے قیاس لگائی۔ جس کی تائید سب نے سر کے خم سے کی تھی۔

"ایک خواب سا تھا جو آج مکمل ہو گیا۔ ایسا لگ رہا ہے دل کی ہر خواہش پوری ہو گئی ہو۔" ماہیر سکندر بولا تھا۔ انمول مسکرا کر اسے دیکھے گئی۔ کیا اس نے آج سے پہلے کبھی ملک کو اتنا خوش دیکھا تھا۔؟ شاید کبھی نہیں۔

"ملک نے اس دن کا بہت انتظار کیا ہے آنٹی۔ اس کی تمام دعائیں رنگ لائی ہیں۔" انمول پہلی مرتبہ بولی تھی ورنہ تو خاموش مورت بنی بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ معید سکندر اور ثانیہ بیگم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ کیا اس نے کچھ غلط کہہ دیا تھا؟

"کک۔ کیا ہوا۔؟" اس نے ان سب کو خود کو گھورتے پا کر استفسار کیا۔ دل دھڑکنے لگا تھا۔

"ملک؟" اس کی اٹکی سانس جاری ہوئی۔ وہ لوگ ماہیر کا دوسرا نام نہیں جانتے تھے شاید۔

"ملک بھی میرا ہی نام ہے ماما۔" ماہیر نے تصدیق کی تھی۔ ثانیہ بیگم اور معید سکندر نے سر ہلا دیا۔ انمول کچھ متذبذب ہوئی تھی۔ انمول نے کبھی ماہیر کو اس کے اصل نام سے نہیں پکارا تھا۔ یہ نام اس نے دوسری مرتبہ اپنے نکاح والے دن ہی سنا تھا۔ کتنا انجان تھا یہ نام۔ ماہیر سکندر۔ اس کے لیے تو ملک ہی اچھا تھا۔

وہ مرد تین تین نام لیے پھرتا تھا۔ اینجل، ملک اور ماہیر سکندر۔ کیونکہ وہ محافظ، محبوب اور بیٹا تھا۔ ہر نام سے اس کی شناخت الگ تھی۔

وہ اینجل کے روپ میں بھائی، ملک کے روپ میں شوہر اور ماہیر سکندر کے روپ میں ایک فرمانبردار بیٹا تھا۔ وہ شخص سب سے مختلف تھا۔ اپنے ہر کردار میں پختہ اپنی ہر شناخت میں پکا۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑا تھا۔ وہ کمرہ جو بچپن میں کبھی اس کا اور بالاج کا ہوا کرتا تھا۔ پورا کمرہ نیلے رنگ کی تھیم لیے ہوئے تھا۔ ہر چیز نیلی تھی۔ بیڈ، وارڈروب، کاؤچ حتیٰ کہ کمرے کے دروازے کا انٹیریئر بھی نیلا تھا۔ اسے چند منٹ ہی ہوئے تھے وہاں آئے ہوئے۔ ہر شے ویسے ہی رکھی تھی۔ اس کے کھلونے، کھیل کا سامان اور بیڈ کے ساتھ دائیں جانب کونے میں رکھا وہ انسان کے قد جتنا ٹیڈی بیئر۔ وہ مسکرایا۔ یہ سفید ٹیڈی بیئر اس کی آخری سالگرہ جو اس نے گھر والوں کے ساتھ منائی تھی اس پر ملا تھا۔ اور وارڈروب کی کھونٹی سے لٹکا ہوا گٹار۔ وہ گٹار بالاج کا تھا۔ جسے ہمیشہ ماہیر پکڑ لیتا اور پھر دونوں کی لڑائی ہوتی۔

بچپن کی کوئی بات یاد گار ہو یا نہ ہو لڑائیاں یاد گار رہتی ہیں۔ لڑائی نہ ہو تو بچپن کی ہر یاد مٹ جائے۔

"آجائیں۔" دروازے پر ہوتی ہلکی سی دستک پر اس نے مقابل کو اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ انمول تھی۔ سلور ہیلز پہنے وہ ٹک ٹک چلتی اس کے شانوں کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

"کمرے کی سجاوٹ بہت خوبصورت ہے۔" اس نے دوپٹہ پشت کی جانب سے بازوؤں پر ڈال رکھا تھا۔

"آپ کا پسندیدہ رنگ۔۔ نیلا۔" اس کی نظریں کھڑکی پر ٹک گئیں۔ وہ بچپن میں اکثر وہاں کھڑے ہو کر دور گھروں کی چھتوں پر جھانکتا تھا۔

"خوش ہو؟" استفسار ہوا۔ یہ پہلی نارمل گفتگو تھی جو اس دن والے واقعے کے بعد ان کے درمیان ہو رہی تھی۔

"بہت۔" خوشی چہرے سے واضح ہو رہی تھی۔ انمول چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

پھر اس نے ملک کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما۔ یوں کہ پانچوں انگلیاں ملک کی انگلیوں کے ساتھ الجھ کر رہ گئیں۔ سر اس کے کندھے سے جوڑ دیا۔

"آئی ایم سوری۔" اور جب بولی تو آواز گلوگیر تھی۔ ملک چونک گیا۔ اس کا گرم ہاتھ انمول کے ٹھنڈے اور نرم ہاتھ میں تھا۔ کھڑکی پر ٹکی نظریں انمول کے سر پر آ ٹکی تھیں۔

"میری طرف سے بھی سوری۔ مجھے اتنا زیادہ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے تھی کہ آپ میرا ماضی، حال اور مستقبل ہیں۔" اس نے انمول کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

"اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔؟" آنکھوں میں شوخی تھی۔ دل طمانیت سے بھر گیا تھا۔

"ہاں۔ کیونکہ میرے ماضی کی ایک حسین یاد اور میرے مستقبل کی بہترین ہمسفر ہیں آپ۔" انمول اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ ابھی تک ملک نے تھام رکھا تھا۔

"اور حال میں کیا ہوں میں تمہارے لیے۔؟" ملک نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"ہر حال میں تو میری زندگی ہیں آپ۔ میری تاریک دنیا میں اجالا بن کر آنے والی شمع اور میرے دل کے باغ میں پھوٹنے والا واحد گلاب ہیں آپ۔" انمول ملک کانوں کی لو تک سرخ ہوئی تھی۔ دل میں تتلیاں پھدکنے لگی تھیں۔

"تھکتے نہیں ہو اظہار کر کر کے۔؟" دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر مصنوعی انداز میں اس کے سینے پر ماری تھیں۔

"جو تھک جائے وہ عاشق کیسا۔۔؟" دل موہ لینے والا انداز۔ انمول کا دل کیا وہ یہاں سے غائب ہو جائے۔

"کبھی آپ بھی کچھ کہہ دیا کریں۔" خفگی سے آنکھیں گھمائیں۔انمول کی آنکھوں میں اچھنبا ابھرا۔

"کیا؟"

"اظہار محبت۔؟" وہ اس کی غزالی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔انمول کو اس کی سبز آنکھوں میں محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔وہ دو قدم آگے بڑھی۔اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ان دونوں کے ارد گرد ایک طلسم سا طاری ہو گیا تھا۔

ملک کا دل زوروں سے دھڑکا۔وہ اظہار کرنے جا رہی تھی کیا؟ اس نے بہت مرتبہ کہا تھا وہ اس سے محبت کرتی ہے لیکن مکمل اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔

"میں انمول ملک آج اس بات کا اعت۔۔۔۔"

"بھائی۔" سارا طلسم چھناکے سے ٹوٹ گیا۔جیا سکندر کی آواز نے ان دونوں کی محویت کو توڑا تھا۔ملک نے چونک کر انمول کی قید سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے پھر جیا کہ جانب متوجہ ہوا۔وہ دروازے میں کھڑی تھی۔شاید اس نے کچھ دیکھا یا سنا نہیں تھا۔

"ہمم۔۔کیا ہوا؟" ملک حتی الامکان پر سکون ہوا۔انمول کی نظریں بھی جیا پر تھیں۔

"بالاج بلا رہے ہیں آپ کو۔" جیا کی نظریں انمول پر تھیں۔اسکین کرتی جانچتی ہوئی نظریں۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہیں۔؟" اشارہ انمول کی جانب تھا۔وہ جو باہر جانے لگا تھا۔ٹھہر کر انمول کو دیکھا پھر جیا کو۔

"کام تھا انہیں۔" کہتا وہ چلا گیا۔انمول بھی وہاں سے جانے لگی تھی۔جب دروازے کے قریب کھڑی جیا کے الفاظ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"میرے بھائی سے دور رہیں۔" وہ جھٹکے سے مڑی اور وہاں سے نکل گئی۔انمول نے حیرت سے اس سنکی لڑکی کی پشت کو گھورا جو اسے اس کے شوہر سے دور رہنے کا کہہ رہی تھی۔کیا اسے معلوم نہیں تھا؟ اگر نہیں تو ملک نے اسے کیوں نہیں بتایا؟

ماہیر اور بالاج دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔باقی تمام لوگ شاید باہر تھے۔بچپن کی یادوں کو تازہ کیا جا رہا تھا۔۔ جب جیا ٹرے میں ٹھنڈی کولڈ ڈرنک رکھے وہاں لائی۔ٹرے میز پر رکھی اور خود ایک صوفے پر جا بیٹھی۔اس کی سیدھ میں بالاج اور بالاج کے دائیں ہاتھ ایک صوفے پر ماہیر بیٹھا تھا یوں کہ ٹانگیں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔کولڈ ڈرنک کو دیکھ کر احتراماً ٹانگیں سیدھی کر لیں۔

"کیا بات ہو رہی ہے۔؟" اس کا موڈ اچھا تھا۔بالاج نے شکر ادا کیا۔

"یہ جھوٹا اپنے نمبر بڑھا رہا ہے۔" ماہیر نے منہ کھولے اسے دیکھا۔ جیا کو معاملہ نہیں معلوم تھا سو خاموش رہی اور دونوں کو دیکھتی رہی۔

"جھوٹ نہیں ایک دم سچ بول رہا ہوں میں۔ بچپن میں ٹیچر سے سب سے زیادہ مار تمہیں پڑی ہے۔ میں تو فیورٹ ہوا کرتا تھا ان کا۔" فرضی کالر جھاڑے۔ کیا مان تھا۔ آہ۔

"اچھا جی اور وہ جو ہر نئے دن تمہاری لڑائی کی شکایات گھر تک آتی تھیں ان کے بارے میں کیا کہو گے تم۔؟" اس نے ماہیر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ وہ بچپن میں ہر کسی سے الجھ پڑتا تھا اور شکایات لگانے میں ہمیشہ بالاج ہی پیش پیش ہوتا۔ ملک چند پل جواب ڈھونڈتا رہا۔ جیا مزے سے انہیں دیکھتی کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ لیکن جواب نہ تھا۔

"ایک سال ہی سہی بڑا ہوں تم سے 'آپ' کہہ کر پکارا کرو۔" جب کوئی بات نہ بن پائی تو رعب ڈالنے کو نیا بہانہ مل گیا۔

"اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں ہے۔" شان بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"پھر کس کی ہے۔؟"

"میرے ماں باپ کی۔" دوبدو جواب آیا۔ جیا کی ہنسی اور ماہیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

"بچپن بھی کتنا خوبصورت ہوتا ہے نا بھائی۔" وہ ماہیر سے کہہ رہی تھی لیکن توجہ بالاج کی جانب تھی۔ جواب اپنا گلاس پکڑے ہوئے تھا۔

"بالکل۔" ملک نے اثبات میں سر ہلایا۔ کولڈ ڈرنک گرم ہو رہی تھی سو اس نے بھی اپنا گلاس اٹھا لیا۔

"بہت سی حسین یادیں جڑی ہوتی ہیں اس سے۔" کن اکھیوں سے بالاج کو دیکھا۔ اس کا دھیان جیا کی طرف ہی تھا۔

"جیسے کہ۔؟" ماہیر نے سوال اٹھایا۔ وہ اس بات سے متفق تھا۔

"آپ جانتے ہیں میں کیا مس کرتی ہوں۔؟"

"کیا۔؟" یہ پوچھ گچھ بالاج کی جانب سے ہوئی تھی۔

"چاکلیٹس۔" وہ یاد کرتی مسکرائی۔ اس نے دیکھا بالاج کے چہرے پر سایہ لہرایا تھا۔ پھر ماہیر کو دیکھا اس کی آنکھوں میں نا سمجھی تھی۔ جیا بولنا شروع ہوئی۔ بالاج بھی ہمہ تن گوش ہوا۔

"بچپن میں کوئی تھا جو ہر روز مجھے چھٹی کے وقت ایک چاکلیٹ دیتا تھا۔ خود نہیں آتا تھا لیکن بچوں کے ہاتھ پہنچاتا۔ وہ بہت لذیذ ہوتی تھیں۔ بہت زیادہ میں نے زندگی میں اس سے زیادہ مزے کی چاکلیٹ آج تک نہیں کھائی۔" بالاج کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ جبکہ ماہیر چہرے پر دھیمی مسکان سجائے اسے سن رہا تھا۔ ہاتھ سر تلے رکھے صوفے کی پشت سے ٹکائے۔

"اور یہ موصوف ان کو اتنی جلن ہوتی کہ میری چاکلیٹ لے کر پھینک دیتے۔ 'یہ مت کھاؤ۔ اس میں کچھ غلط ہو سکتا ہے۔ کسی نے کچھ ملایا ہو گا۔' جیسے جملے کہتے۔ یہ تو ہمیشہ کی طرح مجھ سے جیلس تھے۔" وہ آواز کو بھاری کیے نقل کر رہی تھی۔ بالاج پہلو پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"لیکن میں بھی جیا سکندر تھی اپنے نام کی ایک جب تک اسکول نہیں چھڑوایا گیا میں نے چاکلیٹس نہیں چھوڑیں (بالاج نامحسوس انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔) اور آپ کو پتا اس کے بعد سے میں نے چاکلیٹس کھانا چھوڑ دیا۔ چاکلیٹس تو بہت تھیں لیکن ذائقہ ان جیسا نہ تھا۔" بالاج لاؤنج کے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہاتھ ڈور ناب پر رکھا تھا جب ماہیر کا جاندار قہقہہ گونجا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔؟ یہ دکھ کی بات تھی۔" جیا نے صدمے سے اسے دیکھا۔ جو پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنستا جا رہا تھا۔ بالاج نے بھی اس جوکر کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہنسی دبا رہا تھا۔

"کیونکہ وہ چاکلیٹس تمہیں میں ہی تو بھیجتا تھا۔" ایک بار پھر سے قہقہہ۔

"واٹ!" جیا بھونچکا رہ گئی۔ آنکھیں استعجاب سے پھیل گئیں۔

"سالے۔۔" بالاج دروازے کا ہینڈل چھوڑتا اس کی جانب بڑھا تھا۔ دانتوں پر دانت جمائے۔

"جیا اس نے تمہارے بھائی کو گالی نکالی۔" بالاج کے تاثرات خونخوار تھے۔

"جی نہیں میرے شوہر نے آپ کا رشتہ بتلایا ہے۔" اس سے پہلے ماہیر وہاں سے اٹھ کر بھاگتا یا کوئی جوابی اقدام کرتا۔ بالاج نے اسے صوفے پر ہی جا لیا۔ زوردار دو پنچ اس کے منہ اور پیٹ کی زینت بنائے تھے وہ بے چارہ افف تک نہیں کر سکا۔

اسے غصہ تھا اپنے بچپن کا غصہ۔ کیسے اس نے چھپ چھپ کر چاکلیٹس دینے والے کی جاسوسی کی تھی لیکن کچھ بن نہیں پایا تھا۔ وہ کتنا جلتا تھا جب کوئی جیا کو چاکلیٹس دیتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے چوہے کے بل سے بھی ڈھونڈ لیتا لیکن۔ آہ۔ چاکلیٹس دینے والا اس کا سگا بھائی تھا۔ افف۔

کھانا لگ چکا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسیاں بھی بھر گئی تھیں۔ چمچوں کی پلیٹوں سے ٹکرانے کی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ مدھم ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ جنہیں وہ بار بار ایک ہاتھ سے سمیٹتی تو دوسرے سے کھانا کھانے لگتی۔

"اہم۔اہم۔" بالاج کے متوجہ کرنے پر وہ سب اس کی جانب متوجہ ہوئے تھے جس کا رخ معید سکندر اور ثانیہ بیگم کی جانب تھا۔اس کے سامنے بیٹھی بالوں سے الجھتی جیا کا دھیان بھی اس کی جانب گیا۔

"مجھے آپ لوگوں کو کچھ بتانا ہے۔" اس کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔منہا بھی غور سے سننے لگی۔

"کیا۔؟" یہ سخت آواز معید سکندر کی تھی جو اس نے ناراض تو نہیں لیکن غصہ ضرور تھے۔بالاج نے جیا کی جانب دیکھا۔وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے سمجھنے کی سعی کر رہی ہو کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

"آپ دونوں دادا دادی بننے والے ہیں۔" معید سکندر اور ثانیہ بیگم کی جانب دیکھ کر کہا۔جیا سر جھکا گئی۔گال سرخ ہوئے تھے۔

"رئیلی۔؟" یہ چیخ منہا سکندر کی تھی جو جیا کے دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔

"ارے ماشاءاللہ۔بہت بہت مبارک تم دونوں کو۔" ثانیہ بیگم کی تو جیسے دلی مراد بھر آئی تھی۔اور پھر یکے بعد دیگرے سب نے انہیں مبارک باد دی تھی۔جیا کا بس چلتا وہ وہاں سے اڑ کر کہیں چلی جاتی۔

کھانے کے اختتام پر معید سکندر کی آواز ابھری۔

"جیا تم ہمارے ساتھ چلو گی کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں رہنے کی۔" انہوں نے کہا اور بالاج کی تو مانو خواہش پوری ہو گئی تھی۔

"لیکن۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں اب ہم تمہیں اکیلا نہیں رہنے دیں گے۔تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" یہ آواز ثانیہ بیگم کی تھی۔وہ مسکرا دی۔

"مما۔بابا۔میں کچھ دن اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔کچھ مزید وقت اپنے بھائی کے ساتھ سپینڈ کرنا چاہتی ہوں۔پلیز" بالاج کا موڈ آف ہونے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے نا بابا۔چند دن اور رہ لینے دیں اسے۔میں وعدہ کرتا ہوں میں جیا کا خیال رکھوں گا۔" کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ماہیر بول اٹھا تھا۔معید سکندر نے سر اثبات میں ہلاتے اسے اجازت دی تھی۔وہ خوش ہو گئی۔ادھر ہی بالاج کے چہرے پر بارہ بج چکے تھے۔

کھانے کے بعد کا دور چائے کا چلا تھا۔رات آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور وہ سب صوفوں پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔اب کہ سب کی جگہ بدل گئی تھی۔بسمہ جیا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔اور انمول ماہیر کے ساتھ۔

"آپ بھائی کے ساتھ ہوتی ہیں۔؟" جیا اس سے پوچھ رہی تھی۔ بسمہ نے اچھنبے سے اسے دیکھتے سر ہلا دیا۔

"اتیج کیا ہے آپ کی؟ اسٹڈی کہاں تک کی ہے۔؟" مزید استفسار۔

"اکیس سال کی ہوں۔ گریجویشن چل رہی ہے۔ لاسٹ سیمسٹر باقی ہے۔" اس کی بات پر سوچ میں ڈوبی جیا سکندر نے سر کو خم دیا۔ بسمہ کو اپنے ارد گرد خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئی تھیں۔

"شادی ہو گئی آپ کی؟ یا منگنی، کمٹمنٹ کچھ بھی؟" عجیب سوال تھے یا سوال پوچھنے والی۔ اب کی بار بسمہ نے سر دائیں بائیں ہلا دیا۔ جیا 'اچھا' کہتے ہوئے ہنس دی تھی۔ کیوں؟

"کیوں نا اس خوشی کے موقع پر ایک یادگار گانا ہو جائے۔" کہنے والا ماہیر سکندر تھا۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے بالاج کو دیکھ رہا تھا۔ جو صوفے پر بیٹھا دائیں ٹانگ اضطراب سے جھلا رہا تھا۔

"وہ تو ہو جائے لیکن گانا گائے گا کون؟" انمول نے لب کھولے۔ تینوں بڑوں نے بھی انہیں دیکھا تھا۔

"بالاج۔" ماہیر کی آواز پر اس کی حرکت رک گئی۔ سخت نگاہیں ملک پر جم گئیں۔ جو ملازم کو ہدایت دیتا اپنے کمرے سے گٹار منگوا رہا تھا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو جیسے کچا چبا جاؤ گے۔؟ بچپن میں بھی تو گاتے تھے نا تم۔" ملک جھلا گیا۔ بالاج نے خفگی سے چہرہ موڑا۔ بچپن مختلف تھا اب حالات بدل گئے تھے۔

"اچھا چلو کوئی ایک گانا ہی سنا دو۔ زیادہ کی فرمائشیں نہیں کریں گے ہم" جیا حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے آج تک بالاج کو گانا گاتے نہیں سنا تھا۔ کیا واقعی وہ بچپن میں اتنا مختلف تھا۔

"میں گانا نہیں گاؤں گا۔" چبا چبا کر وہ بولا۔ جیا کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا جو سب کی موجودگی میں خود پر قابو کیے ہوئے تھا ورنہ اب تک ملک کی ناک سلامت نہیں ہوتی۔

"میرے لیے بھی نہیں۔" مومن نے ماہیر کو دیکھا۔ ایک خیال سا اس کے ذہن میں بننے لگا تھا۔

"نہیں۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا۔

"اچھا۔ چلو یہ واپس رکھ دو۔" ماہیر نے ملازم کو اشارہ کیا۔

"رکیں۔" بسمہ کی آواز کافی اونچی تھی۔ سب کی نظریں اس پر جا ٹھہریں۔

"مم۔ مومن گانا گائے گا۔" بسمہ کی بات پر مومن کو کرنٹ سا لگا تھا۔ وہ اب آرام سے بیٹھ چکی تھی۔ سب اسے ہی دیکھنے لگے تھے۔ وہ گھبرا گیا۔ پھر ماہیر کی جانب دیکھا۔ اور گٹار تھام لیا۔

"کان بند کر لیں۔" ملک نے انمول کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں؟ سننے تو دو۔ وہ اچھا گاتا ہو گا۔" اس نے ملک کو خاموش کروایا۔

"وہ اچھا گاتا ہے یا نہیں لیکن۔"

"لیکن؟"

"مجھے آپ کے کانوں کا خیال ہے۔" ہنستے ہوئے مومن کو دیکھا۔ جو اب وہاں رکھے جانے والے اونچے اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

"ملک۔" تنبیہہ کی۔ وہ جانتی تھی ملک مذاق کر رہا ہے۔

ایک دم سے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مومن نے گٹار صحیح سے پکڑا۔ بسمہ کی نظریں اسی پر تھیں۔ اس نے مومن ابراہیم کے کمرے میں گٹار دیکھا تھا۔ شاید وہ کبھی کبھار گاتا تھا۔ اسی لیے بول گئی تھی۔

مومن کی انگلیوں نے دھیرے سے گٹار کی تاروں پر حرکت کی۔ مدھم سی گونج نے کسی کے دل کی تاروں کو بھی چھیڑ دیا تھا۔

"یہ گانا اسپیشل میرے بھائی کے لیے۔" مومن نے اپنی نظریں ماہیر پر ٹکا دی تھیں۔ اس نے سر کے خم سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہر سننے والا گانے کے بول کا منتظر تھا۔

وہ چند سیکنڈ گٹار کی تاروں سے انگلیاں الجھائے ماحول میں سرگھیر تا رہا۔

ہاں یاد ہے، وہ دوستی کا ہر مزا
محبتیں، وہ رونقیں وہ مستیاں

مدھر آواز، لہجے میں بے پناہ محبت اور عقیدت۔ ملک کے ذہن میں وہ دن چھا گیا جب اس نے سات سالہ مومن ابراہیم کو دیکھا تھا۔ اس مومن اور آج کے مومن ابراہیم میں فرق تھا۔

بسمہ شارق کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

لگا کے شرط وہ زندگی کی پھر کوئی

جو وعدے کر لیے نہ ہوں گے ہم جدا کبھی

ہر کوئی جیسے اس کی آواز کے سحر میں کھو رہا تھا۔

جو وعدے کر لیے نہ ہوں گے ہم جدا کبھی

ملک مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دل سے کبھی جدا نہ ہونے کی دعا نکلی تھی۔ مومن اس کا دوست نہیں تھا بلکہ اس کا کل اثاثہ تھا۔ وہ شخص اس کی پوری زندگی کے گزرے ماہ و سال کی جمع پونجی تھا۔ کوئی مومن ابراہیم کو ملک سے جدا کر کے تو دکھائے۔

او میرے یارا تیری یاریاں

دل کی سدا

صوفیہ ابراہیم کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ ملک کے اس احسان کا بوجھ کبھی نہیں اتار سکتی تھیں۔ تمام نفوس اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

گانے کے بول کہنے والا سر جھکائے ہوئے تھا۔ گٹار کی دھن جیسے کسی ماہر کے ہاتھ میں تھی۔

میری خوشیاں تو ساریاں

ہوں گے نہ جدا

مومن نے سر اُٹھائے ملک کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ گہری بھوری آنکھیں سبز آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ملک کا دل دھک سے رہ گیا۔ مومن ابراہیم کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ نمی دوستی کے تقاضے کی تھی۔ کبھی بیچ راستے نہ چھوڑ جانے والے دکھ کی تھی۔ کوئی مومن

ابراہیم کو بتاتا کہ ملک نے اس سے وعدہ کیا تھا ساری عمر دوستی نبھانے کا، محبت کا، ساتھ کا، وفاداری کا۔ اور ملک کبھی اپنا وعدہ بھولتا یا توڑتا نہیں۔

دل کا دل سے ہوا ہے عہد وفا

مومن کا سر اب اٹھا ہوا تھا۔ نگاہیں ملک کی نرم نگاہوں سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔

بسمہ شارق کے چہرے پر اداس مسکراہٹ کا بکھیرا تھا تو وہیں ان کی دوستی بالاج سکندر کی آنکھوں کو نم کر گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسے کھوئے ہوئے تھے جیسے عاشق اپنی معشوقہ سے اظہارِ محبت کر رہا ہو۔

دوست وفادار ہوں تو آپ سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی نہیں ہوتا۔

دل کا دل سے ہوا ہے عہد وفا

گانے کا اختتام ہوا۔ ملک نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آواز اور محبت میں ڈوبے لہجے کو اندر تک محسوس کیا۔ پھر آنکھیں کھولیں تو وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ملک نے اپنی جگہ سے اٹھتے زور سے اسے گلے لگایا۔

"آئی ایم نتھنگ ود آوٹ مومن ابراہیم۔" وہ اسے خود میں بھینچے بولا تھا۔ وہاں بیٹھے تمام افراد کی آنکھیں نم تھیں۔

ان کی دوستی ایک طویل سفر تھی جس کی کوئی منزل، کوئی کنارہ نہیں تھا۔ مثالی دوستیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ان کا یارانہ بھی ازل تا ابد تک آباد رہنا تھا۔

ہر کوئی جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا تھا۔ بسمہ شارق کا دل سینے میں سر پٹکنے لگا تھا۔ وہ ساکت تھی۔ مومن ابراہیم کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ وہ تادیر اس کی آواز کے سحر میں کھوئی رہی۔ رات آہستہ آہستہ بیتنے لگی تھی۔ اور آج کی دعوت کا اختتام ہونے کو تھا۔ دی اینڈ۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑی کانوں میں پہنے آویزے اتار رہی تھی۔جب ملک کسی چیز کی تلاش میں ادھر آیا۔اس نے ٹاپس کی ہک بند کرتے اسے دیکھا۔

"کچھ چاہیے تمہیں۔؟"لہجہ نارمل تھا۔

"ہاں وہ میرا موبائل نہیں مل رہا۔"ملک نے سر کھجاتے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ رہا۔تم نے کھانے کی ٹیبل پر چھوڑ دیا تھا۔"ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے اپنے پرس میں سے انمول نے موبائل نکال کر ملک کی جانب بڑھایا۔

"اوہ شکریہ۔میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"اس نے انمول سے موبائل لے لیا۔وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"ملک نے اسے خاموش پاتے استفسار کیا۔انگلیاں موبائل کی اسکرین پر حرکت کر رہی تھیں۔

"جیا کو بتا دو۔چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"انمول کی بات پر اس کی سٹی گم ہوئی۔لب دبائے انمول کو دیکھا جو اب واپس آئینے میں اپنا عکس دیکھتے بالوں سے ہیئر پن نکال رہی تھی۔جوڑے کی مانند بندھے بال ایک دم سے آبشار کی طرح پشت پر بکھر گئے۔

"میں اس کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔اگر اسے پتا چلا کہ میں نکاح کر چکا ہوں تو اسے تکلیف ہو گی۔"بے تکی بات تھی اس کی۔

"پھر کیا ہو گا ملک۔؟وہ خود بھی تو شادی کر چکی ہے نا؟کیا تمہارا شکوہ نہیں بنتا؟بچوں کی سی باتیں کرتے ہو تم بھی۔بعد میں بھی تو پتا چلنا ہے سو ابھی سہی۔"ملک نے سر کو خم دیا۔

"اوکے میں بتا دوں گا اسے پرامس۔لیکن آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے؟"انمول کے چہرے کی جوت مزید بجھ گئی۔یہ وہ چہرہ نہیں تھا جو وہ لے کر گئی تھی۔ملک نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔وہ چونک گئی۔

"وہ جیا۔تمہاری بہن۔بسمہ میں دلچسپی لے رہی تھی۔"اپنی خفت مٹاتے ادھر ادھر دیکھتے اس نے بات مکمل کی۔ملک حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"رئیلی انمول۔"وہ ہنس دیا۔انمول نے غصے سے اسے گھورا۔

"اور آپ کو لگا وہ یہ سب میری وجہ سے کر رہی ہے۔آپ کو لگتا ہے میں ایسا ہونے دوں گا۔؟"انمول نے معصومیت سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔اور تمہارا کیا ہے۔مان رکھنے کو اس سے ہمارا رشتہ چھپا لیا۔مان رکھنے کو ہی شادی بھی کر لو گے۔"طنز نہیں تھا۔بس لہجہ اکھڑ تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا یہ آئیڈیا اتنا بھی برا۔۔۔"اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔جب انمول نے ہیئر برش اس کے سینے پر مارا۔

"سوچ کر دکھاؤ کسی اور کے بارے میں۔"وہ انگلی اٹھائے وارن کر رہی تھی۔ملک اسے دیکھے گیا۔

"ہائے کیا کریں یہ دل کچھ سوچتا ہی نہیں آپ کے سوا۔"وہ فریفتگی سے بولا تھا۔اس کے گال تپ اٹھے۔

"چلو۔نکلو یہاں سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"انمول نے اسے باہر کا راستہ دکھایا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"آپ زندگی ہیں میری۔یوں پریشان مت ہوا کریں۔"انمول کے گال دہک رہے ملک مزید کچھ کہنے والا تھا۔

"نکلو۔"جب انمول نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔

"یار یہ زیادتی ہے۔"دروازہ بند کرتے اسے ملک کی ہانک سنائی دی تھی۔وہ دل تھام گئی۔جو آج معمول سے زیادہ دھڑک رہا تھا۔

رات ڈھل ھئی تھی۔دن چڑھ آیا تھا۔وہ ہاسٹل میں موجود اپنے اور فریال کے کمرے میں تھی۔فریال اپنے بستر میں دبک کر بیٹھی اسے سن رہی تھی۔

"میں کیا کروں فری۔وہ شخص میرے حواسوں پر چھا رہا ہے۔"وہ اسے اول تا آخر سب بتا رہی تھی۔لہجے میں بے بسی تھی۔

"وہ شخص مومن ابراہیم ہے کسی کو بھی اپنے سحر میں جکڑ سکتا ہے۔تم نے دیکھا ان کی پرسنیلٹی کتنی آؤٹ کلاس۔۔"

"اوہ فو۔فری میں اس وقت تمہاری اس کے لیے پرستش نہیں سن سکتی۔"بسمہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔فریال نے اپنا منہ بند کر لیا۔پھر آنکھوں میں غصہ ابھرا۔

"تو پھر بھلا دو انہیں۔"غصے سے اپنا موبائل پکڑے سیدھی ہو بیٹھی۔ناک پھول گئی تھی۔

"بھلا دوں؟کیا کسی کو بھلانا اتنا آسان ہو سکتا ہے جتنی آسانی سے تم نے یہ بات کہی ہے۔کوئی مومن ابراہیم کو بھی بھول سکتا ہے۔؟"وہ جیسے خلا میں بات کر رہی تھی۔فریال کو چڑ چڑھی۔

"یار تم چاہتی کیا ہو۔؟نہ بھلانا چاہتی ہو نہ سیدھا سیدھا اعتراف کرنا چاہتی ہو۔"بسمہ نے اسے دیکھا۔

"اسے بھلانا میرے بس میں نہیں ہے اور اعتراف کی ہمت میں نہیں رکھتی۔اسے سب پتا ہے لیکن پھر بھی انجان بنا پھرتا ہے۔"عجیب عاجزی پن تھا۔وہ تو کبھی اس کیفیت کا شکار نہیں ہوئی تھی تو پھر آج کیوں؟کیوں آج وہ اس شخص سے ہار رہی تھی۔؟

"تمہیں ان سے محبت ہے؟"فریال نے یقین چاہا۔

"کتنی دفعہ بتاؤ ہے محبت۔ محبت، عشق یا دیوانگی جو مرضی سمجھ لو لیکن وہ شخص میرے جذبات لے گیا ہے فریال۔" بسمہ رو دینے کو تھی۔ وہ بے بس ہو رہی تھی اور ادھر مومن ابراہیم اسے منہ تک نہیں لگا رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ۔۔" موبائل کی رنگ ٹون نے اس کا سلسلہ کلام توڑا۔ اس نے فریال کو دیکھتے موبائل کان سے لگایا۔

"السلام علیکم کون؟" گو کہ نمبر انجانہ تھا اس لیے استفسار کیا۔ دوسری جانب سے رندھے ہوئے لہجے میں کچھ کہا گیا تھا۔ بسمہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

فریال نے اسے کیا کب کیسے جیسے سوال پوچھتے دیکھا پھر اس نے بسمہ کو تیزی سے بیڈ سے اتر کر جوتے کی تلاش میں دیکھا۔

"میں آ رہی ہوں۔" ضبط سے کہتے موبائل کان سے ہٹایا۔ دوپٹے کی تلاش میں نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" بسمہ کے پیروں کو بریک لگی۔ دوپٹہ گلے میں ڈال لیا تھا۔

"با۔با۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔ دل ہول رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ بیگ اٹھاتی باہر نکل گئی۔

اسے فون آیا۔ دوسری طرف شارق کبیر کا سیکرٹری حماد تھا۔ وہ افسوس سے اسے بتا رہا تھا کہ شارق کبیر کو ہارٹ اٹیک آیا ہے اور وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر ہاسٹل سے سیدھا ہاسپٹل پہنچی تھی۔ وہ اسلام آباد کا ایک نجی اور چھوٹا ہسپتال تھا۔ شام ہونے کو آئی تھی جب وہ ہاسپٹل کے اندر داخل ہوئی۔ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے وہ ریسیپشن ڈیسک کی جانب بڑھی۔ نام بتایا اور اس سے پہلے کہ ریسیپشنسٹ کی بات مکمل ہوتی وہ بتائے جانے والے فلور کی جانب بھاگی۔ لفٹ آنے میں دیر ہو جاتی اس نے سیڑھیوں سے جانا بہتر سمجھا۔

وہ فرسٹ فلور اس کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے اور سب سے آخری فلور پر واقعہ روم نمبر ۲۲ کی تلاش میں تھی۔ جو اسے راہداری میں تھوڑا آگے جا کر دائیں جانب مل گیا۔ ناب گھماتے اس کے ہاتھ ایک پل کو لرزے تھے لیکن وہ بیٹی تھی۔ باپ سے نفرت ایک طرف لیکن وہ خبر سن کر اس کا دل کانپ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ بسمہ شارق کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا ہاسپٹل کی پوری عمارت اس پر آن گری ہو اور وہ اس کے ملبے تلے کہیں نیچے دب کر رہ گئی ہو۔

اس نے پلکیں جھپکیں۔ لیکن اس کمرے میں کوئی نہ تھا۔ نفاست سے رکھا ہاسپٹل بیڈ سفید بیڈ شیٹ اوڑھے پڑا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ جیسے اس کمرے میں کوئی آیا تک نہ ہو۔ اس کا دل دھڑ کنا رک گیا۔ کندھے پر پہنی بیگ کی اسٹرپ پر گرفت مضبوط ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔ ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم کے باتھ روم کا دروازہ دھکیلا لیکن وہ بھی خالی تھا۔ کہیں وہ کسی غلط کمرے میں آ گئی تھی شاید۔ وہ بھاگ کر دروازے کے قریب گئی لیکن وہ بند ہو چکا تھا۔

"یا اللہ۔" وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھتی چیخ اٹھی۔ چہرہ ادھر ادھر گھمایا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ لیکن کچھ غیر معمولی سا تھا فضا میں جو اس کا دل بوجھل کرنے لگا۔

وہ عجیب سی بدبو تھی جو اس کے ناک کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس کے گلے میں خراش پیدا ہونے لگی تھی۔

"کوئی ہے۔؟ پلیز ہیلپ می۔؟" وہ چیخی۔ پھر کھانسی کا شدید دورا پڑا۔ کمرے میں کوئی شے تھی جو پھیلتی جا رہی تھی۔ اس سے مزید کھڑا نہیں ہوا گیا۔ معدہ تک جلنے لگا تھا۔ جسم کپکپا رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی۔ اب کہ اس سے کچھ دیکھا بھی نہیں گیا۔ وہ ایک دم سفید ٹائلوں والے فرش پر گری تھی۔ ہتھیلیاں زمین پر ٹکائے اس نے ابکائی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دماغ پھٹ رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت مفلوج ہوتی گئی۔ پھر اس نے باہر شور و غل سنا۔

" I'll not spare you all " کوئی باہر زور سے چیخا تھا۔ آخری چند الفاظ جو اس نے سنے پھر وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتی گئی۔ آس پاس کی دنیا ساکت ہو گئی تھی۔ اس کے دل کی طرح۔

اس شام جب وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ انمول ہمیشہ دروازہ لاک رکھتی تھیں۔ تو پھر آج کیوں؟

وہ آگے بڑھا۔ راہداری میں چلتا گیا۔ وہاں ایک گلدان گرا ہوا تھا۔ اس نے اٹھایا اور اسے پاس رکھے کارنر ٹیبل پر واپس رکھ دیا شاید غلطی یا ہوا سے گر گیا تھا۔

راہداری عبور کرتے اسے معلوم تھا کیا ہو گا۔ انمول ہمیشہ کی طرح اس کا انتظار کرتے صوفے پر بیٹھی ہو گی یا پھر کچن میں کھڑی شام کے کھانے کی تیاری کر رہی ہو گی۔ وہ کھانے کی پابند ہو گئی تھی البتہ صفائی وغیرہ کیلیے ملازمہ کا انتظام تھا۔ انمول اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ وہی کھانا بناتی جو ملک کو پسند ہوتا۔ وہ مسکرا دیا۔ شاید وہ 'شوہر کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر جاتا ہے' والی بات پر یقین رکھتی تھی۔

لیکن۔ لاؤنج خالی تھا۔ بالکل ویسا جیسا وہ صبح چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے کچن کی جانب قدم بڑھائے۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ شاید وہ کمرے میں تھی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ پھر فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پیا۔ نظر انمول کے کمرے کے دروازے کی جانب اٹھی۔ بتی بجھی ہوئی تھی اور دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے بوتل وہی چھوڑے قدم اس کے کمرے کی جانب بڑھا دیے۔ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں۔؟

"انمول۔" سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارتے بتیاں روشن کی لیکن۔۔ وہاں کچھ نہ تھا سب کچھ سلیقے سے سیٹ تھا۔ جیسے انمول آج کمرے میں آئی ہی نہ ہوں۔ اسے غصہ آنے لگا۔ کہاں تھی یہ لڑکی؟

وہ اپنے کمرے میں گیا اور پھر یکے بعد دیگرے تمام کمروں کی تلاشی لی لیکن وہاں انمول تو کیا انمول کی خوشبو تک نہ تھی۔ تمام کمروں کے دروازے کھلے تھے اور بتیاں روشن۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمکا۔ ان کا اپارٹمنٹ عمارت کے سب سے اوپری حصے میں تھا۔ یعنی اوپر چھت تھی۔ دائیں جانب موجود راہداری سے سیڑھیاں اوپر کی جانب جاتی تھیں۔ شام کا منظر بہت خوبصورت نظر آتا تھا کہیں وہ اوپر تو نہیں۔۔

ملک بھاگ کر سیڑھیوں تک آیا۔ جیب میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔ ہاتھوں میں تھامی کیز ایک جانب پھینکتے اس نے موبائل نکالا۔

"جگر کالنگ۔" لکھا ہوا جگمگا رہا تھا۔ فون کان سے لگایا۔ دھپ دھپ جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا جب۔

"جیا کہاں ہے ماہیر؟" پرسکون آواز ٹھہرا ہوا لہجہ اور ماہیر سکندر کو لگا کسی نے اس کے دل پر پیر رکھ دیا ہو۔ وہ پانچویں اسٹیپ پر ریلنگ پکڑے کھڑا رہ گیا۔ آس پاس کی دنیا منجمند ہو گئی۔ سیارے اپنے مدار میں تھم گئے تھے۔ اسے لگا۔ زمین بھی کہیں رک گئی ہو۔ کسی ایسی جگہ جہاں صرف سورج کی تپش اور حبس ہو۔

"کک۔ کیا کہا۔؟" اسے اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

"جیا کا نمبر بند جا رہا ہے۔ حویلی میں کال کی ہے وہ وہاں نہیں ہے۔" بالاج کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو اس کی سماعت میں اتارے گئے۔ پس منظر میں موبائل کی زوں زوں سنائی دی۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ بدوقت وہ پلٹا۔ پیر جم گئے۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا پایا۔ انمول کا موبائل داخلی دروازے کے ساتھ اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔

"میری بیوی کہاں ہے ماہیر۔؟ تم نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔" بالاج کی بے بسی بھری آواز۔ انمول کا بار بار بجتا موبائل۔ ساری دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس کے ہاتھوں سے موبائل چھوٹا اور زینوں سے ہوتا انمول کے موبائل کے ساتھ جا گرا۔

"ان۔ انمول۔" لب ہلے۔ آواز نہیں نکلی۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ دل رک گیا۔ وہ بالاج سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میری بیوی کہاں ہے؟ لیکن پہلے اسے اس کے سوال کا جواب دینا تھا۔

ماہیر سکندر کی دنیا لٹ گئی تھی۔ چند گھنٹوں کی دوری تھی تو سب تباہ ہو گیا۔ اسے لگا کوئی آہستہ آہستہ اس کی سانسیں چھین رہا ہو۔

وہ عورت اس کی زندگی تھی اگر جو کسی نے اس سے اس کی زندگی چھین لی؟

تاثیرِ عشقم

مہک عارف

باب نمبر:8

اگست کی دھوپ اس عالیشان بنگلے کو چمکا رہی تھی۔ سیاہ بڑے گیٹ پر تعینات گارڈ اپنے معمول کے مطابق ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ اس گرمی اور حبس کے ماحول سے دور بنگلے کا اندرونی ماحول قدرے ٹھنڈا اور پر سکون تھا۔ دالان میں کھڑے ہو تو بائیں جانب موجود ٹی وی لاؤنج میں سیاہ صوفے رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر مسٹر شارق کبیر براجمان تھے۔

وہ عمر کا ایک طویل دورانیہ گزار چکے تھے لیکن آج بھی انہوں نے اپنے آپ کو فٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ایک بائیس سالہ بیٹی کے باپ نہیں لگتے تھے۔ وہ دونوں بازو صوفے کی پشت پر پھیلائے، آنکھیں سکیڑے سامنے بڑی سی ایل ای ڈی پر چلتی سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ رہے تھے۔ سیکرٹری حماد ان کے بائیں جانب ہاتھ باندھے مؤدب سا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی سکرین پر ٹکی تھیں۔

"سر یہ کیا؟" حماد کی آواز پر وہ بھی ایک دم سیدھے ہوئے۔ سامنے سکرین پر چلتی فوٹیج میں نظر آنے والا منظر اپنے اندر مزید کسی شخص کو سمیٹ لایا تھا۔

"واٹ ربش! سارے بندے کہاں مر گئے ہیں جو یہ بدذات یہاں بھی پہنچ گیا۔؟" وہ دھاڑے۔ آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے تھے۔

سکرین میں اس نجی ہسپتال کا روم نمبر ۲۲ واضح تھا۔ کچھ لمحات قبل وہاں بسمہ شارق تڑپ کر بے ہوش ہوئی تھی اور چند ہی لمحات بعد اب نیلی جینز شرٹ میں ملبوس مومن ابراہیم وہاں آ چکا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لب آپس میں بھینچے ہوئے تھے۔ وہ خاصا متفکر لگتا تھا۔

"اسے اندر کس نے آنے دیا۔؟" وہ بے چینی سے ماتھا مسلنے لگے۔

"سر یہ یقیناً سیکیورٹی سے لڑ جھگڑ کر وہاں پہنچا ہے۔ ویسے بھی آپ کی ہدایت کے مطابق وہاں کے اسٹاف کو اس معاملے کی خبر نہیں صرف ہارون ملک ہی یہ بات جانتا ہے کہ اس کمرے میں ہم نے کاربن مونو آکسائیڈ (گیس) وافر مقدار میں چھوڑی ہے۔ جس کی وجہ سے میم کی یہ کنڈیشن ہے۔" وہ ہسپتال کے مالک کا نام لے رہا تھا۔ شارق کبیر کا خون کھولنے لگا انہیں اپنی محنت رائگاں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ لڑکا انہیں مات دے رہا تھا۔ لیکن کیا وہ اپنی ہار تسلیم کر سکتے تھے۔؟

"سر فکر نہیں کریں وہ بچ نہیں پائے گی۔"

"فکر کرنے کی ضرورت ہے حماد... کیونکہ مومن ابراہیم کبھی اسے مرنے نہیں دے گا۔" ان کی آنکھیں تفکر سے سکڑ گئی تھیں۔ اگلا لائحہ عمل سوچنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

"اب کیا کریں سر؟" حماد بھی پریشان نظر آتا تھا۔

وفاداری اگر رگوں میں شامل ہو تو اسے نبھانے والا لمحہ بہ لمحہ فکر مند رہتا ہے۔

"پیسے ٹھونس کر ہارون ملک کا منہ بند کرواؤ پہلے۔ اس کے بعد اس لڑکے کے ساتھ میری میٹنگ رکھو۔ اسے بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ شارق کبیر کہتے کسے ہیں۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھی سکرین کی جانب اٹھیں۔ انہیں سمجھ آنے لگا تھا کہ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔

مومن ابراہیم چلا کر کسی کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ پھر اس نے بسمہ شارق کے بے ہوش وجود کو دیکھا۔ اگلا ردعمل ہر ایک کے لیے غیر متوقع تھا۔

وہ ایک منٹ کی تاخیر کیے بنا بسمہ شارق کو اپنی بانہوں میں اٹھا چکا تھا۔

شارق کبیر کا چہرہ غصے کی حدت سے تمتمانے لگا۔

"بل مد کرواسے۔" انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ایل ای ڈی کی سکرین پر مارا تھا۔ ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ رنگ برنگی اسکرین سیاہ ہوتی چلی گئی۔ وہ غصے سے کھولتے، مومن ابراہیم کی شان میں الفاظ بکتے ہوئے کوٹ کا بٹن بند کرتے وہاں سے نکل گئے تھے۔ پیچھے کھڑے حماد نے ایک تاسف بھری نظر سکرین پر ڈالی اور پھر جرنل میں نئ میٹنگ کی تفصیلات ترتیب دینے لگا۔

موسم اپنے تیور بدلنے کے در پر تھا جب سفید ہنڈا سوک سکندر ہاؤس کے سامنے آکر رکی۔ اس نے ہارن نہیں بجایا کیونکہ اگلے ہی لمحے مین گیٹ سے بالاج سکندر باہر نکلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ دوسری جانب سے آکر پیسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ماہیر گردن جھکائے اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے ہوئے تھا۔

"جیا کہاں ہے۔؟" بالاج نے بہت ضبط سے پوچھا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی تو اس کی بات ہوئی تھی ماہیر سے۔ اور وہ منٹوں کا فاصلہ طے کرتا یہاں آچکا تھا۔

"انمول کہاں ہے بالاج۔؟" ماہیر کی آواز بلند تھی۔ بالاج نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے نظریں بالاج پر گاڑھیں۔

"میں کچھ پوچھ....." ماہیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اپنی جگہ شل رہ گیا۔

"بالاج" سرسراتی ہوئی آواز۔ بالاج کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ماہیر کا دل ٹکروں میں بٹ گیا۔

"کیا ہوا۔؟" سوال احمقانہ تھا مگر وہ پھر بھی سوال کر گیا۔

"جیا میرا کل اثاثہ ہے ماہیر۔۔۔" اسکا جملہ ادھورا رہ گیا۔ سانسیں بھاری ہو گئیں۔

"میں مر جاؤں گا اس کے بغیر۔" وہ حزن میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا۔ ماہیر کچھ سیکنڈ کے لیے اپنا دکھ بھول گیا۔ یاد رہا تو صرف اتنا کہ اس کا بھائی تکلیف میں تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا؟

"ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔" وہ جس کا اپنا دل کسی کھائی میں ڈوبا تھا وہ اسے دلاسے دینے لگا۔

بالاج اسکی نہیں سن رہا تھا اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"میری جیا۔۔۔ میرا بچہ۔.." وہ اونچی آواز میں چیخا تھا۔ آخر میں لہجہ رندھ گیا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھے خود کو کنٹرول کیا۔

ماہیر متفکر سا اسے دیکھے گیا۔ ایک جانب اسکی بہن تھی اور دوسری جانب اسکی محبت۔ انمول ملک۔

"میں کس لیے ہوں؟ ہم کس لیے ہیں؟ ہماری عورتوں کے محافظ ہم ہیں۔ ہمیں کمزور نہیں ہونا۔" ماہیر سکندر جس کا اپنا دل کٹ رہا تھا وہ بالاج کو امید کی ڈور تھما رہا تھا۔

بالاج نے اب کی بار اسے دیکھا تو اسکے تاثرات مختلف تھے۔

"ہمیں ہمت سے کام لینا ہے۔ تم دیکھنا کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر پائے گا۔" بالاج نے سر ہلایا۔

"ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ بالاج سکندر اپنی جیا کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔" وہ پر عزمی سے بولا۔ آنسو خشک ہو گئے اور دل مضبوط

۔

"جیا اور انمول ساتھ اغواء ہوئی ہیں۔ لیکن سوال یہ بنتا ہے کہ انہیں کڈنیپ کرے گا کون۔؟" اچانک بالاج سکندر نے سوال داغا۔ ملک کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

"ہے ایک شخص۔ جس نے یہ سب کر کے اپنی موت کو خود دعوت دی ہے۔ اور میں ماہیر سکندر اسے موت کے گھاٹ اتار کر دم لوں گا۔" وہ جوالا مکھی بنا تھا۔ بالاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماہیر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اختتام ابھی باقی تھا۔ انجام ابھی رہتا تھا۔ بدلے کی آگ تیز آندھی سے بھڑک اٹھی تھی۔ جو بہت جلد راکھ ہو جانا تھی۔

ہسپتال کے سفید چادر سے ڈھکے بیڈ پر اس وقت بسمہ شارق لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب ایسے ہی بیڈ ایک قطار میں لگے ہوئے تھے۔ جن پر اس وقت چند مریض تھے۔ ان کے لواحقین میں سے کوئی آ رہا تھا اور کسی کو جانے کی جلدی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ چہرہ دائیں جانب تھا۔

"کچھ دیر تک یہ ہوش میں آ جائیں گی ڈونٹ وری۔ اللہ کا شکر ہے کہ بروقت پہنچ جانے سے مزید کسی نقصان کا سامنا نہیں ہوا۔" وہ ایک نو عمر سا ڈاکٹر تھا۔ بیڈ کی پائنتی کی جانب بنی میز پر رکھی فائلز کی ورق گردانی کرتا ساتھ کھڑے مومن ابراہیم کو پروفیشنل انداز میں بتا رہا تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

"کاؤنٹر سے ان کی چیزیں لے سکتے ہیں آپ۔ باقی ہم مزید انکوائری کریں گے۔ امید ہے اس سب کے پیچھے جس شخص کا ہاتھ ہے وہ جلد بے نقاب ہو جائے۔" اس نے ایک فائل اٹھاتے مومن ابراہیم سے کہا۔

"جہاں پیسہ بولتا ہو وہاں چہرے بانقاب ہی رہتے ہیں۔ بے نقابی پیسے تلے دب جاتی ہے۔ شکریہ۔" اس نے وہ فائل واپس میز پر پٹکی۔ انداز ایسا تھا کہ 'پلیز اب آپ جا سکتے ہیں' اور ڈاکٹر سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔

مومن نے ہاتھ سینے پر باندھے اس لڑکی کو دیکھا جو آج ایک بار پھر سے باپ کی محبت میں دھوکہ کھا چکی تھی۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا وہ شخص کون ہے؟ اس کی کمپنی کیا ہے؟ ملک کی عزتیں کس کی وجہ سے بے آبرو ہوتی ہیں؟ اس کی ماں کا قاتل کون ہے؟ کیا وہ واقعی بے فکر تھی۔؟

کیا تھی وہ لڑکی۔؟ باپ سے نفرت کرنے والی تو دوسری جانب ایک جھوٹی خبر کے سہارے موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے والی۔ ایک طرف ہنس مکھ سی بسمہ شارق تو دوسری طرف ایک محبت کی مریضہ۔ جس کی شفا محبت تھی۔ ہاں کیونکہ وہ بسمہ شارق تھی۔ اسے تربیت کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے محبت سدھار سکتی تھی۔

بیڈ پر پڑے وجود میں ہلچل ہوئی تھی۔ وہ فوراً آگے بڑھا۔

"بسمہ۔" اب وہ اس کے پاس کھڑا تھا۔ بسمہ نے موندی ہوئی آنکھیں کھولیں تو گرے آنکھیں سب سے پہلے بھوری آنکھوں سے ٹکرائی تھیں۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نظروں کا ارتکاز نہیں ٹوٹا تھا لیکن اگلے ہی لمحے ان میں نمکین پانیوں کا سمندر امنڈ آیا۔ اس نے ہچکی بھری اور پھر وہ رونا شروع ہو چکی تھی۔ مومن بوکھلا گیا۔

"ہئے بسمہ۔ کیا ہو گیا ہے یار۔؟" مومن اچانک سے اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ بسمہ نے نفی میں سر ہلاتے اپنا چہرہ اس کے کندھے پر ٹکا دیا اور رونے کا شغل جاری رکھا۔ مومن اسے دیکھے گیا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور اس کے پاس چند الفاظ بھی حوصلے کے لیے نہیں تھے۔

"کیوں بچایا مجھے؟ مر جانے دیتے ناں۔ اچھا ہوتا جان چھوٹ جاتی۔" اس نے چہرہ واپس کھینچ لیا۔ بولی تو لہجے میں ازلی دبنگ انداز تھا۔

"کس کی تمہاری یا میری۔؟" مومن سنجیدہ تھا۔ بسمہ نے اسے خفگی سے گھورا۔ وہ ہنس دیا۔ بسمہ کی آنکھوں میں مزید غصے نے جگہ لے لی۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔"

"کہاں؟"

"بھاڑ میں۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی تھی۔

"میں ایسی جگہوں پر نہیں جاتا جہاں تم جیسی چڑیلوں کا بسیرا ہو۔" مومن نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"تم نے مجھے چڑیل کہا۔؟" نیا صدمہ۔

"ہاں چڑیل ہی تو ہو جو بچ گئی ورنہ آج تک کوئی بچا ہے اس زہریلی گیس سے۔؟" وہ بے دھیانی میں بولا تھا۔ اپنے الفاظ کا احساس بعد میں ہوا۔ بسمہ پھر سے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"کیا تم نے کوئی ایسا باپ دیکھا ہے جو دوسری مرتبہ اپنی بیٹی کی جان لینے کی کوشش کرے اور ناکام رہے۔؟" وہ پوچھ رہی تھی یا بتا رہی تھی؟

"ہاں جس کی بیٹی تم جیسی ڈھیٹ ہو وہی ہو سکتا ہے۔" مومن نے بات ختم کرنی چاہی تھی۔

"میں ڈھیٹ نہیں ہوں۔" اس کی آواز بلند تھی۔ مومن نے اسے اچھنبے سے دیکھا۔

"نہیں ہوں میں ڈھیٹ۔ نہ ہی میں خود سر ہوں۔ مجھے ضرورت ہے اور ہر انسان اپنی ضرورت کے لیے ڈٹ جاتا ہے۔" خاموش آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ مومن نے ناپسندیدگی سے ان آنکھوں کو دیکھا جو چند پل کے لیے بھی تھم جانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

"کس چیز کی ضرورت ہے تمہیں۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"تمہاری۔ تم سب کی۔ ضرورت ہے مجھے کیونکہ میں ایک انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ پتھر نہیں ہوں میں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ بسمہ شارق کو اس وقت صرف ایک شخص کی ضرورت ہے اور وہ ہے مومن ابراہیم۔" وہ اس کے قریب بیٹھی کھلم کھلا اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ مومن کو اپنا وجود انگاروں پر لپٹا محسوس ہوا۔ گرمی کی تپش تھی یا محبت کی جو اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ بسمہ چند پل اسے دیکھے گئی۔ وہ کچھ نہ بولا۔

"تم اچھا نہیں کر رہے مومن۔ اس سب کا حساب دینا ہو گا تمہیں۔ میرے جذبات سے کھیلنے کا بھی اور اس بے رخی کا بھی۔" بسمہ نے انگلی اٹھائے اسے وارن کیا۔ مومن کی نظریں انگلی پر سے اٹھتی اس کی آنکھوں کی طرف آئی تھیں۔ آہ کتنا ستم ڈھا رہی تھی وہ اپنی آنکھوں پر۔ وہ بے اختیار ہوتا چلا گیا۔ شہادت کی انگلی آگے بڑھائے وہ اس کے آنسو چن رہا تھا۔ بسمہ شارق ساکت ہو گئی۔ ارد گرد ایک فسوں طاری ہو گیا تھا۔ کیا اس کے سامنے بیٹھا شخص مومن ابراہیم تھا؟

"آئندہ کبھی رونا مت جب تک کہ وجہ میں نہ ہوں۔" وہ اپنا سحر پھونک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نے مجھے بچایا کیوں تھا؟" وہ اسی فسوں کے زیر اثر پوچھ رہی تھی۔

"مجھے تمہیں بچانا تھا کیونکہ۔" وہ رکا تو بسمہ شارق اسے سننے کو بے تاب ہونے لگی۔ وہ کہنے جا رہا تھا۔ اس کا دل سینے میں ڈھول پیٹنے لگا۔

"کیونکہ تم ایک لڑکی ہو۔" سارا فسوں چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

"مومن!" وہ رو دینے کو تھی۔

"پلیز۔ اب مت رونا۔ بلاوجہ دل میں درد ہونے لگتا ہے۔" وہ اسے ڈپٹتے ہوئے آخری جملہ آہستہ آواز میں بولا تھا۔

"دل بھی ہے تمہارے پاس؟" اس نے کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مومن نے گہری سانس بھری۔

"جواب چاہیے۔؟" بسمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کن سوالات کا۔؟"

"جو جو پوچھوں گی، ان سب کا۔" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ مل جائیں گے۔" اس نے حامی بھری۔ بسمہ کی آنکھوں میں دیے جل اٹھے تھے۔

"ہاں لیکن وقت تاریخ اور دن میں خود طے کروں گا۔ اور تمہیں آنا ہو گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ضرور آؤں گی۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔ پھر آنسو رگڑ ڈالے۔ شاید ان آنکھوں میں دوبارہ نمی کا آنا مشکل ہی تھا۔

مومن ابراہیم اسے مسکراتے دیکھ مسکرایا تھا۔

"تمہاری مسکراہٹ میرے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔" وہ بولا۔ بسمہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یہ الفاظ مومن ابراہیم نے کہے تھے۔ وہ یقین کرنے سے قاصر تھی۔ اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کاش وہ اپنے الفاظ دوہرائے لیکن وہ مدھم مسکراہٹ لیے وہاں سے باہر جا چکا تھا۔

وہ ایک تنگ تاریک سا کمرہ تھا۔ کسی بھی قسم کی کھڑکی اور روشن دان سے بے نیاز۔ وہاں محض ایک دروازہ تھا۔ تاریک ماحول میں اس کا رنگ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کمرے کی ساکن فضا میں کسی کی ہچکیاں وقفے وقفے سے گونج رہی تھیں۔

وہ کمرے کے ایک کونے میں گٹھڑی کی مانند گھٹنے سینے سے ٹیکے بیٹھی تھی۔ چہرہ گھٹنوں میں دیے وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

بال پشت پر تھے جسے وہ دیوار سے لگائے سہمے ہوئے تھی۔

"یا اللہ۔" ہچکیوں کے درمیان اس نے اپنے رب کو پکارا۔

تنہائی میں اس کی فریاد سننے والا صرف اللہ تعالیٰ تھا۔ اسے یہاں آئے چند گھنٹے بیت چکے تھے۔ اور اس تمام وقت میں اس کے چہرے پر قفل پڑا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرے گا۔ اس کے محافظ کو اس تک وہ ذات پہنچائے گی۔

وہ تب سے اب تک رو رہی تھی۔ اسے بے ساختہ آج ہوا واقعہ یاد آیا۔ سن ہوتا دماغ ذہن کے دریچوں میں نیا منظر ابھارنے لگا تھا۔

وہ صبح بہت تازگی بخش تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وہ فجر پڑھ کر سوئی نہیں تھی بلکہ قرآن پڑھ کر باہر کچن میں آگئی۔ چائے کا سامان نکالتے ہوئے اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ ملک سیاہ شرٹ اور ٹراؤزر پہنے اپنے کمرے سے باہر آرہا تھا۔ اسے صبح صبح وہاں دیکھ کر ٹھٹھکا۔ پھر گہری مسکراہٹ لیے کچن میں آگیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس کا موڈ فریش تھا۔ انمول کے دل کو طمانیت پہنچی۔

"چائے بن رہی ہے" اس نے برنر آن کیا۔

"آہ مجھے لگا میری بیوی آج مجھے اپنے ہاتھوں کا ناشتہ کرائے گی۔" وہ اچک کر کچن کاؤنٹر پر بیٹھ گیا تھا۔

"روز تو جیسے پڑوس والی صائمہ کے ہاتھ کا ناشتہ کرتے ہو۔" وہ دوبدو بولی تھی۔ ملک نے مسکراہٹ دبائی۔

"واقعی؟ کیا ہمارے پڑوس میں کوئی صائمہ بھی رہتی ہے؟ جو مجھے ناشتہ بھی بنا کر دیتی ہے؟" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھ رہا تھا۔ انگلی ٹھوڑی پر رکھے۔

"تمہاری صائمہ کی تلاش شروع ہو گئی لیکن سوری میرے طعنے کا اینڈ ہو گیا ہے۔" وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"سوچ لو کہیں وہ تمہاری سوتن ہی نہ نکل آئے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"چائے میں دو چمچ زہر ملا کر یہ قصہ ہی ناں ختم کر دوں۔؟" ملک کا فلک شگاف قہقہہ ابھرا تھا۔

"کیوں بھری جوانی میں بیوہ ہونے کا ارادہ ہے۔" انمول سر جھٹک گئی۔ وہ اسے تپا رہا تھا اور کچھ نہیں۔

"خود تو کچھ کرنا نہیں ہوتا بس بیویوں پر الزام تراشی کرنی ہوتی ہے۔" وہ بڑبڑا رہی تھی اور ملک مسکراہٹ دبائے اسے سن رہا تھا۔

"بیویوں کے طعنے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ انمول کے سر پر لگی تلوؤں پر بجھی۔

"تم اپنی حرکتیں بند کر دو، میں طعنے دینا بند کر دوں گی۔" وہ سیخ پا ہوئی۔

"کون سی حرکتیں؟" ملک کو سچویشن میں آیا ٹوسٹ مزہ دے رہا تھا۔

"یہی جو تم دوسری شادی کے خواب دیکھ رہے ہو۔"

"اب کیا خواب دیکھنے پر بھی پابندی ہے؟" ملک کی آواز میں حسرت تھی۔ انمول منہ کھولے چند لمحات اسے دیکھے گئی۔ پھر پیر پٹختی چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔

"اب مجھ سے کیا چاہتی ہیں آپ زوجہ؟" وہ بے بس تھا۔ ہمیشہ کی طرح انمول کے سامنے اس کی نہیں چلنے والی تھی۔

"تمہارے ہاتھ کا لذیذ سا ناشتہ۔" کیا خواہش تھی اس کی۔

"سوری میں صائمہ نہیں ہوں۔" ملک ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"لیکن شوہر تو ہوناں؟" یاد دلایا۔

"لیکن زن مرید نہیں ہوں" باور کرایا گیا۔

"محبت تو کرتے ہوناں؟" آخری سہارا ڈھونڈا۔

"ہاں تو محبت میں چاند ستارے توڑ لانے کی باتیں کرو نا یہ کیا تم مجھے چولہے میں جھونک رہی ہو۔" وہ سخت خائف نظر آتا تھا۔

"پہلے میرے لیے ناشتہ بناؤ پھر چاند ستارے بھی توڑ لانا۔"

"یا وحشت۔ میں اب اپنی بیوی کے لیے ناشتہ بناؤں گا۔؟ میں ماہیر سکندر۔؟" وہ سینے پر انگلی رکھے تصدیق چاہ رہا تھا۔ انمول نے آنکھیں ٹپٹپائیں۔

"جی آپ میرے یعنی اپنی بیوی کے لیے ناشتہ بنائیں گے۔"

"یہ پہلی اور آخری دفعہ ہو گا" وہ بتا رہا تھا۔ وہ ہار مان چکا تھا۔ بیوی کے سامنے کسی کی چل سکتی ہے بھلا؟

"پہلی دفعہ تو بنالو آخری دفعہ کی دیکھی جائے گی" مطلب وہ مستقبل میں اس سے ناشتہ بنوانے والی تھی۔ آہ۔ کوئی ملک سے پوچھتا اس پر کیا گزر رہی تھی۔

چند ثانیے بعد وہ منہ پھلائے ایپرن پہنے اپنی زوجہ کے لیے ناشتہ بنا رہا تھا۔

وہ اس وقت ٹوسٹ گرم کر رہا تھا۔ انمول کچن کے درمیان میں لگی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اشتیاق سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دل میں تتلیاں اڑ رہی تھی۔ ملک کی حرکتیں اسے بار بار ہنسانے کا سبب بن رہی تھیں۔

"آآ۔" انڈا فرائی کرتے تیل کے چھینٹے اس کے ہاتھ پر گرے تو وہ سلگ کر رہ گیا۔ پھر ضبط کرتے ایک نظر انمول کو دیکھا۔ جو اپنا پورا دھیان لگائے چائے سے انصاف کر رہی تھی۔ پھر اتنا سا منہ لیے ناشتہ طشتری میں لگانے لگا۔

"یہ لیں جی۔ آپ کا ناشتہ تیار ہے۔" اس نے طشتری لا کر میز پر رکھی۔ اسی وقت انمول کھڑی ہوئی تھی۔ ایپرن کی ڈوریاں کھولتے ملک نے اسے دیکھا جو کپ سنک میں رکھنے کے بعد کیبنٹ سے کچھ نکال رہی تھی۔ پھر وہ اس کی جانب آئی۔ ہاتھ میں پکڑی مرحم سے تھوڑی سی مقدار میں ٹیوب نکال کر دوسرے ہاتھ سے ملک کا ہاتھ تھاما۔ وہ حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب جلے پر مرحم رکھے اس پر پھونک رہی تھی۔ ملک کا دل دھڑکا۔

وہ نثار ہو گیا تھا آج انمول ملک پر۔

"اتنا سا جلا تکلیف نہیں دے سکتا انمول۔" وہ اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ جسے انمول ملک نے تھام رکھا تھا۔

"زخم چھوٹا ہو یا بڑا زخم، زخم ہوتا ہے۔ اس لیے زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ چپ کر کے کھڑے رہو۔" وہ اپنے نرم و ملائم انگلیوں سے مرحم لگا رہی تھی اور ملک کو اپنے دل پر ٹھنڈی پھوار گرتی محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا؟" وہ پیچھے ہٹی تو ملک اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس کی جانب جھکا۔

"اپنا خیال رکھا کریں۔ جان سے بھی زیادہ قیمتی ہیں آپ۔" وہ جھک کر اس کی پیشانی پر محبت کی پہلی مہر ثبت کر رہا تھا۔ وہ ساکت ہوئی۔ اس کا چہرہ لالی چھلکانے لگا تھا۔ وہ شرم و حیا سے نظریں جھکا گئی۔ ملک چند پل اسے دیکھے گیا۔ وہ چہرہ ادھر ادھر گھماتی اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کا بہانہ تلاش رہی تھی۔ واللہ یہ اس کی ہی بیوی تھی نا؟ جو آج شرما رہی تھی۔

"ناشتہ۔" ملک نے اس سے دور ہوتے یاد دلایا۔ انمول چونک کر سیدھی ہوئی۔ پھر ایک نظر ٹیبل پر رکھے ناشتے کو دیکھا پھر اسے۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔ تم کر لو۔" وہ تپا دینے والی مسکراہٹ لیے پلٹی تھی۔

"واٹ!" ملک چیخا۔ اپنی محنت اسے ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"اب بنا دیا ہے تو کر کیوں نہیں رہی۔؟" اس کی آواز صدمے سے دوچار تھی۔ انمول نے اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اگر بیویاں غلطی سے صبح جلدی اٹھ جائیں تو ضروری نہیں ہے کہ ناشتہ بھی وہی بنائیں گی۔ خود بنا کر اور کھا کر بھی کام پر جایا جا سکتا ہے۔" وہ چھپاک سے اپنے کمرے میں غائب ہو گئی۔ اور ملک کو اب اس کی بات سمجھ آئی تھی۔

وہ رشتوں میں برابری کی قائل تھی۔ وہ جان گیا تھا۔ ہنس کر سر جھٹکتے وہ اب ناشتہ کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو ملک اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا۔ صبح کو یاد کرتی وہ مسکرائی تھی۔ کتنا مکمل تھا ان کا رشتہ۔

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

تبھی دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ ایک بار پھر دو بار، اور پھر بار بار۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس وقت کون ہو سکتا تھا ملک تو ابھی ہی گیا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ دل انجانے اندیشوں کے خیال سے دھڑکا تھا۔ چھٹی حس فوراً بیدار ہوئی تھی۔ گھنٹی پر گھنٹی بجنے لگی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر دروازے کے قریب گئی۔ ہول سے باہر جھانکا سامنے کوئی نہ تھا۔ کیا کسی بچے کی شرارت تھی۔ اس نے غصے سے تلملاتے دروازہ کھولا۔

دھت۔ شاید یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔؟"سفید لٹھے کے سوٹ میں ملبوس عزرائیل سامنے کھڑا تھا۔انمول ملک کا دل دھک سے رہ گیا۔آنکھوں میں سیاہ سمندر آن ٹھہرا۔وہ سیکنڈ کی دیری کے بغیر پلٹی اور بھاگ کر اندر گم ہوئی۔جہانداد ملک کا قہقہہ گونجا تھا۔ان کے پیچھے ایک اور آدمی کھڑا تھا۔

پھر وہ انمول کے پیچھے بھاگے۔وہ راہداری کے سرے پر گم ہوئی تھی۔جہانداد ملک نے اسے اس کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ ہڑبڑی میں وہ دروازے کو لاک لگانا بھول چکی تھی۔اور یہی دوسری غلطی تھی۔اس نے بھاگ کر اپنا سیل فون اٹھایا۔لیکن جہانداد ملک اس تک پہنچ چکے تھے۔

"چھوڑیں مجھے بابا سائیں۔چھوڑیں۔"وہ چلا رہی تھی۔جہانداد ملک نے اسے بازو سے تھامے اپنے ساتھ گھسیٹا۔راہداری میں رکھے ٹیبل پر پڑا واز انمول کے ساتھ لگنے سے زمین بوس ہوا تھا۔

"میں نے کہا چھوڑیں مجھے۔ورنہ ملک آپ کو نہیں چھوڑے گا۔"اس نے دھمکی دی۔جہانداد ملک دروازے کے قریب رک گئے۔

"شیر کی کچھاڑ میں شیر پر نہ سہی اس کی شیرنی پر تو ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے نا۔"جہانداد ملک نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے بندے سے تائید چاہی تھی۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چل۔"انہوں نے اسے دھکیلا۔اس کا سر دیوار سے جا لگا۔ہاتھ میں تھاما موبائل زمین بوس ہوا تھا۔پیشانی میں درد کی ٹیس اٹھی تھی۔

"بابا سائیں۔چھوڑیں پلیز۔مجھے جانے دیں۔"وہ گڑگڑائی تھی لیکن جہانداد ملک کا یہ روپ باپ والا ہرگز نہ تھا۔

"خاموش۔"وہ دھاڑے۔انمول ملک چونک کر حال میں لوٹی۔آس پاس اندھیرا تھا۔خوشگوار صبح کا اختتام ہو چکا تھا۔باسی اور سوگوار شام چڑھ آئی تھی۔یا شاید رات۔کون سا پہر،کیا وقت ہو رہا تھا اسے نہیں معلوم تھا۔

پورے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔وہ وہیں بیٹھی رہی جب دروازہ کھلا اور جہانداد ملک نے اندر قدم رکھا۔انمول ملک کا وجود خوف سے لرزا تھا۔بچپن سے ایک ڈر سا تھا کہ ایک دن اس کا باپ اسے مار دے گا تو کیا وہ آج حقیقت بن جانے والا تھا۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔؟"ان کا لہجہ نرم تھا لیکن اس میں طنز کی آمیزش تھی۔انہوں نے کوئی بتی نہیں جلائی۔وہاں ویسا ہی گھپ اندھیرا رہا۔محض کھلے دروازے کی ہلکی سی درز سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔

"میری بیٹی۔"انہوں نے دوبارہ پکارا۔

"دیر مت کریں۔"وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔سر گھٹنوں پر ٹکائے وہ بائیں جانب دیکھ رہی تھی۔

"کس سلسلے میں دیر کر رہا ہوں میں؟"

"مارنا چاہتے ہیں ناں آپ مجھے۔ تو مار کر یہ قصہ آج یہیں تمام کر دیں۔ میرا بچپن کا ٹراما ختم کر دیں۔ جیسے میری ماں کو مارا تھا مجھے بھی مار دیں۔" اس نے سر اٹھایا۔ وہ اندھیرے میں سفید رنگ کے سوٹ میں ملبوس جہاندار ملک کو دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ان کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ اسے وہ ملک الموت معلوم ہوئے۔

"کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو مار سکتا ہے؟" انمول کے لبوں پر استہزایہ مسکراہٹ اپنی چھپ دکھا کر معدوم ہوئی۔

"کیا ایک شوہر اپنی وفادار بیوی کو مار سکتا ہے؟" جواب حاضر تھا۔ ایک پل کو وہ خاموش رہ گئے۔ شاید انمول کا جواب سن کر۔

"کیا کرو گی اتنی نفرت کا۔؟" انہوں نے گہری سانس بھری۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اور ملک سے محبت کر کے کیا ملے گا تمہیں۔؟" اب کی بار وہ خاموش رہی۔

"کتنی محبت کرتی ہو اس سے؟" انہوں نے ہاتھ کمر پر باندھے نیا سوال داغا۔

"دیوانگی کی حد تک۔" انمول نے خلا میں گھورتے جواب دیا تھا۔

"جانتی ہو دیوانگی کی حد کیا ہے؟" وہ رکے۔ تھوڑا سا توقف کیا۔

"موت۔" سرگوشی سی تھی لیکن انمول ملک کا دل سکڑ گیا۔

"موت یقینی ہو گی۔ تمہاری یا تمہارے اس ملک کی۔" انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"آپ کچھ نہیں کر سکتے۔" اس نے باور کرایا۔

"میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" بلا کا اعتماد جھلکتا تھا ان کے لہجے سے۔

"خود کو بادشاہ سمجھ کر تکبر نہ کریں آپ منہ کے بل گرے تو اٹھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔" انمول ملک کا دل کیا وہ ان کے انجام کا خاکہ کھینچ کر انہیں دکھا دے۔

"یہ بات ایک بیٹی اپنے باپ سے کہہ رہی ہے۔ اسٹرینج۔" انہوں نے کندھے جھٹکے۔ انمول ملک کا غصہ سر از نو عود آیا۔

"ہاں کیونکہ آپ باپ کہلانے کے لائق ہی نہیں۔ آپ ایک حیوان ہو سکتے ہیں لیکن انسان نہیں۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اسے ان کا سکون غارت کر رہا تھا۔

"اور ایسا کیونکر۔؟"

"آپ قاتل ہیں۔ اتنے آپ کے سر کے بال نہیں ہونگے جتنے گناہ آپ کر چکے ہیں۔ آپ لوگوں کی خوشیوں کے قاتل ہیں۔ پھوپھو اور پھوپھا کا مرڈر بھی آپ نے کیا تھا۔ مومن ابراہیم کے باپ کو بھی آپ نے مارا۔" جہانداد ملک چونکے۔ مومن ابراہیم، ملک کا دوست، ان کا اس سے کیا لینا دینا۔ اور تبھی دماغ میں کوندا سا لپکا۔ ابراہیم داؤد سے مومن ابراہیم اور پھر مومن ابراہیم سے صوفیہ ابراہیم کا وجود ان کی آنکھوں میں سماتا گیا۔ وہ نمک کا مجسمہ بن گئے تھے۔ وہ لڑکا ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انہیں ہمیشہ صوفیہ ابراہیم کی یاد دلاتی تھیں اور وہ تو جیسے جان کر بھی انجان بنے ہوئے تھے۔

"ندیم دارا سے لے کر حدید قریشی تک کے مقتول ہیں آپ۔ اور آپ کہتے ہیں ایسا کیونکر؟ کیا آپ نہیں جانتے آپ کتنے ہی کبیرہ گناہ سرزد کر چکے ہیں۔ جن کی کوئی معافی نہیں۔ کوئی توبہ نہیں۔ آپ خود کو زمینی خدا سمجھتے ہیں لیکن آپ خاک ہیں خاک۔ آپ نے صوفیہ ابراہیم کو اپنی قید میں رکھا لیکن کیا ملا؟ ہار۔ آپ نے میری ماں کو مارا تو کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں بلکہ اس کے بدلے آپ کو اپنی ہی بیٹی کی نفرت مل رہی ہے۔" وہ چلائی تھی۔ کمرے کی سیاہ تاریک دیواروں نے دم روکے اس جنونی ہوتی لڑکی کو تکا۔

"ایک بیٹی اپنے باپ سے ں فرت نہیں کر سکتی۔" جہانداد ملک کا لہجہ اب بھی پر سکون تھا۔ انمول ملک کا دماغ گھوم گیا۔ دانت پر دانت بجنے لگا تھا۔

"کرتی ہے ہر وہ بیٹی کرتی ہے جس کا باپ آپ جیسا ہو گا۔ خدارا خود سے اتنی نفرت مت کروائیں کہ آپ کا چہرہ بھی دیکھنے کو دل نہ چاہے۔" آواز میں غراہٹ تھی۔ جہانداد ملک کا دل ایک لمحے کے لیے ڈوب سا گیا۔

"میں نے کہا ناں ایک بیٹی کبھی۔۔۔" بولنے کی سعی کی گئی لیکن انمول ملک کی چنگھاڑتی آواز بہت تیز تھی۔

"خاموش ہو جائیں۔ میں ہوں وہ بیٹی۔ میں کرتی ہوں آپ سے نفرت۔ آپ میری ماں کے قاتل ہیں۔ آپ میرے بچپن کے قاتل ہیں۔ آپ کو باپ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے مجھے۔ آپ میرے ملک کی خوشیوں کے قاتل ہیں۔ آپ مجھے مار دیں یا چھوڑ دیں لیکن خدارا ایسی اذیت تو مت دیں۔" اس کی آواز بالکل آخر میں کانپی تھی۔ مزید بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ حلق میں کچھ اٹک گیا تھا۔ وہ ملک کی اذیت محسوس کر سکتی تھی۔

"ماروں گا۔ لیکن تمہیں نہیں تم بیٹی ہو میری۔ اسے ماروں گا جو اس سب کی جڑ ہے۔ سب سے پہلے ختم ہو گا ملک اور پھر رفتہ رفتہ تم سب موت کا مزہ چکھو گے۔ جہانداد ملک موت انہیں پلیٹ میں رکھ کر پیش کرے گا۔" وہ جلالی ہو رہے تھے۔ ملک ان کی بیٹی کے معاملے میں انہیں مات دے گیا تھا۔ وہ کیسے اپنی شکست قبول کرتے۔

"نہیں پلیز۔ ملک نہیں اس کو کچھ مت کہیے گا ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گی۔" اس نے برق رفتاری سے کہا۔ جہانداد ملک اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"کہاناں اب وقت آگیا ہے چوہے اور بلی کا کھیل ختم ہونے کا۔ اس شطرنج کی بساط اب الٹے گی۔" ان کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ انمول انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں کریں گے آپ۔" التجا تھی۔

"میں ایسا ہی کروں گا مائی ڈیئر ڈاٹر۔ اور تم دیکھو گی۔ خیر کسی سے ملوانا تھا تمہیں۔" انہوں نے اونچی آواز میں کسی کو بلایا۔

"قسم سے بہت شور کرتی ہے۔ میرا سر درد کرنے لگا اس کی چیخ وپکار سن کر۔ صبح سے اس کمرے کے درودیوار ہلا کر رکھ دیے ہیں اس نے۔" انمول ملک سن بیٹھی رہ گئی۔ دوسری ہستی کون تھی جو ان کے عتاب کا شکار ہونے جا رہی تھی۔؟

باہر سے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے ان آوازوں کو سننے سے خود کو باز رکھا۔ لیکن وہ جو بھی کرتی آواز قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔ کمرے میں لگا نیم وا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ چوکھٹ سے چوکور ڈبے میں بنتی روشنی لمبی ہوتی سامنے سفید وسیاہ دیوار کے ساتھ ٹکرائی تھی۔

تین پرچھائیاں ابھریں۔ انمول ملک نے ادھر نہیں دیکھا۔ وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے کسی شخص کو اندر دھکیلا تھا۔ اور خود واپس ہو لیے۔ جہانداد ملک باہر کی جانب بڑھنے لگے۔

"میٹ یور کزن۔ جیا سکندر۔" وہ بولتے وہاں سے چلے گئے۔

"کھولو۔ پلیز ایسا نہیں کریں۔ مجھے جانے دیں۔" مقابل چیخ رہا تھا۔ لیکن اس کی نہیں سنی گئی۔ جہانداد ملک اسے نظر انداز کرتے باہر نکل گئے۔ دروازہ پھر سے بند ہوا تو کمرے کو مکمل تاریکی میں نہلا گیا۔

"پلیز کوئی ہے کھولو اسے۔ مجھے باہر نکالو پلیز۔" وہ چیخ رہی تھی اور کمرے کے کونے میں بیٹھی انمول ملک کا سر یک دم اٹھا۔ وہ حق دق تاریکی میں مندمل سی نظر آتی جیا سکندر کو دیکھ رہی تھی۔

"تو تمہاری منزل بھی یہی بنی جیا سکندر۔ دشمنی جیت گئی۔ اسے جیتنا ہی تھا۔" وہ بولی تھی۔ جیا نے اندھیرے میں دیدے پھاڑے خود کو اس ماحول سے مانوس کرنا چاہا۔

"آپ انمول؟" وہ یقین چاہتی تھی۔

"ہاں میں انمول۔ جس کا باپ دشمنی میں اپنے دشمن کو مات دینے جا رہا ہے۔ اس کھیل کا انجام یونہی لکھا تھا۔ اسے یونہی کھیلا جا سکتا تھا۔" اس نے خالی ہتھیلیاں اپنے سامنے کیں۔ ہاتھ خالی تھے۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جیا سکندر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

"یا اللہ۔ میں کیا کروں؟ بالاج مجھے کیسے ڈھونڈیں گے؟" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ انمول کے دل کو کچھ ہوا۔ اس کا جیا سکندر سے دوہرا رشتہ تھا۔ ایک طرف کزن کی حیثیت تو دوسری طرف وہ اس کی نند کا درجہ رکھتی تھی۔

"مجھے جانا ہے یہاں سے۔ پلیز کوئی ہے مجھے باہر نکالو۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے مجھ پر رحم کھاؤ۔" اس نے دروازے پر کاری ضربیں لگائی۔ لیکن اس پار سے جواب ندارد تھا۔ اس نے کوشش نہیں چھوڑی۔ وہ چیختی چلاتی دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ جیا سکندر۔!" انمول اونچی آواز میں بولی تھی۔ جیا سہم گئی۔ رونے کا شغل جاری رکھا۔

"کیسے خاموش ہو جاؤں۔؟ انمول مجھے اپنے بالاج کے پاس جانا ہے۔ مجھے یہاں سے نکال دیں پلیز۔" وہ گڑگڑا رہی تھی۔ انمول ملک اندھیرے میں گرتی سنبھلتی اس تک پہنچی تھی۔

"شش۔ خاموش ہو جاؤ۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ وہ ہمیں بچا لے گا۔" اس نے جیا کو خود سے لگایا۔ وہ خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"وہ کون؟" ہچکی بھری۔

"ملک۔"

"ملک کون؟" جیا کو سمجھ نہیں آیا تھا۔

"ماہیر سکندر۔" اصل تعارف جیا کے چودہ طبق روشن کر گیا۔ امید کی ڈھارس بندھی تھی۔ ہاں اس کا اینجل اس تک پہنچ جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اسے بچا لے گا۔ لیکن آخر کب؟

"یہ لوگ ہیں کون؟ مجھے کیوں اغواء کیا ہے۔؟" اس کی آواز بیٹھنے لگی تھی۔ شاید وہ بہت دیر سے رو رہی تھی۔ انمول نے لب بھینچ لیے۔ جیا پریگننٹ تھی اس کے لیے پریشانی نقصان بن سکتی تھی۔

"تمہارا اغواء کار تمہاری ماں کا سگا بھائی اور میرا باپ ہے جیا سکندر۔" انمول نے آہستہ آواز میں سرگوشی کی اور جیا سکندر پر تاریک چھت پھٹ پڑی تھی۔ کیا اس کے ماں باپ اور بھائی کے بعد وہ ان کے ظلم کی نذر ہونے والی تھی۔؟

"تو آپ سے کیا دشمنی ہوئی ان کی؟" اس کی طرح اس کے سوال بھی معصوم تھے۔ انمول ملک آزردگی سے مسکرائی۔ جیا سکندر کی آنکھوں میں موتی تھے۔

"غداری دشمنی سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔"

"مطلب؟" جیا نے سر اٹھائے اسے دیکھا۔ انمول ملک اسے قیمتی متاع کی طرح خود سے لگائے ہوئے تھی۔

"میرے باپ کی ڈکشنری میں غداری کی سزا صرف موت ہے۔" سفاک الفاظ۔ جیا سکندر کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگر جو اس کے بچے کو کوئی نقصان پہنچ گیا؟

"آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں۔ سیدھی طرح بتائیں ناں۔" جیا چڑ گئی تھی۔

"میں ماہیر سکندر عرف ملک کی زوجہ ہوں۔ تمہاری بھابھی۔ اور یہی شکست میرے باپ کو قبول نہیں۔" انمول نے دھیرے سے کہا تھا۔ جیا گنگ رہ گئی۔

"بھابھی؟"

"ہاں۔" انمول نے تصدیق کی تھی۔

"لیکن۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہی سچ ہے جیا سکندر۔ اب ایک لفظ اور نہیں۔ انتظار کرو وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔" انمول نے اس کی پشت تھپکی۔ وہ حیران تھی اور بے یقین بھی۔ لیکن وہ خاموش ہو گئی۔

ان دونوں عورتوں کے لبوں پر دعاؤں کا ورد تھا۔ اپنے محافظوں کو بلانے کی صدا تھی۔ انہیں انتظار کرنا تھا۔ اندھیرے کے بعد اجالے کا۔ بارش کے بعد کے موسم کا۔ انمول کو آج معلوم ہوا تھا وہ اتنی کمزور کیوں تھی۔ کیونکہ وہ ملک سے محبت کرتی تھی اور جہاں جذبات آجائیں وہاں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔

سورج کی تیز روشنی کمرے میں لگی واحد کھڑکی سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ دھول کے ذرّات پتنگوں کی طرح اس روشنی میں صاف نظر آتے تھے۔ اسٹڈی ٹیبل پر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس کا کمرہ درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ ایسے میں ابھی باتھروم سے سے نکلا تھا۔ تولیے سے بال رگڑتے اس نے تولیہ بیڈ پر پھینک دیا۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ جب صوفیہ ابراہیم دروازے پر ہلکی دستک دیتی اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہ مسکرا دیا۔

صوفیہ ابراہیم نے سر تا پیر اسے دیکھا۔ وہ آج مختلف حلیے میں تھا۔ بلیک پینٹ پر گرے شرٹ پہنے ہوئے وہ آج نیلے رنگ سے آزاد تھا۔ اور شاید نیلے رنگ والی سے بھی؟

"کہاں جانے کی تیاری ہے؟" وہ آگے بڑھی۔

"سینٹر جا رہا ہوں۔" صوفیہ ابراہیم اس کے قریب کھڑی تھیں۔

"اتنی تیاری کے ساتھ۔" وہ حیران تھیں۔ آج مومن ابراہیم بدلا بدلا سا تھا۔

"جی کیا معلوم کوئی لڑکی ہی پٹ جائے۔"

"میرے بیٹے کو لڑکی پٹانے کی کیا آن پڑی۔ وہ تو خود بخود پٹ چکی ہے۔" وہ مسکراہٹ دبائے بول رہی تھیں۔ مومن ہنس دیا۔

"اچھا۔" اس نے اچھا کو لمبا کھینچا۔ صوفیہ ابراہیم اسے گھور رہی تھیں۔

"کیا ہوا۔؟"

"سب جانتی ہوں بیٹا آخر ماں ہوں تمہاری لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ پھول ہمیشہ اس باغ میں کھلتا ہے جس کی مٹی زرخیز ہو۔" وہ ان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ لیکن سنجیدہ اور افسردہ ہونے کی بجائے اس نے صوفیہ ابراہیم کا ماتھا چوما۔ وہ ماں تھیں اس کی۔ اسے سب سے عزیز تھیں۔ اس ماں کا انتظار اس نے اپنی زندگی کے تئیس سالوں میں کیا تھا۔ لوگ اگر پہلے کہتے کہ مومن ابراہیم کے پاس ہر شے ہے تو وہ انکار کر دیتا لیکن اب اس کے پاس پوری دنیا تھی۔ وہ اپنی دنیا کو خوبصورت بنائے رکھ سکتا تھا۔ اور وہ ان کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کرنے والا تھا جس کی انہیں چاہ تھی۔

صوفیہ ابراہیم اس سے پہلے کوئی اور بات کرتیں مومن ابراہیم کا فون رنگ ہوا۔

"ٹھیک ہے تم بات کر لو۔ میں چلتی ہوں۔" وہ کہتی جیسے آئی تھیں چلی گئیں۔ مومن نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔ نمبر غیر شناسا تھا۔

"السلام علیکم۔؟" اس نے کال اٹھاتے فون کان سے لگایا۔

"میں حماد بات کر رہا ہوں۔ آپ کو یہ کال میرے باس کی جانب سے کی گئی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"کس باس کی بات کر رہے ہیں آپ۔؟" اس نے پوچھا۔

"شارق کبیر۔ انہیں آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" حماد نے مطلع کیا۔ مومن ابراہیم کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔ وہ شخص چین سے نہیں بیٹھ رہا تھا۔ عزت کا بیڑا غرق کروا کر بھی وہ نئی کشتی میں تیرنا چاہتا تھا۔

"اور آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں آؤں گا؟" وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اسے سینٹر جانا تھا۔ پھر بسمہ کی خیریت دریافت کرنی تھی۔

"مجھے نہیں باس کو لگتا ہے کہ آپ ضرور آئیں گے۔" مومن تلخی سے کچھ بڑبڑایا تھا۔

"اپنے باس سے کہو مجھے خود کال کر کے دعوت دے کیونکہ مومن ابراہیم کسی ملازم کا حکم نہیں مانا کرتا۔" دوسری جانب سے کال ڈراپ ہو گئی۔ مومن اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

"اس بڈھے کا بھی کچھ کرنا پڑے گا۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ شارق کبیر کو اس سے کیا بات کرنی ہے۔

انہوں نے مومن ابراہیم کو کیوں بلایا تھا؟ کیا کچھ تھا جس سے وہ بے خبر تھا؟

ہاسٹل کا ماحول ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ گارڈن میں دھوپ تھی تو اس طرف کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ ٹریننگ ڈپارٹمنٹ میں خاموشی تھی غالباً آج ان کا آف تھا یا کچھ اور۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب موجود لڑکے اور لڑکیوں کے ہاسٹلز میں شور تھا۔ ویسا ہی شور جو کسی بھی ہجوم میں لگا ہو سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس سب سے بے نیاز اپنے روم میں سکون کی نیند سو رہے تھے۔ اور کچھ مختلف کام انجام دے رہے تھے۔

ایسے میں ان دونوں کے کمرے کی جانب آؤ تو دروازہ مقفل تھا۔ اندر دو لڑکیاں محو گفتگو تھیں۔

"واقعی۔؟ مومن نے تمہیں بلایا ہے۔ افف۔" فریال ساجد کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔

"ہاں اس نے مجھے بلایا ہے۔ اینڈ یو نو واٹ، ہی از چینجڈ۔" بسمہ اپنے بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ موبائل ہاتھ میں تھامے اس کی انگلیاں اوپر نیچے حرکت کر رہی تھیں۔

"ہیں؟ کیسی تبدیلی؟" بسمہ نے نظریں اٹھا کر فریال کو دیکھا جو اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچے دونوں پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔

"وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بھول ہے تمہاری۔" اس نے گھور کر فریال کو دیکھا۔

"حقیقت ہے یہ۔" فریال نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر یہ حقیقت ہے تو کبھی آشکار نہیں ہو گی۔" فریال نے کندھے اچکا دیے۔

"فریال تم یوں میرا دل نہیں توڑ سکتی۔" اس کی حالت رونے والی ہوئی تھی۔ فریال کو ایک لمحے کے لیے اس پر ترس آیا لیکن وہ اسے خواب نہیں دکھا سکتی تھی۔ بسمہ اس کی دوست تھی اور دوستوں کے لیے سب سے ضروری چیز یہی ہے کہ انہیں گائیڈ کیا جائے۔

"نہیں میں تو تمہیں۔۔۔" وہ بات سنبھالنے لگی۔ لیکن بسمہ کے موبائل کی رنگ ٹون پر خاموش ہو گئی۔

"ایک منٹ۔" اس کی تیوری چڑھی۔ ناگواری سے آنے والی کال کو کاٹا۔ لیکن مقابل ڈھیٹ تھا۔ دوسری باری پر بسمہ نے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے سرد مگر بہت ہی نرم آواز ابھری تھی۔ بسمہ کی موبائل پر گرفت مضبوط ہوئی۔

"کوئی کسر باقی رہ گئی تھی مسٹر شارق کبیر۔ جو دوبارہ مجھے کال کرنے کی نوبت پیش آگئی؟" ناپسندیدگی عیاں تھی۔ فریال اسے دیکھے گئی۔

"نہیں تو۔ میں نے تو تمہیں کچھ بتانے کے لیے فون کیا ہے 'میری بیٹی'۔" وہ اپنے آفس میں بیٹھے تھے۔ بالکل تنہا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا شاید بتیاں بجھائی گئی تھیں۔

"کیا بتانے کے لیے؟ اب کون سا اٹیک ہوا ہے آپ کو؟" طنزیہ آواز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اٹیک تو تمہیں دینے جا رہا ہوں بسمہ شارق کبیر۔"

"اوہ۔ میں تو ڈر گئی۔ اس بار کیا کرنے والے ہیں آپ؟ مجھے گاڑی تلے کچلنے اور بند کمرے میں مارنے کا پلین تو فلاپ ہو گیا آپ کا۔ کون سا نیا منصوبہ بنایا ہے آپ نے اس دفعہ۔؟" وہ طنز پر طنز کے تیر پھینک رہی تھی اور شارق کبیر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ فریال ساجدنا محسوس انداز میں وہاں سے باہر جا چکی تھی۔

"میں نے پلین چینج کر لیا ہے اب۔ تمہیں نہیں ماروں گا کیونکہ تمہیں مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" ان کی آنکھوں میں کچھ پنہاں تھا۔ بسمہ شارق ان کی سرد آواز پر کانپ گئی تھی۔ وہ نہیں تو کون؟

"اس سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" ان کی آواز واپس نرم سی ہو گئی تھی۔ بسمہ نے حلق تر کیا۔

"ثناء خان یاد ہے تمہیں۔؟ اور اس کی موت کیسے ہوئی یہ پتا ہے تمہیں؟" پراسرار لہجہ۔ بسمہ شارق کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑی تھی۔ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی رہ گئیں۔ ثناء خان کبھی ایک مشہورِ زمانہ اداکارہ ہوا کرتی تھیں۔ ثناء خان کو اگر اداکارہ کی بجائے شارق کبیر کی اہلیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تو بہتر تھا۔

لیکن اس وقت بسمہ شارق انہیں اپنی ماں کے نام سے یاد کر رہی تھی اور شارق کبیر کی طرف سے پھونکے جانے والے صور کے ساتھ اس کا پورا وجود منجمد ہوتا جا رہا تھا۔ آہ کاش وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی یا کال کاٹ دیتی لیکن وہ ہلنے سے انکاری تھی۔ بالکل کسی مورت کی طرح جو پتھر کی بن چکی ہو۔

فریال ساجد ہاسٹل سے باہر نکل آئی تھی۔ گارڈن کی جانب قدم اٹھاتے وہ سامنے سے آتے مومن ابراہیم کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ اس کے قریب آ رکا تھا۔ فریال آنکھیں سکوڑے اسے دیکھے گئی۔

"بسمہ کیسی ہے اب؟" حالِ یار دریافت کیا گیا تھا۔ فریال کچھ سخت کہنا چاہتی تھی لیکن لب سل گئے۔

"ٹھیک ہے۔" محض دو الفاظ۔

"مجھے بات کرنی ہے اس سے، کیا آپ اسے بلوا سکتی ہیں۔ میں باہر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اجلت میں لگتا تھا۔

"نہیں۔ دراصل وہ مصروف ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔" وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔

"کتنا۔؟"

"جی۔؟"

"میں نے پوچھا کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟" بھوری آنکھوں میں کچھ تھا۔ فریال ٹھٹھک گئی۔ تو کیا وہ واقعی محبت کرنے لگا تھا؟

"شاید چند منٹ، گھنٹے اور ہو سکتا ہے پوری زندگی بھی کم پڑ جائے۔" مومن دھیرے سے ہنس دیا۔

"اوکے۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔ اسے بتا دیجئے گا کہ اگر یہی انتظار 'اس' کی قسمت میں لکھا گیا تو کیا وہ صبر کر پائے گی۔؟" وہ پلٹ گیا تھا۔

"وہ بہت صابر ہے۔ وہ آپ کے حصول کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔" فریال کی آواز آہستہ تھی۔ دور جاتے مومن ابراہیم کی سماعت سے کوسوں دور۔ فریال بھی آگے بڑھ گئی۔

لیکن اپنے کمرے میں موجود بسمہ شارق آگے نہیں بڑھ سکی۔

وہ ایک کشادہ حال کمرہ تھا۔ گہرے سبز رنگ سے اٹا ہوا۔ اس کمرے کا دیدار تم پہلے بھی کر چکے ہو۔ وہاں مشرقی دیوار کے ساتھ تصویریں چسپاں تھیں۔ چھوٹی بڑی ہر تصویر۔ اس کے مخالف سمت دیوار پر ایک وائٹ بورڈ لگا ہوا تھا۔

شطرنج کے تمام پیادوں کے چہرے اس دیوار پر ٹنگے تھے۔ ان میں سب سے بڑی اور واضح تصویر جہانداد ملک کی تھی۔ وہ تمام تصویروں کے وسط میں لگی ہوئی تھی۔ ہر شخص گھوم پھر کر اسی سے آ جڑتا تھا۔

"تمہارا دی اینڈ بہت جلد ہو گا جہانداد ملک۔" دیوار کو تکتے کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے ملک گہری سوچ کے زیر اثر بول رہا تھا۔ چند تصویروں پر سرخ کانٹے کے نشان لگے تھے ماسوائے بچ جانے والوں کے۔

"ماہیر ادھر آؤ یہ دیکھو۔" اس کے دائیں ہاتھ پوری اور لمبی دیوار کے ساتھ مختلف مانیٹر اسکرینز لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک کے سامنے بالاج سکندر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ وہی عینک پہنے لڑکا کھڑا تھا۔ جسے تم پہلے بھی کنٹرول روم میں دیکھ چکے ہو۔

"کیا ہوا۔؟" ماہیر چلتا ہوا ان دونوں کے قریب آیا۔ بالاج نے ہاتھ میں تھامے پین سے سامنے اسکرین پر ایک جگہ اشارہ کیا۔

"یہ جگہ جہانداد ملک کے تسلط میں شمار ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ان دونوں کو وہاں رکھا ہو۔" وہ گویا ہوا۔ ماہیر نفی میں سر ہلا گیا۔

"یہ جگہ اس کی ہے کوئی شک نہیں۔ لیکن وہ جیا اور انمول کو وہاں لے کر نہیں جا سکتا کیونکہ اسے معلوم ہے میں اسے اس کی جگہوں پر تلاش کروں گا۔" وہ پیچھے ہٹ گیا کمرے کے وسط میں لگی میز پر رکھی فائلز کھنگالنے لگا۔ کمرے میں مزید ایک لاکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک دیوار خالی تھی جس میں دروازہ نصب تھا۔

"اوہ رئیلی۔؟ اور ماہیر سکندر یہاں کیا کر رہا ہے۔ کیا وہ اسے اس کی جگہوں پر تلاش کر رہا ہے۔ مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔" اس کی آواز کے ساتھ آنکھوں میں بھی طنز تھا۔

ماہیر نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور جب بولا تو آواز سرد تھی۔

"کالم ڈاؤن میرے بھائی۔ اس کا یہ اندازہ غلط ہے۔" وہ مسکرایا۔ بالاج کو اس کی مسکراہٹ مزید سلگا گئی تھی۔

"ماہیر۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔؟ ہم اتنی دیر کیوں کر کر رہے ہیں؟ اگر اس نے میری جیا یا تمہاری انمول کے ساتھ کچھ کر دیا تو۔؟ کیا کریں گے ہم۔؟ سمجھنے کی کوشش کرو وہاں میری بیوی کے ساتھ بچہ بھی خطرے میں ہیں۔" ماہیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ٹیبل کے قریب رکھی دو کرسیوں میں سے ایک کھسکائی۔

"ادھر بیٹھو۔" اس نے بالاج کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھایا۔ اسے ماہیر پر سخت غصہ آیا تھا۔ لیکن وہ دبا گیا۔

"سب سے پہلے تو تمہیں گھبرانا نہیں ہے۔ جسٹ چل لائک می۔"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں ماہیر۔ تم دیر کر رہے ہو اور مجھے یہ سب ہزم نہیں ہو رہا۔" ماہیر نے لمبی سانس بھرے افسوس سے اسے دیکھا۔

"تھوڑی دیر خاموش ہو کر میری سن لو گے یا اپنی ہی کرنی ہے تم نے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"دیکھو ہماری بیویاں اپنے اپنے گھر سے کڈنیپ ہوئی ہیں۔ ان کو کڈنیپ کرنے والا جہاندادملک ہے۔" ماہیر نے ہاتھ ہلاتے اسے سمجھایا۔

"اور تمہیں کیسے معلوم یہ سب اس نے کیا ہے۔؟ ہو سکتا ہے ہمارا دشمن کوئی اور ہو۔؟" بالاج نے جتنی تیزی سے یہ بات کہی تھی ماہیر کے ہلتے لب خاموش ہو گئے۔

"نہیں۔" اور وہ چند دن پیچھے چلا گیا۔

)وہ اس دن کی بات تھی جب وہاج ملک گھر چھوڑ کر گیا تھا اور اسی بات پر جہاندادملک بپھر گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ملک بالکنی میں تنہا بیٹھا تھا۔ جب جیب میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔

"السلام علیکم۔" ہمیشہ کی طرح اس نے اس شخص پر سلامتی بھیجنا لازمی سمجھی لیکن جواباً سلامتی بھیجنا ضروری نہیں جانا گیا۔

"تم اچھا نہیں کر رہے ملک۔" وہ دھاڑے تھے۔ ملک نے ایک دم فون کان سے دور کیا۔

"اب کیا کر دیا مجھ معصوم نے۔" چہرے پر مسکینیت طاری کر لی گئی تھی۔

"معصوم اور تم۔؟ تم جیسا انسان بھیڑیے سے بھی کم خطرناک نہیں ہو سکتا۔"

"بلیو می۔ سسر جی اب تو مجھے یہ لفظ رٹ گیا ہے۔ میں سچ میں ایک بھیڑیا ہوں۔ اور جانتے ہیں ان کی خصلت کیا ہوتی ہے؟" وہ رکا۔ آنکھوں میں جنون سا در آیا تھا۔ ساری معصومیت پل میں ہوا ہو گئی۔

"یہی کہ وہ مردار نہیں کھاتا۔ وہ اپنا تازہ شکار کرتا ہے اور کتوں کو تو ہر گز منہ نہیں لگاتا۔" اس کے لہجے کی پھنکار ایک پل کے لیے جہانداد ملک کو ٹھٹھکا گئی۔

"اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے ماں باپ سے وفادار ہوتا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کا ایلفا کہلاتا ہے صرف اس لیے کہ اسے اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے سروائیول کی فکر رہتی ہے۔ وہ ان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔" پل میں جہانداد ملک کو اپنے کمرے میں آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان کے کمرے کے پردے گھٹن کے ڈر سے ہمیشہ کی طرح ہٹے ہوئے تھے۔

"اور میں واقعی میں ایک بھیڑیا ہوں۔ مجھے اس حال میں پہنچانے والے بھی آپ تھے اور میری اس شناخت کو مجھ پر آویزاں کرنے والے بھی آپ ہیں۔ تھینکس ٹو یو۔" وہ آخر میں پراسراریت سے مسکرایا تھا۔ جہانداد ملک سے کچھ بولا یا کہا نہیں گیا۔

"کیا ہوا بولتی بند کیوں ہو گئی آپ کی؟" انہوں نے غصے سے فون کو بھینچا۔

"تم پچھتاؤ گے ملک۔ مجھے برباد کیا تو رہے گا تمہارے پاس بھی کچھ نہیں۔" ملک دھیرے سے ہنس دیا۔

"میرے پاس آپ نے چھوڑا ہی کیا ہے۔؟" کرب، دکھ اور ملال۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ جلد ہی وہ خود پر قابو پا گیا۔

"مت بھولو کہ تمہارے پاس میری ایک قیمتی شے ہے۔" ان کا اشارہ انمول کی طرف تھا۔

"وہ شے نہیں انسان ہیں اور اب میری ہیں۔"

"اور اگر تم سے چھین لی جائے۔" جہانداد ملک کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔

"شیر کی کچھاڑ میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اپنا بندوبست کر لینا چاہیے۔" وہ انہیں وارن کر رہا تھا۔ اس کی بات پر وہ ہٹ دھرمی سے ہنسے۔

"تو پھر انتظار کرو پیارے۔ کیونکہ جو میں اب کروں گا اس سے تمہاری روح تک کانپ جائے گی۔" انہوں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اور ملک تعوذ پڑھ کر رہ گیا۔ شیطان سے چھٹکارا کا وہ واحد حل تھا۔(

"جہاندادملک مجھے توڑنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔اور اسی لیے انہوں نے انمول کو اغواء کیا ہے۔ان کا اصل مقصد مجھ تک پہنچنا ہے۔وہ مجھے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔کیونکہ اس انتقام کے چکر میں میری یا میرے دشمنوں کی موت اٹل حقیقت ہے۔"بالاج کا دل دھڑکا۔وہ کتنے مزے سے اپنی موت کا نام لے رہا تھا۔

"اس لیے وہ کسی ایسی جگہ کا انتخاب کریں گے جہاں جانے کے لیے بھی مجھے کم از کم دن لگ جائیں۔تم فکر نہیں کرو۔میری تلاش جاری ہے۔ضروری نہیں کہ ہمیشہ کی طرح ماہیر سکندر ہی ہر شے کا سراغ لگائے کچھ چیزیں دوسروں کے لیے بھی چھوڑ دینی چاہئیں۔"بالاج کو اب کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔وہ خاموشی سے سنے گیا۔

"اس نے سب سے پہلے تمہارے گارڈز کو ٹھکانے لگایا اور پھر رات حویلی میں گھس کر جیا سکندر کو اغواء کیا۔انمول اور جیا دونوں ساتھ ہیں۔اور جب انسان ایک سے دو اور میں سے ہم ہو جائے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔"اب وہ بالاج کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"ان کا اغواء کار جہاندادملک ہی ہے۔اور جانتے ہو میں اتنا آرام سے کیوں بیٹھا ہوں۔؟"بالاج کا سر نفی میں ہلتا گیا۔یہ تو وہ واقعی نہیں جانتا تھا۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے وہ خود مجھے کال کرے گا۔"بالاج کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

"اور تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے؟"ماہیر نے سر نفی میں ہلایا۔

"اغواء کرنے کے بعد اغواء کار سب سے پہلے ایک کام کرتے ہیں۔"وہ بولا۔

"اغواء کار سب سے پہلے وکٹم کے وارث کو کال کرتا ہے اور اپنا مطالبہ سامنے رکھتا ہے۔"بالاج کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بالکل۔اس لیے دیکھتے جاؤ۔وہ مجھے کال کرے گا اور پھر اپنا مطالبہ رکھے گا۔"ماہیر پر سکون ہو گیا۔بالاج سکندر کے کندھوں سے بھی یک دم منوں بوجھ ہٹ گیا۔

"تو پھر تم اس سب کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔؟"بالاج نے اس سارے بکھیرے کی طرف اشارہ کیا جو وہ رات سے پھیلائے بیٹھے تھے۔

"میں ایک کام میں بہت اچھا ہوں بالاج۔"اس کے لبوں پر ترچھی مسکان تھی۔

"میں ایک اچھا مخبر ہوں۔"وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں سمجھا نہیں۔؟"وہ واقعی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کس کی مخبری کر رہا ہے؟

"اب میں تمہیں سمجھانے پر اپنا وقت ضائع کروں گا؟"بالاج سلگ کر رہ گیا۔

"ماہیر۔"اس کی آواز میں تنبیہہ تھی۔ماہیر نے ہاتھ سے اسے دھیرج رہنے کا اشارہ کیا۔

"کچھ باتیں بتائی نہیں جاتیں بلکہ وقت کے ساتھ خود ہی عیاں ہو جاتی ہیں۔"اس نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔بالاج سر کھجا کر رہ گیا۔اسے ماہیر سکندر پر پورا یقین تھا۔اس نے کہا تھا کہ وہ ان دونوں کو ڈھونڈ لے گا تو وہ ڈھونڈ ہی لے گا۔لیکن بالاج سکندر بھی یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

آسمان پر سیاہی کی چادر بچھ چکی تھی۔ستاروں کا تھال سیاہ آسمان پر مقیش کی طرح انڈیلا گیا تھا۔فسوں خیز ماحول سے دور اس کے کمرے میں جھانکو تو ایک وجود بستر میں دبکا سویا ہوا تھا۔دفعتاً تیز ہوا کے دوش پر کھڑکی پر لگے سفید پردے پھڑپھڑائے۔بستر میں لیٹے وجود کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر چھانے لگا۔اور پھر وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔

سیاہ لمبے بال چہرے اور کندھوں پر گرے تھے۔چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔پورے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

سامنے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے۔اسے یاد تھا وہ دروازہ اور کھڑکی بند کر کے سوئی تھی۔خوف نے ایک دم اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔اس کے لب کپکپائے۔

"کک۔کون ہے؟"وہ دھیمی آواز میں بولی۔لیکن کوئی آواز نہیں آئی تھی۔کمرے کی تاریکی میں یکلخت اسے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔وہ سانس روک گئی۔اسے لگا جیسے دائیں جانب کوئی کھڑا ہے۔دھیرے سے گردن گھمائی۔

"آآآ۔"اگلے ہی پل اس کی فلک شگاف چیخ کمرے کی ساکن فضا میں گونج گئی۔اسکے دائیں جانب ایک ہیولہ سا کھڑا تھا۔اسے لگا وہ لمحہ سب سے اذیت ناک تھا۔کچھ چھن جانے کا خوف دل کو اپنی لپیٹ میں لے گیا اور اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی۔کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی جو کچھ اونچائی پر موجود سوراخ سے اور دروازے کی دریچوں سے اندر داخل ہوتی تھی۔اس کا ذہن اس سب سے مانوس ہونے لگا۔

"یا اللہ۔"وہ چند سیکنڈ کے لیے نیند میں گئی تھی اور وہی حقیقت اب خواب بن کر نیند تباہ کرنے آ گئی تھی۔وہ بے ساختہ رونے لگی۔

"جیا کیا ہوا تمہیں۔؟"اس کے ساتھ بیٹھی انمول نے اس کا رونا محسوس کر لیا تھا۔

"ان۔انمول بالاج کو بلا دیں پلیز۔مجھے ان کے پاس جانا ہے۔جیا ان کے بغیر اکیلی ہے۔"وہ ہیجانی کیفیت میں رو رہی تھی۔روتے روتے ہچکی بندھتی اور وہ پھر سے رونے لگتی۔انمول نے آنکھوں میں آئی نمی کو پرے دھکیلا۔پھر اس کے بال سہلائے۔

"شش میری جان۔ تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں ناں تمہارے ساتھ اور تو سب سے بڑھ کر تمہارا بے بی ہے تمہارے ساتھ، اس لیے پلیز پریشان مت ہو۔ تمہاری طبیعت بگڑ سکتی ہے۔" اس نے اپنے کندھے سے لگ کر روتی جیا کو دلاسہ دیا۔ لیکن وہ رونے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھی۔

"وہ کب آئیں گے؟" پُر امید نظریں انمول پر جما کر جیا نے سوال کیا تھا۔ مگر انمول کے لبوں پر لگا قفل نہیں ٹوٹا۔ یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کب آئیں گے۔ وہ اسے کیا تسلی دیتی؟ کیونکہ وہ بھی تو اسکی طرح منتظر تھی۔

"تم دعا کرو.... رات ڈھل گئی ہے۔ وہ جلد ہی آجائیں گے۔" لب کچلتے وہ امید کی، دھاگے جیسی نازک ڈور کا سرا جیا کے ہاتھ تھما گئی۔

"تم بہت ہمت والی ہو۔" جیا نے سراہا۔ نا جانے کیسے اسکی زبان سے یہ لفظ انمول کے لیے ادا ہوئے تھے۔

"میں کمزور کیوں بنوں جیا، جس کے پاس ملک جیسا شوہر ہو وہ خوف کیوں کھائے؟" وہ آنکھوں میں الگ تاثر لیے ہوئے کہہ رہی تھی ۔ آواز گھمبیر اور بلند تھی۔

"تمہارے پاس ماہیر جیسا بھائی ہے، ہمت والی تو تم بھی ہو۔" انمول کے الفاظ کانوں میں ہی نہیں دل میں بھی اتر گئے تھے۔ ماہیر کو اچھی ہمسفر ملی تھی، باہمت اور باوقار۔ جیا نے سوچا۔ اور محبت بھری ایک نگاہ انمول پر جمائی۔

"وہ میں۔۔۔" اس سے قبل کہ جیا کچھ کہتی، کھٹاک سے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جیا خود میں سمٹی۔ خوف کی الگ داستان اسکے چہرے پر رقم تھی۔ انمول کے تاثرات سپاٹ رہے۔ وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔

اس نے آدمی اور اندر آتے اور کھانے کی پلیٹ رکھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ البتہ ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

دروازہ پھر سے بند ہوا۔

"کھانا کھالو جیا۔" انمول اسکی جانب متوجہ تھی۔

"انمول.... بالاج" جیا کے آنسو بہنے لگے، بالاج سے دوری کا غم اسے توڑ رہا تھا۔

"رونا نہیں ہے... تم اکیلی نہیں ہو ننھی جان تمہارے ساتھ ہے۔ وہ نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

"مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔"

"کھانا تو پڑے گا۔" یہ تحکم تھا۔

جیا نے پلیٹ سامنے کر کے نوالا توڑا۔ انمول کے لبوں پر تبسم ابھرا۔ وہ جیا کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اپنی بھوک تو مر چکی تھی۔

سورج کی تیز روشنی اس آہنی گیٹ کو سلگا رہی تھی۔اس کے پار موجود عالیشان حویلی بھی اس تپتی دوپہر میں چمک رہی تھی۔ایسے میں ایک گاڑی دروازے کے قریب آرکی۔ٹائر چڑچڑاگئے۔پھر وہ باہر نکلا۔سر اٹھا کر اس حویلی کو دیکھا جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔

زندگی میں بعض اوقات کچھ چھوڑ دینا لاحاصل کی راہ آسان کر دیتا ہے۔

وہ گیٹ کے قریب آیا۔سیاہ پولو شرٹ کے ساتھ سیاہ ہی پینٹ پہن رکھی تھی۔آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔بیل بجائی تو اگلے ہی پل دروازے میں لگی چھوٹی کھڑکی سے چوکیدار نے باہر جھانکا۔ملک کو دیکھ کر وہ چونکا پھر جلدی سے دروازہ کھولتا باہر نکل آیا۔

"سلام صاحب۔خیریت؟"اس نے ہکلاتے ہوئے آنے کی وجہ پوچھی۔

"جہانداد ملک گھر پر ہے؟"دوٹوک لہجہ۔گارڈ کا سر نفی میں ہلتے ہلتے اثبات میں ہلا تھا۔

"جی جی۔وہ اندر ہی ہیں۔آرام فرما رہے ہیں۔خیریت تھی؟"ملک نے اس کے سوال پر اسے گھورا۔

"اسے بتا دینا کہ ملک آیا تھا۔اور یہ بھی کہ وہ بہت بھوکا ہے۔"دو جملے پیام لکھوایا اور واپس مڑا۔گارڈ فوراً اندر چلا گیا تھا۔اس نے مڑ کر اوپر عالیشان گھر کو دیکھا۔جہانداد ملک کے کمرے کی کھڑکی واضح تھی۔پردے گرے ہوئے تھے۔اندر اندھیرا چھایا ہوا لگتا تھا۔عام انسان ہوتا تو سمجھ جاتا کہ وہ سو رہے ہیں لیکن وہ ماہیر سکندر تھا۔

وہ جہانداد ملک کی رگ رگ سے واقف تھا۔وہ جب بھی کمرے میں ہوتے تو پردے ہٹائے رکھتے تھے تو پھر آج ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ یوں ہی سو جاتے۔

ملک کے چہرے پر استہزایہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔جہانداد ملک اسے نہیں جانتے تھے۔وہ یہ بات جانتا تھا۔

یہ منظر کنٹرول روم کا تھا۔کمرے میں محض بالاج سکندر اور دوسرا لڑکا تھے۔

"کیا تم وہاج ملک کو جانتے ہو۔؟"وہ میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"جہانداد ملک کا بیٹا؟"عینک والے لڑکے نے تصدیق چاہی۔بالاج نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی جانتا ہوں اسے۔"اس نے اپنا رخ بالاج کی جانب موڑ لیا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے۔کچھ ضروری کام ہے۔کہاں ملے گا وہ؟"بالاج اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا۔اور قدم دروازے کی جانب بڑھا دیے۔

"وہ پچھلے ہفتے ہی امریکہ جا چکا ہے۔" بالاج کے قدموں تلے سے زمین سرکی۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ بدوقت وہ پلٹا۔

"کیسے؟ میرا مطلب یوں اچانک۔" ایک آخری امید تھی اسکی کہ شاید وہاج ملک تک پہنچ کر وہ جیا کا سراغ لگا پائے۔ وہ بھی اب کہ دم توڑنے لگی تھی۔ وہ بند دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"انہوں نے شادی کر لی تھی ناں آپ کی کزن سے۔ اور پھر اس کے بعد وہ دونوں باہر چلے گئے۔" وہ کمال اطمینان سے بول رہا تھا۔ بالاج کے سر کے عین اوپر کسی نے بم پھوڑا تھا۔

"میری کزن سے؟"

"جی عالیہ جعفری سے۔"

"اوہ خدایا۔" اس نے بے اختیار پیشانی سہلائی۔ عالیہ نے شادی کر لی اس بات کا تو اسے علم تھا لیکن وہ وہاج ملک سے شادی کر چکی ہے یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ بالاج کے جبڑے تن گئے۔ وہ لڑکا اس کے خاندان کی دو عورتوں کو ڈوج دے چکا تھا۔

"کانٹیکٹ نمبر مل سکتا ہے اسکا۔؟" اس نے اپنے دائیں سمت دیوار پر نگاہ اٹھائی۔ وہاں جہاندادِ ملک کی تصویر کے ساتھ قدرے اوپر کر کے وہاج ملک کی تصویر تھی۔ سرخ کراس کا نشان اس پر بھی چھپ چکا تھا۔

"سوری سر۔ لیکن ملک سر نے مجھے منع کیا تھا۔"

"جتنا کہا ہے اتنا کرو۔" بالاج نے گردن موڑے جن نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ حلق تر کرتا سر اثبات میں ہلا گیا۔ بالاج نے موبائل نکالا۔

"شاباش۔" نمبر نوٹ کرنے کے بعد وہ باہر نکل آیا تھا۔

وہ تیز قدموں سے ٹریننگ سینٹر سے باہر نکلا تھا۔ موبائل ہاتھ میں تھامے وہ چہرے پر جھنجھلائے تاثرات لیے کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ تین چار بیل جاتیں اور پھر خاموشی۔

"ساری مصیبتیں ایک ساتھ ہی آنا ہوتی ہیں۔" وہ سخت تپ چکا تھا۔

"ایکسکیوزمی؟" اس نے سر اٹھایا تو سامنے اس کی ہی عمر کا بندہ کھڑا تھا۔

"جی۔؟" بالاج کے چہرے پر ناسمجھی چھا گئی۔

"آپ نے ملک سر کو دیکھا ہے کہیں؟" عبید باجوہ نے استفسار کیا۔

"میں اس کی جاسوسی کرتا ہوں کیا؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"وہ آپ کے ساتھ تھے۔ نہیں؟"عبید نے ضبط سے دوبارہ پوچھا۔

"اب نہیں ہے۔"رنگ ہوتے موبائل کو دیکھ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

"انہیں کیا ہوا۔؟ عجیب انسان ہیں۔"عبید نے سر جھٹکا۔

"السلام علیکم۔جی ماما۔"بالاج نے اپنی گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"کہاں ہو تم بالاج؟ کل سے گھر نہیں آئے خیریت تھی بیٹے؟"دوسری جانب ثانیہ بیگم کی آواز تھی۔بالاج ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"جی ماما۔ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر آیا تھا۔"وہ جھوٹ بول رہا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ماں باپ پریشان ہوں۔وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول اندر بیٹھ چکا تھا۔

"اچھا بتا کر تو جا سکتے تھے ناں؟ اور جیا کہاں ہے وہ کال نہیں اٹھا رہی؟"انہوں نے سوال در سوال کیا۔

"وہ ماہیر کے ساتھ ہے۔ مصروف ہو گی ناں اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ اس لیے نہیں اٹھا رہی ہو گی کال۔"وہ آنکھیں میچ گیا۔

"اچھا۔"مایوسی بھری آواز۔

"آپ اب اسے کال مت کیجیے گا۔خواہ مخواہ وہ پریشان ہو گی۔"وہ انہیں باز رکھ رہا تھا۔اگر انہیں پتا چلتا کہ جیا اغواء ہو چکی ہے تو ان پر کیا گزرتی وہ ابھے سے جانتا تھا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔اب ماں کو مت سیکھا۔جلدی سے کام ختم کر اپنے اور واپس آ۔میں اپنی بہو کو واپس لانا چاہتی ہوں۔"وہ مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔بالاج سکندر کی آنکھوں میں ویرانی اتر آئی۔وہ بدلی سے کال کاٹ گیا۔

"کہاں ہو تم جیا سکندر۔؟ تمہارے بغیر تو یہ زندگی بے رنگ ہے۔"سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے وہ آنکھیں موندے بولا تھا۔پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آیا۔

"وہاج ملک۔"وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ابھی اسے بہت سی جگہوں پر جیا کو تلاش کرنا تھا۔

"میں بہت جلد تمہیں ڈھونڈ لوں گا جیا۔"اس کے تصور سے ہی بالاج کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی۔

ہاسٹل میں موجود فریال ساجد اور بسمہ شارق کے کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔فریال بیڈ کی پائنتی کی جانب بیٹھی دلھ اور ملال سے بسمہ شارق کو دیکھ رہی تھی۔

"حیرت ہوتی ہے مجھے ایسے باپ پر جو اپنی ہی بیٹی کی جان کا دشمن بن بیٹھا ہو۔" سفید ڈھیلی سی شرٹ پہنے وہ بیڈ پر فریال کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔" بسمہ نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں فریال۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کوئی بھی شخص دوسرے کا درد نہیں سمجھ سکتا۔" اس نے سر گھٹنے پر ٹکا دیا۔ آنکھیں رو رو کر حشر برپا کر رہی تھیں۔

"بسمہ تم پلیز بھول جاؤ انہیں۔ تمہارے سامنے ایک نئی زندگی ہے جسے شروع کرنے کے لیے تمہیں محض مومن ابراہیم کا ساتھ چاہیے۔" فریال نے اس کا ہاتھ تھامے اسے سمجھایا تھا۔

"میں جانتی ہوں فریال لیکن پھر بھی دل میں ایک دھڑکا سا ہے کہ اگر اس نے انکار کر دیا۔ اگر جو اس نے کہا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔؟" آنکھوں میں آنسو پھر سے جمع ہونے لگے تھے۔

"اوہ فو بسمہ، تم بھی کچھ بھی سوچتی رہا کرو۔ تم دیکھنا سب اچھا ہو جائے گا۔" آوازیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کمرے سے نکل کر باہر ٹریننگ سینٹر کی جانب آؤ تو وہاں چند اسٹوڈینٹس ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

ایسے میں مومن ابراہیم سفید شرٹ پر بلو جینز پہنے سینٹر میں داخل ہوا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اندر کی جانب بڑھتا اسے ٹریننگ ڈپارٹمنٹ کے دروازے پر ہی عبید باجوہ مل گیا۔

"السلام علیکم سر۔ کیسے ہیں آپ۔؟" وہ خوش اخلاقی سے پوچھ رہا تھا۔

"الحمد اللہ۔ آپ کو کوئی کام تھا؟" عینک اتار کر گلے میں اٹکالی۔

"آپ سے نہیں ملک سر سے کچھ بات کرنا تھی۔ صبح وہ یہیں تھے لیکن اب نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ملیں گے۔؟" وہ ابھی تک ملک کو ڈھونڈ رہا تھا۔

"میری تو ان سے بات نہیں ہوئی۔ (لب کاٹے) میں پتا کروا دیتا ہوں۔" عبید سر ہلاتا آگے بڑھ گیا۔ مومن نے اس کو جاتے دیکھا پھر موبائل نکالے ملک کا نمبر ملایا۔ نظریں گرلز ہاسٹل تک اٹھتی گئیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی؟

"کال کیوں نہیں اٹھا رہے آپ بھائی۔؟" اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ چند ایک دوبارہ کالز کے بعد بھی جب جواب موصول نہ ہوا تو اس نے موبائل میں موجود فائنڈ مائی ڈیوائس، ایپ کھولی تھی۔ جس کے مطابق ملک کی لوکیشن اس کا اپارٹمنٹ بتائی جا رہی تھی۔ وہ پر سکون ہو گیا۔

وہ خود ہی مومن ابراہیم سے رابطہ کر لیں گے۔ یہ طے تھا۔

دفعتاً اس کا موبائل رنگ ہوا۔ نمبر اگرچہ انجان تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ پہچان نہ پاتا۔

"السلام علیکم مسٹر شارق کبیر۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"والسلام۔ سنا ہے تم نے میرے سیکرٹری کو آنے سے انکار کر دیا تھا تو سوچا کیوں نا خود ہی تمہیں یہ دعوت دی جائے۔؟" مومن نے چلتے ہوئے ابرو اچکائے۔

"انکار نہیں کیا تھا، وہ کیا ہے نا کہ میں باس کے سیکرٹریز سے بات نہیں کرتا۔ اور نہ ہی ان کے ایک دفعہ بلانے پر بھاگا چلا آتا ہوں۔ 'تو سوچا کیوں نا آپ کو یہ زحمت دی جائے'۔" آخری جملہ شارق کبیر کے انداز میں کہا گیا تھا۔ وہ ٹریننگ سینٹر کے اندر پہنچ چکا تھا۔

"بات بہت اعلیٰ تھی لیکن میں متاثر نہیں ہوا۔ خیر کل شام پانچ بجے میں اپنے آفس میں تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھے امید ہے تم ضرور آؤ گے۔" وہ اس کے لہجے پر سلگ اٹھے تھے۔

"جی ضرور آؤں گا اگر آپ میری مہمان نوازی کے لیے کچھ اچھا کریں گے تو۔" اس نے آنکھیں ٹپٹپائیں۔

"شارق کبیر کی دشمنی اپنی جگہ لیکن وہ مہمان نوازی بہت اچھے سے نبھاتا ہے۔ کل ملتے ہیں۔" وہ فون بند کر گئے۔ مومن نے موبائل کان سے ہٹا کر اسے گھوری سے نوازا۔ پھر آگے چل دیا۔

شام کے سائے ہر سُو پھیلنے لگے تھے۔ آسمان کی نیلگوں روشنی کو رات کی تاریکی آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ وہ ٹریننگ سینٹر کی چھت پر کھڑا تھا۔ سفید ڈریس شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس وہ تھکا ہارا معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر مایوسی کنندہ تھی اور آنکھیں دور فلک پر جیسے کسی کھوئی ہوئی شے کی متلاشی نظر آتی تھیں۔ چند لمحات قبل ہی وہ اپنے سیکرٹری سے بات کر کے فارغ ہوا تھا۔ اس کے مطابق بتائی جانے والی انفارمیشن سے جیا سکندر کا سراغ لگانا ناممکن سا لگتا تھا۔

"یا اللہ!" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ آج دوسرا دن ڈھلنے کو تھا۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈے، کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں اس نے پتا نہ کیا ہو۔ اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ دل پر گڑھوں بوجھ گرا معلوم ہوتا ایک جیا سکندر نہیں تھی تو زندگی ویران سی لگتی تھی۔

پولیس کے پاس وہ کسی صورت نہیں جا سکتا تھا۔ شہر کا مشہور و معروف بزنس ٹائیکون پولیس والوں کے سامنے اپنی عزت کی دھجیاں نہیں بکھیر سکتا تھا۔ ماہیر سکندر کو بھی اس نے صاف منع کر دیا تھا۔

گریبان کے اوپری دو بٹن کھول رکھے تھے۔ سیاہ فلک کی سیاہی آہستہ آہستہ اس کے اندر بھر رہی تھی۔ دفعتاً جیب میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔ وہ چونک گیا۔ تیزی سے ہاتھ بڑھاتے موبائل نکالا۔ موبائل کی سکرین پر جگمگاتا نام دیکھ اس کا دل ایک دم خوش ہوا تھا۔ امید کی کرن نے جیسے دروازے پر دستک دی تھی۔

"ہیلو۔" اس کی آواز میں بے چینی تھی اور بے قراری بھی۔

"کون؟" دوسری جانب پہچاننے کی سعی کی گئی تھی۔

"میں بالاج سکندر بات کر رہا ہوں۔" دوسری جانب موجود شخص سناٹوں کی زد میں آیا تھا۔

"کیسے ہو بالاج سکندر؟" مقابل اسے پہچان چکا تھا۔

"ایک ضروری کام آن پڑا ہے تم سے۔" حال احوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

"مجھ ناچیز سے کیا کام پڑ گیا مسٹر۔" بالاج نے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔ کیا یہ ستم نہ تھا کہ وہ آج اپنی محبت کے لیے کسی سے بھیک مانگنے جا رہا تھا؟ کیا بالاج سکندر کی انا ٹوٹ چکی تھی؟ کیا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا؟

"یوں سمجھ لو جیسے مجبوری میں گدھے کو باپ بنانا پڑ رہا ہے۔" دوسری جانب مردانہ قہقہہ ابھرا۔

"حکم کرو بالاج سکندر۔" طنز نہیں تھا، نہ ہی احسان۔ بلکہ احساسات مختلف تھے۔

"مجھے تمہارے باپ کے معاملے میں کچھ خفیہ معلومات چاہییں۔"

"تمہارا مطلب جہانداد ملک کے بارے میں؟" بالاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا کچھ نہیں۔ دوسری جانب خاموشی کا مطلب 'ہاں' اخذ کیا گیا تھا۔

"فاریور کائنڈ انفارمیشن، میرا نام نہاد باپ مجھے اتنا اہم نہیں رکھتا تھا کہ اپنی خفیہ معلومات میرے سامنے کھولے رکھتا۔ وہ انسان نہیں شیطان ہے۔ اور اس کے راز اس تک محدود ہیں نہ کوئی دوسرا نہ تیسرا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ مدعے پر آیا تھا۔ بالاج سکندر کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ بیٹے ہو تم ان کے، ان کے جانشین۔ تمہیں تو ان کے ہر عمل کی خبر ہونی چاہیے تھی۔" وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ ماتھے پر پسینہ چمک اٹھا تھا اور فلک پر سیاہی کا تھال بچھ چکا تھا۔

"میں اس شخص کا جانشین نہیں ہوں جس کا ہر قدم ہی گناہوں کا گرویدہ ہے۔ اس فرعون نے مجھے اپنے آنگن میں موسیٰ کی طرح پالا تھا۔ مومن ابراہیم سمجھ کر۔" بالاج کے لب سکڑے۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کیا ہوا ہے؟ پریشان کیوں ہو؟"

"جہانداد ملک نے جیا سکندر کو اغواء کیا ہے وہاج ملک۔ اور یہ خیال ہی سوہان روح ہے کہ وہ مجھ سے دور، اس شیطان کے قبضے میں ہے۔" وہ بولا تو جیسے دوسری طرف موجود وہاج ملک کی زبان گنگ ہو گئی۔

"کیا؟ لیکن ایسے کیسے؟ میرا مطلب تم کہاں تھے؟ کیا تم اپنی بیوی کی حفاظت نہیں کر پائے۔؟" الفاظ بالاج سکندر کا دل چھلنی کر گئے تھے۔ وہ واقعی اپنی عورت کی حفاظت نہیں کر پایا تھا۔ وہ مرد تھا اور اسے اس کی عورت سے ہی آزمایا جا رہا تھا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی تھی جس کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

"اور میں تمہاری مدد کیونکر کرنے لگا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جیا سکندر کون ہے اور تم کون ہو۔" اس کا سرد لہجہ بالاج سے امید کی ڈور چھیننے لگا تھا۔

"تم میری مدد کرو گے وہاج ملک۔ کسی بھی قیمت پر تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔ یہ بالاج سکندر کی نہیں ایک شوہر اور ایک باپ کی التجاء سمجھ لو۔"

"چچ۔ محبت بھی نکما کر دیتی ہے انسان کو۔"

"اب تو کر دیا نا۔ مجھے بتاؤ کیا تم جیا سکندر کو ڈھونڈنے کا سراغ بتا سکتے ہو۔ پلیز کیا تم سارا غصہ اور دشمنی ایک طرف رکھ کر ہمارے بارے میں سوچ سکتے ہو۔؟" چند لمحات خاموشی چھائی رہی۔ پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

بالاج سکندر کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔ امید کی ڈور وہاج ملک نے بہت بے دردی سے کھینچی تھی کہ وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ اور پھر امیدیں تو وابستہ ہی ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس نے زمین پر پیر کی ٹھوکر لگائی۔ مایوسی اور ناامیدی اسے خاک میں ملا رہی تھیں۔

اس نے جیا سکندر کو ستایا تھا اور جب بدلے میں خود ستایا گیا تو جان پر بن آئی۔ کیوں؟

دوسری جانب موجود وہاج ملک شکست خوردہ سا موبائل ہاتھ میں تھامے بیٹھا تھا۔ تبھی کوئی وجود اس کے برابر میں صوفے پر آ بیٹھا۔ اس نے نظریں اٹھائے اپنے پہلو میں براجمان عالیہ جعفری کو دیکھا، پھر وہ نظریں جھکا گیا۔

"کیا ہوا ہے بالاج کو؟" اس کا لہجہ عام سا تھا۔ سفید لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس عالیہ جعفری وہاج ملک سے ہمکلام تھی۔

"جیا سکندر کو جہانداد ملک نے اغواء کر لیا ہے اور۔" وہ رکا۔

"اور۔؟"

"اور بالاج سکندر مجھ سے مدد مانگ رہا تھا۔ کوئی سراغ جو اسے جیا سکندر تک پہنچا سکے۔" اس نے موبائل سامنے موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تو کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟" اس نے وہاج کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہاج نے سر ہلا دیا۔

"پھر بتایا کیوں نہیں؟" اس نے وہاج کو گھور کر دیکھا۔

"میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا اپنے اندر۔ نا جانے کون سا شر کا بیج ہے جس نے مجھے روک لیا۔ میں اسے نہیں بتا پایا عالیہ۔ میں اس کی تڑپ دیکھ کر بھی خاموش ہو گیا۔" عالیہ نے ترحم سے اسے دیکھا۔

"وہاج ایسا نہ کریں۔ اس تمام عرصے میں کیے گئے اپنے اچھے اعمال ایک برائی کی نظر مت کریں۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید بولتی موبائل پر میسج کی بیپ ہوئی تھی۔ عالیہ نے موبائل اٹھا کر وہاج کے سامنے کیا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

"مجھے وہاج ملک نہیں صرف وہاج چاہیے جو ان بھٹکی راہوں سے صراطِ مستقیم پر آ چکا ہے۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے اٹھ گئی۔ وہاج کی نظروں نے کمرے میں گم ہونے تک اس کا پیچھا کیا۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ تھا۔ جس میں صرف وہ اور عالیہ رہتے تھے۔

"مت بھولو وہاج ملک کہ میری بیوی کے ساتھ وہ لڑکی بھی شیطان کی قید میں ہے جسے تم آج تک بہن مانتے آئے ہو۔ تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ بالاج سکندر۔" سکرین پر نظر آتی تحریر پڑھتے وہاج ملک کو زور کا جھٹکا لگا تھا۔ آنکھیں یک دم کھل گئی تھیں۔ جہانداد ملک کے گناہ ایک طرف لیکن انمول ملک اس کی بہن تھی۔ سگی نہ سہی لیکن زندگی کے تئیس سال اس نے اسے بہن مانا تھا۔ وہ اس سے دو تین سال بڑی تھی، اس کے ہر عیبوں پر جہانداد ملک کے سامنے پردہ پوشی کرتی ہوئی، وہ اس کی بہن تھی۔ تو کیا آج وہ بے حس بن سکتا تھا۔

کنٹرول روم کی بتیاں روشن تھیں۔ عینک لگائے بیٹھا لڑکا مستندی سے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتا کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کے عقب میں بالاج اور ماہیر سکندر کھڑے تھے۔

"تم نے کہا تھا کہ جہانداد ملک تمہیں خود کال کرے گا لیکن آج تیسرا دن ہے۔" بالاج اس پر برس رہا تھا۔ ماہیر کے چہرے کے نقوش تنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں تھامی فائل کی ورق گردانی کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔

"تم کون سا چین سے بیٹھ رہے ہو؟ وہاج ملک سے بھی آخر کار رابطہ کر ہی لیا نا تم نے۔" ماہیر نے داں ت کچکچائے۔

"تو کیا کرتا تمہاری طرح خاموش بیٹھا رہتا۔؟"

"میں خاموش ہوں تو یہ جان لو کہ میری خاموشی کسی بڑے طوفان کو لانے والی ہے۔" اس نے لڑکے کو دیکھا۔ پھر فائل واپس رکھ دی۔ بالاج اسے گھور رہا تھا۔

"ماہیر سکندر انمول تمہاری بیوی ہے اس کا باپ اسے تو کچھ نہیں کہے گا لیکن اگر جیا کو ایک کھروچ بھی آئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اور دوسری بات یہ حسیب تمہارا چمچا اسے کیوں منع کیا ہے تم نے مجھے کچھ بتانے سے۔ قسم لے لو بہت پٹے گا یہ مجھ سے۔ (وہ شدید تلملایا تھا۔) میں ہر ممکن جگہ اسے ڈھونڈ چکا ہوں لیکن کوئی سراغ نہیں۔" اس نے غصے سے پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر ماری۔

"کیا تمہیں مجھ سے زیادہ فکر ہے جیا کی؟ اسی لیے۔ اس دن کے لیے میں تم لوگوں میں نہیں آتا تھا کہ جہانداد ملک میرے رشتوں کو میری کمزوری بنا دے گا۔ اور دیکھو وہ ایسا کر رہا ہے۔" ماہیر نے ہاتھ جھٹکے۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بالاج نرم پڑا۔

"وہ دونوں دو دن پہلے اغواء ہوئی ہیں۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جہانداد ملک کوئی عام بندہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے باہر کے ممالک تک کے روابط ہیں جن کو توڑنا آسان نہیں۔ اس جیسے سیاہ شخص کو قانون کے حوالے کرنے یا سزا دینے کے لیے پہلے اس کا پھیلا یا رائتہ سمیٹنا ہو گا۔ تب ہی جا کر کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا نا تم مجھ پر چھوڑ دو۔" ماہیر نے صلح جو انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔ بالاج کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"ابھی تک کچھ ہوتا نظر تو نہیں آ رہا۔" وہ ناچاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا تھا۔ ماہیر دانت بھینچتے کچھ کہنے لگا۔

"سر۔ اٹس ڈن۔" وہ لڑکا بولا تھا۔ ماہیر خاموشی سے اس کے پاس چلا گیا۔ بالاج بھی اس کے کندھے کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

"ویری ویل ڈن حسیب۔ (پھر بالاج کو متوجہ کیا) یہ دیکھو۔ یہ یہاں ان تمام **Luxuries** اور بلیک منی کی ڈیٹیلز ہیں جو آج تک جہانداد ملک کی حراست میں رہی ہیں۔ اور یہاں (انگلی سے تیسرے نمبر کی اسکرین کی طرف اشارہ کیا) یہاں تمام ان جگہوں کی معلومات ہیں جن پر جہانداد ملک کا قبضہ ہے۔ اسی طرح ان کے سیاہ کرتوتوں کی رپورٹس بھی میرے پاس موجود ہیں۔ آج تک اس نے جتنے بھی قتل کیے اور کروائے ہیں ان تمام کیسز کی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ یہ سب میرے ایک سینڈ کے بٹن دبانے کی دوری پر ہے۔ اور جانتے ہو اس سے کیا ہو گا۔؟" وہ خاموش ہو گیا۔ بالاج نے گہری سانس بھری۔

اس نے تو آج تک کسی سے دشمنی نہیں پالی تھی جو اسے کچھ معلوم ہوتا۔ اس جیسا انٹرورٹ بندہ کسی سے کیا ہی دشمنیاں پالتا پھرتا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" تجسس کے ساتھ مستفسر ہوا۔

"جہانداد ملک کا نام پلک جھپکتے ہی ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرا ایک غلط قدم جیا اور انمول کی جان لے سکتا ہے۔" بالاج سکندر کا سانس رک گیا۔ جیا کے نام پر ہر دھڑکن ساکت ہوئی تھی۔

"اور تم یہ سب سینڈ کیسے کرو گے۔؟" وہ وہیں کھڑا تھا۔ حسیب اب کچھ احتیاط سے کام کر رہا تھا۔

"اسے جسے اسکا سب سے زیادہ فائدہ ہو گا۔" ماہیر کا رخ اب لاکر کی جانب تھا۔

"کون۔؟" بالاج کے استفسار پر وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ لیکن موبائل کی رنگ ٹون نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ وہ جھٹکے سے پلٹا۔

"فائنلی داویٹ از اوور۔" اس نے آگے بڑھ کر میز پر رکھا موبائل تھاما۔ اور بالاج سکندر کی جانب کیا۔ موبائل کی اسکرین پر جہانداد ملک کالنگ لکھا آرہا تھا۔ بالاج کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

ماہیر بھی اپنی مسکراہٹ دباتا اب کال اٹھا رہا تھا۔ عینک لگائے بیٹھے لڑکے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اب اپنی کرسی کا رخ پلٹا کر ان دونوں کی جانب کر لیا تھا۔

"اہم اہم۔ میں نے اس کال کا بہت شدت سے انتظار کیا ہے سسر جی۔" وہ تصویروں سے بھری دیوار کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ موبائل کان سے لگائے۔ بالاج کو اس کی پشت نظر آتی تھی۔

"میں نے بھی اس دن کا بہت انتظار کیا ہے ماہیر سکندر۔" ان کی آواز پر ماہیر کی نظریں جہانداد ملک کی تصویر پر گڑھ چکی تھیں۔

"پھر کیا خیال ہے۔ کیا کیا جائے۔؟" وہ جیسے ان کی تصویر سے ہمکلام تھا۔

"خود کو میرے حوالے کر دو۔" اسپاٹ سی آواز ابھری۔

"اتنی آسانی سے کیسے؟"

"ان دونوں عورتوں کو ختم کر دوں تو آؤ گے؟" ان کے طنز پر ایک تلخ مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا بسیرا کیا تھا۔

"اگر تو تمہیں لگتا ہے کہ ان دونوں کو ختم کر کے تم مجھ تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔ تو تم غلط ہو۔ کیونکہ وہ دونوں عورتیں میری زندگی کا حصہ ہیں میں ان کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں اور اگر تم نے انہیں ایک چوٹ بھی دی تو تمہاری جان لے بھی سکتا ہوں۔ اس شطرنج میں جو ہارے گا وہ صرف تم ہو گے جہانداد ملک۔ تمہارا اختتام بہت بھیانک ہو گا۔" ملک کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ انتقام اگر جنون تھا تو وہ اس کی ہر حد پار کر جانے والا تھا۔

"تم مجھے ہرا نہیں سکتے۔" جہانداد ملک کے پر عزم ارادے ملک کو مزید بھڑکا رہے تھے۔

"تو پھر ہو جائے آمنا سامنا۔؟" وہ جہانداد ملک کی تصویر کے بہت قریب کھڑا تھا۔

"آج کی شام سات بجے سے پہلے اگر تم یہاں پہنچ گئے تو ٹھیک ورنہ انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔" ملک نے سر کو خم دیا۔ پھر اپنا چہرہ تصویر کے بالکل قریب لے گیا۔

"لیکن تم چھپے کہاں بیٹھے ہو؟" ملک نے طنز کیا۔

"ایک جگہ ہے ایسی جسے تم بھی جانتے ہو۔ڈھونڈو اور بچالو ان دونوں کو۔"وہ بولے۔

"بدلے میں تمہیں کیا چاہیے ہو گا؟"

"تم اور تمہاری لاش۔"ملک سر جھٹکتا ہنس دیا۔ نظریں تصویر میں نظر آتی آنکھوں پر جمی تھیں۔

"آج شام سات بجے سے پہلے میں جہانداد ملک کا نام صفحۂ ہستی سے مٹادوں گا۔پھر میری لاش کا کیا کروگے۔؟"وہ پھنکار کر پیچھے ہٹا۔ جہانداد ملک کا قہقہہ گونجا تھا۔

"ویسے وہ تمہارا کزن کیا نام ہے اس کا بالاج سکندر۔بیچارہ کیسے دیوانہ ہوا پھرتا ہے ناں بیوی اور بچے کے غم میں۔چچ چچ۔مجھے ڈھونڈنے کے اتنے جتن کہ حد نہیں۔"وہ کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن وہ کھٹاک سے فون بند کر گیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔وہاں بالاج نہیں تھا۔

"بالاج کہاں گیا؟"

"انہیں کوئی ضروری فون آیا تھا سو وہ چلے گئے۔"لڑکے نے نہایت ادب سے کہا۔پھر ہاتھ میں پکڑی خاکی فائل ہلا کر ملک کو متوجہ کیا۔

"سر یہ فائل بھی اس سب میں شامل کروں یا نہیں۔؟"

"یہ کس چیز کی فائل ہے؟"ماہیر نے آنکھیں سکیڑ کر فائل کو دیکھا۔

"آپ دیکھ لیں۔"اس نے حسیب کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے فائل تھام لی۔

اندر مختلف کاغذات تھے۔کسی کی گمشدگی کی رپورٹ کی کاپی تھی تو وہیں کچھ میڈیکل رپورٹس تھیں۔ملک اسے واپس بند کرنے لگا جب ایک سطر پر نگاہ پڑی۔دماغ میں روشنی کا کوندا لپکا تھا۔

"یہ اس لڑکی کی ہی فائل ہے سر جسے جہانداد ملک نے اغواء کروایا تھا۔اور پھر۔۔۔"لیکن وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔ وہ ورق پر لکھی اس تحریر کو پڑھ رہا تھا۔اسے آس پاس بہار اترتی محسوس ہوئی تھی۔ہر شے جیسے دوبارہ سے کھلنے لگی تھی۔

"حسیب۔تیار رہو۔"

"کس لیے سر۔؟"وہ چونکا۔

"آج شام سات بجے تم سب کچھ سنبھالو گے۔ میں رہوں یا نہ رہوں تمہیں وہی کرنا ہے جس کا تمہیں میں نے حکم دیا ہے۔" اس نے حسیب کی جانب تائیدی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سر ہلا گیا۔ البتہ آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ وہ ایک عرصے سے ان کے ساتھ تھا۔ اگر جو ملک کو کچھ ہو جاتا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔؟

ملک باہر کی جانب بھاگا تھا۔

لاعلمی کے عذاب سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ لیکن کیا واقعی؟

وہ جہاندادِ ملک کو مات دینے والا تھا لیکن کیا انہیں شکست دینا اتنا آسان تھا۔؟

اور پھر کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ وہ اس کھیل میں بدلے کے متبادل کیا دینے والا تھا۔ اپنی جان یا اپنوں کی جان؟

دوپہر کا وقت تھا۔ اسلام آباد کی سڑکیں آج ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔ آسمان پر مزید کالی گھٹاؤں کا بسیرا تھا۔ بادل کسی بھی وقت برسنے کو تیار نظر آتے تھے۔ ایسے میں تم اسلام آباد کے ایک مشہور کیفے "Em en Cafe" کا رخ کرو تو اس کی پارکنگ میں بہت سی گاڑیوں کی آماجگاہ تھی۔ اسلام آباد کی ایک خصوصیت ہے کہ یہاں شور کم ہوتا ہے۔ ایسا ہی ماحول اس کیفے کا تھا۔

اِیم ان کیفے اسلام آباد میں پنک کیفے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی اینٹرنس سبز پتوں اور گلابی پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہاں سے اندر جھانکو تو کچھ حصہ آوٹ ڈور تھا اور باقی تمام ان ڈور۔ بائیں ہاتھ اندرونی دیوار کے ساتھ بھی چند کرسیاں اور میزیں لگی تھیں۔ داخل ہوتے ساتھ ہی سامنے گول میزیں چند قدم کے فاصلے سے سلیقے سے پڑی تھیں۔ گلابی میز کے ساتھ گلابی ہی کرسیاں۔ اوپر سفید چھاتا لگا ہوا تھا۔ عموماً دھوپ اور بارش سے بچاؤ کے لیے اسے کھول دیا جاتا تھا۔ مختلف لوگ وہاں بیٹھے موسم اور کھانے دونوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن وہ وہاں نہیں بیٹھی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ لگی میز میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ سفید پرنٹڈ کرتے کے ساتھ بلو جینز پہنے وہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ ہاتھ میں مینو کارڈ تھامے اس نے کلائی میں بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ تین بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"حد ہے بسمہ شارق اتنی جلدی آنے کا کیا فائدہ ہوا تمہیں؟ آنا تو اسے اپنے وقت پر ہے۔" وہ بڑبڑائی اور واپس نگاہ جھکالی۔ ساتھ میز پر اس کا گلابی کلچ اور موبائل رکھا ہوا تھا۔ اس سب کے ساتھ ہی وہاں ٹیشو باکس اور ایک سفید صراحی دار گلدان میں سرخ گلاب پڑا تھا۔

اب کی بار کسی احساس کے تحت مینو کارڈ سے نگاہ اٹھی تو واپس پلٹنا بھول گئی۔ وہ اینٹرنس میں کھڑا تھا۔ ہاں وہی جس کا وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ سفید شرٹ پہنے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر بسمہ شارق پر آکر ٹھہر گئی۔

'پلٹ جاؤ' دماغ نے ڈپٹا لیکن دل نے اس کا حکم مسترد کر دیا۔ وہ آگے بڑھا۔ دل میں ہوک اٹھی۔ کیا وہ صحیح تھا؟ کیا وہ صحیح کرنے جا رہا تھا۔؟ کیا وہ کسی دوسرے کو اپنے دل کی دنیا میں شریک کر سکتا تھا؟ اس کے پاس جواب نہیں تھے یا دینا نہیں چاہتا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مومن نے سلام عرض کیا۔ بسمہ نے جواب دیتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آئی ایم سوری۔" بسمہ کو حیرت ہوئی۔ وہ سوری کس بات پر کر رہا تھا۔

"انتظار کروانے کے لیے؟"

"نہیں۔ تھپڑ مارنے کے لیے۔" وہ ہنس دی۔ وہ کتنے دن پرانی بات کر رہا تھا۔

"جلدی نہیں یاد آ گیا تمہیں۔" مومن نے سر کھجایا۔ پھر کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

"کچھ آرڈر کیا؟" اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ویٹر۔" مومن نے قریب سے گزرتے ویٹر کو پکارا۔ وہ پلٹ کر ان کی جانب چلا آیا۔ سفید شرٹ پر گلابی پٹیوں والا یونیفارم پہنے وہ تمام پروانوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

"ہمم۔ تو شروع کریں۔" ویٹر کو آرڈر نوٹ کروانے کے بعد بسمہ نے گلا کھنکارا۔ مومن ابراہیم ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

"پوچھو آج میں تمہیں تمہارے تمام سوالوں کا جواب دوں گا۔"

"تمہارا کیا بھروسہ کہ تم سچ بولو گے یا جھوٹ؟"

"میرا کہا ہر لفظ سچ ہو گا۔ اتنا تو یقین کر سکتی ہو تم؟" بسمہ نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"میرے باپ نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور تم نے میری حفاظت کی۔ پہلی دفعہ تب جب ہم ملے تھے۔ دوسری مرتبہ ہسپتال کے باہر سڑک پر۔ اور تیسری دفعہ ہسپتال کے بند کمرے میں۔ تم نے مجھے شارق کبیر کے بچھائے ہوئے جال سے تین مرتبہ بچایا۔ کیوں؟" پہلا سوال پوچھا گیا۔

"شاید اس لیے کہ تم کچھ خاص ہو میرے لیے۔" مومن نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ بسمہ کا دل دھڑکا۔ عجیب سا احساس تھا جو ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

مومن ابراہیم اس احساس میں کھوتا کچھ عرصہ پیچھے چلا گیا تھا۔

کہتے ہیں محبوب سے پہلی اور آخری ملاقات ہمیشہ یادگار ہوتی ہے۔ان دونوں کی پہلی ملاقات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ملک کے کہنے پر اسے شارق کبیر کی معلومات اکٹھی کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔وہ ہر کسی اسٹاکر کی طرح ان کا پیچھا کرتا اور اپنا کام جاری رکھتا۔اس رات موسم شدید سرد تھا۔شارق کبیر کی گاڑی ایک کلب کے باہر کھڑی تھی۔وہ بھی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔کلب کا اندرونی ماحول ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے۔ڈانس فلور پر نشے میں دھت لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے میں مگن نظر آرہے تھے۔ایسے میں وہ تمام سے بے نیاز ایک جانب رکھے سیاہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔مومن ابراہیم ماسک لگائے ان سے دور کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا تھا۔یوں کہ وہ سامنے کے منظر کو صاف دیکھ سکے۔

ان کے ساتھ دو تین ان کی عمر کے آدمی تھے اور ایک جوان لڑکا تھا۔کرلی بالوں والا وہ لڑکا دیکھنے سے ہی بیچ معلوم ہوتا تھا۔لیکن وہاں صرف وہ چار نہیں تھے۔وہاں کوئی اور بھی تھا۔سرخ لباس میں ملبوس بھورے بالوں والی لڑکی۔اس کی پشت مومن کی جانب تھی۔کچھ دیر بعد شارق کبیر لڑکی کا شانا تھپتھپاتے دونوں آدمیوں کے ساتھ ادھر ادھر غائب ہوگئے۔وہ ان کے پیچھے جانے لگا تھا جب ٹھہر گیا۔کرلی بالوں والے لڑکے نے کچھ کہتے لڑکی کے گالوں کو چھونے کی کوشش کی تھی جب وہ بدک کر اس سے دور ہوئی۔اور اپنی خفت مٹانے کو ادھر ادھر دیکھا۔وہ ایک سیکنڈ کے لیے پلٹی تھی اور مومن ابراہیم کے لیے وہ لمحہ امر ہو گیا۔سرمئی آنکھیں گہری بھوری آنکھوں میں جذب ہوتی گئیں۔فقط ایک لمحے کے لیے اس کا دل بے ہنگم دھڑکا تھا۔وہ لڑکی خوبصورت نہیں ماہ جبیں تھی۔

"استغفرُللہ۔"اس نے خود کو ڈپٹا۔اور آگے کمروں کی جانب بڑھ گیا۔لیکن وہ تمام لاک تھے۔اور شارق کبیر بھی وہاں نہیں تھے۔وہ واپس فلور کے قریب آیا۔غیر ارادی نگاہ صوفوں کی جانب اٹھی تھی۔وہ وہاں نہیں تھی۔مومن ابراہیم کو شاک لگا۔

گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے سیڑھیاں چڑھتا وہ لڑکا دکھائی دیا۔اس کا خون کھول اٹھا۔وہ سرخ لباس والی لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔مومن ابراہیم سے رہا نہیں گیا۔وہ بیچ بچا کر ان کے پیچھے گیا۔لڑکے نے سیڑھیاں چڑھ کر اس لڑکی کو دائیں جانب موجود ایک کمرے میں دھکیلا تھا۔اس کی چیخ دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی دب گئی۔

ناجانے کون سی کشش تھی جو وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ہاتھوں کی نسیں غصے سے پھول رہی تھیں۔اس نے جا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ بند تھا۔اور ایسے عام لاک کھولنا مومن ابراہیم کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

چند ہی لمحات بعد وہ لاک کھولنے میں کامیاب ہوا۔ایک ہی جست میں دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔سامنے کا منظر اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔وہ لڑکی رو رہی تھی۔ایک جانب دیوار سے لگی وہ زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔جبکہ اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا خباثت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز فہد۔مجھے جانے دو۔"اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"نو بے بی۔"اس سے پہلے وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے اس کو چھوتا۔مومن ابراہیم کسی شیر کی طرح اس پر جھپٹا تھا۔

"یو باسٹرڈ۔"منہ سے غلیظ القابات بکتے وہ لڑکا نیچے فرش پر گرا۔مومن ابراہیم اس پر حاوی تھا۔

بسمہ شارق کا پورا وجود تھر تھرانے لگا۔

"تم جیسے بھوکے کتوں کو اسی چیز کی کمی ہوتی ہے۔"وہ پے در پے اس پر مکے برسا رہا تھا۔عام مکا ہوتا تو شاید اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتا لیکن وہ فسٹ رنگس پہنے ہوئے تھا۔ایک مکے پر ہی منہ سے خون کا فوارہ پھوٹا۔

"لیو ہم۔وہ مر جائے گا۔"اس کی ابتر حالت دیکھ بسمہ شارق آگے بڑھی تھی۔مومن نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔وہ سہم گئی۔

فہد کی اچھی سی درگت بنانے کے بعد وہ ہاتھ جھاڑتے اٹھا تھا۔اور ایک نظر بسمہ کے حلیے پر ڈالی۔وہ سرخ رنگ کی پیروں کو چھوتی، آستینوں سے بے نیاز فراک پہنے ہوئی تھی۔دروازہ کھلا ہونے کے باعث ٹھنڈ کمرے میں گھس رہی تھی۔اس کے لب بھی اب ہلکے سے کپکپا رہے تھے۔مومن نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی جانب بڑھائی۔

"پہنو اسے۔"وہ ماسک لگائے اور پی کیپ پہنے ہوئے تھا۔بسمہ شارق اس کی شکل نہیں دیکھ پائی۔محض آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔اس نے جیکٹ پہن لی۔

"چلو۔"مومن نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔وہ وہیں کھڑی رہی۔

"میں نے کہا چلو میرے ساتھ۔"اس نے بسمہ کا ہاتھ تھام لیا۔اور اپنے ساتھ لیے چلنے لگا۔

باہر پارکنگ میں آکر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔وہ ٹھنڈ کے باعث جیکٹ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی۔

مومن اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔اور پیسنجر سیٹ کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔وہ شش و پنج میں مبتلا کچھ دیر بعد گاڑی میں آ بیٹھی۔مومن نے گہری سانس بھری۔

"نام کیا ہے تمہارا۔؟"

"بسمہ شارق۔"مومن نے جھٹکے سے گردن موڑی۔

"اوہ تو تم شارق کبیر کی بیٹی ہو۔"بسمہ آنکھیں میچ گئی۔اس شخص کا حوالہ اسے اذیت دیتا تھا۔

"جانتی ہو یہ کیسی جگہ ہے۔؟"وہ سنجیدہ تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس کی آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"پھر بھی آگئی تھی یہاں۔" مومن نے ستائشی آبرو اچکائے۔

"خود نہیں آئی تھی۔ بابا نے بلایا تھا اپنے کسی فرینڈ کے بیٹے سے ملوانے کے لیے۔" وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"واہ کیسا باپ ہے۔" اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"باپ صرف نام کے ہیں اصل میں ہمیشہ مجھے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے انہوں نے۔"

"اچھا یوں رو تو مت۔"

"تت۔ تم کون ہو؟" اسے اب یاد آیا تھا کہ وہ کسی غیر کے ساتھ ہے۔ جسکا اس نے چہرہ تک نہیں دیکھا۔ وہ یک دم گھبرا گئی۔

"یہ بھی صحیح۔ مجھ سے گھبرا رہی ہو جو تمہیں وہاں سے رہائی دلوا کر لایا ہے۔" اسے برا لگا تھا۔ بسمہ نے لب کترے۔

"تمام مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔" بہت دیر بعد وہ بولی تھی۔

"غلط نامرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن مرد کبھی کسی دوسرے جیسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے تردد کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔؟" اس نے مومن ابراہیم سے پوچھا۔

"کیا کرو گی نام جان کر۔" وہ بات کو طول سے رہا تھا۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

"تمہارا باپ اچھا آدمی نہیں ہے بسمہ۔" اس نے مومن کی بات پر سر ہلا دیا۔ ایسے جیسے وہ جانتی ہو پہلے سے۔

"میں مجبور ہوں ورنہ کبھی بھی ان کے سائے میں نہ رہتی۔ بیٹیاں مجبور ہی ہوتی ہیں۔"

"ایک آفر دوں تمہیں۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ بسمہ کا سر اثبات میں ہلتا گیا۔

"میرے ساتھ چلو گی۔"

"کہاں۔؟" اس کی اچانک اس آفر پر وہ ایک دم بولی۔

"جہاں میں لے چلوں۔" وہ ہنسا۔ لیکن بسمہ کو صرف اس کی آنکھیں ہنستی نظر آئی تھیں۔

"ایسے تو مت گھورو۔ مجھ پر یقین رکھو۔ ایک جگہ ایسی ہے جہاں تم خود کو محفوظ سمجھ سکتی ہو۔" وہ دماغ میں سارے معاملات طے کر رہا تھا۔

"اور تم یہ عنایت کیوں کرو گے مجھ پر۔؟"

"کیونکہ۔" وہ خاموش ہو گیا۔ یہ بات وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیوں؟ اس کیوں کے جواب میں اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

"کیونکہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اسپاٹ انداز میں بات سمیٹ دی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اگر وہ اس پر احسان کر رہا تھا تو وہ اپنے محسن پر اعتبار کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اسے ایم ایس مارشل آرٹس سینٹر لے گیا۔ جو بسمہ شارق کے لیے ایک مضبوط پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔

ایک دم سے بادل گرجا اور وہ فوراً حال میں پلٹ آیا۔ بسمہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے جواب پر مسکراتی ہوئی۔

"میرا دوسرا سوال (بسمہ شارق ٹھہری تھی) کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" اس کا دل دھڑکا۔ وہیں مومن ابراہیم کا دل ایک دم سکڑ گیا تھا۔

"مجھے تم سے محبت نہیں ہے لیکن، محبت ہو تو سکتی ہے ناں۔؟" وہ تھوڑا آگے ہوا تھا۔ بسمہ نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے رکھے۔ وہ اس شخص سے سوالات کے جوابات لینے آئی تھی لیکن کون سے سوالات؟ وہ اسے سامنے پا کر سب کچھ بھولنے لگی تھی۔ ذہن کے دریچوں میں کوئی لفظ اپنی جگہ نہیں بنا پا رہا تھا۔

"مم۔ میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے مومن ابراہیم۔؟" گہری بھوری آنکھوں میں کانچ سا کچھ ابھرا تھا۔ اس نے آنکھوں کا رخ بائیں جانب موڑ لیا۔ بارش برسنے لگی تھی۔ باہر بیٹھے لوگوں کی میزوں پر چھاتا کھل چکا تھا۔ وہ خاموش تھا اور خاموش بیٹھا رہ گیا۔

"بولو مومن۔" بسمہ کے لب کپکپائے۔ وہ خود کو بے توقیر کر رہی تھی۔ کیا واقعی محبت نیلام کرتی ہے؟

"ہاں۔" جواب مومن ابراہیم کی جانب سے آیا تھا۔ دل میں پوچھے جانے والے سوال کا یا براہِ راست کیے گئے سوال کا۔ وہ اندازہ نہیں کر سکی۔

"آگر میں تم سے کچھ مانگو تو کیا تم میری بات مانو گے۔؟" اب کی بار ہاتھ باہم پھیلائے اس نے میز پر رکھا تھا۔ مومن ابراہیم اور بسمہ شارق کے درمیان محض ایک میز حائل تھی۔ اور اس پر رکھے سفید گلدان میں سجا سرخ پھول۔

"کہو۔" مومن نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ سرخی سی اس کی سرمئی آنکھوں کو خود میں رنگنے لگی تھی۔

"کیا تم میرے لیے ایک قتل کر سکتے ہو۔؟" مومن ابراہیم ساکت رہ گیا۔ آنکھوں میں حیرت اور تعجب پھیلا تھا۔ وہ سوال کرنا چاہتا تھا لیکن برسات کا سماں پیش کرتی سرمئی آنکھوں کے سامنے وہ ہارنے لگا تھا۔

اگر تو محبت میں نیلامی تھی تو وہ نیلام ہونے لگا تھا۔ اور یہ وہی پل تھا جب مومن ابراہیم کے دل نے 'اس 'سنگدل کے علاوہ کسی کی صدا لگائی تھی۔ دل کی دنیا میں کوئی شریک ہوا تھا۔ جو اس سے بھاری مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ ہارا ہوا شخص ایک بار پھر سے ہار رہا تھا۔

"ہاں بولو وہاج ملک۔ کچھ معلوم ہوا؟" پارکنگ ایریا میں کھڑا بالاج سکندر موبائل تھامے کہہ رہا تھا۔

"یہ بہت مشکل تھا۔" وہ یک دم خاموش ہوا۔ بالاج لب بھینچ گیا۔

"جہانداد ملک کے کچھ بندوں سے میرا رابطہ ہوا ہے۔ باتوں باتوں میں پوچھنے پر جس لوکیشن کا پتا چلا ہے وہ میں تمہیں سینڈ کر چکا ہوں۔" بالاج نے فوراً سے واٹس ایپ پر آئی نئی نوٹیفکیشن کھولی۔ وہاں پن لوکیشن جگمگا رہی تھی۔

"خیال رکھنا جہانداد ملک بہت خطرناک ہے۔ اور...." بالاج کے عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ وہ پلٹا، ماہیر اس کے قریب آ رہا تھا۔

"اور کیا؟"

"جہانداد ملک مومن ابراہیم کے بارے میں بھی جان چکا ہے۔" اس کی آواز میں ملال تھا۔ وہ فون بند کر گیا۔ بالاج نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ایک نا ایک دن تو اسے معلوم ہو جانا تھا۔

"کیا ہوا۔؟" ماہیر کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"**Unity, Faith and Discipline**." ماہیر سکندر کی زبان سے تین لفظ ادا ہوئے۔ بالاج نے جوش سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سات بجنے میں چار گھنٹے باقی تھے۔

یہ تین لفظ تم نے بھی کہیں دیکھے یا سنے ضرور ہونگے۔ ہیں ناں؟

مہک عارف

باب نمبر:9

(انتقام کی آگ میں جل کر تم راکھ کی مانند ٹھنڈے تو ہو جاؤ گے لیکن جانتے ہو کیا؟)

گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئیوں نے پانچ اور گیارہ کے ہندسے کو عبور کیا تو 'زووں' کی آواز کے ساتھ کوئی گاڑی وہاں آ کر رکی تھی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ نے ماحول میں شور سا برپا کیا تھا۔ سناٹے میں گونجنے والی آواز سن کر درختوں میں چھپے بیٹھے پنچھی بھی پھڑ پھڑائے تھے۔ دفعتاً ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ 'ٹھک' کی آواز سے کھلا اور اس نے اپنا بھاری بوٹ میں مقید پیر باہر نکالا تھا، پھر اس کا مکمل سراپا واضح ہوتا گیا۔ وہ دراز قامت وجود بالاج سکندر کا تھا۔ سفید ڈریس شرٹ کے آستین کہنیوں تک موڑ رکھے تھے۔ آنکھیں سامنے نظر آتے منظر پر اٹک چکی تھیں۔

"پانچ بج کر پچپن منٹ۔" پیسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا ماہیر سکندر بڑبڑایا تھا۔ وہ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ ہیزل گرین آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہاتھ میں تھامے موبائل پر چند بٹن دبائے۔ کسی کو کوئی پیغام لکھا اور موبائل واپس جیب میں اڑستے وہ بالاج کے قریب آیا تھا۔

بارش کی بوندوں کا راستہ رک چکا تھا۔ سیاہ آسمان تلے موجود وہ عمارت قدرے پرانی اور خستہ حال تھی۔ سفید رنگ سے مزین دیواریں میل پکڑ چکی تھیں۔ عمارت کے سرے پر نیلے رنگ کا زنگ آلود ہوتا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سفید رنگ سے کنندہ مٹے مٹے حروف پر نظر ڈالو تو وہاں کسی اسکول سسٹم کا نام لکھا ہوا تھا۔ ماہیر نے گہری سانس بھری۔ وہ یہاں ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ تب کسی کی زندگی کا سوال تھا اور آج اس کی زندگی کا کھیل تھا۔

"ہم سامنے سے اندر نہیں جا سکتے۔" ماہیر کی آواز ابھری تو بالاج نے جھٹکے سے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کا قد برابر تھا۔ نہ بڑا نہ چھوٹا، بالکل برابر۔

"تو کیا چور دروازے سے جائیں گے؟" بالاج کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے ماہیر سکندر کی یہ بات بھلی نہیں لگی۔

"چور دروازے چوروں کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ ہم چور نہیں ہیں، چور اندر چھپا بیٹھا ہے۔ ہمیں اس پر تمام در بند کرنے ہیں۔" اس کی آواز برہم تھی۔ بالاج کے چہرے کے تاثرات سیدھے ہوئے۔

"اب کہاں سے جائیں گے؟" بالاج نے سوال داغا۔

"جنگ جیتنے کے لیے ہمیں اپنے راستے خود بنانے پڑتے ہیں۔" اس کے قدم متحرک ہوئے۔ بالاج بھی اس کی تقلید میں چل دیا۔

ہلکی پھلکی بوندا باندی کا شور تھم گیا تھا۔ آسمان کی سیاہی نیلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ ہر شے چمکتی ہوئی صاف معلوم ہوتی تھی۔ ایسے ہی جیسے اس وقت اس بلند و بالا عمارت کے شیشے جگمگا رہے تھے۔ وہ گاڑی سے باہر نکلا۔ نظریں اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ گارڈ نے چند ثانیے اسے اینٹرنس پر روکا اور پھر جانے دیا۔ وہ سنجیدہ تاثرات چہرے پر سجائے ریسیپشن ڈیسک پر آیا تھا۔

"ہیلو سر۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔؟" ریسیپشنسٹ نے مسکرا کر استفسار کیا۔

"آپ کے باس شارق کبیر سے ملاقات طہ ہوئی ہے میری۔" اسپاٹ انداز میں آنے کی وجہ بتائی۔

"کیا آپ کے پاس کوئی اپائنٹمنٹ لیٹر ہے؟" مصنوعی مسکراہٹ سے مزید استفسار ہوا۔ مومن ابراہیم نے اکتا کر جیب سے موبائل نکالا تھا۔ پھر چند بٹن دبائے اور موبائل اس کی جانب بڑھایا۔

"اوکے سر ویٹ آمنٹ۔" موبائل میں شارق کبیر کی جانب سے کوئی میل بھیجی گئی تھی۔ ریسیپشنسٹ نے دیکھ کر سر ہلایا پھر پاس رکھے ٹیلی فون کی جانب بڑھی۔ باس کو مطلع کرنا بھی لازم تھا۔

"سر مومن ابراہیم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" دوسری جانب سے شارق کبیر کی آواز ابھری تھی۔

"اوکے سر۔" اس نے سر ہلا کر فون رکھ دیا پھر اسی مسکراہٹ سے مومن ابراہیم کو دیکھا۔ وہ فون کو گھور رہا تھا۔

"سر ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔" مومن لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔ پھر سر ہلاتا واپس مڑا۔ سامنے ایک راہداری نظر آتی تھی۔

"سر رکیں۔ آپ یوں اندر نہیں جا سکتے۔" اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ پاتا، وہ لڑکی ڈیسک کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ صاف بوکھلائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر مومن ابراہیم یوں اندر چلا گیا تو اس کا باس اس کے ساتھ کیا کرے گا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"ہٹو میرے راستے سے۔۔" سنجیدگی حد سے بڑھ کر چھا گئی تھی۔

"لیکن سر میں۔۔۔"

"ہٹو۔" وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔ ریسیپشنسٹ ہڑبڑا کر دور ہٹی۔ مومن اسے ہی گھور رہا تھا۔

"میں عورتوں سے بحث نہیں کرتا۔" چند حروف اس کے منہ پر مارتے وہ آگے بڑھ گیا۔ ریسیپشنسٹ شرمندہ شرمندہ سی اس کے پیچھے گئی تھی۔ مومن نے اکتا کر اسے دیکھا۔

"میں آپ کو لے چلتی ہوں۔" وہ آرام سے بولی البتہ مسکراہٹ غائب تھی۔ مومن ابراہیم نے سر ہلا دیا۔

وہ دونوں اسکول کی پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ ایک وسیع قطعہ پر بنا اس اسکول کا گارڈن جھاڑیوں اور لمبے لمبے گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو آگے ایک بڑا سا شیلٹر بنا نظر آتا تھا عموماً گاڑیاں اور بس کھڑی کرنے کے لیے بنایا گیا وہ شیلٹر زنگ آلود ہو چکا تھا۔

"تم اس طرف سے جاؤ میں یہاں سے جاؤں گا۔" بالاج نے ماہیر کو بائیں جانب موجود دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ماہیر سر ہلاتا اس طرف چل دیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھی۔

بالاج بھی اپنے ہاتھ میں موجود گن تھامے آگے بڑھا۔ وہاں دروازے تو نہیں لگے تھے لیکن اندر داخل ہونے کا راستہ وہی بنتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ ڈھلتی شام کی روشنی میں وہاں مدھم روشنی پڑتی تھی۔

بائیں ہاتھ موجود ایک کمرہ تھا۔ وہ آگے بڑھا پھر رک گیا۔ وہاں باتھ روم تھے۔ اس نے سر جھٹکا۔

ماہیر سکندر کا ایک ایک قدم اس سنسان جگہ پر کانوں میں سنائی دیتا تھا۔ وہ ریوالور تھامے اندر داخل ہوا۔ وہاں اندھیرا نہیں تھا کیونکہ سامنے ہی کھلے آسمان تلے ایک گول اسٹیج اور اس کے سامنے گارڈن تھا۔

۔ وہ جبڑے بھینچے آگے بڑھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی زی روح موجود نہ ہو۔ آگے اسٹیج پر کھڑے ہو کر دیکھو تو وہ جگہ بہت زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ بڑا سا ہال تھا جبکہ بائیں کاریڈور میں کلاسسز تھیں۔ ایسا ہی نقشہ اوپر والے پورشن میں بھی بنا ہوا تھا۔

بالاج سکندر آگے بڑھا اور وہاں موجود ایک کلاس میں داخل ہوا۔ دروازہ جھٹکا لگنے سے کھلتا چلا گیا۔ اس کا سانس رک گیا۔ سامنے موجود کلاس روم گرد سے بھرا ہوا تھا۔ کرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک ایک انچ کی گردان پر اپنی تہہ جما چکی تھی۔

گرد کے مرغولے کھڑکی سے آتی ہلکی روشنی میں تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ باہر نکلا دوسرے کمرے میں گیا، پھر تیسرا، چوتھا اور تمام کمرے چھان مارے۔ لیکن وہاں کوئی شے نہ ملی تھی۔

سامنے ہی چند مزید کمرے دکھائی دیتے تھے جو کلاس روم کہیں سے نہیں دکھائی دیتے تھے۔وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھا۔دل بے ساختہ دھڑک اٹھا تھا۔اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ کیسے برداشت کرے گا؟

ماہیر کمروں کی تلاشی لے کر جلدی سے ہال کی جانب بڑھا۔ہال کا پچھلا دروازہ بند نظر آتا تھا جو ایک ہی جھٹکے پر کھلتا چلا گیا۔وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا۔چوکھٹ سے آتی روشنی کے سبب وہاں روشن ہونے لگی تھی۔

سامنے ایک اور کمرہ تھا اور اس کے دائیں جانب بڑے سے ہال کے اسٹیج کا دروازہ تھا۔وہ آگے بڑھا۔یہ تمام جگہ اسٹیج کا پچھلا حصہ تھا۔راستے میں کسی شے سے ٹکرانے کی ٹھڈ کی آواز کو نظر انداز کر کے وہ اگلے کمرے میں داخل ہوا۔

لیکن وہ دروازہ مضبوط تھا۔ماہیر نے اسے دھکا لگایا وہ کھلا نہ ہی ٹوٹا۔چند بے دریغ دھکوں کے باعث وہ ایک دم ٹوٹ کر دور جا گرا۔وہ تیزی سے اندر گیا۔اور چند لمحات میں ہی زمین اس کے پیروں تلے سے کھینچ چکی تھی۔فضا میں کچھ ایسا تھا کہ وہ سانس روک گیا۔ہر گزرتا لمحہ اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

دھپ دھپ کی آواز پیدا کرتے اس کے قدم سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔نیچے پرنسپل کا آفس تھا،کچن تھا،اسٹاف روم تھا لیکن جیا اور انمول کا نام و نشان بھی نہ تھا۔اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکیں۔سانس پھول رہا تھا۔عرق آلود پیشانی لیے وہ اوپر آیا۔اس کے انداز میں جلدی تھی۔وقت کم تھا۔

وہاں بھی ایک جانب ہاتھ روم تھے وہ آگے بڑھتا گیا۔سامنے ہی نیچے والے کمروں کا اوپری حصہ تھا۔اس کے قدموں میں خود بخود تیزی بھرتی گئی۔سبز رنگ کا ایک دروازہ کھولے وہ اندر آیا،وہاں خاموشی کا راج تھا۔ویسا ہی ماحول جیسا وہ نیچے دیکھ چکا تھا۔

تبھی پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔کسی شے کے چلنے کی آواز وہ آہستہ آہستہ پلٹا،باہر نکل کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ہاتھ میں پکڑی گن کو سیدھ میں رکھے اس نے وہاں موجود کمروں کی تلاشی لی پھر بائیں ہاتھ موجود کاریڈور میں چل دیا۔آرام آرام سے محتاط قدم اٹھاتے ہوئے،اس سے پہلے کہ وہ دوسرے کاریڈور میں مڑتا۔وہاں کسی کی سانسوں اور قدموں کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔وہ دیوار کے ساتھ چھپ کر کھڑا ہو گیا۔وہ بندہ اسی جانب آ رہا تھا۔

"ایک--دو--تین—"وہ ایک دم پلٹا۔دوسرے بندے نے ایک دم اس پر گن تانی اور پھر وہ دونوں گہری سانس بھر کر رہ گئے۔وہ ماہیر سکندر تھا۔

"کچھ ملا۔؟"بائیں ہاتھ موجود لیب کا دروازہ کھولنے کی تگ و دو کرتے اس نے ماہیر سے پوچھا۔

"بہت کچھ۔"اس کی شرٹ گرد سے بھر چکی تھی۔بالوں پر بھی مٹی گری تھی۔دونوں بیک وقت اندر داخل ہوئے۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔اندر گھپ اندھیرا تھا۔ملک نے ہاتھ میں تھامے موبائل سے روشنی کی۔تبھی اس کی نظریں وقت پر پڑیں تھیں۔

وقت: چھے بج کر پندرہ منٹ۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ہاتھ میں موجود کپڑا بالاج کی جانب بڑھایا۔

"یہ.... یہ تو"، موبائل کی روشنی میں نظر آتا وہ کپڑا دیکھ کر بالاج کی رگیں تن گئی تھیں۔

"یہ تو جیا کا دوپٹہ ہے۔" دل میں ہک سی اٹھی۔ وہ بے تابی سے اسے اپنے ہاتھ پر لپیٹ گیا۔

"ہاں یقیناً وہ دونوں نیچے تھیں۔ یہ بھی وہی سے ملا ہے اور ان کا احساس تھا وہاں، انمول کی خوشبو تھی وہاں۔ وہ دونوں وہیں تھیں بالاج۔ ہم نے دیر کر دی" اس کا ضبط جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ بالاج نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ لیکن بعض اوقات انسان کو تسلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تسلی کے چند حروف سے بہلایا نہیں جا سکتا۔

اس نے شانے جھٹکے۔ بالاج وہیں کھڑا تھا۔ موبائل کی ٹارچ سے اس نے روشنی چیزوں پر ڈالی وہاں ایک دیوار کے ساتھ الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں کیبینٹس میں پڑی بوتلوں میں سے اسے ایک شے واضح نظر آئی تھی۔

"ایچ سی ایل (ایسڈ)۔" وہ مسکرا دیا بے جان مسکراہٹ۔

"آآآ" ایک دم سے آگے بڑھتے وہ چیخ اٹھا۔ پیچھے بالاج سکندر کا مدھم سا قہقہہ گونجا تھا۔ اس نے مڑ کر بالاج کو گھورا۔ ماتھے کی رگیں تن گئیں۔

"بائیولوجی لیب ایک شے کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہتی ہے۔" ماہیر نے اس کی بات پر دانت بھینچے۔ دل کیا تھا اس کا جبڑا سہلا دے۔ لیکن وہ اپنی خواہش پر بند باندھ گیا۔ آہ دل کی خواہش دل میں ہی رہ گئی تھی۔

"اور وہ ہے Skeleton" وہ پھر سے ہنسا کیونکہ ماہیر وہاں رکھے skeleton سے ایک دم ڈر گیا تھا۔ ایک تو اندھیرا اوپر سے وہ انسانی ڈھانچہ۔

"شش۔" اس سے پہلے وہ مزید کوئی بات کرتے باہر سے پھر سے ویسی ہی قدموں کی آواز آئی تھی۔

بالاج نے باہر نکل کر جھانکا۔ پھر آگے بڑھ کر جلدی سے دوسرے کاریڈور میں دیکھا۔ ماہیر بھی اس کے پیچھے تھا۔

اور پھر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ سامنے ہی سیاہ اور سفید رنگ کی بلی مزے سے کاریڈور میں چلتی جا رہی تھی۔ ایک دم اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ دم کھڑی کی، بال بھی کھڑے ہو گئے، میاؤں کی زور دار آواز کے ساتھ وہ وہاں سے دم دبا کر بھاگی تھی۔

"یقیناً وہ تمہاری شکل دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ بیچاری۔" ماہیر کہاں باز رہنے والا تھا۔ بالاج نے سر جھٹکا۔ وہ بلی اس سنسان جگہ پر انسانی وجود دیکھ کر ڈر گئی تھی۔

"وہ دونوں آخر جا کہاں سکتی ہیں؟ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے ماہیر، ہم انہیں کہاں ڈھونڈیں گے؟" بالاج کے لہجے میں فکر صاف ظاہر تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" وہ ایک دم اس کی جانب بڑھا۔

"وہیں، جہاں میں نے انہیں بھیجا ہے۔" وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"کون؟ کس کو بھیجا ہے؟"

"عبید باجوہ اور حسیب کو۔" وہ سکون سے بولتا سیڑھیاں اتر گیا۔ بالاج کے لب اوہ میں سکڑے۔ منزل قریب تھی لیکن کیا واقعی؟

"انہیں کیوں؟" بالاج اور وہ اب اسکول کے داخلی راستے کی جانب جا رہے تھے۔

"کیونکہ جنگیں تنہا نہیں لڑی جا سکتیں۔ وہ دونوں کچھ اہم کام پر مامور کیے گئے ہیں۔" اس نے کہا تو بالاج نے سر ہلا دیا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا تھا۔

"اور وہ مومن کہاں ہے؟ تمہارا دوست ہے ناں وہ اور دوست احباب تو ہر مشکل وقت میں ساتھ ہوتے ہیں۔" بالاج سکندر کے لہجے میں بالکل ہلکی سی طنز کی آنچ تھی۔ ماہیر مسکرا کر پلٹا۔

"دوست مشکل وقت میں ساتھ نہیں ہوتے، ان کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی دی گئی اسپورٹ اور موٹیویشن ہوتی ہے ساتھ..... اور وہ اب تک میرے مشکل وقت میں ساتھ رہا ہے اب تمہاری باری۔" اس نے بالاج کا کندھا تھپکا۔ بالاج سکندر نے گہری سانس بھری اور آگے چل دیا۔

اس کا سن ہوا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ سر من من بھاری محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹوں کو حرکت میں لاتے اس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش ناکام ٹھہری تھی۔

"یا اللہ۔" پپڑی زدہ لبوں سے گھٹی گھٹی آواز برآمد ہوئی تھی۔ چہرہ کملایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کھلے بال کھردرے ہو رہے تھے۔

"آہ۔" کہنی فرش پر ٹکائے اس نے اٹھنا چاہا لیکن وزن کا تناسب بگڑا اور وہ دوبارہ ڈھیر ہو گئی۔

"مم۔ملک۔" آنکھوں کے کنارے نم ہوئے تھے۔ حلق خشک ہو رہا تھا یوں جیسے برسوں سے پیاسا ہو۔ چند ثانیے وہ یونہی بے دم لیٹی رہی تھی اور پھر زمین سے بھرپور اڑیس لگائے وہ اٹھ کر بیٹھی۔ پیچھے کوئی دیوار تھی، وہ ٹیک لگائے بیٹھ گئی۔ ہڈیوں میں سرائیت ہونے والی ٹھنڈ سے اسے معلوم ہو چلا تھا کہ وہ دیوار پتھر کی نہیں بلکہ لوہے کی تھی۔

لمبی سانس خارج کرنے کے بعد اس نے آنکھوں کو دوبارہ کھولنے کی کوشش کی اب کی بار وہ کامیاب ہوئی تھی۔ بھاری پپوٹوں نے ایک سیکنڈ اسے ماحول سے آشنا کرایا اور ایک بار پھر سے وہ بند ہو گئے۔ اسے اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی گھٹن زدہ اور کم جگہ پر موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے باہر کی مدھم روشنی چھن کر اندر رہی تھی۔

درد کی ٹیسوں سے پھٹتے دماغ پر زور ڈالے اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخری مرتبہ کھلی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا اس نے؟

آخر کہاں تھی وہ؟ وہ تو اس کمرے میں تھی لیکن یہاں تک کیسے آئی؟ کون لایا؟

اسے آہستہ آہستہ کچھ سمجھ آنے لگا تھا۔ آخری دفعہ وہ اور جیا ساتھ تھیں۔ جب دروازہ کھلا اور وہی پہلے دن والا لڑکا کھانا لے کر اندر داخل ہوا۔ ٹرے ان کے سامنے رکھی اور انہیں کھانا سارا ختم کرنے کی تاکید کرتے وہ مڑ گیا۔

تین دن کی ناقابلِ برداشت بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر انمول ملک نے بھی جیا کے ساتھ مل کر کھانا سارا ختم کیا تھا۔ اور پھر؟

وہ ایک دم سب کچھ جیسے بھول گئی۔ ذہن واپس حال میں پٹخا تھا۔

"یہ آزمائش ختم کر دے میرے رب۔" وہ دل میں پکاری تھی۔

یکلخت کسی احساس کے تحت اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ایک دم جیسے اس کے اندر طاقت بھر گئی تھی۔

"جیا۔ جیا۔" سرگوشی نما آواز۔ وہ ہربڑا گئی تھی۔ گھبراہٹ سے کچھ بولے بھی نہیں جا رہا تھا۔

"جیا کہاں ہو تم۔؟" وہ سیدھی ہوئی۔ اپنے اردگرد اسے کوئی دوسرا وجود دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"جیا۔؟" اس کی آواز رندھ گئی۔ حلق میں بہت سے آنسو پھنس گئے تھے۔

"آہ۔" جھٹکے سے کھڑی ہونے کی کوشش میں اس کا سر اوپر چھت سے لگا تھا۔ لوہے کی مضبوط چھت۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پل توڑتے بہہ نکلے تھے۔ وہ نیچے بیٹھ گئی۔

"کہاں ہو جیا سکندر۔؟" اس کا جسم ٹھنڈے لوہے کے فرش کے باعث ہلکا ہلکا کپکپانے لگا تھا۔ وہ تو پھر بھی ٹھیک تھی لیکن جیا؟ وہ تو ماں بننے والی تھی؟ وہ اور اس کا بچہ؟

"اوہ خدایا۔" وہ دوبارہ سیدھی ہوئی۔ اسے اپنی پرواہ نہیں تھی لیکن اگر جیا سکندر کو کچھ ہوا تو ملک کو تکلیف پہنچتی اور وہ اسے تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ بچوں کی طرح رینگتے ہوئے آگے بڑھی۔ دوسرے کونے کی طرف۔

"جج۔ جیا۔ تم۔" اس کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ وہ کسی انسانی وجود سے ٹکرائی تھی۔ یقیناً وہ جیا سکندر تھی۔

"جیا تم ٹھیک ہو؟ اٹھو پلیز۔" اس نے جیا کا وجود جھنجھوڑا۔ لیکن بے سود۔ انگشت شہادت اور دوسری انگلی اس نے ناک کے نتھنوں کے قریب لے جا کر اس کی سانسوں کے چلنے کی تصدیق کی۔ اس کی سانسیں مدھر سی چل رہی تھیں لیکن وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

"اٹھ جاؤ پلیز۔" وہ چیخی۔ جیا کے رخسار پر ہاتھ رکھے وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

کسی کے بھیگے لہجے میں کہے گئے جملے جیا سکندر کو دور سے آتے معلوم ہوتے تھے۔ یوں جیسے کوئی اس سے دور کھڑے ہو کر اسے پکار رہا ہو؟ ماؤف ہوتے دماغ میں اسے پہلا خیال بالاج کا آیا تھا۔

"بالاج۔" اس نے لب وا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ جیا اٹھ جاؤ پلیز ہوش میں آؤ۔" اس نے جیا کو اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ انمول کے سہارے اٹھ کر بیٹھی تھی۔

"انمول، بالاج آ گئے۔؟" اس کا حلق بھی خشک تھا۔ انمول نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ جیا سکندر کی ہچکیاں ابھرنے لگی تھیں۔

"شش رونا مت۔ وہ جلد ہی ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔" لیکن وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ انمول کا ذہن ایک بار پھر پیچھے جا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کیا ہوا تھا؟ اور تبھی ایک جھماکے سے اسے سب یاد آیا۔ کھانا کھانے کی کچھ ہی دیر بعد اس کا سر بھاری ہوا تھا۔ جیا سکندر کی حالت بھی مخفی نہیں تھی۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے اس نے جیا سکندر کو ابکائی کرتے دیکھا تھا۔ یقیناً کھانے میں کوئی sedation ملائی گئی تھی۔

"جیا تم ٹھیک ہو۔؟" اس نے جیا کا چہرہ ہتھیلیوں میں بھرا۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"انمول۔ مم۔ میرا بچہ۔ میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔ انمول۔" اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ انمول کا دل لرز کر رہ گیا۔ سیڈیشن کا اثر پریگننینسی میں بہت سے مسائل بنا سکتا تھا۔

"جیا۔ تم رکو میں کچھ کرتی ہوں۔" باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ روشنی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہوش سے بیگانہ ہونے سے پہلے جیا سکندر نے انمول کو روتے اور زور زور سے وہ لوہے کا ڈربہ بجاتے دیکھا تھا۔ پھر وہ ساکت پڑی رہ گئی۔

"جیا آنکھیں نہیں بند کرنا پلیز۔ ہوش میں رہو۔" وہ چیخ رہی تھی لیکن شاید وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کسی کو آنا تھا نہ کوئی آنے والا تھا۔

ماضی:

اس روز جس شخص کی تلاش اسکے ذمے لگی تھی، وہ کوئی اور نہیں بلکہ جیا سکندر تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا جہانداد ملک نے یہ کام اسے کیوں سونپا لیکن اسے یہ کرنا تھا۔ سر عام نہیں چھپ کر۔ ماہیر نہیں ملک بن کر۔

اس نے اس کی تمام تر موٹی موٹی تفصیلات جہانداد ملک کو لا کر دی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئے اور ملک پر سکون ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے ماہیر سکندر پر بھروسہ کر لیا تھا۔

وہ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں دوسروں کی وفاداری پر اندھا اعتماد رکھنے والے؟

جہانداد ملک کے مذموم ارادوں سے باخبر وہ قدم بہ قدم جیا سکندر کے پیچھے رہتا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو اس نے جیا سکندر کو چاکلیٹس دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی بند ہو گیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا وہ جیا کے لیے کسی بھی قسم کی اذیت کا سبب بنے۔

اس نے چند ماہ تک جہاندار ملک کو ٹالا لیکن پھر ایک روز اس کا دل ان کی گفتگو سن کر ساکت رہ گیا۔

"وہ غدار کا بیٹا غدار ہے۔ اس لیے مجھے اس پر بھروسہ نہیں۔ یہ کام میں تمہیں سونپ رہا ہوں وہ لڑکی مجھے ہر حال میں چاہیے وہاج ملک ورنہ اپنا انجام سوچ لینا۔" انہوں نے ملک کے ارادوں سے واقفیت پکڑتے یہ کام وہاج کے ذمے دیا تھا۔ تو انہیں بھنک پڑ چکی تھی۔

ملک پریشان ہو گیا۔ اس رات اس کے دل کا سارا غبار بہہ نکلا تھا۔ بچپن کی خوفناک یادیں خواب بن کر اسے ایک بار پھر جھنجھوڑ گئی تھیں۔ اس رات اس نے اپنے رب کا کلام سنتے ہوئے بھی کانوں پر پردے لپیٹ لیے تھے۔ اس کی خود غرضی حد سے سوا تھی۔ اور وہ اپنی اس خود غرضی کے بھیانک انجام سے ناواقف رہا تھا۔

آزمائش اپنے آنے کا پتہ بتا کر نہیں آتی۔ اور پھر اس رات اس نے وہاج ملک کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اس کا دل یہ سوچ کر پسیج گیا تھا کہ اگر جو وہ کچھ دیر سے پہنچتا یا اس روز وہ جہانداد ملک کے ارادوں سے باخبر نہ ہوتا تو؟

یہ خبر جیسے جہانداد ملک کو بھی گراں گزری تھی۔ وہ وہاج سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے لہذا اسے چند ماہ کے لیے خود سے دور کر دیا۔

انہوں نے جیا سکندر کا قصہ ختم کرنے کرنے کے لیے دن کے وقت اس کی گاڑی پر حملہ کروایا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ بچ گئی۔

جہانداد ملک کے اس کام کی خبر ملک کو تھی اس لیے وہ بروقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے جیا سکندر اور اپنے گھر والوں کی زندگی اپنی جان سے بڑھ کر تھی۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک بھیڑیا ہے۔ اور بھیڑیے اپنے خونی رشتوں سے وفادار ہوا کرتے ہیں۔

وہ چاہتا تو جیا سکندر اور گھر والوں سے مل سکتا تھا لیکن اس کا یہ قدم جہانداد ملک کے لیے پلس پوائنٹ کا کام کرتا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ جہانداد ملک اس کی کمزوری جان جائیں، اس لیے وہ قریب ہو کر بھی اپنے رشتوں سے دور رہا۔ اگر اس کے اس عمل سے اس کے گھر والے حفاظت سے تھے تو اسے یہ دوریاں اور فاصلے منظور تھے۔

"بسمہ آخر کچھ بتاؤ گی بھی کیا ہوا ہے؟" فریال نے جھنجھلا کر سو دفعہ کا کہا سوال دوہرایا۔ بسمہ شارق ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ جب سے واپس آئی تھی یونہی گم سم بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔ وہی حلیہ وہی کپڑے وہ اضطراب کی کیفیت میں گھن چکر بنی ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔

"کہا ہے نا خاموش ہو جاؤ۔ میری پریشانی کو مزید مت بڑھاؤ۔" وہ ایک دم غصے سے بولی۔ فریال اس کے ہارش رویے پر حیران رہ گئی تھی۔

"اوکے ایزیو وش۔" اس نے سر جھٹکا۔ پھر اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ ناک پر غصہ بیٹھ گیا تھا۔

"فریال۔" بسمہ کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا تو ندامت نے آن پکڑا۔ یہ ہم اپنی پریشانی میں دوستوں کا دل کیوں دکھاتے ہیں؟ کیوں یہ نہیں جان لیتے کہ ہمیں اپنے دکھوں سے نمٹنے کے لیے دوستوں کی ایموشنل سپورٹ چاہیے ہوتی ہے، انہیں یوں جھڑک کر خود سے دور کر دیں ما بیوقوفی ہے۔

"اچھا یار سوری۔ مجھے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا تھا۔ فریال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بک ہاتھ میں پکڑے وہ غصے سے صفحے پلٹاتی جا رہی تھی۔

"میری دوست، میری بہن پلیز مان جاؤ۔ اتنی سی بات کو دل پر مت لو۔" وہ اس کے بیڈ کی پائنتی کی جانب بیٹھ گئی یوں کہ دونوں کے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ تھا۔

"اتنی سی بات نہیں ہے یہ بسمہ۔ کہہ دینے سے اتنی سی بات ختم نہیں ہو سکتی۔ میں تمہاری دوست ہوں اور دوست سے بڑھ کر وفادار کوئی نہیں ہوتا۔ دوستوں کی فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے کیونکہ اس سے زیادہ مخلص اور عزیز رشتہ کوئی نہیں ہے۔" اس نے دھپ سے کتاب بند کر کے ٹیبل پر پٹکی۔ ہاتھ سینے پر باندھے وہ سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"اور دوستوں کی فرمانبرداری کیسے ہوتی ہے؟"

"ان کی بات مان کر، ان کے ساتھ اپنا ہر دکھ سکھ شئیر کر کے، اور مشکل وقت میں ان کا ساتھ دے کر۔ دوستوں کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہمارے کڑے مراحل کے ساتھی ہوتے ہیں۔ دوستوں سے دل کا نہیں روح کا رشتہ ہوتا ہے اور یقین جانو یہ

رشتہ سب سے کھرا اور پکا ہوتا ہے۔" اس کا ایک ایک لفظ سچا تھا۔ اس نے فریال کو نہ بتا کر غلطی کی تھی، دوستوں سے وفاداری نبھانی پڑتی ہے ورنہ ہم پلّہ دوست بھی بیگانے ہونے لگتے ہیں۔

"سوری کہہ تو رہی ہوں میں۔" وہ منمنائی۔ فریال نے اب کی بار اسے نرم نگاہوں سے دیکھا تھا۔

" تھینکس اور سوری لوگوں سے کرتے ہیں دوستوں سے نو تھینکس نو سوری۔ ڈنکے کی چوٹ پر بات کرتے ہیں۔" وہ مسکرا دی۔ بسمہ شارق کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔

ہر شخص اپنی زندگی میں ایک مخلص دوست کا مستحق ضرور ہوتا ہے۔

"اب سیدھی طرح سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟" وہ اس کے ساتھ بیڈ پر آ بیٹھی۔

"مومن میری کال نہیں اٹھا رہا۔" اس نے منہ بسورا۔ فریال نے گہری سانس بھری۔

"دعا کے سوا میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"ایک کام کر سکتی ہو؟"

"حکم کرو۔"

"اتنی فرمانبردار مت بنو میں خوشی سے مر جاؤں گی۔" آنکھوں سے نادیدہ آنسو پیچھے دھکیلتے وہ تڑک کر بولی۔

"تم جیسے شیطانوں کو عزت راس نہیں آتی۔ بولو اب۔" فریال نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"میرے ساتھ مومن ابراہیم سے ملنے چلو گی؟ اس کے گھر؟" بسمہ نے اس کا ہاتھ اپنی نرم گرفت میں لیا۔

"مم۔ میرا بھلا وہاں کیا کام؟" وہ سٹپٹا گئی۔ بسمہ شارق کی مدھر ہنسی گونجی تھی۔

"اوہو یار۔ تمہیں ساتھ لے جانا تو ایک بہانہ ہے۔ میں مومن سے مل لوں گی اور تم ماما سے مل لینا۔" اس نے چٹکیوں میں ہل نکالا تھا۔

اور پھر ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں مومن ابراہیم کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔

مین گیٹ گارڈ نے کھولا۔ بسمہ کو دیکھ کر اس نے فوراً اندر اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں اینٹرنس پر پہنچیں تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ بسمہ شارق کا سانس ایک دم رک گیا۔ اگر وہ سامنے ہوا تو وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی؟ کیا وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی تھی۔ شاید نہیں یقیناً 'نہیں'۔

"السلام علیکم ماما۔" سامنے صوفیہ ابراہیم کو دیکھ کر اس کا اٹکا سانس جاری ہوا۔ وہ دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی۔

"والسلام۔ کیا حال ہے میری بیٹی کا؟" انہوں نے بسمہ کے بال سہلائے۔ اس نے پیچھے ہٹتے اندر جھانکا۔ وہ سامنے تو کہیں نہیں تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟" صوفیہ ابراہیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے فریال کی جانب دیکھا۔

"یہ میری دوست ہے فریال ساجد، اور فریال یہ مومن ابراہیم کی والدہ ہیں۔" وہ تینوں یونہی باتیں کرتیں اندر چلی گئی تھیں۔

وہ ریسیپشنسٹ کی معیت میں چلتا راہداری کے سرے پر موجود آفس کے قریب آکر رک گیا۔ فروسٹڈ گلاس ڈور کے اس پار شارق کبیر تھے۔ ریسیپشنسٹ نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسے سخت گھوری سے نوازتا آگے بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے پر ٹھنڈک کے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

آفس سرمئی رنگ سے ڈھکا ہوا تھا۔ دائیں دیوار گلاس کی تھی جس سے اس پار کا سارا شہر نظر آتا تھا جبکہ بائیں جانب دیوار پر چند تصاویر اور پینٹنگز لٹکی ہوئی تھیں۔ اسی دیوار کے ساتھ سفید کاؤچ رکھے ہوئے تھے۔

کمرے کے نیم وسط میں آفس ٹیبل اور چیئر زر کھی ہوئی تھیں۔ مرکزی کرسی پر کوئی براجمان دوسری جانب رخ کیے بیٹھا تھا ایسے کہ مقابل دیوار میں نصب بڑے سے شیشے میں مومن ابراہیم کے ابھرتے عکس کو وہ باخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دفعتاً وہ تیزی سے گھوما۔ کرسی کی پشت سے ٹیک ہٹائی تھوڑا سا آگے جھک کر آنکھیں سکوڑے مومن ابراہیم کو دیکھا۔ پھر وہ مسکرا دیے۔ شارق کبیر کی سرمئی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔

"ویلکم۔ ویلکم۔ ویلکم۔" ان کا انداز ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ بالکل تروتازہ۔

مومن کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ وہ آگے بڑھا اور پیر کی مدد سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری پر جمالی۔ شارق کبیر نے ایک دم لب بھینچے صبر سے اسے دیکھا۔ اب کی بار مومن ابراہیم مسکرایا تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ۔

"کیوں بلایا ہے مجھے۔؟" سنجیدگی حد سے سوا تھی۔

"کیسے ہو؟" وہ کرسی کی پشت سے دوبارہ ٹیک لگا گئے۔

"میں نے پوچھا مجھے یہاں کیوں بلایا ہے تم نے؟" لفظ گویا دانتوں کے درمیان چبائے گئے تھے۔

"سوچ رہا تھا کہ ایک آخری دیدار آمنے سامنے ہو جائے۔" ان کی نظریں مومن ابراہیم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"کیوں ملک الموت تمہیں لینے آیا ہے؟" مومن کے سوال پر شارق کبیر کا قہقہہ گونجا تھا۔

"کسی کی موت کے فیصلے یونہی نہیں ہو جاتے مومن ابراہیم۔" انہوں نے ہاتھ جھلایا۔ مومن ابراہیم نے سر کو تائیدی جنبش دی۔

"زندگی اور موت تو ازل سے لکھی جا چکی ہے۔ پھر کون کہاں کیسے اور کب چلا جائے کسی کو معلوم نہیں؟ میں اور تم کیا چیز ہیں؟" شارق نے ہنستے ہوئے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"شارق کبیر کی موت اتنی آسان نہیں برخودار۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ تبھی مومن ابراہیم کے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی۔

"کیا تم میرے لیے ایک قتل کر سکتے ہو؟"

نسوانی آواز ذہن کے پردے پر ابھری تھی۔ مومن ابراہیم کا دل یک بار کئی مرتبہ دھڑک اٹھا تھا۔

"تمہاری موت لکھی جا چکی ہے شارق کبیر۔" وہ آگے کو جھکا۔ گہری بھوری آنکھوں میں سفاکیت تھی۔ کہیں سے بھی اس میں نرمی کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

"کیسے؟" وہ کرسی کو جھلانے لگے تھے۔ دائیں سے بائیں اور پھر ہلکی "چر" کی آواز کے ساتھ بائیں سے دائیں۔

"میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔" مومن نے ٹانگ پر سے ٹانگ ہٹائی۔ دفعتاً وہ میز کے قریب ہوا۔ دایاں ہاتھ میز پر رکھ لیا۔ انداز پُرسکون تھا لیکن آنکھیں۔

گہری بھوری آنکھیں حشر برپا کر سکتی تھیں۔

"ایک وزیر تھا، نام 'نامعلوم'۔ ایک روز بادشاہ نے اسے بازار سے کچھ لانے کا حکم دیا۔ وہ بازار پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ کوئی شخص سیاہ چغہ پہنے اس کے تعاقب میں چل رہا ہے۔ اس نے اپنا خیال جانتے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔" اس کی انگلیوں نے پیپر ویٹ پر گرفت جمائی۔

"اگلے دن وہ دوبارہ کسی کام سے بازار آیا تو وہی شخص ایک بار پھر سے اس کے تعاقب میں چل رہا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اور اس کا ڈر اس پر اس قدر حاوی ہوا کہ وہ بادشاہ سے معذرت کرتا اپنے شہر واپس چلا گیا۔ 'وہ موت سے بھاگا تھا شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ موت اس کے آگے کھڑی ہے۔" وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے کہانی سنا رہا تھا۔

"ایک دن بادشاہ بازار میں داخل ہوا تو لوگوں کی بھیڑ میں اس شخص کو پہچان گیا۔ وہ اسکے پاس گیا اور دریافت کیا کہ تم ہو کون جس سے میرا وزیر ڈر کر بھاگ گیا۔؟ سیاہ چغہ پہنے وہ شخص مسکرایا اور بولا: میں وہ ہوں جسے ملک الموت کہتے ہیں اور اس روز میں تمہارے وزیر کو اس شہر میں دیکھ کر حیران ہو گیا کیونکہ مجھے اس کے شہر میں اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور وہ مجھ سے بھاگ کر اپنے شہر چلا گیا اور آج وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ بادشاہ سب سن کر دنگ رہ گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ....." اس نے پیپر ویٹ 'ٹھک' کی آواز سے واپس رکھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

"تم موت سے جتنا بھاگو گے وہ ہمیشہ تمہارے تعاقب میں رہے گی۔" سرمئی آنکھوں میں بھوری آنکھیں عکس بناتی واقعی حشر برپا کر رہی تھیں۔ شارق کبیر ایک دم سیدھے ہوئے۔ ہاتھ بے ساختہ گردن کی جانب بڑھایا۔

"کہانیاں فرضی ہوتی ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور پھر دروازے کی جانب متوجہ ہوگئے۔ ایک دو تین اور پورے تین سیکنڈ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔" مومن نے چہرہ موڑ کر آنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ آگے آیا۔ چائے اور لوازمات سے بھری ٹرے ان دونوں کے درمیان موجود ٹیبل پر رکھی۔

"سر چائے۔" آنکھ کے اشارے سے دونوں کپوں کی جانب اشارہ کیا اور باہر چل دیا۔ مومن ابراہیم نے خاموشی سے یہ ساری کاروائی دیکھی تھی۔

"تم آج کے دن میرے مہمان ہو اور شارق کبیر اس مہمان نوازی کو عبادت کی طرح پورا کرے گا۔" انہوں نے مسکرا کر ٹرے سیدھی کی۔

"تم جیسے شخص کی زبان سے عبادت کا لفظ زیب نہیں دیتا۔"

"مومن کو بھی بہت کچھ زیب نہیں دیتا لیکن افسوس کہ تمہارا صرف نام مومن ہے۔" وہ دوبدو بولے۔ پھر چائے کے کپ ٹرے سے اٹھا کر ایک اپنے سامنے رکھا اور دوسرا مومن کی جانب بڑھا دیا۔

"مومن ابراہیم کوئی سستی شے نہیں ہے۔ وہ تم جیسوں پر اکیلا ہی بھاری ہے لہذا بچ کر رہو ورنہ مارے جاؤ گے۔" اس نے کپ اپنی جانب کھینچا۔ انداز میں لاپرواہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کبھی میرے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہو گے۔" انہوں نے ٹرے سے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے واضح طنز کیا تھا۔ مومن ابراہیم تھم گیا۔

"کیا تم میرے لیے ایک قتل کر سکتے ہو۔؟"

پھر سے وہی آواز۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ شارق کبیر نے اپنی چائے کا کپ نہیں اٹھایا۔

"ایک کہانی تم نے مجھے سنائی ہے، اب ایک کہانی کا اختتام میں تمہیں دیکھاؤں گا۔" شارق کبیر کی آواز میں کچھ تھا جو مومن ابراہیم کو ٹھٹھکا گیا۔ اس نے چونک کر شارق کبیر کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں تھامے کپ پر نظر گئی۔ ایک لمحہ لگا تھا اور مومن ابراہیم کو بہت کچھ سمجھا گیا۔ کیا وہ جان ہتھیلی پر رکھے موت کے کنویں میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی مومن ابراہیم؟" دل نے 'ہاں' کی صدا بلند کی تھی۔ وہ کپ لبوں کے قریب لے کر گیا ایک سیکنڈ محض ایک سیکنڈ ناک کے نتھنوں سے خوشبو اندر کھینچی تھی اور پھر وہ کڑک چائے حلق میں اترتی گئی۔ اس نے دھیرے سے کپ ہٹایا پھر شارق کبیر کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

"ایسا کیا ہے تم میں مومن کہ میری بیٹی کو تمہارے آگے کوئی نظر نہیں آتا؟" انہوں نے اپنا کپ اٹھایا۔ نظریں مومن ابراہیم کے چہرے کو اسکین کرتی ہوئی تھیں۔

"نہیں ایسا نہیں ہے کہ اسے میرے آگے کوئی نظر نہیں آتا، بات دراصل یہ ہے کہ اسے میرے علاوہ کوئی میسر نہیں رہا۔ نہ تم نہ تمہارا پیار۔" چائے کا کپ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ میں تھامے کپ پر گردش کر رہی تھیں۔

"جانتے ہو کیا؟ میں نے کبھی اولاد کی خواہش نہیں کی تھی۔" ایک دم ان کی آواز میں اداسی در آئی۔

مومن ابراہیم ساکن ہوا انہیں سن رہا تھا۔

ماضی:

اس نے اپنا ایک علیحدہ اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ وہ اکثر اوقات وہاں جاتا رہتا ورنہ مومن ابراہیم اس میں مقیم تھا۔ اور یونہی ایک روز اس نے مومن کی باتوں میں آکر سکندر حویلی کے چوکیدار کو ایک چٹ دی تھی جس پر اینجل کنندہ تھا۔ اس نے وہ چٹ جیا سکندر تک پہنچانا چاہی تھی۔ اس کے ذریعے وہ یقیناً اس تک پہنچ سکتی تھی۔ زیادہ نہ سہی وہ اتنا جان سکتی تھی کہ اس کا بھائی زندہ ہے۔ لیکن جیا کی کم عقلی کہ وہ اس کی تلاش نہیں لگا پائی تھی۔ وہ اتنی ذہین نہ تھی۔ ملک تب بھی سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

جیا سکندر کی شادی پر ملک کا دل اداس ہوا تھا۔ لیکن وہیں جیا اور بالاج کی شادی کی خبر سن کر ایک طمانیت کا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ وہ شادی میں جا سکتا تھا لیکن وہ نہیں گیا۔

بہت کچھ تھا جو وہ کر سکتا تھا لیکن اس نے نہیں کیا۔ کس کے لیے؟ فقط جیا سکندر کی زندگی کے لیے۔ خود سے جڑے اپنے عزیز از جان رشتوں کو کھونے کے ڈر سے، وہ خاموش رہا تھا۔ بالاج سکندر جیسے مضبوط شخص کے ہاتھ میں اس کی بہن تھی اسے فکر کی ضرورت تو نہ تھی۔

ایسے ہی ایک رات اس نے جیا سکندر کو اپنے خوابوں میں روتے ہوئے پایا۔ اس کا دل پسیج گیا۔ وہ فوراً مومن ابراہیم سے ملنے بھاگ نکلا۔

وہ اس کا دوست تھا اور دوست سے بڑھ کر ہم راز کوئی نہیں ہوتا۔

مومن ابراہیم سے مل کر اس کا دل ہلکا تو ہو گیا تھا لیکن پھر بھی دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ اس کا ہر لمحہ فکر میں گزارنے لگا۔

جہاندار ملک کی خاموشی کسی بڑے طوفان کا عندیہ تھی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ بالاج اور جیا کی لڑائی ہوئی اور وہ گھر سے نکل آئی۔

سکندر ہاؤس کے گرد پہرہ دیتے ملک کے بندوں نے اسے اس بات سے خبر دار کر دیا تھا اور یوں وہ جیا سکندر تک جا پہنچا۔

اس کا سب سے پہلا شک وہاج ملک پر تھا لیکن وہ اس معاملے سے بری الذمہ نکلا۔ بعد ازاں حریم ناز اور عالیہ کا بھی اس واقعے سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ لاکھ کوششوں کے باجود بھی اس بندے کو نہیں پکڑ پایا جس نے اس کی بہن کو غم سے دوچار کیا تھا۔ جیا سکندر کی حفاظت کا عہد اس نے اپنے دل سے کیا تھا اور اسے یہ نبھانا ہی تھا۔ جب اس دن بالاج اور جیا کے سامنے اس کا کور بلو ہوا تو وہ خاصا پریشان ہوا تھا۔ اس کا دل ڈر گیا تھا لیکن تمام خدشات دور جا سوئے جب ان دونوں کا ری ایکشن دیکھنے کو ملا۔

اسے رشتوں کو پا کر جو سکون ملا تھا وہ آج تک نصیب نہیں ہوا تھا۔

وہ خوش ہو گیا تھا۔ تمام راستے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ اور یہی انسان کی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوشی میں بہت کچھ کو بھول جاتا ہے۔ خوشیوں کے مل جانے سے زندگی مکمل نہیں ہو جاتی بلکہ آزمائش شروع ہوتی ہے۔

وہ اس خوشی میں مگن اپنی عورتوں کو بھول گیا تھا۔ اس کا نتیجہ بھیانک نکلا تھا لیکن اسے اس سب سے نمٹنا تھا۔

کیونکہ وہ محافظ تھا۔

جنگ کا آغاز جہاندار ملک نے کر دیا تھا اسے للکار کر انہوں نے اپنی موت کو للکارا تھا۔ وہ قہر بن کر ان پر ٹوٹنے والا تھا۔ لیکن کیا واقعی بدلے کی آگ میں وہ اکیلا جلنے والا تھا؟ کیا واقعی جنگجو مضبوط تھا یا محبت اسے کمزور بنانے والی تھی؟

---

۲۲ اگست کی وہ شام آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ چھے بج کر تیس منٹ پر ان دونوں کی گاڑی اس غیر آباد علاقے میں داخل ہوئی۔ آس پاس سوائے ویران جنگل کے کچھ نہ تھا۔ بڑے چھوٹے درخت، خاردار جھاریاں اور پرندوں کی آوازوں کے ساتھ چند ایک جانوروں کی خوفناک آوازیں بھی شامل تھیں۔ یوں کہ اگر اس علاقے کو تم آنکھوں میں بھرنا چاہو تو اس کے دائیں جانب دور بہت دور چند ایک روشن بلب نظر آتے تھے۔ ڈوبتی شام کے سائے میں جگتے وہ بلب اور جگہ جمالیاتی ماحول پیدا کر رہے تھے۔ نظروں کی سیدھ میں دیکھو تو سامنے ہی ایک پرانی اور خستہ حال عمارت تھی۔

"ایک کھنڈر اور ویران ویئر ہاؤس"

اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تمہیں ایک گاڑی کھڑی نظر آئے گی۔ سفید ہنڈا سوک۔ میلوں کی مسافت طے کیے جانے سے اس کے ٹائر گرد سے بھرے پڑے تھے۔ وہ دونوں گاڑی سے نکل کر آگے چل دیے۔ یہ اس وئیر ہاؤس کا پچھلا حصہ تھا۔ سامنے ہی ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آتی تھی۔ سیاہ کائی زدہ دیوار شام کے پھیلتے اندھیرے میں ہولناک منظر پیش کر رہی تھی۔ ان دونوں کے پاؤں تیز روی سے آگے چلتے گئے۔

بالاج نے اچک کر دیوار پھلانگی اور دوسری جانب دھپ کی آواز سے زمین پر پیر رکھا۔ اس کی آنکھیں باریک بینی سے ہر شے کا معائنہ کر رہی تھیں۔ اس کی تقلید میں ماہیر نے ایک ہاتھ دیوار پر رکھا اور اس سے پہلے وہ دیوار پھلانگ کر دوسری جانب کودتا، دائیں جانب سے ٹھاہ کی آواز بلند ہوئی تھی۔ اور پھر خاموشی پھیل گئی۔ دوسری جانب موجود بالاج سکندر کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھر لیا وہ ایک دم واپس مڑا۔

آگے بڑھ کر دیکھنے پر اسے ماہیر سکندر دیوار کے ساتھ بیٹھا نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھی۔ اس کی نظروں نے ماہیر سکندر کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ایک جانب ان کی گاڑی کے تھوڑے ہی فاصلے پر سیاہ یونیفارم پہنے کوئی شخص ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ مقابل کا نشانہ تو چوک چکا تھا لیکن ماہیر سکندر کے ہاتھوں کبھی نشانہ چوکا نہیں تھا۔

"تم ٹھیک ہو ماہیر؟" وہ دیوار پر جھکا نیچے بیٹھے ماہیر سے پوچھنے لگا۔ اس نے نظریں اٹھا کر بالاج کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ بالاج سکندر پر جھپٹا تھا۔ دوبارہ کہیں سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اگر وہ بالاج کو نہ بتاتا تو شاید گولی اسے لگ جانی تھی۔ وہ دونوں توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے دوسری جانب گرے تھے۔ نیچے زمین کچی تھی جو ان کی بچت ہو گئی۔

"اپنا بچاؤ کرو۔" اس کی آواز تیز تھی۔ بالاج کا ہاتھ اپنی پستول تک گیا۔ اور پھر یہ سب رکا نہیں یکایک فضا میں چاروں جانب سے گولیوں کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ماحول میں بلٹس کی بدبو پھیل اٹھی تھی۔ بچاؤ مشکل تھا ناممکن نہیں۔ وہ دونوں مختلف راستوں سے وئیر ہاؤس کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کچھ بھی ہو جاتا انہیں یہ سب سر کر کے جانا تھا۔

(کسی بھی جنگ کا حصہ بننے کے لیے ضروری نہیں تھا کہ ان کے پاس ساز و سامان موجود ہوتا۔)

اللہ پر توکل کامیابی کی سب سے بڑی کنجی ہے۔ نصرت اور فتح طاقتوروں کا مقدر ہوتی ہے وہ جو اللہ پر یقین رکھتے ہی۔ وہ جو نازاں ہونے کی بجائے عاجزی اپناتے ہیں۔ ان دونوں کا یقین بھی پختہ تھا۔ وہ دونوں اگر اس جنگ میں سرخرو ہوتے تو یقیناً غازی کہلائے جانے والے تھے۔

وہ کھنڈر عمارت بہت پرانی اور خستہ حال تھی۔ رنگ و روغن نہ ہونے کے برابر تھا۔ ماہیر سکندر ایک چھوٹی سی گلی نما راہداری میں دبے قدم اٹھاتا چلتا جا رہا تھا۔ چہرہ دائیں اور پھر بائیں جانب گھماتا وہ محتاط نظر آتا تھا۔

اس نے دائیں دیکھا اور ادھر بائیں جانب سے کسی نے ایک دم اس پر حملہ کیا تھا۔ وہ فوراً جھک گیا۔ بائیں بازو سے مقابل بندے کے وار کو ناکام بنایا تھا اور پھر کھینچ کر ٹانگ اس کے پیٹ میں دے ماری۔ وہ درد سے دوہرا ہوتا دور ہوا لیکن رکا نہیں۔

"آہ۔" اس نے آگے بڑھ کر ماہیر سکندر کے ب۔ہ پر مکا رسید کیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے ماہیر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا اور پھر اس کی گردن ماہیر سکندر کے شکنجے میں پھنس گئی۔

"لگتا ہے اپنی جان پیاری نہیں تھی تمہیں۔" ایک جھٹکا لگا اور اس کی گردن "کڑک" کی آواز کے دوسری جانب ڈھلکتی چلی گئی۔ ماہیر نے کسی اچھوت کی مانند اسے خود سے دور جھٹکا تھا۔ پھر وہ بھاگنے کے سے انداز میں آگے بڑھا۔

(وہ دونوں بھی بغیر کسی بڑے ہتھیار کے میدان میں اترے تھے۔)

دوسری طرف بالاج سکندر کا پالا ایک ہٹے کٹے گارڈ سے پڑا تھا۔ وہ دوسری طرف چاک و چوبند سا دیکھتا ہاتھ میں بندوق تھامے کھڑا تھا۔ بالاج اس سے لڑائی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ آرام سے چند قدم اٹھائے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اور بغیر اسے کسی قسم کا شک دلائے اس کی گردن کی مخصوص نس کو دبایا تھا۔ وہ تڑپ کر مڑا اور بھاری بندوق سے بالاج سکندر کے سر پر وار کیا۔ حملہ زوردار تھا لیکن بالاج کی گرفت ہلکی نہیں ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ گارڈ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ اور پھر انگلی سے بالوں سے ٹپکتے خون کی بوندوں کو چنا۔ آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ حزن اور بدلہ نئے سرے سے اٹھا تھا۔ اس نے گارڈ کو ایک ٹھوکر ماری اور ایک دم پیچھے مڑا۔ سامنے ایک گارڈ کھڑا تھا۔ چہرے پر ماسک تھا لیکن پھر بھی وہ اس کی پیشانی پر نمودار ہوتا پسینہ دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پستول نہیں تھی ایک ڈنڈا نما چیز تھی۔ شاید لوہے کا راڈ۔ جو اگر کسی کو بھی پڑتا تو نانی یاد دلا دیتا۔

"مم۔ میں نے۔ کچھ نہیں کیا۔ مجھے مت مارنا۔" وہ نوعمر سا گارڈ ہکلایا تھا۔ بالاج کی آنکھوں میں استہزاء ابھرا۔ وہ اس کے قریب گیا۔ لڑکے کے ہاتھ سے راڈ ایک دم زمین بوس ہو گیا۔ وہشت سی تھی جو اس لڑکے کو دوسرے گارڈ کے بے ہوش ہونے پر طاری ہوئی تھی۔

"بھاگ جاؤ۔" سرگوشیانہ انداز۔ لڑکے نے مرتے مرتے سر ہلایا۔ حلق تر کرتا وہ سر ہلاتا مڑا اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگ پاتا بالاج سکندر نے اسے گردن سے تھامے اس کا سر دیوار میں دے مارا۔

اپنی ریوالور نکالتا گارڈ کا ہاتھ ساکت ہوا تھا۔

"تمہیں کیا لگا تھا میں تمہیں بخش دوں گا اور تم مجھ پر چھپ کر وار کر سکو گے۔ ایسا سوچا بھی کیسے تم نے۔؟" بالاج نے اس کی گردن کر دباؤ بڑھاتے اسے دور پھینکا تھا۔ اس کے اندر دوبارہ اٹھ کر لڑنے کی ہمت مفقود ہو چکی تھی۔

)اور یہ میدانِ جنگ دو چیزوں پر محیط تھا۔ جیت یا فتح اور ہار یا شکست)

شارق کبیر کے آفس کا ماحول افسردہ ہو چکا تھا۔ پہلے جیسا تناؤ اداسی میں گھل گیا تھا۔ مومن ابراہیم کی اسپاٹ نگاہیں شارق کبیر کے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں پکڑے کپ پر نظریں ٹکائے بول رہے تھے۔ بہت کچھ تھا جسے وہ مومن ابراہیم کے گوش گزار چکے تھے۔ اور بہت کچھ ابھی باقی تھا۔

کچھ الفاظ، کچھ باتیں زہر سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہیں جو انسان کو ختم کرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

وہ مطمئن تھا کہ اس وقت ان باتوں کو سننے کے لیے بسمہ شارق یہاں موجود نہیں تھی۔ ورنہ زہر میں ڈوبے تیر اس کا وجود چھلنی کر جاتے۔

"بے حسی تم پر ختم ہوتی ہے شارق کبیر۔" انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ اپنی بات کے اختتام پر مومن ابراہیم کا جواب انہیں پسند نہیں آیا تھا۔

"غلط، بے حسی کی حد مجھ سے شروع ہوتی ہے۔" وہ استہزایہ ہنسے۔ آنکھوں کے کنارے نم تھے۔ بالکل ہلکی سی نمی جو غور کرنے پر معلوم پڑتی تھی۔

"اس تمام کہانی کو بتانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو؟" ان کے لب اب بھی مسکرا رہے تھے۔ سرمئی دیواروں نے تاسف سے اس شخص کو دیکھا۔

"شاید نہیں یقیناً یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔" مومن ابراہیم نے خالی کپ نیچے رکھ دیا۔ شارق کبیر نے اس کی چہرے کے تاثرات جانچے۔ مومن ابراہیم نے ایک دم سے نظریں پورے آفس میں گھمائی تھیں۔

"تم جانتے ہو ایک زہر انسان کو کتنی دیر میں ختم کر سکتا ہے؟" انہوں نے اپنا کپ بڑے دھیان سے ٹرے میں واپس رکھا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو تمہارے ایک وفا شعار غلام کو خریدنے میں کتنا پیسہ لگتا ہے؟" مومن ابراہیم کی آنکھیں سارے میں پہلی مرتبہ مسکرائی تھیں۔ شارق کبیر اپنی جگہ تھم گئے۔

"کیا مطلب؟" ان کی آواز کانپی تھی۔ مومن ابراہیم ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں ہتھیلیاں میز پر رکھے وہ ان کے قریب جھکا۔

"جتنا زہر تم نے میرے کانوں میں انڈیلا ہے، اس زہر کے آگے اس زہر کی کوئی اہمیت نہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ انداز جتاتا ہوا تھا۔ شارق کبیر کی آنکھیں کھل گئیں۔

"تت۔ تم ٹھیک ہو۔" ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ مومن ایک دم پیچھے ہوا۔

"آف کارس۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ (ہاتھ اٹھائے اور پھر شارق کبیر کی آنکھوں میں اپنی بھوری آنکھیں گاڑھ دیں) لیکن تمہاری زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اب۔" اس کی نظریں شارق کبیر کے وجود پر تھیں۔

"میں۔ میں نے زہر کھالیا۔؟ لیکن زہر تو تمہاری چائے میں تھا۔" ان کا ہاتھ گردن کی جانب بڑھا۔ حلق میں کڑواہٹ پھیلی تھی۔ ان کی حالت مومن ابراہیم کو لطف دے رہی تھی۔

"قسمت بچپن سے مومن ابراہیم پر مہربان رہی ہے۔ اس کی اعلیٰ مثال تمہارے سامنے ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے چائے کی جانب اشارہ کیا۔ شارق کبیر کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیروں پانی آ ٹھہرا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری چائے میں زہر۔؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" بے ربط جملے ان کی ابتر حالت کی عکاسی کر رہے تھے۔

"چچ چچ چچ۔ تمہارا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ کہا تھا ناں تم جتنا موت سے بھاگو گے وہ تمہارے تعاقب میں رہے گی۔ اور جب جہاں جیسے بھی وہ آئے گی تمہیں نیست و نابود کر دے گی۔" اس نے شارق کبیر کے دل کے مقام پر دیکھا۔

"میں زندہ نہ رہا تو بچو گے تم بھی نہیں۔" انہوں نے جلدی سے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پر مارا تھا۔ مومن ابراہیم کی نظریں ایک ہی جگہ پر تھیں۔ شارق کبیر کا سانس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا۔

"تمہیں لگتا ہے تم زہر کھا کر مر جانے والی شے ہو؟ تمہیں مارنے کے لیے زہر کی ضرورت نہیں مومن ابراہیم کو۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ شارق کبیر نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کیا کر رہا تھا یا کیا کرنے والا تھا اس کی خبر ان کو نہیں تھی۔

انہوں نے تو چائے میں زہر ملوایا تھا تو کیا مومن ابراہیم ان کے بندے کو خرید چکا تھا۔

"تمہیں مارنے کے لیے صرف ایک گولی کی ضرورت ہے۔ اور تم خلاص۔" وہ سفاکیت سے بول کر پیچھے ہٹا تھا۔ شارق کبیر کے چہرے پر انجانہ سا خوف لہرایا۔ انہوں نے مومن ابراہیم کی جانب غور سے دیکھا۔ اور پھر انہیں یقین ہو چلا کہ ان کی چائے میں زہر نہیں تھا۔ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔" وہ دوبارہ بولے۔ وہی جملہ جسے وہ اس ساری ملاقات کے دوران بارہا دوہرا چکے تھے۔

"شاید یہ تمہاری آخری سانسیں ہوں۔" مومن ابراہیم کے لفظ اس کے منہ میں تھے۔ جب دائیں جانب موجود گلاس وال ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی۔ کانچ کے ٹوٹنے کی آواز دور دور تک گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی بم دھماکہ ہوا ہو۔ وہ ایک دم شارق کبیر سے دور ہو گیا۔ لیکن نظریں ان پر سے نہیں ہٹائیں۔ کانچ اڑ کر اسے بھی لگا تھا۔ دائیں رخسار پر کٹ لگ چکا تھا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس نے دیکھا شارق کبیر سامنے کرسی پر بیٹھے تڑپ رہے تھے۔ گولی دل کے مقام پر لگی تھی۔ خون کا ایک فوارہ سا تھا جو ان کے

سینے سے بہہ نکلا۔ منہ پر بھی خون کے چھیٹے گئے تھے۔ ایک، دو، تین سیکنڈ اور پھر ان کا وجود بالکل جامد ہو گیا۔ ایک ہاتھ دل کے مقام پر تھا اور دوسرا کرسی سے نیچے ڈھلک گیا۔

'موت یقینی ہوتی ہے کب کہاں کیسے آجائے یہ کسے معلوم ہوتا ہے بھلا؟'

"حیوان کی موت انسان کی بقا ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ اور آگے بڑھ کر شارق کبیر کا ہاتھ اٹھا کر ان کی گود میں رکھ دیا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے ابھی باہر نکل آئیں گی۔ ان کا گرم وجود آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" پھر وہ پیچھے مڑ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ آفس کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم اکھٹا ہو چکا تھا۔ اس نے ناب پر ہاتھ رکھا۔ ایک پل کے لیے گردن بائیں جانب موڑی۔

"کیا تم میرے لیے ایک قتل کر سکتے ہو؟" لفظوں کی بازگشت سنائی دی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ گلاس وال کا کباڑہ ہو چکا تھا۔ نیچے سڑک پر بھی لوگوں کا جھنڈ اکھٹا ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن سامنے موجود اونچی عمارتیں بالکل ساکت تھیں۔ مومن ابراہیم کے دل کی طرح ساکت۔

اس نے دھیرے سے ناب گھماتے دروازہ کھول دیا۔ ورکرز کا ریلا سیلاب کی مانند اندر آیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

"سر۔ سر۔ کیا ہوا آپ کو۔؟" کتنی ہی آوازیں تھیں جو کانوں کے پردے پھاڑتی محسوس ہو رہی تھیں لیکن اس کی توجہ محض ایک آواز پر تھی۔

بسمہ شارق کی آواز۔ سفاک اور ٹھنڈی آواز۔ اگست کی گرمی میں بھی ہڈیوں کو جما دینے والی آواز۔

"کیا تم میرے لیے ایک قتل کر سکتے ہو؟"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی مومن ابراہیم؟"

"تم محبت کے امتحان میں ہار جاؤ گے" یہ بات اس نے کچھ ہی دیر پہلے مومن ابراہیم کے منہ پر کہی تھی۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ مومن ابراہیم ایک ہارا ہوا شخص تھا؟

سب جیت کر بھی ہار جس کا مقدر بنتی ہو، وہ شخص مومن ابراہیم تھا۔

"باس۔" سیکرٹری حماد چلا رہا تھا۔ مومن ابراہیم نے مزید کچھ نہیں دیکھا۔ قدموں پر بوجھ سہارنا اس کے لیے مشکل ہوا تھا۔ وہ موقع غنیمت جانتے وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور اسے وہاں سے نکلتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

(میدانِ جنگ میں فتح اور شکست گھڑیال کے پنڈولم کی طرح تیرتی ہیں)

آج سے پہلے بھی اس نے کئی بار ایسی صورتحال کا سامنا کیا تھا۔ جہاندادملک کے کاموں میں مشکل سے مشکل مراحل آکر گزرے تھے۔ جب وہ اس لڑائی میں سرخرو ہوا تھا تو یہ تو پھر اس کی زندگی کی جنگ تھی۔

وہ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں مڑنے ہی لگا تھا کہ اس کے قدموں کو بریک لگی۔ دوسری طرف راہداری میں کوئی تھا۔ قدموں کی چاپ کی آواز ابھر رہی تھی۔ کوئی آہستہ آواز میں بات کرتے ہوئے اس کی جانب ہی آرہا تھا۔ وہ رک گیا۔ ہال میں جانے کی بجائے وہ راہداری کے سرے پر چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ میں تھامی پستول کو اوپر اٹھا رکھا تھا۔ دوسری جانب موجود شخص بالکل راہداری کے سرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک دو سیکنڈ اور یہاں ماہیر اس پر حملہ کر دیتا لیکن یہ کیا؟

وہ شخص واپس مڑ گیا۔ ماہیر نے راہداری میں جھانک کر دیکھا۔ وہ فون پر بات کرتا سر ہلاتا دوسری جانب قدم بڑھا رہا تھا۔

"ہیئے یو۔" ایک دم اس کی کرخت آواز گونجی۔ ماہیر سکندر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس نے دروازے کی جانب فائر کیا تھا۔

وہاں یقیناً بالاج تھا۔ ماہیر فوراً اندر داخل ہو گیا۔

"کس کو ڈھونڈ رہے ہو۔؟" آرام دہ انداز میں اس نے راہداری کے بیچ و بیچ کھڑے ہو کر اسے پکارا۔

"ملک۔ تم۔؟" وہ ایک دم اس کی جانب مڑا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

"ملک نہیں تمہاری موت۔" گارڈ کو جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔ اور اس نے پستول کی نال ماہیر کی جانب کی۔ دوبارہ فائر ہوا لیکن ماہیر سکندر بچ نکلا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوبارہ اس پر گولی چلاتا، ماہیر تیر کی تیزی سے اس کی جانب بھاگا۔ گارڈ بوکھلا گیا اور کسی بھی قسم کے ردِ عمل سے قبل ماہیر نے اپنی ٹانگ گھما کر گارڈ کے منہ پر دے ماری۔ راہداری میں انسانی چیخ گونجی تھی۔ اس کی گردن ٹوٹنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی ہو گی۔

ماہیر جھکا اور اسے کھینچ کر اٹھایا۔ گارڈ کی گردن ایک جانب تھی، درد شدید تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے در پر تھا جب ماہیر سکندر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے بمشکل اپنی آنکھیں جھپکیں۔ لڑائی کی ہمت اس کے اندر سے جاتی رہی تھی۔

"انمول کہاں ہیں۔؟" اس نے چبا چبا کر پوچھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا گریبان تھام رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی پستول کی نال اس کی عین کنپٹی پر تھی۔

یخ ٹھنڈی نال کو اپنی کنپٹی پر محسوس کرتے گارڈ کے پسینے چھوٹے تھے۔ وہ موت کے قریب تھا۔

"مم۔ مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔" ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کے حلق سے برآمد ہوئے۔ ماہیر نے پستول زور سے اس کے سر میں دے ماری۔ وہ چیخا۔ اس کی چیخ اونچی تھی۔

"جھوٹ نہیں صرف سچ سننا ہے مجھے۔"اس کے عقب میں کسی کی آمد محسوس ہوئی تھی۔اس نے ایک دم مڑ کر اپنے پیچھے دو فائر کیے۔اندر آتے گارڈز دروازے میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔

"میں سچ۔سچ کہہ رہا ہوں۔آآآ"روح کپکپا دینے والی چیخ ایک بار پھر سے گونجی تھی۔ملک نے اس کی ٹانگ پر فائر کیا تھا۔

"وہ وہ۔وہاں ہیں۔دیوار کے اس پار۔"وہ ایک دم چیخ کر بولا۔ملک نے اسے چھوڑا۔وہ درد سے کراہتا نیچے زمین پر تڑپ رہا تھا۔ماہیر گردن جھکائے گن دوبارہ لوڈ کرنے لگا۔اور اسی دوران سینسر لگی بندوق سے سسس کی آواز سے گولی اس کی جانب اڑتی ہوئی آئی تھی۔جو اس کے مڑنے سے قبل بائیں کندھے کو چھو کر گزر گئی۔وہ درد سے کراہا۔جبڑے بھینچ گئے۔ہڈیوں کو چٹخا دینے والا درد حد سے سوا تھا۔اس نے دیکھا،بائیں کندھے پر سے شرٹ پھٹ چکی تھی۔ہاتھ کندھے پر رکھے درد کو روکنے کی ناکام سی کوشش کرتے وہ باہر بھاگا۔واپس راہداری کے سرے پر آتے اس نے مردہ گارڈز کو عبور کیا اور تبھی سامنے سے ایک بندہ نمودار ہوا۔

ملک نے بنا دیکھے اس کے پاؤں میں ٹانگ الجھا کر اسے نیچے پٹک دیا۔اور پھر ایک دم اس پر لاتوں اور مکوں کی برسات کر دی۔ایک منٹ کا کھیل تھا اور وہ ادھ موا ہو کر وہاں گر پڑا۔ماہیر نے اپنے کندھے سے رستے خون کو دیکھا اور ایک دم پوری قوت سے اٹھا۔

اس نے جیب سے ٹٹول کر موبائل نکالا۔اور پھر نفی میں سر ہلاتے اسے واپس رکھ دیا۔

"کہاں رہ گئے ہو حسیب۔"دل میں آواز لگائی تھی۔

(جیت اسی کا مقدر بنتی ہے جو خود میں کچھ کر دکھانے کی ہمت رکھتے ہوں)

بالاج سکندر جس نے آج تک کسی سے لڑائی نہیں کی تھی۔کول مائنڈ بندہ جو بلاوجہ کسی قسم کے لڑائی جھگڑوں میں نہیں پڑتا تھا۔یہاں آکر اسے کیا کیا دیکھنا پڑ رہا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

لیکن وہ دو جانوں کو بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا سکتا تھا۔بلکہ وہ داؤ پر لگا چکا تھا۔

اس نے پلٹ کر ایک جانب درد سے چیختے چلاتے بندے کو دیکھا اور پھر اپنے ہونٹوں کے قریب سے خون کی بوند چن لی۔

اب وہ اگلے کسی حملے کا منتظر تھا۔لیکن چاروں جانب جیسے سکوت چھا چکا تھا۔ویئر ہاؤس کا وہ ایریا بہت ویران نظر آ رہا تھا۔اس نے قدم آگے بڑھائے۔خود بخود تیزی سے بڑھتے قدم ایک کمرے کے دروازے پر رک گئے۔وہ گہرے سانس بھرتا ٹھہر گیا۔دوسری جانب یقیناً کوئی موجود تھا۔اور وہ جو کوئی بھی تھا آج بالاج سکندر کے عتاب سے نہیں بچنے والا تھا۔

'ٹھاہ'کی آواز سنتے اس نے دہل کر آنکھیں وا کیں۔سر میں اٹھتی ٹیسوں نے کچھ دیکھنا محال کر رکھا تھا۔مشکل سے ہی سہی وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔اس نے دیکھا جیا سکندر کا وجود بے ہوش پڑا تھا۔اسے بے ہوش ہوئے آدھ سے زائد گھنٹہ گزرنے

والا تھا۔اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے لیکن حلق سوکھ چکا تھا۔ آواز نکلنے سے انکاری تھی۔وہ آگے کو ہوئی اور اس ڈربے نما چیز میں موجود سوراخ سے باہر جھانکا۔ گرمیوں کی شام تھی۔اندھیرا مکمل چھایا نہیں تھا لیکن سب کچھ اسے دھندلا نظر آرہا تھا۔اس نے آنکھیں مسلیں اور دوبارہ باہر دیکھنا چاہا۔ غور سے دیکھنے پر اسے معلوم پڑتا تھا کہ وہ زمین پر موجود نہیں ہے۔ہاں وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔یقیناً دوسری منزل پر۔اس سوراخ سے دیکھے جانے پر سامنے موجود دیوار ٹوٹی ہوئی نظر آتی تھی۔یقیناً وہ ٹوٹ کر نیچے گر چکی تھی۔

تبھی واپس بیٹھنے سے قبل اس کی نگاہ پھسلتی ہوئی دور قطعے پر پھیلتی گئی۔وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ سفید ہنڈا سوک۔اور اس کے کچھ فاصلے پر بے سود پڑا کوئی شخص۔

"ملک۔" اس کی پکار میں کچھ تھا۔ سرشاریت بھر دینے والا احساس

آنسو تواتر چہرے پر گرنے لگے تھے۔وہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔لب آپ ہی آپ بنجر مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔ سر کا درد جیسے دور بھاگنے لگا تھا۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹکا تو انمول کا خشک حلق تر ہو گیا۔اس نے چیخنا چاہا لیکن پہلی دفعہ میں آواز بلند نہیں ہوئی۔

"ملک۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخی تھی۔ ہتھیلیوں سے لوہے نما وہ ڈربہ بھی بجا ڈالا۔ لیکن دوسری جانب جیسے کسی نے سنا ہی نہیں تھا۔اور پھر کچھ وقت بعد اسے گولیوں کی آواز آنا شروع ہوئی۔اس کارواں رواں ملک کے لیے دعا گو تھا۔وہ سوراخ سے باہر نظریں ٹکائے بیٹھی تھی۔

یوں جیسے کوئی پیاسا کنویں کے کنارے پر بیٹھا ہو۔جو کنویں سے پانی نہ نکال پانے پر آنکھوں سے خود کو سیراب کر رہا ہو۔یا وہ جسے کنویں کے کنارے بیٹھ کر بھی پانی ملنے کی آس باقی ہو۔

وہ بھی امید لگائے بیٹھی تھی۔ لیکن!

امیدیں تو وابستہ ہی ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔

لاؤنج میں رکھے نیلے رنگ کے صوفوں پر اس وقت وہ تینوں عورتیں براجمان تھیں۔صوفیہ ابراہیم اور بسمہ شارق ایک جانب صوفے پر بیٹھی تھیں۔ جبکہ ان کے سامنے ہی دوسرے صوفے پر فریال ساجد بیٹھی ہوئی تھی۔اسے صوفیہ ابراہیم سے مل کر بہت اچھا لگا تھا۔وہ نہایت ہی خوبصورت اخلاق رکھتی تھیں۔وہ پل میں ان سے مرعوب ہو گئی۔

"آپ سے مل کر بہت اچھا لگا آنٹی۔ آپ بہت نائس خاتون ہیں۔" اس کی تعریف پر وہ مسکرا دیں۔

"ہاں بس اللہ جانے بیٹا کس پر چلا گیا ہے۔" بسمہ شارق کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔ صوفیہ ابراہیم نے اس کے سر پر ہلکی چپت رسید کی۔

"میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔" انہوں نے باور کرایا۔

"جی لاکھوں میں جو ایک پیس بچتا ہے وہ مومن ابراہیم ہی ہے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"نظر نہیں آرہا 'آپ کا بیٹا'۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ تو صبح سے اب تک گھر نہیں آیا۔" بسمہ شارق کی آنکھوں میں اچھنبا ابھرا۔ دل وسوسوں میں گھر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کا سوال پڑھتے صوفیہ ابراہیم نے مزید بتایا۔

"صبح کہہ رہا تھا ماں دعا کرنا کہ مجھے وہ مل جائے جس کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی۔" وہ بولیں تو فریال ساجد کی نظریں بسمہ پر اٹھی تھیں۔

"بھلا بتاؤ جسے مانگو گے نہیں وہ تمہارے نصیب میں کیسے آئے گا؟" ان کے چہرے پر اداس مسکان تھی۔ بسمہ نے سر ہلایا۔

"انسان کی دعا میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔؟" سوال فریال کی جانب سے تھا۔

"اتنی کہ دعا فرش سے عرش تک کو ہلا دیتی ہے۔ انسان دعا کے ذریعے اپنے رب سے مانگتا ہے۔ اور وہ رب کبھی اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ ہر حال میں اس سے فریاد کرتے رہنا چاہیے کیونکہ دعا ایک عبادت ہے اور عبادتیں ترک نہیں کی جاسکتیں۔" ان کی آواز میں سحر تھا۔ ویسا ہی سحر جو کسی بھی راہ بھٹکے کو سیدھے راستے پر لانے کا ہنر رکھتا ہو۔

"اور انسان کتنا ناشکرا ہے ناں میسر پر بھی صبر نہیں کرتا اور غیر میسر کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔" وہ کسی گہری سوچ کے زیرِ اثر کہہ رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا بسمہ اس جہاں میں نہیں تھی شاید۔ اور تبھی ایک دم سے ڈور بیل بجی تھی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"مومن ہوگا۔" وہ اٹھنے لگی تھیں۔

"آپ بیٹھیں میں دیکھتی ہوں۔" بسمہ نے ان کے ہاتھ کر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور ایک نظر فریال ساجد کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔ اینٹرنس کا دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا مومن ابراہیم اندر کی جانب کی آرہا تھا۔

چال میں عجیب بے گانگی تھی۔ بال ماتھے پر بکھرے تھے۔ گہری بھوری آنکھیں سرخ تھیں۔ صدیوں کی تکان نے انہیں بوجھل کر رکھا تھا۔ وہ جھکے سر کے ساتھ چلتا ہوا آگے آیا۔ کسی کو کھڑے دیکھ کر جھکا سر اٹھایا تو سامنے ہی وہ کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے والے لباس میں ملبوس تھی۔

بسمہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ سرمئی آنکھوں کا بھوری آنکھوں سے زوردار تصادم ہوا تھا۔ کچھ تھا جو بسمہ شارق پل میں اپنی نظریں پھیر گئی۔ وہ اس سے چند قدم کی دوری پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ کی بند مُٹھی میں کوئی شے تھام رکھی تھی۔ پیشانی عرق آلود تھی لیکن ہلکی پھلکی ہوا تو سرد معلوم ہوتی تھی۔ بارش کا اثر تھا جو موسم خوش گوار تھا۔ پھر اس کا حال ایسا کیوں تھا؟

"کیسے ہو۔؟" وہ بولی تو لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ مومن ابراہیم کا ذہن شارق کبیر کے آفس جا پہنچا۔

)مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں رہی تھی۔ وجہ میرے اعمال تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ اولاد میرے لیے کسی قسم کی زنجیر بنے۔ کیونکہ زنجیریں جکڑ لیں تو چھٹکارا ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں نے سارہ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بضد تھی کہ پہلی اولاد وہ بھی بیٹی کو وہ ختم نہیں کر سکتی۔ میں ملک سے باہر تھا اور جب واپس آیا تو اس کے دنیا میں آنے کے دو ماہ باقی تھے۔ میں نے اسے ختم کرنا چاہا۔ لیکن بد قسمتی سے وہ بچ گئی اور اس کی ماں مر گئی۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ سارہ کا قاتل کون تھا۔ سب نے اسکی موت کو ارلی پریگنینسی کا نتیجہ سمجھا۔)

"شکست خوردہ۔" ایک لفظ اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مومن ابراہیم نے کوئی بات کی نہ ہی بسمہ شارق نے کچھ پوچھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کیا تم بابا سے ملے ہو۔؟" مومن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بسمہ کا سانس بندھ گیا تھا۔ دل میں خون کی گردش تیز ہوتی گئی۔ لیکن مومن ابراہیم جیسے اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔

)بیٹی کی پیدائش میرے لیے پھانسی کا پھندہ تھی جو مجھے کسی بھی وقت موت کے قریب لے جا سکتی تھی۔ لیکن میں نے اسے اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بننے دیا اور اسے آیا کے حوالے کر دیا۔ اس کی پرورش کیسے ہوئی، کن حالات میں ہوئی، اس نے کیا سیکھا، کیا کرنے کو ملا، مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ اس نے سر اٹھایا تو اپنے باپ کو عیاش آدمی پایا۔ اس کا جس سے پالا پڑا اس نے اسے چوٹ دی۔ جس مرد کو اس نے اپنی زندگی میں دیکھا اسے وہ اپنے باپ جیسا لگا، لگتا بھی کیوں ناں؟ بیٹیوں کا تو آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے ناں اور جب اس کا باپ ہی ایک ایسا مرد تھا جس کی معاشرے میں کوئی وقعت نہیں تو وہ کیسے کسی دوسرے مرد پر بھروسہ کر سکتی تھی؟)

"میں اس محبت کے امتحان میں کامیاب ٹھہرا ہوں بسمہ شارق۔" اس نے ہاتھ میں موجود چٹ بسمہ شارق کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کا وجود سن ہو گیا۔ فضا میں جیسے حبس طاری ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔

"اسے ابھی کھولنا مت، کم از کم جب تک تمہیں میں نہ کہوں۔" بسمہ نے ہاتھ کی مٹھی بند کر لی۔ گرفت مضبوط کر لی جیسے وہ بہت قیمتی شے ہو۔

"کیا تمہیں میری شرط یاد ہے؟" اس نے بسمہ کی آنکھوں میں دیکھتے سوال کیا۔ سوال تھا یا کیا؟ بسمہ شارق نے آنکھیں میچ لیں۔

"ہاں۔" ٹھنڈی سانس خارج کی۔ یہ سب توطہ تھا پھر طے شدہ بات سے کیسے مکرا جا سکتا ہے۔؟

)وہ مجھ سے بد دل ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ مجھ سے نفرت کی دعویدار ہے لیکن ایک بیٹی کبھی اپنے باپ سے نفرت کر ہی نہیں سکتی۔ دل کے کسی کونے میں باپ کی محبت کا بیج ضرور موجود ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسے ملنے والی غذا کا نام نفرت رکھ دیا جاتا ہے۔ نفرت اور محبت اور پھر جہاں یہ دونوں جذبے پائے جاتے ہوں وہاں تباہی کے سوا کچھ نہیں آ سکتا۔ اس نے دانستہ طور پر اس بیج پر دھیان نہیں دیا، دیتی تو آج وہ میرے ساتھ ہوتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ نفرت کے سامنے میری محبت کو ہار گئی۔ اور جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو مجھے وہ ایک روشن اور چمکتا ہوا ستارہ نظر آئی تھی۔ (ان کی آنکھوں میں کرب ابھرا) وہ میرے لیے ایک جیک پاٹ تھی۔ (مومن ابراہیم کی قاتلانہ نگاہوں کو دیکھ کر وہ آسودگی سے مسکرائے)۔ دولت کی حوس انسان کا ضمیر مار دیتی ہے۔ شاید اسی لیے میں نے پہلے اسے تکلیف دی، پھر اذیت سے دوچار کیا اور آخر میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا تو میں ہار گیا (مومن ابراہیم مسکرایا تھا)۔ میری ہار کی وجہ تم بنے مومن ابراہیم۔)

"تو پھر ثابت کرو کہ بسمہ شارق اپنی زبان سے پھرتی نہیں۔" وہ غور سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بسمہ نے نظریں اٹھائے اسے تکا۔ وہ اس سے دراز قد تھا۔ بسمہ اس سے چھوٹی نظر آتی تھی۔ ان کا میچ پرفیکٹ تھا۔

"مم۔ میں ویسا ہی کروں گی جیسا تم نے کہا تھا۔ لیکن...."

"لیکن کیا؟" اس نے ٹھہر کر پوچھا۔

"لیکن جب تم اس امتحان میں کامیاب ہو گے۔" اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور مومن کے دل کے مقام پر رکھی۔ وہ ایک دم جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ جسم کا سارا خون نا جانے کیوں چہرے پر آن ٹھہرا تھا۔ بسمہ نے اسے سرخ پڑتے دیکھا۔ آن کی آن چہرہ جھکا کر تھوڑا سا مسکرائی۔

"تمہاری آنکھیں جھوٹی ہیں مومن، یہ جھوٹ بولتی ہیں کہ تم اس امتحان میں سرخرو ہو کر آئے ہو۔ جبکہ تمہارا دل بھی اس بات کا گواہ ہے کہ تم فیل ہو چکے ہو۔" اس نے انگلی سے دو مرتبہ اس کے سینے پر دستک دی۔ مومن کی آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ حیرانی کا عنصر نمایاں ہوتا گیا۔

"گریٹ! تجزیہ اچھا ہے...." اس نے داد دینے والے انداز میں ابرو اچکائے۔ اور بسمہ شارق کا ہاتھ نرمی سے جھٹک دیا۔ وہ مزید کچھ دیر یہاں رکتا تو یقیناً اس کے دل نے کچھ اور راز کھول دینے تھے۔ آہ یہ دل بھی ناں!

"لیکن میرے لیے نہیں ہے۔" اس نے اب کی بار بسمہ کو نہیں دیکھا تھا۔ قدم آگے بڑھانے چاہے۔

"میں نے سنا ہے کہ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے وہ اس چیز سے بھی آپ کو نواز دیتی ہے جس کا آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ دعا حاصل کا ذریعہ ہے۔ دعا تو وہ عبادت ہے جو رب سے جوڑتی ہے۔ اور وہ رب پھر سب عطا کر دیتا ہے تو پھر یہ سب کیوں؟" وہ رو دینے کو تھی۔ اس کا چہرہ اس کے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ کی روداد سنا رہا تھا۔

مومن اس کی بات کو سمجھ چکا تھا۔ وہ رک گیا۔ یوں کہ دونوں کا کندھے سے کندھا ملا ہوا تھا۔ لیکن دونوں کے رخ مخالف سمت میں تھے۔

) تم آئے اور میری بیٹی کو مجھ سے دور لے گئے۔ اس نے مجھ سے میری آدھی دولت چھین لی۔ اور جانتے ہو یہ کاری وار مجھے یوں لگا تھا کہ میری دولت کی بھوک نئے سرے سے بڑھ گئی جیسے بھوکے جانور کے آگے سے کھانا اٹھا لینے پر وہ بپھر تا ہے بالکل ویسے ہی میرے جذبات بھڑکے تھے۔ لیکن تم نے ہر جگہ اسے پروٹیکٹ کیا، اس کی مدد کی اور مجھے یہ شکست قبول نہیں۔ تمہیں مارنا میرے لیے مشکل نہیں ہے، اسے جان سے مار دینے کی بات سن کر میرا دل کانپ جاتا ہے۔ باپ ہوں ناں ایسا تو ہو گا۔ لیکن جب تک میں اپنے جسم کے اس عضو کو کاٹ کر نہیں پھینکو گا جو مجھے تکلیف دے رہا ہے، تب تک میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ مجھے دولت سے عشق ہے اور پیسے کی چمک انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ جلد یا بدیر تم دونوں کو ختم ہونا ہو گا۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"بے حسی کی حد تم پر ختم ہوتی ہے شارق کبیر۔" وہ کہہ رہا تھا)

تمام مناظر چھٹ گئے۔

اس کے ساتھ بسمہ شارق کھڑی تھی۔ وہ محبت کی پیاسی تھی۔ اس کے ارد گرد کے تمام مرد اسے ایک جیسے لگتے تھے۔ پھر بھی وہ مومن ابراہیم سے محبت کر بیٹھی تھی۔ کیوں؟

'کیونکہ دو ٹوٹے ہوئے دل مل کر جڑ سکتے ہیں۔'

شاید وہ یہی جانتی تھی یا شاید وجہ کچھ اور تھی۔ جو بھی وجہ تھی اس وقت مومن ابراہیم کے لیے بسمہ شارق کے سوال کا جواب دینا سب سے مشکل ترین کام تھا۔

"اللہ تعالیٰ انسان کو اس سے نوازتا ہے جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔" اس نے سوال کا جواب اسی کے انداز میں دیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

"لیکن انسان تو ہمیشہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتا ہے۔" اس نے نظروں کا ترچھا رخ مومن کی جانب موڑ لیا۔

"ہاں کیونکہ انسان ہے ہی ناشکرا۔" وہ منہ کے زاویے بگاڑ کر بولا تھا۔ بسمہ کو اس کی حرکت پر ہنسی آ گئی۔

وہ تھا ہی اتنا دلکش کہ اس کی ہر ادا پر وہ دل ہار بیٹھتی تھی۔

وہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی یہ شخص مشکل تھا لیکن اسے سمجھنا ناممکن نہیں تھا۔ اور ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے۔

"اندر کون ہے؟" اسے باتوں کی آواز آئی تو پوچھ بیٹھا۔

"فریال آئی ہے میرے ساتھ۔" اس کی بات پر مومن ابراہیم نے سر ہلا دیا۔

"مومن۔" وہ دوبارہ کچھ کہنے لگی تھی۔

"مجھے۔ ریسٹ کرنا ہے۔ ایکسکیوزمی۔" وہ آگے بڑھ گیا۔ بسمہ نے کھلے لب بند کر لیے۔ اور گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ مومن ابراہیم کو پالینا اتنا آسان نہیں آخر کب اسے اپنی ریاضت کا صلہ ملے گا؟

موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ اس نے آنسو صاف نہیں کیے۔ دفعتاً فریال ساجد باہر آئی تھی۔

"بسمہ تمہارا موبائل کب سے رنگ کر رہا ہے۔" فریال نے موبائل اس کی جانب بڑھایا۔ بسمہ کو مزید رونا آنے لگا تھا۔

"تم جاؤ میں آتی ہوں۔" اس نے موبائل پر آتی کال ریسیو کی۔ اور فریال کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ وہاں تنہا کھڑی تھی۔ نمبر انجان نہیں تھا۔ بسمہ شارق کا دل سکڑ گیا۔

وہ ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا لیکن چھت سے لٹکتا سو واٹ کا بلب روشنی کرنے میں محو نظر آتا تھا۔ دائیں بائیں جھولتا وہ بلب عجیب سا فسوں بنا رہا تھا۔ تبھی کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ بھاری بوٹوں والے قدم۔ زمین پر دھپ پیدا کرتے قدم آہستہ آہستہ اسی کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ چوکنا ہو گیا۔

ماہیر سکندر کی ساری توجہ خود پر سے اور اس بلب پر سے ہٹ کر آنے والے شخص کی جانب گئی تھی۔ اگر تم اس کمرے کا نقشہ اپنی آنکھوں میں سمونا چاہو تو تمہیں چار دیواری نظر آئے گی جس کی دیواریں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ چھت البتہ مضبوط تھی۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک وہ جہاں سے ماہیر سکندر اندر داخل ہوا تھا اور دوسرا بالکل اس کے مخالف سمت میں تھا۔ جبکہ کمرے کے وسط میں کھڑے ماہیر سکندر کے سامنے موجود دیوار خالی تھی۔ جس پر اسپرے پینٹ سے بہت کچھ لکھا گیا تھا کہ کوئی ایک لفظ بھی سمجھ میں آنے سے قاصر تھا۔ سربراہی دیوار کے دائیں جانب سے ایک راہداری سی نکلتی تھی۔ وہ قدموں کی آواز وہیں سے آ رہی تھی۔ ماہیر سکندر کا ہاتھ رینگتا ہوا اپنی پستول کی جانب بڑھ گیا۔ وہ آنے والے کو کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں دینا چاہتا تھا۔

دوسری طرف راہداری سے ایک بندہ ہاتھ میں بھاری بندوق تھامے باہر نکلا تھا۔

"وہیں کھڑے رہو، ورنہ شوٹ کر دوں گا۔" اس کی آواز پر ماہیر سکندر کے لب بھینچ گئے۔ وہ جانتا تھا یہ کس کی آمد ہے۔ گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اور پھر وہاں سے ایک شخص اندر داخل ہوا تھا۔

ماہیر سکندر کا شکار اس کے سامنے تھا۔ جہانداد ملک اپنی پوری وجاہت کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ سفید کافتان نما سوٹ پہنے وہ اپنے ہاتھوں کو پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ سفید وسیاہ کھچڑی جیسے بال جیل سے پیچھے سیٹ کر رکھے تھے۔ مباداوہ کسی دعوت میں شرکت کے لیے آئے تھے؟

ان کے پیچھے سے چھ سات بندے نکل کر پورے کمرے میں بکھر گئے۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"ایک شیر کو مارنے کے لیے اتنے گیدڑ؟ لیکن افسوس تمہارے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" اس نے طنز اچھالا تھا۔ جہانداد ملک اسے دیکھ رہے تھے۔ یاشاید وہ پہلی بار اسے ان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آج ان کی نظروں میں سب کچھ تہس نہس کر دینے کا عزم تھا۔ لیکن ماہیر سکندر کی نظروں میں وہ عزم وارادے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

کیونکہ کمزور عزائم انسان کو ختم کر دیتے ہیں۔

"ہیلو۔" اس کی آواز میں لرزش تھا۔ دوسری جانب کوئی شخص ہکلاتے ہوئے اسے اپنی بات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اسے آس پاس کی دنیا ساکت ہوتی نظر آئی تھی۔

"کیا۔" اس کے لب ہلے۔ آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس نے خود کو رونے سے باز رکھنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ سینے میں جیسے کسی نے خنجر گھونپ دیا تھا۔ اس کی تکلیف ہر احساس پر بھاری تھی۔

"بابا۔" قدموں نے ساتھ چھوڑا تو وہ وہیں گر پڑی۔ دروازے کی دہلیز پر بیٹھی بسمہ شارق کا دل کپکپا گیا تھا۔ خوف وہراس نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تو اس نے ہزیانی انداز میں کان سے موبائل ہٹا کر زمین پر پٹکا۔ ٹھنڈے فرش پر دروازے کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی وہ لڑکی بسمہ شارق نہیں تھی بلکہ ایک بیٹی تھی۔ اور جانتے ہو کیا؟

بیٹیوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے خاص طور پر باپ کے لیے ان کے جذبات کبھی پتھر نہیں ہو سکتے لیکن اس کا دل نا جانے کیسے پتھر بن چکا تھا۔

وہ مکمل سیاہ تھی۔ اور اس کی سیاہی اسے کھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ، آرام آرام سے اس کا وجود سیاہی کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی سیاہی کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ سب کچھ ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور پھر بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے تب جب خالی ہاتھ انسان کو پچھتاوے میں گھسیٹ دیتے ہیں۔

"بابا۔ میرے بابا۔" وہ رو دی۔ اونچی آواز میں ہچکیاں بھرتا اس کا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز بند دروازے سے اندر نہیں جا رہی تھی تبھی کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے صرف بدلہ لیا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے کر اس کی صورت اپنے کندھوں کو جکڑ لیا۔ پیشانی پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ سرمئی آنکھوں میں سرخ پن تھا۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اور لبوں پر کپکپاہٹ تھی۔

"میں نے انہیں نہیں مارا۔ میں کیسے مار سکتی ہوں۔" اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو سمیٹا مبادا خود میں ہی چھپ جانا چاہتی ہو۔ اس کی سسکیاں نم ہوا میں جذب ہوتی جا رہی تھیں۔

"مومن... تم جیت گئے تم واقعی جیت آئے ہو۔" اب کی بار رونے کی تاب نہ لاتی وہ وہاں گٹھری کی مانند پڑی رہ گئی۔

یہ احساس ہر احساس پر غالب تھا کہ وہ لڑکی اپنے سگے باپ کی قاتل تھی۔

ہاں وہ قاتل ہی تو تھی، اس کا حکم ہی تو مانا گیا تھا۔ انسان زرائع بنتے ہیں وہ بھی اس سب کا زریعہ بنی تھی۔ کیا واقعی اس کے باپ کا قاتل کوئی اور نہیں اس کا اپنا آپ تھا۔ وہ باپ سے نفرت کی دعویدار آج ان کی جان لینے کا سبب بنی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا۔ شاید دس منٹ، بیس منٹ اور آدھا گھنٹہ۔ کسی نے بھی اس کی باہر نکل کر خبر نہیں لی۔

اور پھر ایک دم جھٹکے سے دروازہ کھلا تھا۔ غیر مرئی نقطے کو گھورتی اس کی آنکھوں نے آنے والے کو دیکھا۔ وہ مومن ابراہیم تھا۔ ابھی تو وہ اندر گیا تھا اور اب باہر آ گیا تھا؟ شاید وہ اس کے لیے آیا تھا۔ ہاں مگر شاید۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر مومن ابراہیم بنا ادھر ادھر دیکھے گولی کی مانند اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔ بسمہ شارق کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ آج اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تو یہ طہ تھا کہ وہ شخص اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ جیسے آیا تھا بالکل ویسے ہی۔ اور بسمہ شارق کا کیا؟

تبھی موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے موبائل ٹٹولا۔ پھر کپکپاتے ہاتھوں سے لاک کھولا تو سامنے واٹس ایپ پر آیا میسج جگمگا رہا تھا۔ اس نے اسے کھول لیا۔ وہاں ایک وائس نوٹ تھا۔

چیٹ کے نام پر 'عبید بھائی' لکھا ہوا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن بسمہ کی سماعتوں نے صرف ایک لفظ سنا تھا۔ اور وہ لفظ تمام الفاظ پر بھاری تھا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے قدم مین گیٹ کی جانب متحرک تھے۔ اور پھر قدموں میں ایک دم تیزی بھر گئی۔ وہ بھاگ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

(اور جنگیں اکیلے نہیں جیتی جا سکتیں...)

ویئر ہاؤس کے ارد گرد موجود سناٹے سے دور اگر اس کے اندر جھانک کر دیکھو تو وہاں کا ماحول گرم تھا۔ حبس کا ماحول ہر ایک کو چٹخا رہا تھا۔ اب تو کوئی ٹھنڈی ہوا تھی نہ ہی کوئی تازگی کا احساس تھا۔

ان سب کو وہیں چھوڑ کر اگر تم اس چھوٹے کمرے میں جھانکو تو وہاں تمہیں بالاج سکندر کسی شخص سے لڑتا دیکھائی نظر آ رہا تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن آگے سے ٹوٹ چکے تھے۔ اوپری چند بٹن کھلے ہونے کے باعث اس کا سینہ نظر آ رہا تھا۔ وہاں پر خون لگا تھا۔ گہرا کٹ جس میں سے خون نکلتا سفید شرٹ کو رنگ چکا تھا۔ لیکن اس نے پرواہ نہ کرتے اپنے سامنے موجود گارڈ کو ٹھوکریں ماریں۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ پھٹے ہوئے سر سے خون کی بوندیں چہرے کو تر کر رہی تھیں۔ اگر اسے دیکھا جائے تو کراہیت محسوس ہونے لگے۔ لیکن وہ رکا نہیں، مسلسل مکوں، اور پستول کی بونٹ سے اسے مارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بے حال ہو کر گر پڑا، تب جا کر وہ اس سے دور ہوا۔

اس نے اس شخص کو پیچھے جھٹکتے ایک جانب تھوکا تھا جس میں خون کی آمیزش شامل تھی۔ اس نے اپنا جبڑا سہلایا وہاں بڑا سا نیل کا نشان تھا۔ چہرے پر اور بھی کٹ کے نشان تھے۔ بالوں سے کچھ دیر پہلے نکلا ہوا خون اب اپنی جگہ جم گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے سیڑھیاں تھیں۔ اور سیڑھیوں سے اوپر روشنی نظر آتی تھی۔

اسے اندھیرے میں امید کی کرنیں نظر آئیں تھیں۔

"سو بالآخر تم آ گئے ماہیر سکندر۔" انہوں نے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اسے داد دینے والے انداز میں سراہا۔ وہ اپنی ہی جگہ پر کھڑا تھا۔ جہانداد ملک اور اس کے درمیان بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ اونچا بول رہے تھے شاید اس لیے کہ ان کی آواز ماہیر تک پہنچ جائے۔

"میری بیوی اور بہن کہاں ہیں۔؟" ماہیر نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جہانداد ملک نے ابرو اچکایا۔

"مار دیا میں نے انہیں۔ ہاہاہا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ماہیر سکندر کے وجود میں شرارے پھوٹے تھے۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا، وہ اس فرعون کا منہ نوچ لینا چاہتا تھا لیکن جہانداد ملک کے بندوں نے اسے روک رکھا تھا۔

چند بے ہنگم قہقہوں کے بعد انہوں نے ماہیر کو دیکھا۔ پھر انہوں نے قریب کھڑے گارڈ سے کچھ کہا۔

"تمہیں شرط یاد ہے جو میں نے رکھی تھی؟" انہوں نے ایک لکڑی کی کرسی منگوائی تھی۔

"میں کچھ نہیں بھولا۔" اس نے دانت پر دانت جما لیے۔

"زبردست تو اب اس شرط کو پورا کرو۔" وہ کرسی پر بیٹھے اب سیگریٹ سلگا رہے تھے۔

"ماہیر سکندر کا خون ان دونوں عورتوں کی رہائی کی صورت ہے ورنہ وہ تو جان سے جائیں گی ہی ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں گی۔" جہانداد ملک نے دھواں فضا کے سپرد کر دیا۔ ان کے قریب کھڑے بندے کے موبائل پر کسی کی کال آئی، اس نے چند لمحے ٹھہر کر بات سنی تھی۔

"میرے خون کی ایک بوند کی قیمت بھی نہیں چکا سکتے تم جہانداد ملک اور بات کرتے ہو مجھے ختم کرنے کی چچ چچ چچ۔" اس نے سر دائیں بائیں نفی میں ہلایا۔ اب وہی گارڈ جھک کر جہانداد ملک کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر شاطرانہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر دوڑ گئی۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔ گارڈ دور ہٹ گیا۔

"یہ بدلہ ہے برخوردار اس میں تم جذبات کو درمیان میں نہیں لا سکتے۔ تمہارے پاس وقت کم ہے گھڑی کی سوئیاں سات بجانے میں سات منٹ پیچھے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ میں بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی پھر دوبارہ سیگریٹ کا کش بھرا۔

"بدلہ تو ہم لے کر رہیں گے ڈئیر انکل اور تمہاری قبر میں اپنے ہاتھوں سے کھودوں گا۔" کسی انجان شخص کی آواز ماحول کا حصہ بنی تھی۔ جہانداد ملک کے گارڈز ایک دم الرٹ ہوئے تھے۔ ماہیر سکندر کے بائیں جانب موجود دروازے سے کوئی شخص اندر داخل ہوا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس کی آواز میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ مضبوط قدم ماہیر سکندر سے کچھ دوری پر آ کھڑے ہوئے۔

"شکار خود چل کر قید میں آیا ہے اور صیاد کو خبر نہیں۔ ہے نا عجیب بات؟" انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے بندے سے تائید چاہی۔ اس نے مسکراہٹ دباتے سر اوپر نیچے ہلا دیا۔

وہ دھپ دھپ کرتا جلدی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا تھا۔ پوری منزل خالی تھی۔ وہ صرف ایک مستطیل راہداری تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ لیکن وہاں پھر بھی روشنی تھی کیونکہ اس کے اوپر چھت کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ ٹوٹی ہوئی چھت نیچے گری ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ سرے کے آخر میں موجود دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی شے رکھی تھی۔ لوہے کا بڑا سا ڈبہ۔ یوں جیسے کوئی کنٹینر ہو۔

بالاج سکندر کا دل دھڑکتے دھڑکتے جیسے تھک گیا ہو۔ اس کے اندر کوئی تھا۔ کسی کے رونے کی مدھم آواز اسے سنائی دیتی تھی۔ لوہے کے بجنے کی آوازیں بھی اس میں شامل تھیں۔ وہ دونوں وہاں تھیں۔

اس کی بیوی اس کے سامنے تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ وہ اسے عبور کر کے جیا سکندر تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ وہ اسے بچا لے گا۔ بلکہ نہیں وہ اسے بچا چکا تھا۔ وہ اور اس کا بچہ محفوظ ہو چکے تھے۔ لیکن کیا واقعی؟

وہ بھاگنے کے انداز میں آگے بڑھا۔ایک قدم دو قدم وہ اس کے قریب پہنچنے والا تھا جب کوئی شے اڑتی ہوئی آئی اور اسے ہٹ کرتی چلی گئی۔وہ اوندھے منہ زمین پر گرا۔چہرے میں تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔سینے کا زخم زمین پر لگنے سے نئے سرے سے تازہ ہوا تھا تبھی اس سب کے ساتھ کسی کی چیخ گونجی۔وہ چیخ انمول ملک کی تھی۔

"کوئی ہے ادھر۔پلیز ہیلپ۔"اس کی چیخ وپکار اُونچی ہوتی گئی۔بالاج نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں۔اور پھر وہ اس سے پہلے اٹھتا کہ کوئی شخص اس پر جھپٹا تھا۔بالاج سکندر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔اس نے بدوقت اسے خود سے دور دھکیلا۔وہ شخص لڑکھڑایا تھا لیکن بالاج کو زدوکوب کرنے کی کوشش جاری رکھی۔اور پھر ایک اور فائر کی آواز کے ساتھ انسانی چیخ گونجی اور اس گارڈ کا وجود ڈھیلا ہوتا گیا۔

بالاج نے اسے دور پھینکا اور لڑکھڑاتے قدم اٹھاتے وہ اس لوہے کے کنٹینر کی جانب بڑھا۔چہرے پر اس وقت تمام احساس یکجاں تھے۔کنٹینر کے چاروں اطراف ایک سے تھے۔لیکن ایک نکر پر لاک لگا تھا۔سیاہ بڑا سا تالا جسے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت تھی۔لیکن اس کی کنجی تو بالاج سکندر کے ہاتھ میں تھی۔

اس نے تالے کو ایک زاویے پر رکھ کر اس پر پستول سے فائر کیا۔لاک ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا تھا۔لیکن اندر بیٹھا وجود سہم گیا تھا۔اس نے تیر کی تیزی سے اس کنٹینر کا دروازہ الٹ دیا۔اندر اندھیرا تھا۔باہر کی روشنی اندر جانے لگی تھی۔بالاج سکندر کا دل رک گیا۔انمول ملک بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

"آآآ۔"خون آلود شرٹ کو دیکھ کر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخی۔

"ملک۔"وہ سسکی۔بالاج نے نیچے کی جانب اشارہ کیا۔وہ وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔اس نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔جہاں بالاج سکندر اب اس کنٹینر کے اندر داخل ہوا تھا۔اس نے جیا سکندر کے بے ہوش وجود کو تکا۔اس کی حالت دیکھ کر بالاج سکندر کا دل پسیج گیا۔وہ آگے بڑھا۔

"جیا۔"وہ اس کے قریب بیٹھا۔ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔وہ اسے اس حال میں دیکھ کر شل ہو چکا تھا۔

"جیا۔آنکھیں کھولو۔"اس نے جیا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔اس کے چہرے پر گرد تھی۔سفید ملائم چہرہ پس مردگی کا شکار تھا۔اس کا دھیان جیا سکندر سے ہٹ کر اپنے بچے کی جانب گیا تھا۔اور ایک دم پوری دنیا اس کے لیے ساکت ہو گئی۔بالکل منجمند کسی برف کے مجسمے کی طرح۔کسی پتھر کی مورت کی طرح۔

وہ اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔لیکن جیا سکندر کے بے بس وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔وہ اسے جھنجھور رہا تھا لیکن سب بے سود تھا۔

"خوش آمدید مومن ابراہیم۔" انہوں نے سر کو خم دیا۔ ماہیر کی نگاہیں اس کے وجود پر ٹک گئی تھیں۔ اس کا حلیہ کچھ بے ترتیب سا تھا۔ وہ عام روٹین میں ٹپ ٹاپ رہنے والا مومن ابراہیم نہیں تھا۔ یا شاید ماہیر اسے بہت دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ لیکن ایسا کیسے ممکن ہے کہ چند دنوں میں انسان بدل جائیں؟

جبکہ انسان بدلتے نہیں ہیں، وقت کے ساتھ اپنی اصلیت دکھا دیتے ہیں۔

"آج تم یہاں میرے سامنے کھڑے ہو مومن ابراہیم، صوفیہ ابراہیم کے بیٹے بن کر۔" ان کی خون آشام تھیں۔

"ایک تم ہو ماہیر سکندر جس کے ماں باپ کی وجہ سے مجھ سے سب کچھ چھن گیا اور ایک تم ہو (آنکھوں کا رخ مومن کی جانب کر لیا) میرے رقیب کا خون۔" ان کا لہجہ ایک دم سے بدل گیا تھا۔ سانپ کی سی پھنکار ان کے لہجے میں نظر آتی تھی۔

"تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے مجھے دیکھ کر کہو۔ تمہارا دشمن میں ہوں وہ نہیں۔" ماہیر نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ انہوں نے ڈرامائی انداز میں سر ہلاتے پیچھے کھڑے گارڈ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ایک پستول ان کی ہتھیلی پر رکھی تھی۔ انہوں نے اسے سیدھا کر کے اس پر پھونکا۔ پھر ہتھیلی سے اس پر سے نادیدہ گرد جھاڑی۔

"تمہیں کچھ نہیں کہنا بس تمہارا بھیانک سے بھی بدتر انجام لکھنا ہے میں نے۔" اور اسی لمحے مومن ابراہیم کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تھا۔ وہ آتے ہوئے کیوں اپنے ہتھیار نہیں لایا تھا؟

انہوں نے پستول سیدھی کی اس کا رخ ماہیر کی جانب تھا۔ تبھی جیب میں رکھا ملک کا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے بغور آہٹ محسوس کی تھی۔ وہ لب بھینچ گیا۔

"بابا۔ نہیں پلیز۔" اس سے پہلے کہ وہ پستول اس پر تان کر کوئی کاروائی کرتے۔ بائیں دروازے پر کسی کا عکس نمودار ہوا تھا۔

یہ آواز، یہ بھیگا ہوا لہجہ، یہ انداز اس کی انمول کا تھا۔ وہ عورت جسے ماہیر سکندر نے چاہا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ عین دہلیز کے درمیان۔

سر پر دوپٹہ نہ پاؤں میں جوتی، وہ ننگے سر پیر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کتنے دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید چار نہیں پانچ۔ اس نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ چہرے پر گرد تھی، کملایا ہوا چہرہ اور پاؤں پر دھول جم چکی تھی۔ کنکر لگنے کے باعث چھوٹے چھوٹے کٹ بھی لگے ہوئے تھے۔ ماہیر سکندر نے ایک لمحے میں اسے سر تا پیر دیکھا۔ مومن کی نظروں میں حیرانی تھی۔ وہ جتنا حیران ہوتا کم تھا۔ اسے اس سب سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا۔

"انمول۔" اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

"وہیں رک جاؤ۔" ملک کے سر پر لگی تلوؤں پر بجھی۔ اس کا دماغ ایک دم گھوم گیا تھا۔

"خاموش۔" برق رفتاری سے پستول نکال کر اس نے جہانداد ملک کے ارد گرد دو تین فائر کیے۔ انمول ملک کی چیخیں اس کی آواز میں دب کر رہ گئیں۔ جہانداد ملک ایک دم ہڑبڑا گئے تھے۔ وہ سکون سے دوبارہ پلٹ گیا۔

"سر صرف ایک حکم دیں ہم اسے ابھی منہ کے بل گرا دیں گے۔" کوئی گارڈ بولا تھا جب جہانداد ملک نے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

"وہ اس وقت بپھرا ہوا ہے، اسے شانت ہو جانے دو زرا۔" اب کی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ انمول ملک نے شدید ناگواری سے انہیں تکا اور پھر ملک کو۔ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ جہانداد ملک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مومن بھی اپنی جگہ پر ٹھہرا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

"تم..." اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے یا اسے روکتے ملک نے خونخوار نظروں سے مڑ کر انہیں گھورا۔

"مجھے میری بیوی سے مل لینے دو، کسی کی دخل اندازی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔ اور اب اگر کسی نے مداخلت کی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔" اس نے وارن کیا اور انمول کی جانب گھوم گیا۔

"ملک۔" وہ رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی لکیریں اس کے گالوں پر بنتی تھوڑی سے نیچے ٹپک رہی تھیں۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

"شش۔ میں آ گیا ہوں۔" وہ اس کے قریب آیا۔ انمول اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم نہیں آئے تھے۔ تم اتنے دن نہیں آئے۔ میں کتنی تکلیف میں تھی ملک۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔" کیا وہ اندازہ کر سکتی تھی اس تکلیف کا جو ملک نے سہی تھی۔ اتنے دنوں کی اذیت، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"خاموش ہو جائیں انمول۔ میں آپ کے پاس ہوں آپ کے بالکل قریب۔" ان دونوں میں چند انچ کا فاصلہ تھا۔ جہانداد ملک نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا، دوسری نظر مومن پر اٹھائی وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کوئی اپنی جگہ سے ہل پاتا جب...

"ملک۔" گولی کی آواز کے ساتھ ہی انمول ملک کی دل خراش چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہاں کھڑے تمام نفوس ساکت ہو گئے۔

اور ساکت تو پھر اوپری منزل پر کھڑا بالاج سکندر بھی ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ....

کچھ آوازیں روح فنا کر جاتی ہیں۔

وہ اضطراب کی کیفیت میں انگلیاں مڑوڑتی سر جھکائے بیٹھی تھی۔وہ اور صوفیہ ابراہیم وہاں اکیلے تھے۔بسمہ شارق معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ گارڈ سے خبر ملی تھی کہ وہ بہت جلدی میں کہیں گئی ہیں۔وہ تب سے اب تک اس کا انتظار کر رہی تھی۔شام سے رات ہو گئی تھی۔سیاہ رات تھی جسے اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھی تھی۔صوفیہ ابراہیم اس کے قریب بے چین سی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں یہ دونوں۔؟"وہ بولیں تو لہجے میں فکر تھی۔ماں تھیں ناں پریشان ہونا تو بنتا تھا۔

"آپ فکر نہیں کریں آنٹی وہ آجائیں گے۔ایک تو یہ فون بھی نہیں اٹھا رہی۔"اس نے جھنجھلا کر دوبارہ بسمہ شارق کا نمبر ملایا لیکن بے سُود۔

"آنٹی۔"اس نے دیکھا صوفیہ ابراہیم کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔بس گھبراہٹ ہو رہی تھی۔"انہوں نے دو انگلیوں سے پیشانی مسلی۔

"میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔"وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔پریشانی اس کے چہرے پر بھی عیاں تھی۔وہ فون پر بسمہ کا نمبر دوبارہ ملاتی کچن میں داخل ہوئی۔

"کیا مسلہ ہے بسمہ فون اٹھاؤ۔"رات کے بارہ بجنے کے قریب تھے۔اور اس کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ تبھی موبائل پر کسی کی کال آئی تھی۔اسکرین پر 'عبید باجوہ' لکھا نظر آرہا تھا۔

اس نے گلاس نکال کر شیلف پر رکھا۔بوتل سے اس میں پانی انڈیلا۔دل سکڑ رہا تھا۔پتا نہیں کیوں اسے کچھ برا معلوم ہو رہا تھا۔بہر حال اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"السلام علیکم۔"اس نے سلام کیا۔

"جی؟"اگلے ہی لمحے ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔دوسری جانب سے عبید باجوہ کی آواز ابھر رہی تھی۔وہ گلاس ہاتھ میں تھامے پلٹی۔اور تبھی اس کی گرفت سے گلاس چھوٹ کر زمین بوس ہوا۔

کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز پر صوفیہ ابراہیم بھاگ کر کچن میں داخل ہوئی تھیں۔سامنے فریال ساجد کھڑی تھی۔اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا یوں جیسے بدن سے سارا خون نکال دیا گیا ہو یا یوں جیسے کوئی مردہ ان کے سامنے کھڑا ہو۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔"موبائل اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر جا گرا۔اسکرین پر جالی سی بن آئی تھی۔صوفیہ ابراہیم جلدی سے آگے بڑھیں۔فریال ساجد کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر سمٹ آیا تھا۔

"فریال بچے۔کیا ہوا؟"ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"بھیانک اختتام۔"فقط دو الفاظ اور وہاں کھڑے دونوں وجود سن رہ گئے تھے۔یوں جیسے صور پھونک دیا گیا ہو۔

اختتام موت تھا کیا؟

نہیں...اختتام ابھی باقی تھا۔

وہ ایم ایس مارشل آرٹس سینٹر کے گارڈن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے چھو کر گزر رہے تھے۔وہ وہاں تنہا نہیں تھی لیکن کچھ تھا جو اسے اپنا آپ خالی محسوس ہو رہا تھا۔گارڈن میں اور بھی اسٹوڈنٹس تھے جو اپنے کاموں اور باتوں میں مشغول نظر آتے تھے۔دفعتاً اسے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔کوئی اس کے بینچ کے نزدیک آ رہا تھا وہ جو کوئی بھی تھا بسمہ شارق اسے پہچان چکی تھی۔وہ جب بھی آتا تھا وہ اسے پہچان جاتی تھی۔

وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا۔یہ واقعہ ہسپتال والے واقعے سے پہلے کا تھا۔یہ اس روز سے اگلے دن کا واقعہ تھا جب بسمہ شارق اپارٹمنٹ چھوڑ کر واپس ہاسٹل آئی تھی۔

"کیوں آئے ہو؟""وہ اس کے قریب بیٹھا تھا۔وہ اس کے پاس آیا ہی کیوں تھا؟آخر کیا چاہتا تھا وہ؟

"مجھے آنا تھا۔ہمیشہ کی طرح۔"چند لمحے خاموشی چھا گئی۔دونوں فریق خاموش تھے۔بسمہ شارق کو اس کے پاس ہونے سے ہتک اور بے عزتی کا احساس دوبارہ ہوا تھا۔

"تمہیں اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔"اس نے کہا تو بسمہ شارق نے زرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔وہ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہاتھوں کی دونوں ہتھیلیاں باہم الجھائے آگے کو جھکا ہوا تھا۔بال ہمیشہ کی طرح ماتھے پر بے ترتیب سے گرے تھے۔

"کچھ سال پہلے کی بات ہے شاید تب میں دس بارہ سال کا تھا، میں لندن کے ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔میری کلاس کا ایک لڑکا تھا جیک۔میری اور اس کی دوستی کافی گہری تھی۔ہمارا بہت سارا وقت ساتھ گزرتا تھا۔ہم بیسٹ فرینڈز فار ایور تھے۔لیکن دوستی ہر ایک کو راس نہیں آتی۔"اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔بسمہ نے چہرے پر پھسلتی بالوں کی لٹوں کو پیچھے دھکیلا۔وہ اسے سن رہی تھی۔سرمئی آنکھوں میں مومن ابراہیم سمایا ہوا تھا۔

"ہم غلط وقت پر اپنے راز غلط لوگوں کو تھما دیتے ہیں۔میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا تھا۔اسے معلوم تھا میرا ماضی کیا ہے۔اور اس نے اس سب کو 'فن' سمجھ کر پوری کلاس میں پھیلا دیا۔میرا مذاق اڑایا اور مجھے ذلیل کیا۔انگریز بچوں کے لیے میری کہانی بہت عام تھی۔بروکن فیملیز کے بچے تو میری کلاس میں بہت تھے لیکن انہوں نے اس بات کو عام نہیں رہنے دیا۔ان سب نے مل کر مجھے

bully کیا۔ جیک نے مجھ پر فقرے کسے، بھائی کو بھی بہت برا بھلا کہا اور یہی اس کی حد تھی۔" مومن ابراہیم نے دونوں ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"اگلے دن اسکول سے واپسی پر میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ مار کٹائی ہوئی اور جیک کو بہت زیادہ چوٹیں آئیں۔ بھائی کی تربیت تھی جو میں نے ان کی خاصی دھلائی کر ڈالی اور پھر اس دن مومن ابراہیم نے اپنے واحد دوست کو کھو دیا۔ اس کے مجھ سے لاکھ اختلاف سہی لیکن مجھ سے جڑے رشتوں کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے تھا۔" اس کے لبوں پر استہزایہ مسکان تھی۔ بسمہ شارق ہمہ تن گوش تھی۔

"ہم سب کی زندگی میں کوئی ایسا دوست ضرور ہوتا ہے جس کے بعد دوستی جیسے رشتے پر سے اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔ انسان کسی دوسرے سے دوستی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بھروسہ اور اعتماد ایسے رشتے ہیں جو ٹوٹ جائیں تو کبھی جڑ نہیں سکتے۔ میں نے اسے کھو دیا۔ اور پھر اس کے والدین نے میرے خلاف کاروائی کی۔ بھائی کے توسط میں بچ گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط شخص پر بھروسہ کیا تھا۔ بعض اوقات ہم غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط مان لیتے ہیں۔ میں نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اسے بخشا نہیں۔" اب کی بار اس نے اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

"اس نے دوبارہ مجھے تنگ کرنا چاہا، لیکن اب کی بار میں نے اسکول واپسی پر اسے کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ میرے راستے میں نہیں آیا۔ ہم اجنبی سے دوست بنے اور دوست سے پھر سے اجنبی بن گئے۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جسے میں نے بہت کچھ سمجھا وہ اصل میں میرا تھا ہی نہیں۔ بچپن کی ٹوٹی ہوئی دوستیاں بہت تکلیف دیتی ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ بسمہ سر جھکائے سب سن رہی تھی۔ سر اٹھایا تو مومن اسکی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کمال محویت تھی۔ وہ سٹپٹا گئی۔

"لیکن... وہ تو تمہارا دوست تھا ناں؟" اس نے سنبھل کر پوچھا۔

"وہ دوست نہیں آستین کا سانپ تھا...

"And snakes aren't friends"

اس نے نظروں کا رخ پھیر لیا۔ دل میں گلٹ سا اٹھا تھا۔ اس نے کل بسمہ کو تھپڑ مارا تھا اسے سوری کرنی چاہیئے تھی لیکن اس نے نہیں کی۔ چلو پھر کبھی سہی۔

"ہماری دوستی کبھی دشمنی میں نہ بدلتی اگر وہ بھائی کو برا بھلا نہیں کہتا۔ بھائی میں میری جان بستی ہے۔ وہ 'وہ ہیں جنہوں نے میری پرورش کی۔ وہ میرے محسن میرے دوست ہیں اور ان کے بارے میں 'میں کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔" بسمہ کو آہستہ آہستہ اس کی بات کی سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ کیوں اسے اتنا لمبا قصہ سنا رہا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا۔

"بھائی کو اذیت پہنچانے والے کے لیے مومن ابراہیم اذیتوں کے سو در کھول دے گا۔ جو کوئی بھی انہیں نقصان پہنچانا چاہے گا وہ خود اپنا نقصان کرے گا۔ اس لیے آئندہ احتیاط کرنا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بات ختم ہو چکی تھی۔ بسمہ شارق یونہی بینچ پر بیٹھی رہی۔

"تمہیں ملک سر بہت عزیز ہیں ناں۔"

"جان سے بھی زیادہ۔" وہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"اور اگر کبھی انہیں کچھ ہو جائے تو۔؟" اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ نظریں مومن ابراہیم پر تھیں۔

"تو ان سے پہلے مومن ابراہیم اپنی جان دینا پسند کرے گا۔" آخری جملہ تھا جو اس نے کہا اور آگے چل دیا۔ وہ اسے دور جاتے ہوئے دیکھے گئی۔

مومن ابراہیم کے لیے قریبی رشتے بہت عزیز تھے، وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تو پھر خود اس شخص کے حصے میں محرومیاں کیوں آتی تھیں؟

) آگ اپنے ساتھ بہت کچھ لپیٹ کر لے جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح بلکہ ہر انسان کی طرح تمہیں جیت کا خسارہ بھگتنا ہو گا۔)

□□□□□

﴿جاری ہے﴾

نوٹ: تاثیرِ عشقم کا سفر آہستہ آہستہ اپنے اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کی اگلی قسط انشاء اللہ تعالیٰ 'آخری قسط' ہو گی۔ جسے لکھنے کے لیے وقت اور محنت دونوں درکار ہیں لہٰذا میرے ساتھ تعاون کریں اور بار بار قسط کا پوچھ کر پریشان نہ کریں۔

شکریہ!

☆☆☆☆☆☆☆☆

﴿جاری ہے﴾

Share your valuable feedback please.....!